ماهنامہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

.و پے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پاکستانی عورت دوراہے پر

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی دوران نظربندی

تازہ تصنیف

(دیباچہ از مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی)

جس میں اس منظم تحریک کو بے نقاب کیا گیا ہے:—

— جو آج کل مسلمان عورت کو مغربیت کے سانچے میں ڈھالنے کیلئے جاری ہے

— جو مذہب ملا سے نہیں، بلکہ دین خدا سے برسر پیکار ہے

— جس کے طریق کار میں بغاوت کے ساتھ منافقت بھی شامل

— جس سے نہ ہماری دنیا بننے کا امکان ہے، نہ عاقبت سنورنے کی تو

جلد عمدہ گرد پوش دیدہ زیب، ضخامت ۲۶۴ صفحات، قیمت ۲ روپے ۱۲ آ

اسلام کے نظام معاشرت پر مزید لٹریچر

پردہ

اس کتاب کا مطالعہ ہر اس مسلمان کیلئے ناگزیر ہے جو اسلام اور مغرب کے معاشرتی نظریات و عملیات کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہے اور اسلام کے اصول تمدن پر دھنا مطمئن ہونا چاہے مرد و زن کے آزادانہ میل جول سے یورپ میں جو فواحش کی کثرت، خاندانی نظام کی بربادی اور کلی قومی ہلاکت نمودار ہوئی ہے اسکی تفصیلی روداد کتاب میں پیش کی گئی ہے ضخامت ۳۴۲ صفحات قیمت ۲ روپے آٹھ آنے

حقوق الزوجین

مرد اور عورت کے قانونی اور معا حقوق جو اسلام کے عطا کردہ ہ اُنکی تفصیل اِس کتاب میں موجود ضخامت ۱۲۴ صفحات قیمت -/۸

اسلام اور ضبط ولادت

اِس رسالے کا موضوع ضبط کی تحریک کی علمی اور عملی بنیا کا اِبطال ہے۔ ضخامت ۶۰ صفحات قیمت ایک روپیہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۳۵ | محرم ۱۳۷۰ھ مطابق نومبر ۱۹۵۰ء | عدد ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلی صحبت میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ جماعت اسلامی جس دعوت پر قائم ہوئی ہے اس کا مقصد اول روز سے
الہ دینِ حق کو اس کی اصلی اور مکمل صورت میں پورے نظامِ زندگی پر غالب کیا جائے۔ اس مقصد کے مختلف پہلوؤں سے
لمانوں کے مختلف الخیال اشخاص اور گروہوں کو جس جس نوعیت کے اختلافات ہیں ان کی طرف بھی مختصر اشارات کئے
اچکے ہیں۔ اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پچھلے اٹھارہ سال میں یہ تحریک کن مراحل سے گزرتی ہوئی آرہ
ہے۔ اس بیان سے مقصود محض تاریخ نگاری نہیں ہے۔ دراصل جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اپنے نصب العین کے
ئے ہم نے اب تک جو کام جس طرح کیا ہے اسے لوگ اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ آئندہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں اس
سمجھنا ان کے لئے آسان ہو۔
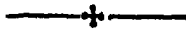
۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) میں جب اس تحریک کا آغاز ہوا اُس وقت ہمارے سامنے اولین کام یہ تھا کہ مسلمانوں
صاحبِ فکر و فہم طبقے کو اسلام کا معتقد بنایا جائے۔

عام انسانوں کے بجائے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو ہم نے اس لئے خطاب کیا کہ دُنیا میں مسلمان اسلام کے
مانگے نمائندے ہیں خواہ وہ اپنی اس حیثیت کا شعور رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، بہرحال دُنیا ان کو نظر انداز کر کے خالص اور
سلام کو محض الفاظ کی مدد سے سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی۔ اس کو جب کبھی اسلام کی طرف دعوت دی جائے گی، اس کی
احمالاً اُن لوگوں کی طرف اٹھے گی جو پہلے سے اس دین کے پیرو ہیں۔ اور اگر وہ اپنی زندگی میں انسانیت کا کوئی دلکش
پیش نہ کر رہے ہوں تو دُنیا سے یہ توقع کرنا بہت مشکل ہے کہ وہ اس دین کے اتباع سے اپنی فلاح و بہبود کی امید رکھ
لے گی۔ اس لئے دُنیا میں نظامِ حق برپا کرنے کے لئے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ اگر سارے مسلمان نہیں تو کم از کم اُن میں کوئی
گروہ ایسا ضرور موجود ہو جو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسلام کی صحیح نمائندگی کرتا ہو۔

مسلمانوں میں سے پہلے عوام کو چھوڑ کر خاص طور پر سوچنے سمجھنے والے اہل دماغ طبقے کو مخاطب کیا، کیونکہ کسی قوم کے مسلمانوں کے اہل دماغ لوگ جو راستہ چلتے ہیں، زندگی میں جو راستہ بھی وہ اختیار کرتے ہیں عوام ان کے پیچھے اس راستے پر چل جاتے ہیں۔ اسی لئے ہم نے عام مسلمانوں کی اعتقادی و عملی اصلاح سے پہلے ضروری سمجھا کہ اپنی کوششوں کو ان خواص کی اصلاح پر مرکوز کر دیں جو اپنی علمی و ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے قوم کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ تخصیص اس لئے بھی ضروری تھی کہ معاشرے کی عام اصلاح کے لئے جو کام ہم کرنا چاہتے تھے اس کے لئے کارکن ہم کو بہرحال اہل دماغ طبقے ہی سے مل سکتے تھے۔

پھر اصلاح کے معاملے میں بھی ہم نے اخلاقی و عملی اصلاح پر فکری و ذہنی اصلاح کو مقدم رکھا کیونکہ خیال ہی اخلاق و کردار کی جڑ ہے۔ کسی شخص یا گروہ کی زندگی میں کوئی عملی تغیر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کے نظریات بدلیں، اس کے سوچنے کا انداز نہ بدلے، اور اس کی اقدار نہ بدل جائیں۔

یہ تھا اس دعوت کی راہ میں ہمارا پہلا قدم۔ یہ خالص تنقید اور تبلیغ و تلقین کا مرحلہ تھا جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۱ء تک ۹ سال رہا۔

اس میں ایک طرف جاہلیت کے ہر گوشے پر تنقید کی گئی۔ قدیم مشرکانہ اور راہبانہ جاہلیتوں پر بھی اور جدید مغربی جاہلیت پر بھی۔ جاہلیت کے ان اثرات پر بھی جو اپنی پچھلی تاریخ کے دوران میں ہم قبول کرتے رہے ہیں، اور ان اثرات پر بھی جنہیں آج ہم اپنی زندگی میں لئے ہوئے ہیں۔ ان ساری جاہلیتوں پر تنقید کر کے ان کی عقلی کمزوریوں اور ان کے اخلاقی و تمدنی نقصانات کو واضح کیا گیا، اور پورا تجزیہ کر کے بتایا گیا کہ اسلام کا راستہ اپنی فکری بنیادوں اور اپنے عملی نتائج میں ان جاہلیتوں سے کس طرح ممیز ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے مختلف مذاہب فکر پر بھی تنقید کی گئی۔ فقہی جمود کے حامیوں پر بھی اور اجتہاد کے مدعیوں پر بھی، حدیث کا انکار کرنے والوں پر بھی اور حدیث کے بارے میں غلو کرنے والوں پر بھی، دین سے پھرنے والوں پر بھی اور دین کو اپنی خواہشات کا پابند بنانے والوں پر بھی۔ اس پورے تنقیدی کام میں جو کچھ ہمارا پیش نظر تھا وہ صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کے صاحب فکر لوگوں کی ان ذہنی الجھنوں کو دور کیا جائے جن کی وجہ سے ان کے لئے اسلام کو سمجھنا اور خیالات کے جنگل میں اس کی شاہراہ کو صاف صاف دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی لئے

جب کبھی ہمارے کسی عقیدے یا اصول پر کسی نے ہم کو بحث میں الجھانا چاہا ——— اور ایسی نوبت بارہا آئی ہے ———
تو ہم نے اس کے ساتھ الجھنے سے انکار کر دیا، کیونکہ ہمارے لئے بحث بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی بلکہ اپنے مقصد
کی راہ صاف کرنے کے لئے ہم نے ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر انھیں اختیار کیا تھا اور ہم ان میں الجھ کر
کھوٹی کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

دوسری طرف اس مرحلے میں اسلام کے پورے نظام زندگی کو جیسا کہ وہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت
میں بیان ہوا ہے، معقول اور مدلل اور مفصل طریقے سے پیش کیا گیا۔ اس کے عقائد اور ایمانیات کیا ہیں۔ اس کا نقطۂ
کائنات و انسان کیا ہے۔ اس کا فلسفۂ اخلاق کیا ہے۔ اس کی عبادات کس غرض کے لئے ہیں۔ وہ انسانی سیرت و کردار کو کس سانچے
میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کی تہذیب کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ وہ تمدن، معیشت، معاشرت اور سیاست کے لئے کیا قاعدے
تجویز کرتا ہے۔ اس کے مزاج سے کس قسم کا نظام تعلیم مناسبت رکھتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو پہلے کس طرح
حل کرتا رہا ہے اور آج کس طرح کر سکتا ہے۔ اس کے نظام زندگی کو برپا کرنے کے لئے پہلے کیا کچھ کیا گیا ہے اور آج
کیا کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام امور کو جہاں تک ہمارے بس میں تھا ہم نے ایسے طریقوں سے پیش کرنے کی کوشش کی
موجودہ دور کے ایک تعلیم یافتہ آدمی کو مطمئن کر سکیں۔ مگر اس کام سے ہمارا مقصد محض ایک علمی خدمت انجام دینا نہ
بلکہ اول روز سے ہمارے پیش نظر یہ تھا کہ جو لوگ سوچ سمجھ کر اسلام کے معتقد ہوں وہ اس کو عملاً قائم کر
بھی تیار ہو جائیں۔ اسی لئے ہم ہر قدم پر دماغوں کو مطمئن کرنے کے ساتھ دلوں کو اکسانے کی بھی کوشش کرتے رہے
کی دعوت کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کرتے رہے کہ کوئی دین کسی دوسرے دین کی آغوش میں پرورش نہیں
جو سچے دل سے اسلام کی پیروی کرنا چاہتے ہوں انھیں دنیا میں کفر کی امامت کے بجائے اسلام کی امامت
سر دھڑ کی بازی لگا دینے پر تیار ہونا چاہئے۔

اس مرحلے کے کام کو جو لوگ اچھی طرح سمجھنا چاہیں وہ اگر ہماری مطبوعات کو ذیل کی تاریخی ترتیب
نظر کے سامنے رکھیں تو پورا نقشہ واضح ہو سکتا ہے جس پر شروع سے [illegible] کے اختتام تک کام کیا گیا۔

زکوٰۃ کی حقیقت اور اس کے اصولی احکام

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

زکوٰۃ کی حقیقت اور اس کے احکام و ضوابط کے متعلق بار بار مختلف سوالات ہمارے سامنے آتے ہتے ہیں اور اس بات کی ضرورت ہم خود محسوس کرتے ہیں کہ یہ مسائل زیادہ سے زیادہ واضح ہوں، ایک تو غرض کے لئے کہ زکوٰۃ کی مالی عبادت کی انجام دہی علم کے بغیر ممکن نہیں، دوسرے اس مقصد کے لئے کہ ستان میں ہمیں اسلامی نظام کو استوار کرنا ہے اور اس نظام کا ایک ستون زکوٰۃ کے وصول و صرف کا نظام ہے جس کے لئے ذہنوں کو ابھی سے تیار کرنا ضروری ہے۔

اس موضوع سے متعلق پچھلے دنوں ایک جامع سوالنامہ ہمارے پاس آیا جس میں قریب قریب تمام روری اور اصولی سوالات شامل ہیں۔ اس سوالنامے کے جوابات جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لانا امین احسن صاحب اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب سے مشورہ فرماتے ہوئے قلمبند کئے ہیں۔ یہ وابات اگرچہ مختصر ہیں، لیکن جامع بھی ہیں، اور یہ وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کر سکیں گے۔

ترجمان القرآن کے گزشتہ شمارے کے ایک مضمون میں زکوٰۃ کے مصارف میں سے "فی سبیل اللہ" کی تشریح کے متعلق جو اہم سوال اٹھایا گیا تھا، اس کا جواب بھی اسی سوالنامے کے جوابات میں آگیا ہے۔ [illegible]

سوال نامہ

[illegible] تعریف کیا ہے؟

[illegible] زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس سلسلے میں [illegible]

[illegible] کی حیثیت کیا ہے؟ وضاحت سے بیان کیجئے۔

[illegible] کے لئے کسی [illegible] سمجھنا چاہیے؟

(۴) زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہونے کے لئے عورت کے ذاتی استعمال کے زیور کی کیا حیثیت ہے؟

(۵) کیا کمپنیوں کو زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے یا حصہ دار کو اپنے اپنے حصے کے مطابق فرداً فرداً ادا کرنے کا ذمے دار ٹھیرا جائے؟

(۶) کارخانوں اور دوسرے تجارتی اداروں پر زکوٰۃ کے وجوب کی حدود بیان کیجئے؟

(۷) جن کمپنیوں کے حصص قابلِ انتقال ہیں ان کے سلسلے میں تشخیصِ زکوٰۃ کے وقت کس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی حصص کے خریدنے والے پر یا فروخت کرنے والے پر؟

(۸) کن کن اثاثوں اور چیزوں پر اور موجودہ سماجی حالت کے پیشِ نظر کن کن حالات میں زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے بالخصوص ان چیزوں کے بارے میں یا ان سے پیدا شدہ حالات میں کیا صورت ہوگی۔

(ا) نقدی۔ سونا۔ چاندی۔ زیورات۔ اور جواہرات۔

(ب) دھات کے سکے (جن میں طلائی نقرئی اور دوسری دھاتوں کے سکے شامل ہیں) اور کاغذی سکے۔

(ج) بنکوں میں بقایا امانت بنک یا کسی دوسری جگہ حفاظت میں رکھی ہوئی چیزیں۔ لئے ہوئے قرضے۔ مرہونہ جائیداد اور متنازعہ فیہ جائیداد اور ایسی جائیداد جو قابلِ ارجاعِ نالش ہو۔

(د) عطیات۔

(ہ) بیمے کی پالیسیاں اور پراویڈنٹ فنڈ کی رقمیں۔

(و) مویشی، ڈھور خانے کی مصنوعات۔ زرعی پیداوار مع اناج سبزیاں پھل اور پھول۔

(ز) معدنیات۔

(ح) برآمد شدہ دفینہ۔

(ط) آثارِ قدیمہ۔

(ی) جنگلی یا پالتو مکھی کا شہد۔

(ک) مچھلی موتی اور پانی سے نکلنے والی دوسری چیزیں۔

(۹) رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں جن اموال پر زکوٰۃ واجب تھی کیا خلفائے راشدین نے ان کی فہرست میں
اضافہ کیا؟ اگر کوئی اضافہ یا تبدیلی کی گئی تو کن اصولوں پر؟

(۱۰) کیا نکل کے سکوں اور سونے اور چاندی کے سوا دوسری دھاتوں کے رائج الوقت سکوں پر زکوٰۃ ہو
جو سکے رائج نہیں رہے جو خراب ہیں یا جو حکومت نے واپس لے لئے ہیں یا دوسرے ملکوں کے سکے
بھی اس سلسلے میں شمار ہونا چاہئیے یا نہیں؟

(۱۱) مال ظاہر اور مال باطن کی تعریف کیا ہے؟ اس سلسلے میں بنکوں میں جمع شدہ رقوم کی حیثیت کیا ہے

(۱۲) اغراض زکوٰۃ کے لئے مال نامی (نمو پذیر) کی حدود بیان کیجئے۔ کیا صرف مال نامی پر زکوٰۃ واجب ہوگی

(۱۳) جو مکان زیورات اور دوسری چیزیں کرائے پر دی جاتی ہیں ان پر اور ٹیکسی گاڑی موٹر وغیرہ پر ز
نے کے کیا قاعدے ہونے چاہئیں؟

(۱۴) کسی آدمی کے کن کن مملوکہ جانوروں پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے؟ اس سلسلے میں بھینسوں مرغیوں اور ذ
اور شوقیہ پالے ہوئے جانوروں کی حیثیت کیا ہے؟ کیا ان پر زکوٰۃ نقدی کی شکل میں یا جنس کی صورت
جوں طرح دی جا سکتی ہے؟ کسی آدمی کے مختلف مملوکہ جانوروں کی کتنی تعداد پر اور کن حالات میں ز
سب ہونی چاہئیے؟

(۱۵) جن مختلف سامانوں اور چیزوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ان پر زکوٰۃ کس شرح سے لی جائے؟

(۱۶) کیا خلفائے راشدین کے زمانے میں نقدی سکوں مویشیوں سامان تجارت اور زرعی پیداوار پر زکوٰۃ کی
اصولی تبدیلی کی گئی ہے؟ اگر ایسا ہوا تو سند کے ساتھ تفصیلی وجوہ بیان کیجئے۔

(۱۷) نقدی کی صورت میں اگر زکوٰۃ دو سو نقرئی درہم اور ۲۰ طلائی مثقال پر واجب ہو تو یہ سکے
شائد [illegible] کے برابر ہوں گے؟ اناج کی صورت میں صاع اور وسق پاکستان کے مختلف علاقوں اور
کن مروجہ اوزان کے برابر ہوں گے؟

(۱۸) کیا موجودہ حالات کے پیش نظر نصاب (وہ کم از کم سرمایہ جس پر زکوٰۃ واجب ہے) اور زکوٰۃ

میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے؟ اس مسئلے پر اپنے خیالات دلائل کے ساتھ پیش کیجئے

(۱۹) مختلف اثاثوں اور سامان پر کتنی مدت گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟

(۲۰) اگر ایک سال میں کئی فصلیں ہوں تو کیا سال میں صرف ایک بار زکوٰۃ ادا کی جانی چاہئے۔ یا ہر فصل پر؟

(۲۱) زکوٰۃ قمری سال کے حساب سے واجب ہونی چاہئے یا شمسی سال کے حساب سے؟ کیا زکوٰۃ کی تشخیص اور وصولی کے لئے کوئی مہینہ مقرر ہونا چاہئے؟

(۲۲) زکوٰۃ کی رقم کن مصارف میں خرچ ہونی چاہئے؟

(۲۳) قرآن حکیم میں جن مختلف مصارف میں زکوٰۃ خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کی حدود بیان کیجئے بالخصوص اصطلاح "فی سبیل اللہ" کے معنیٰ اور مفہوم کی وضاحت کیجئے۔

(۲۴) کیا یہ لازمی ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کا ایک حصہ ان مصارف میں سے ہر ایک مصرف پر خرچ کرنے کے لئے الگ رکھا جائے جن کا قرآن کریم میں ذکر آیا ہے یا زکوٰۃ کی پوری رقم قرآن مجید میں بتائے ہوئے تمام مصارف پر خرچ کرنے کے بجائے ان میں سے کسی ایک یا چند مصارف میں بھی خرچ کی جا سکتی ہے؟

(۲۵) مستحقین زکوٰۃ کے ہر طبقے میں کسی فرد کو کن حالات میں زکوٰۃ لینے کا حق پہنچتا ہے؟ پاکستان کے مختلف حصوں میں جو حالات پائے جاتے ہیں ان کی روشنی میں اس امر کی وضاحت کی جائے کہ سیدوں اور بنی ہاشم سے تعلق رکھنے والے دوسرے افراد کو زکوٰۃ لینے کا کہاں تک حق پہنچتا ہے؟

(۲۶) کیا زکوٰۃ صرف افراد کو دی جا سکتی ہے یا اداروں (مثلاً تعلیمی اداروں، یتیم خانوں اور محتاج خانوں وغیرہ) کو بھی دی جا سکتی ہے؟

(۲۷) کیا زکوٰۃ کی رقم میں سے مستحق غریبوں، مسکینوں، بیواؤں اور ان لوگوں کو جو اپاہج یا ضعیف ہونے کی وجہ سے روزی کمانے سے معذور ہوں عمر بھر کی پنشن کے طور پر گزارہ الاؤنس دیا جا سکتا ہے؟

(۲۸) کیا زکوٰۃ کو رفاہ عامہ کے کاموں مثلاً مسجدوں، ہسپتالوں، سڑکوں، پلوں، کنوؤں اور تالابوں وغیرہ کی تعمیر پر خرچ کیا جا سکتا ہے جس سے ہر آدمی بلالحاظ مذہب وملت فائدہ اٹھا سکے؟

(۲۹) کیا زکوٰۃ کی رقم کسی شخص کو قرضہ حسنہ یا قرضہ بلا سودی کے طور پر دی جا سکتی ہے؟

(۳۰) کیا یہ ضروری ہے کہ زکوٰۃ جس علاقے سے وصول کی جائے اسی علاقے میں خرچ کی جائے یا اس علاقے سے باہر یا پاکستان سے باہر تالیفِ قلوب کے لئے یا آفاتِ ارضی و سماوی مثلاً زلزلہ یا سیلاب وغیرہ کے مصیبت زدگان کی امداد پر بھی خرچ کی جا سکتی ہے؟ اس سلسلے میں آپ کے نزدیک علاقے کی کیا تعریف ہوگی؟

(۳۱) کسی متوفی کے متروکہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا کیا طریقہ ہونا چاہیئے؟

(۳۲) ایسی کیا احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں کہ لوگ زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لئے حیلے نہ کر سکیں؟

(۳۳) زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کا انتظام مرکز کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے یا صوبوں کے ہاتھ میں؟ اگر زکوٰۃ مرکز جمع کرے تو اس میں سے صوبوں یا دوسرے علاقوں کا حصہ مقرر کرنے کے کیا اصول ہوں؟

(۳۴) آپ کی نظر میں زکوٰۃ کے نظم و نسق کو چلانے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ کیا زکوٰۃ جمع کرنے کے لئے کوئی الگ محکمہ قائم کیا جائے یا حکومت کے موجودہ محکموں سے ہی یہ کام کیا جائے؟

(۳۵) کیا کبھی زکوٰۃ کو سرکاری محصول قرار دیا گیا یا وہ کوئی ایسا محصول ہے کہ حکومت محض اس کی وصولی اور انتظام ہی کی ذمہ دار رہی ہو۔

(۳۶) کیا رسولِ اکرمؐ کے زمانے یا خلفائے راشدین کے دورِ حکومت میں اغراضِ عامہ کے کاموں کے لئے زکوٰۃ کے علاوہ بھی کوئی سرکاری محصول وصول کیا گیا۔ اگر کیا گیا تو وہ کون سا محصول تھا؟

(۳۷) اسلامی ملکوں میں زکوٰۃ کی وصولی اور انتظام کرنے کا کیا طریقہ رہا ہے اور اب کیا ہے؟

(۳۸) کیا زکوٰۃ کی وصولی اور خرچ کا انتظام صرف حکومت کے پاس رہنا چاہیئے یا کوئی مجلس آئینی مقرر کر کے اس کا انتظام حکومت اور عوام کی مشترکہ نگرانی میں ہونا چاہیئے؟

(۳۹) زکوٰۃ جمع کرنے اور اس کا انتظام کرنے کے لئے جو عملہ رکھا جائے اس کی تنخواہیں، الاؤنس، پنشن، پراویڈنٹ فنڈ اور شرائطِ ملازمت کیا ہونی چاہئیں؟

جواب

(۱) زکوٰۃ کے لغوی معنی طہارت اور نمو کے ہیں۔ انہی دونوں معنوں کے لحاظ سے اصطلاح میں "زکوٰۃ"

یہ مالی عبادت ہے کیونکہ یہ ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر اس غرض سے فرض کی گئی ہے کہ غرباء و مساکین کا حق ادا کر کے اس کا مال پاک ہو جائے اور اس کا نفس، نیز وہ سوسائٹی جس میں وہ رہتا ہے، بخل، خود غرضی، بغض وغیرہ جیسے بُرے اخلاق سے پاک ہو اور اس میں محبت، احسان، فراخ دلی اور باہمی تعاون و مواسات کے اوصاف نشوونما پائیں۔"

فقہا نے زکوٰۃ کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں مثلاً

حق یجب فی المال (المغنی ابن قدامہ ج ۲ ص ۴۳۳)	وہ ایک حق ہے جو مال میں واجب ہوتا ہے۔
اعطاء جزء من النصاب الی فقیر ونحوہ غیر متصف بمانع شرعی یمنع من الصرف الیہ۔ (نیل الاوطار ج ۴ ص ۹۸)	نصاب میں سے ایک جز کسی محتاج اور اس کے مانند شخص کو دینا جو کسی ایسے مانع شرعی سے متصف نہ ہو جس کی بنا پر اسے زکوٰۃ نہ دی جا سکے۔
تملیک مال مخصوص لمستحقہ بشرائط مخصوصۃ۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱ ص ۵۹۰)	ایک مخصوص مال کو مخصوص شرائط کے مطابق اس کے مستحق کی ملک میں دینا۔

(۲) عاقل و بالغ مسلمان مرد و زن اگر صاحبِ نصاب ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے اور اس کی ادائیگی کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔

نابالغ بچوں کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک مسلک یہ ہے کہ یتیم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ دوسرا مسلک یہ ہے کہ یتیم کے سنِ رشد کو پہنچنے پر اس کا ولی اس کا مال اس کے حوالے کرتے وقت اس کو زکوٰۃ کی تفصیل بتا دے، پھر یہ اس کا اپنا کام ہے کہ اپنے ایامِ یتیمی کی پوری زکوٰۃ ادا کرے۔ تیسرا مسلک یہ ہے کہ یتیم کا مال اگر کسی کاروبار میں لگایا گیا ہے اور نفع دے رہا ہے تو اس کا ولی اس کی زکوٰۃ ادا کرے ورنہ نہیں۔ چوتھا مسلک یہ ہے کہ یتیم کے مال کی زکوٰۃ واجب ہے اور اس کو ادا کرنا اس کے ولی کے ذمے ہے۔ ہمارے نزدیک یہی چوتھا مسلک زیادہ صحیح ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

الا من ولی یتیما له مال فلیتجر له فیه ولا یترکه فتاکله الصدقة۔ (ترمذی، دارقطنی، بیہقی، کتاب الاموال لابی عبید)	خبردار! جو شخص کسی ایسے یتیم کا ولی ہو جو مال رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ اس کے مال سے کوئی کاروبار کرے اور اسے یونہی نہ رکھ چھوڑے کہ اس کا سارا مال زکوٰۃ کھا جائے۔

اسی کے ہم معنیٰ ایک حدیث امام شافعی نے مرسلاً اور ایک دوسری حدیث طبرانی اور ابو عبید نے مرفوعاً نقل کی

ہے اور اس کی تائید صحابہ و تابعین کے متعدد آثار و اقوال سے ہوتی ہے جو حضرت عمر، حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر، حضرت علی، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے مجاہد، عطاء، حسن بصری، مالک بن انس اور زہری سے منقول ہیں۔

فاتر العقل لوگوں کے معاملے میں بھی اسی نوعیت کا اختلاف ہے جو اوپر مذکور ہوا ہے اور اس میں بھی ہمارے نزدیک قول راجح یہی ہے کہ مجنون کے مال میں زکوٰۃ واجب ہے اور اس کا ادا کرنا مجنون کے ولی کے ذمہ ہے۔ امام مالک اور ابن شہاب زہری نے اسی رائے کی تصریح کی ہے۔

قیدی پر بھی زکوٰۃ واجب ہے جو کوئی اس کے پیچھے اس کے کاروبار یا اس کے مال کا متولی ہو وہ اس کی طرف سے جہاں اس کے دوسرے واجبات ادا کرے گا زکوٰۃ بھی ادا کرے گا۔ ابن قدامہ اس کے متعلق اپنی کتاب المغنی میں لکھتے ہیں: "اگر مال کا مالک قید ہو جائے تو زکوٰۃ اس پر سے ساقط نہ ہوگی خواہ قید اس کے اور اس کے مال کے درمیان حائل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو کیونکہ اپنے مال میں اس کا تصرف قانوناً نافذ ہوتا ہے۔ اس کی بیع، اس کا ہبہ اور اس کا مختار نامہ، سب کچھ قانوناً جائز ہے۔" (ج ۲۔ ص ۶۴۴)

مسافر پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مسافر ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ کا مستحق ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر وہ صاحبِ نصاب ہے تو زکوٰۃ کا فرض اس پر سے ساقط ہو جائے گا۔ اس کا سفر اسے زکوٰۃ کا مستحق بناتا ہے اور اس کا مالدار ہونا اس پر زکوٰۃ فرض کرتا ہے۔

پاکستان کا مسلمان باشندہ اگر کسی غیر ملک میں مقیم ہو تو اس پر زکوٰۃ اس صورت میں عائد ہوگی جب کہ اس کا مال یا جائداد یا کاروبار پاکستان میں بقدرِ نصاب موجود ہو۔ کسی مسلمان مملکت کا مسلمان باشندہ اگر پاکستان میں مقیم ہو اور یہاں اس کے پاس مال یا جائداد یا کاروبار بقدرِ نصاب ہو تو اس سے بھی زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ رہا وہ مسلمان جو کسی غیر مسلم حکومت کی رعایا ہو اور پاکستان میں رہتا ہو، تو اسے ادائے زکوٰۃ پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، الا یہ کہ وہ خود بخوشی دینا چاہے۔ اس لیے کہ اس کی آئینی حیثیت اس حکومت کی غیر مسلم رعایا سے مختلف نہیں ہے۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ (الانفال)

(۳) زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہونے کے لیے کسی عمر کی قید نہیں ہے۔ جب تک کوئی شخص ہے صاحبِ نصاب

اس کی زکوٰۃ ادا کرنا اس کے ولی کے ذمے ہے۔ اور جب وہ سن رشد کو پہنچ کر اپنے مال میں خود تصرف کرنے لگے تو وہ اپنی زکوٰۃ خود ادا کرنے کا ذمہ دار ہے۔

(۴) زیور کی زکوٰۃ کے بارے میں کئی مسلک ہیں۔ ایک مسلک یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اسے عاریتاً دینا ہی اس کی زکوٰۃ ہے۔ یہ انس بن مالک، سعید بن مسیّب، قتادہ اور شعبی کا قول ہے۔ دوسرا مسلک یہ ہے کہ عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ زیور پر زکوٰۃ دیدینا کافی ہے۔ تیسرا مسلک یہ ہے کہ جو زیور عورت ہر وقت پہنے رہتی ہو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے اور جو زیادہ تر رکھا رہتا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ چوتھا مسلک یہ ہے کہ ہر قسم کے زیور پر زکوٰۃ ہے۔ ہمارے نزدیک یہی آخری قول صحیح ہے۔ اول تو جن احادیث میں چاندی سونے پر زکوٰۃ کے وجوب کا حکم بیان ہوا ہے ان کے الفاظ عام ہیں۔ مثلاً یہ کہ فی الرقۃ ربع العشر ولیس فی مادون خمس اواقی صدقۃ (چاندی میں ۲½ فی صدی زکوٰۃ ہے اور پانچ اوقیہ سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے) پھر متعدد احادیث و آثار میں تصریح ہے کہ زیور پر زکوٰۃ واجب ہے۔ چنانچہ ابوداؤد، ترمذی، اور نسائی میں قوی سند کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس کے ساتھ اس کی ایک لڑکی تھی جس کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا ایسرک ان یسورک اللہ بھما یوم القیمۃ سوارین من النار (کیا تجھے پسند ہے کہ خدا قیامت کے روز تجھے ان کے بدلے آگ کے کنگن پہنائے؟) نیز مؤطا، ابوداؤد اور دارقطنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے ما ادیت زکوٰتہ فلیس بکنز (جس زیور کی زکوٰۃ تو نے ادا کر دی وہ کنز نہیں ہے) ابن حزم نے محلّٰی میں بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری کو جو فرمان بھیجا تھا اس میں یہ ہدایت بھی تھی مرنساء المسلمین یزکین عن حلیھن (مسلمان عورتوں کو حکم دو کہ اپنے زیوروں کی زکوٰۃ ادا کریں) حضرت عبداللہ بن مسعود سے فتویٰ پوچھا گیا کہ زیور کا کیا حکم ہے تو انھوں نے جواب دیا اذا بلغ مائتین ففیہ الزکوٰۃ (جب وہ دو سو درہم کی مقدار کو پہنچ جائے تو اس میں زکوٰۃ ہے) اسی مضمون کے اقوال صحابہ میں سے ابن عباس، عبداللہ بن عمرو بن عاص اور حضرت عائشہ سے، تابعین میں سے سعید بن مسیّب، سعید بن جبیر، عطاء [illegible] اور زہری سے اور ائمہ فقہ میں سے سفیان ثوری، ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب سے منقول ہیں۔

(۵) کمپنیوں کے بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ جو حصہ دار بقدر نصاب سے کم حصے رکھتے ہوں، یا جو ایک سال سے کم وقت تک اپنے حصے کے مالک رہے ہوں، ان کو مستثنیٰ کر کے باقی تمام حصہ داروں کی اکٹھی زکوٰۃ کمپنیوں سے وصول کی جانی چاہیئے۔ اس میں انتظامی سہولت بھی ہے اور اس طریقے میں کوئی بات ایسی بھی نہیں ہے جو اسلامی شریعت میں سے کسی اصل کے خلاف پڑتی ہو۔ ہماری یہ رائے امام مالک، امام شافعی اور متعدد دوسرے فقہاء کے مسالک کے مطابق ہے (بدایۃ المجتہد، ج ۱، ص ۲۲۵)

(۶) کارخانوں کی مشینوں اور آلات پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی۔ صرف اُس مال کی قیمت پر جو آخر سال میں ان کے پاس خام یا مصنوع شکل میں، اور اس نقد روپے پر جو ان کے خزانے میں موجود ہو عائد ہوگی۔ اسی طرح تاجروں کے فرنیچر، اسٹیشنری، دوکان یا مکان اور اس نوعیت کی دوسری اشیاء پر زکوٰۃ عائد نہ ہوگی۔ صرف اُس مال کی قیمت پر جو ان کی دوکان میں، اور اس نقد روپے پر جو ان کے خزانے میں ختم سال پر موجود ہو، عائد ہوگی۱؎ اس معاملے میں اصول یہ ہے کہ ایک شخص اپنے کاروبار میں جن عوامل پیدائش سے کام لے رہا ہو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ لیس فی الابل العوامل صدقۃ (کتاب الاموال) یعنی کوئی شخص جن اونٹوں سے آب پاشی کا کام لیتا ہو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی زکوٰۃ اُس زرعی پیداوار سے وصول کر لی جاتی ہے جو ان کے عمل سے حاصل کی گئی ہو۔ اسی پر قیاس کر کے فقہا نے بالاتفاق دوسرے تمام آلاتِ پیدائش کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

(۷) کمپنیوں کے جو حصے قابلِ فروخت ہوں وہ جب سال کے دوران میں فروخت کر دیئے جائیں تو اس سال نہ ان کے بائع پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ مشتری پر۔ کیونکہ دونوں میں سے کسی کی ملکیت پر بھی سال نہ گزرے گا۔

(۸) شریعت میں جو اشیاء محلِ زکوٰۃ ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔ زرعی پیداوار، فصل کٹنے کے بعد، سونا چاندی جب کہ وہ سال کے آغاز و اختتام پر بقدرِ نصاب یا اس سے زائد موجود ہوں، ...... اسی طرح نقد روپیہ جو سونے چاندی کا قائم مقام ہو، مواشی جب کہ وہ افزائشِ نسل کے لئے پالے گئے ہوں اور سال کے آغاز و اختتام پر

۱؎ جو کاروبار اس نوعیت کے ہوں کہ ان کی زکوٰۃ کا حساب اس طرح نہ لگایا جا سکے (مثلاً اخبار) ان کے کاروبار کی مالیت ان کی سالانہ آمدنی کے کسی تناسب سے یا وقت کے عام رواج کے مطابق مشخص کی جائے اور اس پر زکوٰۃ عائد کی جائے۔

بقدرِ نصاب ہوں۔ اموالِ تجارت، جبکہ وہ سال کے آغاز و اختتام پر بقدرِ نصاب ہوں۔ معادن و رکاز۔

الف۔ نقدی، سونے، چاندی اور زیورات پر زکوٰۃ ہے۔ زیور کی زکوٰۃ میں صرف اس سونے یا چاندی کے وزن کا اعتبار کیا جائے گا جو ان میں موجود ہو۔ جواہر خواہ زیور میں جڑے ہوئے ہوں یا کسی اور صورت میں ہوں زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص جواہر کی تجارت کرتا ہو تو اس پر بھی زکوٰۃ عائد ہوگی جو دوسرے اموالِ تجارت پر ہے یعنی ان کی قیمت کا ۲½ فی صدی "الفقہ علی المذاہب الاربعہ" میں لکھا ہے: "موتی، یاقوت اور دوسرے تمام جواہر پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے جبکہ وہ تجارت کے لئے نہ ہوں۔ اس پر تمام مذاہب کا اتفاق ہے" (ج ۱، ص ۵۹۵)

(ب) دھات کے سکے اور کاغذی سکے محلِ زکوٰۃ ہیں، کیونکہ ان کی قیمت ان کی دھات یا ان کے کاغذ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس قوتِ خرید کی بنا پر ہے جو قانوناً ان کے اندر پیدا کر دی گئی ہے، جس کی وجہ سے وہ سونے اور چاندی کے قائم مقام ہیں۔ "الفقہ علی المذاہب الاربعہ" میں ہے: "جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اوراقِ مالیہ پر زکوٰۃ ہے کیونکہ وہ تعامل میں سونے اور چاندی کے قائم مقام ہیں اور ان کو بلا تکلف سونے اور چاندی سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے ائمہ میں سے تین (ابو حنیفہ، مالک اور شافعی) کا مذہب یہ ہے کہ ان پر زکوٰۃ ہے" (ج ۱، ص ۶۰۵)

(ج) بینکوں میں جو امانتیں رکھی ہوں وہ محلِ زکوٰۃ ہیں۔ دوسرے ادارے اگر رجسٹرڈ ہوں اور حکومت ان کے حساب کتاب کی پڑتال کر سکتی ہو، تو ان میں رکھی ہوئی امانتوں کا وہی حکم ہے جو بینک کی امانتوں کا ہے۔ اور اگر وہ رجسٹرڈ نہ ہوں، نہ ان کے حساب کتاب کی پڑتال کرنا حکومت کے لئے ممکن ہو، تو ان میں رکھی ہوئی امانتیں اموالِ باطنہ کی تعریف میں آتی ہیں، جن کی زکوٰۃ وصول کرنا حکومت کا کام نہیں ہے۔ ان کے مالک خود ان کی زکوٰۃ نکالنے کے ذمہ دار ہیں۔

لئے ہوئے قرضے اگر ذاتی حوائج کے لئے لئے گئے ہوں اور خرچ ہو جائیں تو ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ اگر قرض لینے والا سال بھر تک ان کو رکھے رہے اور وہ بقدرِ نصاب ہوں تو ان پر زکوٰۃ ہے۔ اور اگر ان کو تجارت میں لگایا جائے تو وہ قرض لینے والے کا تجارتی سرمایہ شمار ہوں گے اور اس کی تجارتی زکوٰۃ وصول کرتے وقت ایسے قرضوں کو مستثنیٰ نہ کیا جائے گا۔

دیئے ہوئے قرضے اگر بآسانی واپس مل سکتے ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک ان کی

زکوٰۃ سال بسال ادا کرنی ہوگی۔ یہ حضرت عثمانؓ، ابنِ عمرؓ، جابر بن عبداللہؓ، طاؤس، ابراہیم نخعی اور حسن بصری کا مسلک ہے۔ اور بعض کے نزدیک جب وہ قرض وصول ہوں تو تمام گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ یہ حضرت علیؓ، ابو ثور، سفیان ثوری اور حنفیہ کا قول ہے۔ اور اگر ان قرضوں کی واپسی مشتبہ ہو تو اس بارے میں ہمارے نزدیک قول راجح یہ ہے کہ جب رقم واپس ملے اُس وقت صرف ایک سال کی زکوٰۃ نکالی جائے۔ یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز، حسن، لیث، اَوزاعی اور امام مالک کا قول ہے اور اس میں بیت المال اور صاحبِ مال، دونوں کے مفاد کی منصفانہ رعایت پائی جاتی ہے۔

مرہونہ جائداد کی زکوٰۃ اس شخص سے وصول کی جائے گی جس کے قبضے میں وہ ہو۔ مثلاً مرہونہ زمین اگر مرتہن کے قبضے میں ہے تو اس کا عشر اس سے وصول کیا جائے گا۔

متنازع فیہ جائداد کی زکوٰۃ دورانِ نزاع میں اس شخص سے لی جائے گی جس کے قبضے میں وہ ہو۔ اور فیصلہ ہونے کے بعد اس کی زکوٰۃ کا ذمہ دار وہ ہوگا جس کے حق میں فیصلہ ہو۔

قابلِ ارجاعِ نالش جائداد کا بھی وہی حکم ہے جو اوپر بیان ہوا۔ وہ بالفعل جس شخص کے قبضے میں ہو اور جب تک رہے، اس کی زکوٰۃ اسی کے ذمے رہے گی۔ کیونکہ جو شخص کسی چیز سے فائدہ اٹھاتا ہے اُس کے واجبات بھی اُسی کو ادا کرنے ہوں گے۔

(د) حلیہ اگر بقدرِ نصاب ہو اور اس پر سال گزر جائے تو جس شخص کو وہ دیا گیا ہو اس سے زکوٰۃ لی جائے گی۔

(ہ) بیمہ اور پراویڈنٹ فنڈ اگر جبری ہوں تو ان کا حکم وہی ہے جو مشتبہ الحصول قرضوں اور اموال کا ہے یعنی جب ان کی رقم واپس مل جائے تو صرف ایک سال کی زکوٰۃ نکالنی ہوگی۔ اور اگر وہ اختیاری ہوں تو ہمارے نزدیک ہر سال کے ختم پر جتنی رقم ایک شخص کے حساب میں بیمہ کمپنی یا پراویڈنٹ فنڈ میں جمع ہو اس پر زکوٰۃ وصول کی جانی چاہئے کیونکہ اگرچہ یہ رقم اب اس کے لئے قبل از وقت قابلِ وصول نہیں ہے، لیکن اس نے اپنے مال کا یہ حصہ خود اس حالت میں ڈالا ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ زکوٰۃ سے بچ جائے۔

(و) غیر منقولہ اشیاء (مکانات) کے منافع اموال کی تعریف میں آتے ہیں اس لئے ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ البتہ غیر منقولہ کی مصنوعات پیداوار کی طرح سے زکوٰۃ عائد ہوگی جس طرح دوسرے کارخانوں پر۔

[illegible] پیداوار میں جو چیزیں ذخیرہ کرکے رکھنے کے قابل ہوں اُن پر عشر یا نصف عشر ہے۔ اور یہی حکم ان پھلوں کا ہے جو ذخیرہ کرکے رکھے جاسکتے ہوں، جیسے خشک میوہ اور چھوارے۔ جو زراعت بارانی زمینوں میں ہو اس پر عشر واجب ہوگا، اور جس میں مصنوعی ذرائع سے آب پاشی کی جائے اس پر نصف عشر۔

سبزی، ترکاری، پھول اور پھل جو ذخیرہ کرکے نہیں رکھے جاسکتے، اُن پر عشر تو نہیں ہے، لیکن اگر زمیندار انھیں مارکٹ میں فروخت کرتا ہے، تو اس پر تجارتی زکوٰۃ عائد ہوگی جبکہ وہ بقدرِ نصاب ہو۔ اس معاملے میں نصاب وہی ہوگا جو تجارت میں معتبر ہے، یعنی اس کاروبار کا تجارتی سرمایہ سال کے آغاز و اختتام پر دو سو درہم یا اس سے زائد ہو۔

(ز) معدنیات کے بارے میں ہمارے نزدیک سب سے بہتر مسلک حنابلہ کا ہے۔ یعنی وہ تمام چیزیں جو زمین سے نکلتی ہیں، خواہ وہ دھات کی قسم سے ہوں، یا مائعات (پٹرول، پارہ وغیرہ) کی قسم سے، یا جوامد (گندھک وغیرہ) کی قسم سے، ان سب پر ڈھائی فی صدی زکوٰۃ ہے جبکہ ان کی قیمت بقدرِ نصاب ہو، اور جبکہ وہ پرائیویٹ ملکیت میں ہوں۔ اس مسلک پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حکومت میں عمل بھی تھا (المغنی لابن قدامہ۔ ج ۲ ص ۱۸ ھ)

(ح) برآمد شدہ دفینہ (رکاز) کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ وفی الرکاز الخمس، یعنی اس میں خمس (۵/۱ حصہ) لیا جائے گا۔

(ط) آثارِ قدیمہ، یعنی وہ قیمتی نوادر جو کسی نے بطور یادگار اپنے گھر میں رکھ چھوڑے ہوں، ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ بغرضِ تجارت ہوں تو ان پر تجارتی زکوٰۃ ہے۔

(ی) شہد کے بارے میں یہ بات مختلف فیہ ہے کہ آیا بجائے خود شہد کی ایک مقدار میں سے زکوٰۃ وصول کی جانی چاہیے، یا اس کی تجارت پر وہی زکوٰۃ عائد کی جائے جو تجارتی مال پر ہے۔ حنفیہ اس بات کے قائل ہیں کہ شہد بجائے خود محلِ زکوٰۃ ہے اور یہی مسلک احمد، اسحاق بن راہویہ، عمر بن عبدالعزیز، ابن عمر اور ابن عباس کا ہے، اور امام شافعی کا بھی ایک قول اس کے حق میں ہے۔ بخلاف اس کے امام مالک اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ شہد بجائے خود محلِ زکوٰۃ نہیں ہے۔ امام شافعی کا بھی مشہور قول یہی ہے۔ اور امام بخاری کہتے ہیں کہ لیس فی زکوٰۃ العسل شیئٌ یصح۔ "شہد کی زکوٰۃ کے معاملے میں کوئی حدیث صحیح موجود نہیں ہے۔" ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ شہد کی تجارت پر زکوٰۃ عائد کی جائے۔

(ک) گھوڑوں پر بحیثیت خود محض زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ ان کی تجارت پر وہی زکوٰۃ واجب ہے جو اموالِ تجارت پر عائد ہوتی ہے۔

موتی عنبر اور دوسری وہ چیزیں جو سمندر سے نکلتی ہیں، وہ ہمارے نزدیک معدنیات کے حکم میں ہیں اور ان پر وہی زکوٰۃ عائد ہونی چاہئے جو معدنیات میں بیان ہو چکی ہے۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے اور اسی پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حکومت کا عمل رہا ہے (کتاب الاموال ص ۳۴۹، کتاب المغنی لابن قدامہ، ج ۲، ص ۴۸۵)

(ل) پٹرول کا حکم اوپر معادن کے سلسلے میں گزر چکا ہے۔

(م) برآمد پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ درآمد پر جو محصول حضرت عمر کے زمانے میں لیا جاتا تھا، اس کی حیثیت زکوٰۃ کی نہ تھی، بلکہ وہ صرف جواب تھا اس محصول کا جو ہمسایہ حکومتیں اسلامی مملکت کے مال کی درآمد پر اپنے ملک میں وصول کرتی تھیں۔

(۹) خلافتِ راشدہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے اموالِ زکوٰۃ کی فہرست میں کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا گیا جو اپنی ایک مستقل بالذات نوعیت رکھتا ہو، بلکہ ایسی چیزوں کا اضافہ کیا گیا تھا جو حضور کے مقرر کئے ہوئے اموالِ زکوٰۃ میں سے کسی پر قیاس کی جا سکتی تھیں۔ مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھینس کو گائے پر قیاس کیا اور اس پر وہی زکوٰۃ عائد کی جو گائے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کی تھی۔

(۱۰) ہر قسم کے سکوں پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔ اوپر نمبر (۸) ضمن (ب) میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

جو سکے رائج نہیں ہیں، یا جو خراب ہیں، یا جو حکومت نے واپس لے لئے ہیں، ان میں اگر چاندی یا سونا موجود ہو تو ان پر چاندی یا سونے کی اُس مقدار کے لحاظ سے زکوٰۃ عائد ہوگی جو اُن کے اندر پائی جاتی ہو۔

دوسرے ملکوں کے سکے اگر ہمارے ملک کے سکوں سے بآسانی تبدیل کئے جا سکتے ہوں تو ان کا حکم نقدی کا ہے۔ اور اگر تبدیل نہ کئے جا سکتے ہوں تو ان پر صرف اس صورت میں زکوٰۃ عائد ہوگی جبکہ ان کے اندر بقدر نصاب سونا یا چاندی موجود ہو۔

(۱۱) مالِ ظاہر وہ ہے جس کا معائنہ اور تشخیص عاملینِ حکومت کر سکتے ہوں اور مالِ باطن وہ جو عاملینِ حکومت کے لئے قابلِ معائنہ و تشخیص نہ ہو۔ بنکوں میں جمع شدہ رقوم مالِ ظاہر کی تعریف میں آتی ہیں۔

(۱۲) مالِ نامی وہ ہے جو یا تو بطبعہ افزائش کے قابل ہو یا جسے سعی و عمل سے بڑھایا جا سکے۔ اس تعریف کی رو سے زکوٰۃ انہی اموال پر عائد کی گئی ہے جو نامی ہیں۔ اور جمع شدہ روپے پر اس لئے عائد کی جاتی ہے کہ اس کے مالک نے اسے بڑھنے سے روک رکھا ہے۔

(۱۳) جو اشیاء کرایہ پر دی جاتی ہیں ان کی مالیت رائج الوقت قواعد کے مطابق ان کے منافع سے تشخیص کی جائے اور اس پر ڈھائی فی صدی زکوٰۃ لی جائے۔ لیث بن سعد کہتے ہیں کہ "میں نے دیکھا ہے کہ جو اونٹ کرایہ پر چلائے جاتے ہیں ان پر مدینے میں زکوٰۃ لی جاتی تھی"۔ (کتاب الاموال ص ۳۷۶)

(۱۴) مویشی (اونٹ، گائے، بھینس، بکری اور جو ان کے مانند ہوں) اگر افزائش نسل کی غرض سے پالے جائیں اور بقدر نصاب یا اس سے زائد ہوں تو ان پر وہ زکوٰۃ عائد ہوگی جو شریعت میں مواشی کے لئے مقرر ہے (اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرت النبی مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی، ج ۵، ص ۱۶۵ تا ۱۶۷) اور اگر وہ تجارت کے لئے ہوں تو ان پر تجارتی زکوٰۃ ہے یعنی اگر ان کی قیمت بقدر نصاب (دو سو درہم) یا اس سے زائد ہو تو ان پر ڈھائی فی صدی زکوٰۃ لی جائے گی۔ اور اگر ان سے زراعت یا حمل و نقل کا کام لیا جاتا ہو یا کسی شخص نے ان کو اپنے ذاتی استعمال کے لئے پالا ہو، تو ان کی تعداد خواہ کتنی ہی ہو ان پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔

مرغیاں اور دوسرے جانور اگر شوقیہ پالے جائیں تو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ اگر تجارت کے لئے ہوں تو ان پر تجارتی زکوٰۃ ہے۔ اور اگر انڈوں کی فروخت کے لئے مرغی خانہ قائم کیا جائے تو اس کا حکم وہی ہے جو شیرخانہ اور دوسرے کارخانوں کا ہے۔

مویشی کی زکوٰۃ نقدی کی صورت میں بھی وصول کی جا سکتی ہے اور خود مویشی بھی زکوٰۃ میں لئے جا سکتے ہیں۔ اس پر حضرت علی کا فتویٰ ہے (کتاب الاموال ص ۳۶۸)

(۱۵) جن مختلف سامانوں پر زکوٰۃ واجب ہے ان کی شرح حسب ذیل ہے:

زرعی پیداوار = ۱۰ فی صدی جب کہ وہ بارانی زمینوں سے حاصل ہو۔ ۵ فی صدی جب کہ وہ مصنوعی آب پاشی سے حاصل ہو۔

نقدی اور سونا چاندی = ۲½ فی صدی۔

اموالِ تجارت = ۲½ فی صدی۔

مواشی ۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا اس کا تفصیلی نقشہ سیرۃ النبی جلد پنجم میں ملاحظہ ہو۔

معادن = ۲½ فی صدی۔

رکاز = ۲۰ فی صدی۔

کارخانوں کے اموال = ۲½ فی صدی۔

(۱۶) خلفائے راشدین کے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کئے ہوئے نصاب اور شرح زکوٰۃ میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ، نہ اب اس کی کوئی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور ہمارا خیال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی آپ کی مقرر کردہ مقادیر میں ترمیم کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

(۱۷) نقدی ، چاندی ، اموالِ تجارت ، معادن ، رکاز ، اور کارخانوں کے اموال میں نصاب دو سو درہم ہے۔ مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کی تحقیق یہ ہے کہ دو سو درہم کی چاندی ہمارے ملک کے معیاری وزن کے حساب سے ۳۶ تولہ ۵ ماشہ ۴ رتی ہوتی ہے۔ مگر مشہور ½ ۵۲ تولہ چاندی ہے۔

۲۰ طلائی مثقال کے متعلق مولانا عبدالحی صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ وہ ۵ تولہ ۲ ماشہ ۴ رتی سونے کے برابر ہیں۔ اور عام طور پر مشہور یہ ہے کہ ½ ۷ تولے کے برابر۔

کتاب الاموال لابی عبید میں جو حساب لگایا گیا ہے اس کی رو سے دس درہم کا وزن ۸۲ جو بنتا ہے اور وہ ۷ مثقال طلائی کے برابر ہے۔

(۱۸) اس کا جواب نمبر ۱۶ میں گزر چکا ہے۔ البتہ سونے کے نصاب میں تبدیلی ممکن ہے کیونکہ اس کا نصاب ۲۰ مثقال جس روایت میں آیا ہے اس کی سند بہت ضعیف ہے۔

(۱۹) معادن ، رکاز ، اور زرعی پیداوار کے سوا تمام صورتوں میں وجوب زکوٰۃ کے لئے یہ شرط ہے کہ بقدر نصاب یا اس سے زائد مال پر ایک سال گزر جائے۔ معادن اور رکاز کے لئے سال گزرنے کی شرط نہیں ہے۔ اور زرعی پیداوار پر فصل کٹنے کے ساتھ ہی زکوٰۃ واجب ہو جائے گی خواہ سال میں دو یا زائد فصلیں کاٹی جائیں۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ آتوا حقہ یوم حصادہ۔

(۲۰) اس کا جواب نمبر ۱۹ میں گزر چکا ہے۔

(۲۱) چونکہ آج کل تمام مالی معاملات اور حساب کتاب شمسی سال کے لحاظ سے ہو رہے ہیں اس لئے زکوٰۃ کے معاملہ میں بھی شمسی سال ہی استعمال کیا جائے تو مضائقہ نہیں ہے۔ قمری سال کا وجوب اس معاملے میں کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔

تحصیلِ زکوٰۃ کے لئے کوئی خاص مہینہ شرعاً مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ حکومت جس تاریخ سے زکوٰۃ کی تحصیل کا نظام شروع کرے اسی سے سال کا آغاز ٹھیرایا جا سکتا ہے۔

(۲۲) و (۲۳) قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصرف بیان کئے گئے ہیں: فقراء، مساکین، عاملینِ زکوٰۃ، مؤلفۃ القلوب، رقاب، غارمین، فی سبیل اللہ، ابن السبیل۔

فقیر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی بسر اوقات کے لئے دوسروں کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ لفظ تمام حاجتمندوں کے لئے عام ہے، خواہ وہ بڑھاپے یا کسی جسمانی نقص کی وجہ سے مستقل طور پر محتاجِ اعانت ہو گئے ہوں یا کسی عارضی سبب سے سرِدست مدد کے محتاج ہوں اور کچھ سہارا پا کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہوں، جیسے یتیم بچے، بیوہ عورتیں، بے روزگار لوگ، اور وہ لوگ جو کسی وقتی حادثے کے شکار ہو گئے ہوں۔

مسکین کی تشریح حدیث میں یہ آئی ہے کہ الذی لا یجد غنی یغنیہ ولا یفطن لہ فیتصدق علیہ ولا یقوم فیسال الناس "جو نہ اپنی حاجت بھر مال پاتا ہے، نہ پہچانا جاتا ہے کہ لوگ اس کی مدد کریں، نہ کھڑے ہو کر لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔" اس لحاظ سے مسکین اُس شریف آدمی کو کہتے ہیں جو اپنی روزی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہو مگر اپنی ضرورت کے قابل روزی نہ پا سکتا ہو۔ لوگ اسے برسرِروزگار پا کر اس کی مدد نہیں کرتے اور وہ اپنی شرافت کی وجہ سے مدد مانگتا نہیں پھر سکتا۔

عاملین سے مراد وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کی تحصیل تقسیم اور اس کے حساب کتاب کا انتظام کرتے ہوں۔ خواہ صاحب نصاب ہوں یا نہ ہوں، ہر حال میں وہ اس مد سے اپنے کام کی تنخواہ پائیں گے۔

مولفۃ القلوب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اسلام اور اسلامی مملکت کے مفاد کی مخالفت سے روکنا، یا اس مفاد کی خدمت پر آمادہ کرنا مقصود ہو اور اس غرض کے لئے مال دے کر ان کی تالیفِ قلب کرنے کی ضرورت

چاہے وہ ہوں۔ یہ لوگ کافر بھی ہو سکتے ہیں، اور ایسے مسلمان بھی جن کا اسلام انہیں اسلامی مفاد کی خدمت پر ابھارنے کے لئے کافی نہ ہو۔ نیز یہ لوگ اسلامی مملکت کے باشندے بھی ہو سکتے ہیں اور کسی بیرونی مملکت کے بھی۔ اس قسم کے لوگ اگر صاحبِ نصاب بھی ہوں تو ان کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے بشرطیکہ اسلامی حکومت اس کی ضرورت محسوس کرے۔

رقاب سے مراد غلام ہیں۔ غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے زکوٰۃ دینا اس مد میں شامل ہے۔

غارمین سے مراد ایسے قرضدار لوگ ہیں جو اگر اپنا پورا قرض ادا کر دیں تو ان کے پاس بقدرِ نصاب مال باقی نہ رہے۔ ایسے لوگ کمانے والے بھی ہو سکتے ہیں اور بے روزگار بھی۔

فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے خواہ وہ تلوار سے ہو یا قلم و زبان سے، یا ہاتھ پاؤں کی محنت اور دوڑ دھوپ سے۔ سلف میں سے کسی نے بھی اس لفظ کو رفاہِ عام کے معنیٰ میں نہیں لیا ہے۔ ان کے نزدیک بالاتفاق اس کا مفہوم اُن مساعی تک محدود ہے جو خدا کے دین کو قائم کرنے، اس کی اشاعت کرنے اور اسلامی مملکت کا دفاع کرنے کے لئے کی جائیں۔

ابن السبیل، یعنی مسافر۔ ایسا شخص خواہ اپنے گھر میں غنی ہو، لیکن اگر حالتِ سفر میں وہ مدد کا حاجتمند ہو جائے تو زکوٰۃ سے اس کی مدد کی جا سکتی ہے۔

(۲۴) یہ ضروری نہیں ہے کہ زکوٰۃ کی رقم اُن تمام مصارف میں صرف کی جائے جو قرآن میں مقرر کئے گئے ہیں حکومت حسبِ موقع و ضرورت ان میں سے جن جن مصارف میں جس جس قدر مناسب سمجھے خرچ کر سکتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر ضرورت پڑ جائے تو ایک ہی مصرف میں ساری زکوٰۃ خرچ کی جا سکتی ہے۔

(۲۵) مستحقینِ زکوٰۃ میں سے فقیر اور مسکین اس صورت میں زکوٰۃ لے سکتے ہیں جب کہ وہ صاحبِ نصاب نہ ہوں۔ عاملین اور مؤلفۃ القلوب صاحبِ نصاب ہوں تب بھی ان کو زکوٰۃ کی مد سے دیا جا سکتا ہے۔ غلام کا غلام ہونا بجائے خود اسے اس بات کا مستحق بناتا ہے کہ اس کی آزادی پر زکوٰۃ صرف کی جائے۔ قرضدار اس حالت میں زکوٰۃ لے سکتا ہے جبکہ وہ اپنا پورا قرض ادا کر کے صاحبِ نصاب نہ رہ سکتا ہو۔ راہِ خدا میں جہاد کرنے والے اگر بجائے خود صاحبِ نصاب بھی ہوں تو اس جہاد کے مصارف کے لئے انہیں زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ ابن السبیل

ایسی صورت میں زکوٰۃ پا سکتا ہے جبکہ حالتِ سفر میں وہ مدد کا محتاج ہو۔

بنی ہاشم پر زکوٰۃ لینا حرام ہے۔ مگر آج پاکستان میں یہ تحقیق کرنا بہت مشکل ہے کہ کون ہاشمی ہے اور کون نہیں ہے۔ اس لئے حکومت تو ہر شخص کو زکوٰۃ دے گی جو اس کا حاجتمند نظر آئے۔ یہ لینے والے کا اپنا کام ہے کہ اگر وہ اپنے ہاشمی ہونے کا یقین رکھتا ہو تو زکوٰۃ نہ لے۔

(۲۶) زکوٰۃ جب حکومت کے خزانے میں جمع ہو جائے تو وہ افراد اور اداروں سب کو دے سکتی ہے اور خود بھی زکوٰۃ سے ایسے ادارے قائم کر سکتی ہے جو مصارفِ زکوٰۃ سے متعلق ہوں۔

(۲۷) جو لوگ زکوٰۃ کے مستقل یا عارضی طور پر محتاج ہوں ان کو مستقل طور پر یا عارضی طور پر وظائف دیئے جا سکتے ہیں۔

(۲۸) مصارفِ زکوٰۃ کی مد فی سبیل اللہ اتنی عام نہیں ہے کہ "رفاہِ عام" کی ہم معنی قرار پائے۔

(۲۹) زکوٰۃ کی مد سے قرضِ حسن دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بلکہ موجودہ حالات میں حاجتمند لوگوں کو قرض دینے کے لئے بیت المال میں ایک مد مخصوص کر دینا ہمارے نزدیک مستحسن ہے۔

(۳۰) عام حالات میں تو یہی مناسب ہے کہ ایک علاقے کی زکوٰۃ اسی علاقے کے حاجتمندوں پر صرف کی جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں ایک مرتبہ رَے کی زکوٰۃ کوفہ منتقل کر دی گئی تو انھوں نے حکم دیا کہ وہ رَے واپس کی جائے (کتاب الاموال ص ۵۹۰) البتہ اگر دوسرے کسی علاقے میں کوئی زیادہ شدید ضرورت پیش آجائے تو ایسے علاقوں کی زکوٰۃ وہاں لے جا کر صرف کی جا سکتی ہے جہاں زکوٰۃ کے بقایا موجود ہوں، یا جہاں کی ضروریات اس سے کمتر ہوں۔ ملک سے باہر بھی اگر کوئی بڑی مصیبت پیش آجائے تو انسانی ہمدردی اور تالیفِ قلوب کی خاطر زکوٰۃ بھیجی جا سکتی ہے، مگر اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ خود ملک کے اندر جو حاجت مند ہیں وہ محروم نہ رہ جائیں۔

علاقے سے مراد انتظامی حلقے ہیں۔ اس سے مراد ضلع، قسمت، اور صوبہ تینوں ہو سکتے ہیں۔ ملک کے لحاظ سے ایک علاقہ صوبہ ہوگا۔ صوبہ کے لحاظ سے قسمت۔ اور قسمت کے لحاظ سے ضلع۔

(۳۱) متوفی کے ترکے سے پہلے وہ قرضے ادا کئے جائیں گے جو اس نے دوسرے لوگوں سے لئے ہوں، پھر زکوٰۃ کے بقایا، پھر وصیت، اور اس کے بعد جو کچھ بچے گا وہ وارثوں میں تقسیم ہوگا۔ صاحبِ مال کی موت کی وجہ سے

اس کی زکوٰۃ ساقط نہیں ہو جاتی، اس نے چاہے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو، وہ اس کے مال میں سے نکالی جائے گی۔ عطاء، زہری، قتادہ، امام مالک، امام شافعی، امام محمد، اسحاق بن راہویہ اور ابو ثور کی رائے قریب یہی ہے۔ بعض فقہاء نے یہ رائے دی ہے کہ اگر صاحبِ مال نے زکوٰۃ کے لئے وصیت کی ہو تو وہ نکالی جائے گی ورنہ نہیں۔ مگر ہماری رائے میں اس کا تعلق صرف اموالِ باطنہ سے ہے، کیونکہ اس میں اس امر کا احتمال ہے کہ صاحبِ مال نے اپنی موت سے پہلے زکوٰۃ نکال دی ہو اور دوسروں کو اس کی خبر نہ ہو لیکن جبکہ اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرنے کا باقاعدہ انتظام حکومت کر رہی ہو، تو ایسا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا۔ اس لئے زکوٰۃ کے بقایا اس شخص کے ذمے بمنزلہ قرض ہوں گے۔ پہلے اس کے مال میں سے افراد کا قرض وصول کیا جائے اور اس کے بعد خدا اور جماعت کا۔

(۳۲) زکوٰۃ سے بچنے کے حیلوں کا علاج تین طریقوں سے ہو سکتا ہے:

اوّل یہ کہ حکومت کا انتظام ایماندار لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو رشوتیں نہ کھائیں، زکوٰۃ کی تحصیل اور تقسیم میں جانبداری اور بددیانتی سے کام نہ لیں، اور نہ اموالِ زکوٰۃ کا بڑا حصہ اپنی تنخواہوں اور الاؤنسوں پر صرف کر دیں۔ محصلین کی دیانت لوگوں میں یہ اعتماد پیدا کرے گی کہ ان کی زکوٰۃ صحیح طریقے سے وصول اور صحیح مصارف میں صرف کی جائے گی، اس لئے وہ ادائے زکوٰۃ سے بچنے کی کوشش نہ کریں گے۔

دوّم یہ کہ اجتماعی اخلاق کی اصلاح کی جائے اور لوگوں کی سیرت و کردار کو خدا کی محبت اور اس کے خوف پر تعمیر کیا جائے۔ حکومت کا کام صرف انتظامِ ملک اور دفاعِ ملک تک ہی محدود نہ رہے بلکہ وہ عوام کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دے۔

سوّم یہ کہ زکوٰۃ سے بچنے کی عام اور ممکن الصدور صورتوں کے خلاف قوانین بنائے۔ مثلاً جو شخص اپنے قابلِ زکوٰۃ اموال کو ختمِ سال سے پہلے کسی غیر معمولی مقدار میں اپنے کسی عزیز کے نام منتقل کرے اس پر مقدمہ چلایا جائے اور بارِ ثبوت اس پر ڈالا جائے کہ اس نے یہ انتقال زکوٰۃ سے بچنے کے لئے نہیں کیا ہے۔

(۳۳) ہماری رائے میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا انتظام صوبوں کے ہاتھ میں ہونا چاہئے اور مرکز کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ ایک صوبے کی وافر زکوٰۃ دوسرے ایسے صوبوں میں بھجوا سکے جہاں کی زکوٰۃ معمولی یا

غیر معمولی مقامی ضرورتوں کے لئے کافی نہ ہو رہا ہو۔ نیز مرکز کو یہ بھی اختیار رہنا چاہیئے کہ اگر زکوٰۃ کی مد سے کچھ ایسے ادارے قائم کرنے یا کچھ ایسے کام کرنے کی ضرورت پیش آئے جن کا تعلق ملک کے اندر اور باہر "فی سبیل اللہ" خدمات انجام دینے سے ہو، یا ملک کے باہر غیر معمولی مصائب کے موقع پر مدد بھیجنے کی ضرورت ہو، تو وہ صوبوں سے ان کی زکوٰۃ کا ایک حصہ طلب کر سکے۔

(۴) ہمارے نزدیک زکوٰۃ کی تحصیل کے لئے کوئی الگ محکمہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مختلف اقسام کی زکوٰۃ وصول کرنا ایسے محکموں کے سپرد ہونا چاہیئے جن کے فرائض اسی قسم کے دوسرے ٹیکس وصول کرنے سے متعلق ہیں۔ مثلاً زرعی زکوٰۃ اور مواشی کی زکوٰۃ وصول کرنا محکمۂ مال کے سپرد ہو۔ اموالِ تجارت کی زکوٰۃ انکم ٹیکس محکمہ وصول کرے۔ کارخانوں کی زکوٰۃ اکسائز کا محکمہ۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ زکوٰۃ کی حفاظت سرکاری خزانے کے سپرد، اور اس کا حساب اکاؤنٹنٹ جنرل کے محکمے کے سپرد ہو۔

اگر ہماری سفارش کے مطابق زکوٰۃ کو صوبوں کے انتظام میں دیا جائے، اور تحصیلِ زکوٰۃ کے کسی شعبے کو کسی ایسے محکمے کے حوالے کرنا پڑے جو مرکزی محکمہ ہو، تو باہمی قرارداد سے یہ انتظام کیا جا سکتا ہے کہ تحصیلِ زکوٰۃ کی حد تک اس محکمے کے مصارف صوبہ ادا کر دیا کرے۔

البتہ زکوٰۃ کی تقسیم اور مصارفِ زکوٰۃ میں اموالِ زکوٰۃ کو خرچ کرنے کیلئے ایک الگ محکمہ قائم ہونا ضروری ہے جسے کسی ایسے وزیر کے ماتحت رکھا جائے جو اوقاف اور دوسرے مذہبی اداروں کی نگرانی کا کام بھی کرتا ہو۔

(۵) یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ زکوٰۃ کوئی "ٹیکس" نہیں ہے بلکہ ایک "مالی عبادت" ہے۔ "ٹیکس" اور "زکوٰۃ" میں بنیادی تصور اور اخلاقی روح کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حکومت کے کارندوں اور زکوٰۃ دینے والوں میں اگر "عبادت" کے بجائے "ٹیکس" کی ذہنیت پیدا ہو جائے تو یہ ان اخلاقی و روحانی فوائد کو بالکل ضائع کر دے گی جو زکوٰۃ سے اصل مقصود ہیں، اور اجتماعی فوائد کو بھی بہت بڑی حد تک نقصان پہنچائے گی۔ حکومت کے سپرد زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کرنے کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ یہ ایک سرکاری محصول ہے، بلکہ دراصل اس عبادت کا انتظام اس وجہ سے حکومت کے سپرد کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی تمام اجتماعی عبادات میں نظم پیدا کرنا ایک اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ اور امارتِ حج بھی اسی طرح اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے

طریقِ تحصیل و تقسیمِ زکوٰۃ۔

(۳۶) حدیث میں اصول بیان کیا گیا ہے کہ ان فی المال حقاً سوی الزکوٰۃ۔ "آدمی کے مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی حق ہے"۔ اس اصولی ارشاد کی موجودگی میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کیا ایک اسلامی حکومت زکوٰۃ کے سوا دوسرے محاصل عائد کر سکتی ہے۔ پھر جبکہ قرآن میں زکوٰۃ کے لئے چند مخصوص مصارف معین کر دیئے گئے ہیں تو لامحالہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان مصارف کے ماسوا جو دوسرے فرائض حکومت کے ذمے عائد ہوں ان کو بجا لانے کے لئے وہ دوسرے محاصل پبلک پر عائد کرے۔ نیز قرآن میں یہ اصولی ہدایت بھی دی گئی ہے کہ یسئلونک ماذا ینفقون، قل العفو۔ "تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ کہو عفو"۔ عفو کا لفظ (ECONOMIC SURPLUS) کا ہم معنی ہے اور اس میں نشان دہی کی گئی ہے کہ "عفو" ٹیکس کا صحیح محل ہے۔ مزید برآں ایسے نظائر بھی موجود ہیں کہ خلفائے راشدین کے عہد میں دوسرے محاصل عائد کئے گئے ہیں مثلاً حضرت عمر کے عہد میں محصول درآمد مقرر کیا گیا اور اس کا شمار "زکوٰۃ" میں نہیں بلکہ "فے" (حکومت کی عام آمدنیوں) میں تھا۔ علاوہ بریں شریعت میں کوئی ایسی ہدایت موجود نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ حکومت اجتماعی ضروریات کے لئے کوئی دوسرا ٹیکس نہیں لگا سکتی، اور اصول یہ ہے کہ جس چیز سے منع نہ کیا گیا ہو وہ مباح ہے۔ فقہائے اسلام میں سے بھی جہاں تک ہم کو معلوم ہے، ایک غیر معروف شخصیت ضحاک بن مزاحم کے سوا کوئی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ نسخت الزکوٰۃ کل حق فی المال (زکوٰۃ نے مال میں ہر دوسرے حق کو منسوخ کر دیا)۔ ضحاک کی اس رائے کو کسی قابلِ ذکر فقیہ نے تسلیم نہیں کیا ہے (المحلّٰی لابنِ حزم، ج ۶، ص ۱۵۸)

(۳۷) صدرِ اول میں حکومت کی طرف سے محصلین مقرر تھے جو اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ ان مقامات پر خود ہی جا کر وصول کرتے تھے جہاں وہ اموال ہوں۔ زکوٰۃ جمع کرنے کے لئے الگ خزانے نہیں تھے بلکہ حکومت کے خزانے ہی میں وہ جمع ہوتی تھی، البتہ اس کا حساب کتاب الگ رہتا تھا، اور زکوٰۃ کی تقسیم حکومت کے عمال کرتے تھے جن کے سپرد دوسری سرکاری خدمات بھی ہوتی تھیں۔ تقسیمِ زکوٰۃ کے لئے کسی الگ محکمے کا وجود ہمارے علم میں نہیں ہے۔ لیکن یہ ایسے انتظامی معاملات ہیں جن میں آج کے احوال و ضروریات کے لحاظ سے ہم جس طرح مناسب سمجھیں مختلف صورتیں اختیار کر سکتے ہیں۔

موجودہ مسلم حکومتوں کے متعلق ہمیں معلوم نہیں ہے کہ کسی نے زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا باقاعدہ انتظام کیا ہو۔

(۳۸) ہماری رائے میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا انتظام اسلامی حکومت ہی کو کرنا چاہیے۔

(۳۹) زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا انتظام کرنے والے عملے کی حیثیت تنخواہوں، الاؤنسوں، پنشنوں اور شرائط ملازمت کے لحاظ سے دوسرے سرکاری ملازمین سے مختلف نہ ہونی چاہیے۔ البتہ تمام سرکاری ملازمین تنخواہوں کے معاملے میں حکومت کو اپنے طریق کار میں بنیادی تبدیلیاں کرنی چاہئیں۔ موجودہ افراط و تفریط اگر بحال رہے تو نہ زکوٰۃ کی تحصیل صحیح طریقے سے ہو سکے گی اور نہ اس کی تقسیم۔

مکاتیبِ زنداں

ناظرین ترجمان القرآن کی خدمت میں عموماً اور رفقاء جماعت کی خدمت میں خصوصاً فرطِ انبساط سے اطلاعاً عرض ہے کہ مجھ ناچیز کو حضرت مولانا مودودی صاحب و مولانا اصلاحی صاحب و محترم نعیم صاحب کے خطوط جو انھوں نے ملتان جیل سے اپنے مختلف احباب کو لکھے تھے کتابی صورت میں شائع کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ بندہ اُن کو نہایت اہتمام سے اعلیٰ قسم کے کاغذ پر بہترین لکھائی چھپائی کے ساتھ شائع کر رہا ہے اس لئے جن دوستوں کے پاس ایسے خطوط موجود ہوں وہ اپنی پہلی فرصت میں مجھے رجسٹرڈ بھیج دیں تاکہ یہ نایاب جواہر بکھرے نہ رہیں بلکہ یکجا مرتب ہو کر زینتِ ادب و افادۂ انسانیت کا باعث بنیں۔ جن اصحاب نے انھیں خریدنا ہو وہ ابھی سے مطلع فرما کر خریداروں میں نام درج کرائیں، فقط والسلام۔

خادم خلق اللہ: خاکسار حکیم محمد شریف امرتسری

شریف دواخانہ، حافظ آباد شہر، مغربی پنجاب۔

انفرادی ملکیت اسلام میں

نعیم صدیقی

(۲)

چند غلط فہمیوں کا ازالہ

گذشتہ اشاعت میں جو مدعا پیش کیا گیا ہے، اس کی افادیت کی تکمیل چند غلط فہمیوں کا ازالہ کئے بغیر نہیں ہو سکتی۔ یہ غلط فہمیاں وہ ہیں جو اسلامی اور غیر اسلامی تصورات کے تصادم سے رونما ہوئی ہیں، اور ان کو اپنی جذباتی تحریروں، تقریروں اور گفتگوؤں نے ہوا دی ہے جن میں اسلام کے اصل مآخذ سے کوئی ٹھوس استدلال کم ہی کیا گیا ہے۔ یہاں ان کے بارے میں ضروری تصریحات عرض کی جا رہی ہیں۔

محض محنت ذریعۂ ملکیت نہیں

مارکسی فلسفے نے اس خیال کو پھیلانے میں پوری طرح سرگرمی دکھائی ہے کہ ملکیت صرف محنت سے قائم ہوتی ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا جائز ذریعہ مالک بننے کا نہیں ہے۔ اس فلسفے کے علمبردار جو اتفاق سے مسلمانوں کے سے نام رکھتے ہیں، قرآن سے ایک برہانِ قاطع لیس للانسان الا ما سعیٰ سے اخذ کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کو اگر سیاق و سباق سے الگ کر کے موضوعِ معاد کی بجائے موضوعِ معاش سے وابستہ کرنا جائز ہو تو پھر اس کے الفاظ جو کچھ تقاضا کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہر شخص صرف اپنی ہی محنت سے اپنی ساری ضروریات پوری کرے۔ پھر نہ تبادلہ جائز ہوگا، نہ ہدیہ و صدقہ، نہ کرایہ داری و شراکت، نہ مزارعت و مضاربت۔ تمدن کے معاملات کے ہزاروں پہلو حرام ٹھیریں گے، جنھیں خود شریعتِ الٰہی نے صراحت کے ساتھ حلال ٹھیرایا ہے اور جو نبی صلعم اور صحابہ نے عملاً اختیار کئے ہیں۔ مثلاً آپ کسی قلی کو معاوضہ دے کر بوجھ اٹھواتے ہیں، کسی نائی اور موچی کی خدمات حاصل کرتے ہیں، ایک بیوہ عورت اپنی زمین مزارعت کے لئے دیتی ہے، ایک یتیم بچے کا تانگہ شراکت کے اصول پر کوئی اور ہاں چلاتا ہے۔ ایک کمپنی کے ہزاروں حصہ داروں کا مشترک کاروبار کچھ ڈائرکٹر چلاتے ہیں، ایک مسافر کسی کرائے کے مکان کو رہائش کے لئے

حاصل کرتا ہے تو ان حضرات کا مفہوم "ما سعیٰ" فرض ہونے کا کہ یہ سب کچھ حرام ہے۔ خود محنت کریں دوسرے کی محنت کو خرید کر یا اس کے نتائج کو بالمعاوضہ حاصل کر کے اگر تم نے کچھ کیا تو یہ قرآن کی خلاف ورزی ہوگی اور اس طرح سے جو ملکیتیں نمودار ہوں گی وہ سب ناجائز اور قابلِ سلب ٹھہریں گی۔

پس یہ ایک انتہائی لغو فلسفہ ہے جس کو نہ قرآن سے تعلق ہے، نہ عملی حالات سے۔

لیس للانسان الاما سعیٰ کا اصل مفہوم سمجھنے کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ محض اس ایک ٹکڑے کو اصل کلام سے الگ کر کے اس کا کوئی ترجمہ کر لیا جائے، بلکہ اس کو اصل بیان میں دیکھا جائے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ ان الفاظ سے فلسفۂ ملکیت اخذ کرنے والوں نے کبھی ایک مرتبہ بھی سورۂ النجم کو ترجمہ کے ساتھ پڑھا بھی نہیں ہوگا۔ ان سے پوچھ دیکھئے کہ اس سورۂ النجم کا نفسِ مضمون کیا ہے اور اس کا عمودِ کلام کیا ہے تو وہ کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

یہ حرکت کہ کسی کے کلام میں سے ایک فقرہ نکال کر اس کو من مانے معنیٰ پہنائے جائیں، انتہائی بداخلاقی میں شمار ہوتی ہے جسے لوگ بددیانتی کہتے ہیں۔ یہ حضرات اس طرح کی بددیانتی کسی عام سیاسی ورکر کی تقریر یا کسی ادنیٰ اخبار نویس کے افتتاحیے کے ساتھ تو کرنے کی جرأت نہیں رکھتے، لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کے کلام کے ساتھ اس حرکت کو روا رکھنے میں پوری طرح بےباک ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ شاید قرآن سے ساری دنیا انھی کی طرح جاہل واقع ہوئی ہے۔

سورۂ النجم کا سلسلۂ مطالب یوں چلتا ہے کہ:۔

(۱) نبی صلعم کا سر نہیں پھر گیا، وہ من گھڑت باتیں نہیں کہتے، بلکہ ان کی ہر بات وحی کے مطابق ہے۔

(۲) یہ وحی ایک قوی و امین فرشتے کے ذریعے آتی ہے

(۳) نبی صلعم کو اپنے آقا سے حقیقی قرب حاصل ہو چکا ہے اور اُس نے جو کچھ چاہا وہ کچھ آپ پر براہِ راست وحی کیا ہے۔

(۴) نبی صلعم نے ایک کیفیت چشمِ بصیرت سے دیکھی ہے اور اُن کے دل نے اُس کی تکذیب نہیں کی، اسے قبول کیا ہے۔

(۵) اب تم ـــــ اے کفارِ مکہ ـــــ نبی صلعم سے ایسے معاملے میں جھگڑتے ہو [illegible]

دیکھا اور محسوس کیا ہے؟

(۶) خود اپنے گریبان میں منہ ڈالو کہ تم لات، منات اور عزیٰ کو الٰہ بنائے ہوئے ہو اور ان کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہو، حالانکہ اس کے لئے نہ تم پر وحی کی گئی، نہ تم کو اللہ کی حقیقتوں کا چشم بصیرت سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا —— یہ تم نے خود ہی نام گھڑ لئے ہیں جن کے لئے کوئی دلیل نہیں۔

(۷) تم محض ظن و قیاس پر جان دے رہے ہو۔

(۸) کیا انسان کو وہی کچھ مل جاتا ہے جس کی اپنے قیاسات کے پیش نظر وہ ہوس کرنے لگے؟

(۹) حالانکہ دنیا و آخرت کا سارا معاملہ اللہ کے اپنے بس میں ہے اور اس کے سامنے اس کے اذن کے بغیر کسی کی سفارش نہیں چلتی۔

یہ ہے سلسلۂ کلام جس میں نبی صلعم کی نبوت اور حقیقتِ وحی پر گفتگو شروع ہوتی ہے اور خطاب کفار و مشرکین سے ہے اور یہاں کی بُت پرستی اور مشرکانہ عقائد کا تذکرہ ہے جن کی بنا پر وہ نبی صلعم کو جھٹلاتے ہیں، اور اسی سلسلۂ کلام کے تحت بات یہاں پہنچتی ہے کہ:۔

لیجزی الذین اساءوا بما عملوا ویجزی الذین احسنوا بالحسنیٰ۔ یعنی برا کرنے والوں کو بُرا بدلہ ملے گا اور بھلائی کرنے والوں کا انجام بھلا ہوگا۔

اور یہ کہ "الا تزر وازرۃ وزر اخریٰ"! یعنی کیا ان لوگوں کے پاس صحفِ موسیٰؑ و ابراہیمؑ کے ذریعے یہ بات واضح نہیں کر دی گئی ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

"وان لیس للانسان الا ما سعیٰ" اور یہ کہ انسان کے پلے بجز اُس کے کچھ نہ پڑے گا جس کے لئے اس نے دوڑ دھوپ کی ہوگی۔

"وان سعیہ سوف یریٰ"۔ اور یہ کہ اس کی کمائی یقیناً اس کے سامنے لا رکھی جائے گی۔

"ثم یجزٰہ الجزاء الاوفیٰ"۔ پھر اسے پورے کا پورا بدلہ دیا جائے گا:

"وان الی ربک المنتہیٰ" اور یہ کہ آخر کار حاضری تیرے رب کے سامنے ہونے والی ہے۔

پھر اس سلسلۂ کلام کے تحت یہ باتیں آگے آتی ہیں کہ:۔

(۱) اللہ ہی کے بس میں مسرت بھری زندگی بھی ہے اور دکھیا راجیون بھی۔

(۲) وہی مارتا اور جلاتا ہے۔

(۳) اسی نے مذکر و مؤنث کے جوڑے بنائے ـــــ مادۂ حیات سے جبکہ وہ رقصندہ تھا!

(۴) اور دوبارہ جلا اٹھانا بھی اُسی کے ذمے ہے۔

(۵) وہی مال و دولت دینے والا ہے۔

(۶) وہی مشرکین عرب کے معبود شعریٰ ستارے کا رب ہے۔

(۷) اور وہی ہے جس نے عاد کو، ثمود کو، گروہِ فرعون کو ختم کیا، کیونکہ وہ انتہائی ظالم اور شقی بن گئے۔

اس طرح اپنی ربوبیت و الٰہیت اور اپنے بے پناہ اختیارات کا تذکرہ کرتے ہوئے پھر انّی دیک کی طرف بات لوٹا دی کہ:۔

اَزِفَتِ الآزِفَۃ۔ جب آ پہنچے آنے والی گھڑی۔

لیس لھا من دون اللہ کاشفہ۔ کوئی نہیں اللہ کے سوا اس کی گرفت کی گرہ کو کھول دکھانے والا۔

پھر خاتمے پر مشرکین سے سوال کیا جاتا ہے کہ:۔

افمن ھذا الحدیث تعجبون؟ کیا یہی بات ہے جس پر تم کو حیرت ہوتی ہے؟

وتضحکون ولا تبکون؟ اس پر تم رونے کے بجائے ہنستے ہو؟

وانتم سامدون! اور تم ہو ہی غفلت زدہ!

اب غور کیجئے کہ کیا اس سورت کا موضوعِ اصلی یا کوئی موضوعِ ضمنی معاشیات ہے؟ اس میں تو کہا ہے کہ نبی صلعم کی دعوت کو تم جھٹلاتے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ شخص من گھڑت باتیں کہہ رہا ہے، حالانکہ یہ وحی ہے جو تم تک پہنچ رہی ہے۔ اس حقیقت بیں کے پیغام کو جھٹلا کر تم اپنے قیاسات کو بڑی اہمیت دیتے ہو لیکن قیاسات کے تحت جو کچھ خواہشات اور تمنائیں رکھتے ہو یہ پوری ہونے کی نہیں ہیں، کیونکہ تمہارے اصنام اس کے حضور بالکل بے بس ہیں، اختیار جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اللہ کا سارا نظام اس طرز پر وجود میں آیا ہے۔ اس کے تحت برائی کرنے والوں کو آخرت میں بہرحال برے نتائج کا سامنا کرنا ہوگا اور بھلائی کرنے والا

لئے آخری نتیجہ بھلائی ہو گا۔ یہ سمجھ لو کہ خدا کی بارگاہ میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک کے گناہوں کا بار اس سے ہٹ کر دوسرے

کے کندھوں پر لد جائے بلکہ اس کا قانون یہ ہے کہ جو کچھ کسی نے کارگزاری انجام دی ہو، اس کا حساب اسے

ملے اور ٹھیک اس کارگزاری[1] کے مطابق ملے، نہ کم نہ زیادہ! چنانچہ نوعِ انسانی کے ہر فرد کے سامنے اس کی پو

کمائی لا رکھی جائے گی کہ یہ ہے تیرا حاصلِ حیات۔ پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور آخر کار تمہاری

اللہ کے سامنے ہو کے رہے گی۔ وہ گھڑی ہر حال آنے والی ہے جس کا آنا مقدر ہے۔ اسے کوئی ٹالنے والا نہ

آخر اس میں اچنبھے کی بات کیا ہے؟

اب دیکھئے یہ ہے سلسلۂ کلام ——— لیکن مارکسی مفسرین اس سارے سلسلہ کو کنویں میں ڈال کر

میں سے ایک ٹکڑا لیس للانسان الا ما سعیٰ کا الگ کر لیتے ہیں اور پھر اس میں وہ معنیٰ داخل کرتے ہیں جن

سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرزِ تفسیر کے موجدین کو چاہیئے یہ تھا کہ وہ اس ٹکڑے کے بجائے اپنی توجہ

ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ" پر صرف کرتے، اور اس کی تفسیر یہ فرماتے کہ اسلام نے حکم دیا ہے کہ کوئی شخص

کا بوجھ نہ اٹھائے یعنی کسی نوکر، کسی ملازم، کسی پیشہ ور، کسی مزارع، کسی مزدور کی محنت خریدنا یا کسی سے

کام لینا ممنوع ہے۔ ہر شخص اپنا کام خود کرے۔ پھر دنیا کو بتایا جائے کہ دیکھئے کہ اسلام نے کس طرح ا

(EXPLOITATION) کے خلاف آواز بلند کی ہے اور سرمائے کی گردن مار دی ہے۔ ہر شخص کے لئے محن

لازم ٹھیرا دیا ہے، وغیرہ۔ اس طرح کی فلسفہ طرازیاں اگر کی جانے لگیں تو قرآن میں سے دنیا کا ہر

ہر نظام برآمد کیا جا سکتا ہے۔

مارکسی فلسفۂ ملکیت کا دوسرا سہارا قرآن کا یہ ٹکڑا ہے کہ "للرجال نصیب مما اکتسبوا و

نصیب مما اکتسبن"۔ اس کی مارکسی تفسیر یہ ہے کہ مردوں کے لئے صرف وہ اموال واملاک جائز ہیں

وہ خود اپنی محنت سے کمائیں اور عورتوں کے لئے صرف وہ اموال واملاک حلال ہیں جن کو وہ خود محن

---

[1] یہی مفہوم ہے کہ من یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ نیز یک پہلے

یہاں مجمل رکھا گیا ہے جسے دوسرے موقع پر وھم لا یظلمون کے الفاظ سے واضح فرمایا ہے۔

کمائیں۔ باقی سب کچھ حرام۔

اس تفسیر کا بھرم بھی اسی صورت میں قائم رہتا ہے جبکہ آگے پیچھے کے سلسلۂ کلام سے قطع نظر کیا جا۔ ورنہ فلسفہ طرازی کا سارا محل زمین پر آرہتا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ نساء :-

ولا تتمنوا ما فضل الله به بعضکم علی بعض ، للرجال نصیب مما اکتسبوا ، وللنساء نصیب مما اکتسبن ، واسئلوا الله من فضله ، ان الله کان بکل شیئ علیما ؁

یعنی تم کو (مردوں اور عورتوں کو) ایک دوسرے پر جو فضیلتِ رزق دی گئی ہے، اس پر رشک و حسد ——— بلکہ اپنے اپنے جائز حاصل کردہ املاک پر اکتفا کرو ——— مرد جو کچھ کماتے ہیں اس کے مالک ہیں۔ اور عورتیں جو کچھ کمائیں اس کی مالک عورتیں ہیں۔ اور تم دوسروں کے رزق پر نگاہ ڈالنے کے بجائے تعالیٰ کی بارگاہ سے اپنا رزق طلب کرو جیسے کہ اس کا طریقہ ہے۔ خدائے علیم تمہاری ضروریات اور تمہاری پوری نگاہ رکھنے والا ہے۔

کلام کا منشا ذیل کی دو باتیں ہیں :-

(۱) آپس کے تفاوتِ رزق سے تم کو حسد و رشک کے جذبے (اور ایک دوسرے کی حق ماری کی کوشش) میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ تمہیں دوسروں کے رزق پر نگاہ رکھنے کے بجائے خود اللہ تعالیٰ سے رزق طلب کرنا:

(۲) عورتوں کو اپنے اموال[۱] و املاک پر اسی طرح مالکانہ حقوق حاصل ہیں جیسے مردوں کو ان کے اموال و آپ کہتے ہیں کہ نہیں یہاں ایک تیسری بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ ملکیت صرف وہ جائز ہے جو اپنی محنت کا نتیجہ لیکن ذرا تکلیف فرما کر آگے کی عبارت پڑھئے، لکھا ہے کہ ولکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون یعنی ہم نے ہر متوفی کے ترکے کے لئے اس کے والدین اور اعزہ و اقربا کو حقدارِ میراث ٹھیرا دیا ہے۔

کیا اس آیت نے آپ کے معنی کو ختم نہیں کر دیا؟

---

[۱] اس آیت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں عورتوں کے مستقل حقِ ملکیت کا اعلان کیا گیا ہے۔ ان کی ملکیت مرد کے واسطے سے نہیں، بلکہ بلا واسطہ ہے۔

پھر آگے آتا ہے کہ: الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضہم علی بعض وبما انفقوا من اموالہم۔ یہاں "انفقوا من اموالہم" کا فکرا صاف بتا رہا ہے کہ مرد اپنی محنت کی کمائی کو اپنی بیویوں کی ضروریات پر خرچ کرتے ہیں، اور عورتوں کے نان و نفقہ کی ذمہ داری مردوں پر ڈال کر ان کو اس سے بے نیاز ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ اپنی ضروریات اپنی ہی محنت سے بہم پہنچائیں۔ یہ دوسری تردید ہے جو اس غلط مفہوم کی نفی کرتی ہے۔

یہاں ان آیات پر تفصیلی کلام کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ان کو مارکسی فلسفۂ ملکیت کے علمبرداروں نے بازاری منطق کے نیلام گھر کا مال بنا دیا ہے۔ وہی صورت کہ "شعر مرا بمدرسہ کہ بُرد"

اسلام مارکسی فلسفۂ ملکیت کی تائید نہیں کرتا اور اس کے ہاں ایسا کوئی اصول نہیں ہے کہ صرف محنت وسیلۂ ملکیت ہے۔

اسلام میں حصولِ ملکیت کے مباح دروازے حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) قبضۂ ابتدائی ــــــ کرۂ ارضی پر جو کچھ ذرائع و وسائل پھیلے ہوئے ہیں اُن میں سے کسی غیر مقبوضہ و غیر مملوکہ چیز پر سب سے پہلے قبضہ کرنے والا انسان حقوقِ مالکانہ حاصل کرتا ہے۔ بلالحاظ اس کے کہ اُس چیز کی مقدار کیا ہے۔

اس معاملے میں دولت کی جن اقسام کو اسلامی قانون کے تحت نبی صلعم نے غیر ملکیتی قرار دے دیا ہے مثلاً ہوا، پانی وغیرہ، ان پر انفرادی حقوقِ مالکانہ تسلیم نہ ہوں گے۔ یا مثلاً جنگلات اور چراگاہوں کی انفرادی ملکیت کے خلاف صراحت موجود ہے، لہٰذا ان کا معاملہ مستثنیٰ رہے گا۔

ایسے چند استثنائی موجودات کو چھوڑ کر بقیہ میں سے جس کسی پر ایک فرد پہلے قابض ہو جائے گا وہی اس کا مالک ٹھہرے گا۔

(۲) ایجاد ــــــ ایک فرد ذہنی کاوش سے (جو محنت کی ایک قسم ہے) کسی چیز کا انکشاف کرتا ہے، کوئی آلہ کار ایجاد کرتا ہے تو وہ چاہے بالکل اتفاقی حادثے کے ذریعے ہی کیوں نہ اُس پر قادر ہوا ہو اُس حقوقِ مالکانہ حاصل کرے گا۔

اسی ذیل میں ادیبوں، صحافیوں، شاعروں، مقرروں اور صناعوں کی وہ تخلیقاتِ فکر آتی ہیں جن کو

ول اول وجود دیتے ہیں اور جن کے ابتدائی نمونے وہ دُنیا کو فراہم کرتے ہیں۔

چنانچہ اکتشافات اور ایجادات اور فنی شاہکاروں کی قیمتیں وصول کرنے کا حق اسی طرح موجدوں اور اہلِ فن کو حاصل ہوتا ہے جیسے عام لوگوں کو زمین، مکان، گھوڑے اور سائیکل کا معاوضہ لینے کا حق ہوتا ہے اسی حق کی بنا پر "کیمیاوی نسخے" اور "حکیمانہ راز" جو ظاہراً محض کاغذ کے پرزے یا چند الفاظ کے جملے ہوتے ہیں لکھوں پونڈ میں بکتے ہیں۔

(۳) محنت و تصرف ــــــ کسی مادی وجود کو جب صنعتی عمل کے بعد انسانی ضروریات میں استعمال کرنے کے قابل بنایا جاتا ہے تو شئے مصنوعہ کی ملک محنت و تصرف کرنے والے[1] کو از خود حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی نے درخت کاٹا اور اسے ایندھن یا تعمیر میں کام آنے کے قابل بنا دیا، کسی نے کچے لوہے کو تیار کیا اور اس سے کدال یا تلوار یا ٹائپ رائٹر مشین تیار کر دی تو اسے اپنے نتیجۂ صنعت پر مالکانہ حقوق حاصل ہو گئے۔

لیکن یہ مالکانہ حقوق صرف اس صورت میں حاصل ہوتے ہیں جب کہ ابتدائی جنس خام کو صانع نے خود حاصل کیا ہو اور پھر اس پر خود محنت کی ہو، لیکن اگر جنس خام پر ابتدائی قبضہ دوسرے نے کیا یا اس پر محنت کئی آدمیوں نے مشترک طور پر صرف کی، یا پہلے ایک اسٹیج پر کسی محنت کار نے اولین محنت کر کے حقوقِ مالکانہ حاصل کرنے کے بعد دوسرے اسٹیج کی محنت کے لئے اسے دوسرے محنت کار کے سپرد کیا، یا ایک شئے خام اپنی تکمیل کے لئے صرف محنت ہی کی نہیں سرمایہ کی بھی مقتضی تھی اور سرمایہ صرف کر کے کسی نے اس پر حقوقِ مالکانہ پہلے حاصل کر لئے تو ان ساری صورتوں میں محض ایک شخص کی محنت اسے حقوقِ مالکانہ نہ دلوا دے گی۔

اس قسم کے حالات میں دراصل ایک محنت کار اپنی محنت کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کر کے مقررہ معاوضہ لے لیتا ہے یا سرمایہ و محنت کے نتائج میں کسی تناسب سے حصہ داری کر لیتا ہے۔

بہرحال محنت و تصرف حقوقِ مالکانہ کے حاصل کرنے کا ایک بڑا راستہ ہے، لیکن صرف یہی ایک راستہ نہیں۔ محنت و تصرف سے اگر پورے نتیجۂ کار پر مالکانہ حقوق حاصل نہ ہوں تو بھی جو معاوضہ لیا جاتا ہے بہرحال

---

[1] مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ جس نے ایک مُردہ (بیکار) زمین کو زندہ (کارآمد) بنایا تو وہی اس کا مالک بھی ہے۔

اس پر محنت کار کو حقوقِ مالکانہ محنت ہی کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں۔

مارکسی فلسفے کی زیادتی یہ ہے کہ اُس نے صرف ایک ہی راستے کو برحق کہا اور دوسرے راستوں کی نوعیتِ خاص کی بھی تاویل کر کرا کے سب کو ایک ہی عنوان کے تحت داخل کر دیا۔ مثلاً سرمائے کو محنت کاروں کی صرف کردہ سابق محنت کا جمع شدہ جوہر ثابت کیا اور دعویٰ یہ کیا کہ خود سرمایہ بھی محنت ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے اور اُس پر بھی حقوق محنت کاروں ہی کے قائم ہونے چاہئیں۔ اس طرح کی تاویلاتِ فکر سے تو دن کو رات اور رات کو دن ثابت کیا جاسکتا ہے۔

(۴) توارث ــــــــ اسلام میں حقوقِ مالکانہ حاصل کرنے کے جائز راستوں میں سے ایک بڑا راستہ توارث کا ہے۔ یعنی ایک شخص کے نتائجِ محنت میں سے جو کچھ املاک اس کی موت پر اس کے ترکے میں رہ جائیں ان کے حقوقِ مالکانہ قانونِ اسلامی کے مطابق اس کے اقربا کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔

اسلام کا قانونِ وراثت خود اس دعوے کی تردید کرتا ہے کہ ملکیت کا دار و مدار تنہا محنت پر ہے۔

پھر توارث کے دروازے سے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے پاس کئی کئی متوفیوں کے ترکے آ کے جمع ہو جائیں اور وہ بڑا مالدار بن جائے، اور اس پر کمیونزم کے ماتھے پر بل پڑ جائیں کہ ایک شخص کے پاس اتنی دولت کیوں ہے۔ لیکن اسلام اسلام ہے، کمیونزم نہیں! اسلام میں توارث ایک جائز ذریعۂ ملکیت ہے۔

(۵) ادائے قیمت (تبادلہ) ــــــــ یہ بھی اسلام میں ایک بہت بڑا ذریعۂ ملکیت ہے۔ آپ اپنی زمین دے کر دوسرے کی موٹر لے سکتے ہیں، آپ باغ کے بدلے میں مکان حاصل کر سکتے ہیں، آپ مکان دے کر سونا چاندی یا جواہرات خرید سکتے ہیں، آپ محنت بیچ کر روپیہ لا سکتے ہیں اور روپیہ صرف کر کے محنت حاصل کر سکتے ہیں، آپ دوسروں کی املاک کے حقوقِ استعمال اور حقوقِ انتفاع کو کرایہ یا معاوضہ ادا کر کے خرید سکتے ہیں۔ آپ دماغی قوت صرف کر کے دوسروں کی جسمانی محنت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اسی طرح اپنی جسمانی محنت کے عوض میں دوسروں کی دماغی قوت یا اس کے نتائج مول لا سکتے ہیں۔ یہ سب حلال صورتیں ہیں، ان میں سے کوئی حرام نہیں۔

(۶) قبولِ ہدیہ و صدقہ ــــــــ مسلم سوسائٹی میں ہدیہ، عطیہ اور صدقہ کا راستہ بھی حصولِ ملکیت کا بہت بڑا راستہ شمار ہوتا ہے۔ دولت کی بے شمار مقدار ہے جو صدقاتِ واجبہ و نافلہ اور ہدایا و عطیات کے

ذریعے ایک صالح معاشرہ کے اوپر کے طبقے سے نیچے کے طبقے کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ بے شمار لوگ محنت کئے بغیر دوسروں کے نتائجِ محنت پر حقوقِ مالکانہ حاصل کرتے ہیں۔

ان تمام ناجائز ذرائعِ حصولِ ملکیت کو اسلام کے قانون واخلاق نے قطعاً ناجائز قرار دیا ہے اور ان میں سے کسی کو ناجائز قرار دینے کا حق نہ رائے عام کو ہے، نہ پریس کو، نہ سیاسی پارٹیوں کو، نہ اسٹیٹ کی اسمبلی کو ——— چاہے کتنے ہی مارکس دانت پیستے رہیں اور کتنے ہی اسٹالن پیچ وتاب کھاتے رہیں۔

اسلام میں مساواتِ ملکیت کوئی اصول نہیں

"قومی ملکیت" کے نظریئے کے لئے وجہ جواز جن دلائل سے گھڑی گئی ہے، اُن میں سے ایک مساواتِ ملکیت بھی ہے

مساواتِ ملکیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ تمام ملک کی دولت اجتماعی قرار پائے اور تمام افراد اس کے حقوقِ مالکانہ میں مساوی طور پر حصہ دار ہوں، اور اس دولت کا جو حصہ ان کے انفرادی قبضے میں دیا جائے وہ ہر فرد کو برابر سرابر ملے۔

"یک عروس وشوہر او ما ہمہ"

یعنی زمین سب کی زمین، باغ سب کا باغ، ریل سب کی ریل، ہوٹل سب کا ہوٹل، حوض سب کا حوض، اور اسکول سب کا اسکول ہو۔

لیکن عملاً اس فلسفے کے علمبرداروں کا قائم کردہ نظام اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی زمین سب کی زمین کہلاتی ہے، لیکن اس کی پیداوار سے مختلف درجے کے لوگوں کو مختلف مقداروں میں حصہ ملتا ہے، باغ سب کا باغ ہوتا ہے لیکن اس کے پھل کچھ کو زیادہ ملتے ہیں، کچھ کو کم اور کچھ کو صفر۔ اسی طرح ہر اجتماعی ملکیت کے حقِ انتفاع اور حقِ استعمال میں افراد کے لئے عملاً عدم مساوات ہے، پھر ان کی انفرادی املاک میں بھی تفاوت ہے، معاوضے مختلف ہیں، لہٰذا املاک کی مقداریں اور درجات بھی مختلف ہیں۔

صاف سیدھی بات ہے کہ صلاحیتوں اور قوتوں میں مساوات نہیں تو آخر محنت اور کارکردگی میں کیسے ہوگی اور محنت اور کارکردگی میں مساوات نہ ہوگی تو معاوضوں میں کیسے برابری ہو سکے گی اور معاوضوں میں برابری نہ ہوئی تو مساواتِ ملکیت کہاں سے آجائے گی؟ املاک میں تفاوت ناگزیر ہے۔

آیت کی تفسیر کرنے کے لئے فصاحت و بلاغت کے منبر پر جا نظریں رکھیں گے اور پھر تاویل کے خود پر کے کلام الہٰی کا ستیاناس کریں گے۔

سورۂ نحل مرکزی مفہوم کے لحاظ سے معاشی مسائل سے بحث نہیں کرتی (اگرچہ اس میں بعض معاشی معاشی مسائل کے لئے اشارات ملتے ہیں) بلکہ خدا تعالیٰ کی ربوبیت والٰہیت کی توحید کا اثبات مظاہر کائنات سے کر کے دکھانا اس کا عمودِ کلام ہے۔ اور اس موضوع کے لحاظ سے وہ مشرکین مکہ کے نظریات و مسلک کی تردید کرتی ہے۔

چنانچہ پیرایۂ آغاز سے ہی انعامات الٰہی اور نظام کائنات کے اہتمام کا تذکرہ شروع ہوتا ہے جس سے خدائے واحد کے لاشریک ہونے اور اس کے حقوق میں کسی کے حصہ دار نہ ہونے کا مسئلہ واضح کرنا مطلوب ہے۔ تخلیقات الٰہی کا ذکر کرنے کے بعد فوراً ایک سوال سامنے لایا جاتا ہے کہ "افمن یخلق کمن لایخلق" ؟ — کیا وہ جو پیدا کرنے والا ہے اُس جیسا (یعنی اس کے برابر اور اس کی شراکت کا روادار) ہو سکتا ہے جو کچھ پیدا کرنے والا نہیں ہے؟ اس سوال کے ساتھ ہی فرمایا جاتا ہے کہ "افلا تذکرون" ؟ — کیا تم غور و فکر کرتے ہی نہیں؟ بس پوری سورت میں جگہ جگہ یہی روح کارفرما ہے کہ تم سوچنے کی قوتوں سے کیوں کام نہیں لیتے۔

یہی سلسلہ کلام جب شباب پر آتا ہے تو اس موقع پر مثبت دعوت سامنے رکھی جاتی ہے جس کی طرف بلانا سورت کا اصل مقصد ہے یہ کہ "وقال اللّٰہ لاتتخذوا الٰہین اثنین ج انما ھو الٰہ واحد ج فایای فارھبون ہ ولہ ما فی السمٰوٰت والارض ولہ الدین واصبًا ط افغیر اللّٰہ تتقون ؟

دعوت یہ تھی کہ ایک سے زیادہ "الٰہ" نہ تسلیم کرو۔ اللہ تو ایک ہی الٰہ ہے۔ پس مجھی سے ڈرو۔ اسی کی ملکیت میں ہیں زمین و آسمان کی ساری موجودات اور اُسی کا عمل دوامی ہے۔ تو پھر اللہ کے سوا آخر تم کو اور کس کے جبروت سے خوف و مرعوبیت لاحق ہے؟

اس کے بعد حسبِ ذیل باتیں ایک تسلسل سے آئی ہیں :-

(۱) تمہارے قبضے میں جو کچھ نعمتیں ہیں سب اللہ کی عطا کردہ ہیں، اور جب تم کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی کے حضور فریادی ہوتے ہو۔

[illegible] ہیں۔

(ج) اور ان کے لئے آسمانی علم سے آزاد ہو کر اپنی زندگی میں سے نرالے [illegible] ہو۔

(د) تم بیٹیوں سے نفرت کرتے ہو اور اللہ کے لئے فرشتوں کو بیٹیاں قرار دیتے ہو

(ہ) اس معاملے میں لوگوں کی اصلاح کے لئے ہم نے پیغمبر رسول بھیجے لیکن وہ شیطان کی خوش خیالیوں میں مگن رہے۔

(س) تمہارے لئے چوپایوں میں نشاناتِ عبرت ہیں، جن کے بدن میں لہو اور گوبر ہونے کے ساتھ ساتھ تمہاری مرغوب غذا دودھ بنتا ہے۔

پھر کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں میں سامانِ بصیرت ہے جن سے ضروریات بناتے ہو۔

پھر خدا ہی نے شہد کی مکھی کو وحی کے ذریعے یہ بصیرت دی ہے کہ وہ چھتہ بناتی ہے اور رنگارنگ قسم کے پھول پھول کے رس سے جمع کرتی ہے۔

پھر وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں خلق کیا اور پھر تم میں سے بعض پر جوانی میں اور بعض پر ارذلِ عمر میں داخل کرنے کے بعد موت وارد کرے گا۔

(اب اس سلسلۂ کلام میں مارکسی حضرات کی آیتِ مساوات آتی ہے)

(ص) اور اللہ ہی نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق کے معاملے میں فضیلت دی ہے۔ تو پھر جن کو فضیلت دی گئی ہے وہ اس بات پر ہرگز آمادہ نہیں ہو سکتے کہ اپنے حصہ کا رزق اپنے غلاموں کے حوالے کردیں اور اس طرح باہم برابر ہو جائیں ——— پھر کیا وہ اللہ کی نعمتِ رزق کے منکر ہیں؟

ذرا غور فرمایئے کہ اوپر کے سلسلۂ کلام کی مناسبت سے موضوع سے نکلتا ہوا مفہوم اس مقام پر کیا منطبق ہوتا ہے؟

صرف یہ کہ جیسے آقا اپنے غلام کو اپنا شریک نہیں ٹھہرا سکتا اور اپنی املاک کا اسے ساجھی [illegible] اگر یہ شریک [illegible] زندگی کے [illegible]

ہے ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل ہے۔ اس تفاوت کا منشا یہ ہے کہ لوگ باہم ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ گویا تفاوت[1] ہی موجب ہے تعاون و تبادلہ کا، ورنہ انسانی زندگی اجتماعی اور تمدنی نہ ہوتی بلکہ انفرادی اور حیوانی ہوتی۔ کوئی انسانی تمدن تفاوتِ رزق سے بالکل پاک نہیں ہو سکتا، چنانچہ مارکس کے مومنین بھی جب اپنا عملی معاشرہ قائم کرنے چلے تو ان کی خیالی جنتوں کے سارے محل اور مینار زمین پر آ رہے۔

اگر مساواتِ رزق کا اصول کوئی شرعی وجوب اپنے ساتھ رکھتا تو نبی صلعم اور حضرت عثمانؓ میں تفاوتِ رزق نہ ہوتا، اور ہوتا تو حضرت عثمانؓ کا مقام نبی صلعم کے اولیاء مقربین میں نہ ہوتا بلکہ مغضوبین میں ہوتا۔

دورِ نبوت اور خلافتِ راشدہ کی سوسائٹی میں تفاوتِ رزق کی فطری حالت علانیہ قائم رہی اور کسی کو یہ گمان بھی نہ گزرا کہ آیت "واللہ فضل بعضکم" کی رو سے یہ نظام کفرانِ نعمت کا نظام ہے۔ نہ مسلم رائے عامہ نے اس نظام کو باطل سمجھ کر اس کے خلاف کوئی تردیدی اقدام (REVOLT) کیا، بلکہ محققین و مفکرینِ امت کا اس معاملے میں اجماع ہے کہ وہ نظام نظامِ حق تھا۔

روکا جس چیز کو گیا وہ یہ تھی کہ تفاوتِ رزق کو غیر فطری (منکر) ذرائع سے فطری معیار سے زائد حد تک مصنوعی طریق سے بڑھایا نہ جائے، چنانچہ املاک پر اسلام کے اخلاقی حدود جاری رہے اور تفاوتِ رزق اپنی حدِ اعتدال پر قائم رہا۔ بعد میں دورِ ملوکی نے اسے فطری سطح سے ہٹا کر غیر فطری حدود تک وسیع کر دیا۔

ایک اور استدلال مساواتِ ملکیت کے حق میں "خلق لکم ما فی الارض جمیعاً" سے بھی کیا جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے اس پر پوری نوعِ انسانی کا مساویانہ حقِ انتفاع قائم فرمایا ہے اور اس کی ملکیت تمام افراد کے لئے مساوی ہونی چاہیئے، جس کے لئے واحد عملی صورت قومی ملکیت کی ہو سکتی ہے "ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین" سے بھی یہی استدلال کیا جاتا ہے۔

---

[1] یہ فطری تفاوت کا ذکر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نعمت قرار دیا ہے، لیکن ناجائز استحصال سے جو غیر فطری تفاوت انسانی معاشرہ میں رونما ہو جایا کرتا ہے وہ چیزے دیگر ہے اور اس کی روک تھام کے لئے حصولِ دولت، صرفِ دولت اور [illegible] کے لئے خاص ضابطہ اسلام نے مقرر کر دیا ہے۔

بہر حال یہ بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ تم انسانوں ہی کی خاطر موجودات کے یہ اہم رکن یعنی زمین کی ضروریات پوری کرنے کے لئے "ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند" ساری دُنیا تمہارے لئے اور تم اللہ کے لئے ۔ اس کے معنی کسی طرح بھی یہ نہیں نکالے جا سکتے کہ تمام اموال و املاک پر ملکیت پوری نوع کی تسلیم کی جانی چاہیے یا یہ کہ جتنی املاک ایک آدمی کے پاس ہوں اتنی ہی ہر دوسرے شخص کے پاس بھی ہونی چاہئیں ۔ ایک کے پاس کپڑا ہو تو سب کے پاس کپڑا ہونا، اور ایک کو مکان ملے تو ہر فرد کے قبضے میں ایسا ہی مکان ہونا چاہیے ، ایک موٹر گاڑی خریدے تو بقیہ تمام لوگوں کو سائیکلیں ، بیل گاڑیاں ، تانگے آگ میں جھونک دینے چاہئیں کہ لاؤ ہمیں بھی موٹر گاڑی دلواؤ ، ایک مالک زمین ہو تو دوسروں کو بھی اتنی ہی زمین ملے اور ایک کارخانہ کھولے تو دوسرے بھی ایسے ہی کارخانے کھول لیں ۔ یہ فضول خیال آرائی آخر کیسے ثابت ہو جاتی ہے ؟

دوسری بات آدم و حوا کو ارضی زندگی کی سرحد پار کراتے ہوئے یہ کہی گئی کہ دیکھو تمہاری جنت سے علیحدگی عارضی ہے اور یہ تمہارا زمینی دور آزمائش کا ہے ۔ وہاں تمہیں ایک محدود زمانے کے لئے قیام کرنا ہے اور اسباب قوی سے تا مدت حیات استفادہ کرنا ہے ۔ اسی لئے دوسرا جزء کلام کا یہ ہے کہ فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ۔ میں جو ضابطہ مقرر کروں اس پر چلو گے تو زندگی میں امن رہے گا اور آخرت میں حزن و ملال سے بچ سکو گے ۔

بہر حال "مساوات رزق" یا "مساوات ملکیت" کا نظریہ اسلام کے فریم میں لاکے فٹ کرنا ہو تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ پورے قرآن کو اس کی اپنی کسی ایک ہی آیت سے منسوخ کر ڈالئے ، پورے ذخیرۂ احادیث کے خلاف کسی ایک روایت کو حجت بنا دیجئے ، اصحاب نبی کی پوری سوسائٹی سے کسی ایک صحابی کے قابل تاویل قول کی ٹکر پر لا دیجئے ، پوری تاریخ کی تردید کسی ایک جزئی واقعہ سے کر ڈالئے ۔

[illegible] مساوات ملکیت کے معنی استعمال کرتے ہیں ۔

آپ سوچئے کہ اگر دنیا کے موجودہ نظام تجارت کو ختم کر کے اسلام بالکل نئے سرے سے مساوات ملکیت کا [illegible]

[illegible]

معلوم کیا تو وضاحت سے گفتگو کی، اُس نے پچھلے کا سسٹم قائم کیا تو اس کے لئے پورا استدلال کیا، اس نے کبھی ترلیست کا انتظام بدلنا چاہا تو کھری کھری سنائیں، لیکن اس اسلام کو ملکیت کے بارے میں کس چیز نے مجبور کیا کہ وہ بات کہنے تو ابہام کے پردوں میں لپیٹ کر کہے؟ دنیا کی ایک اہم ترین بنیادی تبدیلی کی علمبرداری اور پھر کلام اشارات و کنایات میں؟ ـــــــ یہ صورت ہماری عقل سے بالا تر ہے۔

مارکس تو اپنے نظریئے کے نئے پن کی وجہ سے مجبور ہوا کہ دو صفحے کے صفحے قومی ملکیت، نظریہ قدر زائد اور مساواتِ ملکیت کے موضوعات پر کالے کر دے لیکن اللہ تعالیٰ اور نبی صلعم ہی کو یہ ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ ایک بنیادی تبدیلی کے لئے کھلا کھلا تفصیلی استدلال کریں؟

یہ ساری باتیں سوچی جائیں تو ہمارے متجددین کرام کے دعوے اور استدلال مہملات معلوم ہوتے ہیں۔ صاف نظر آتا ہے کہ قرآن اور ذخائرِ دین ان کے نزدیک مذاق کا سامان ہیں، دراں حالیکہ ان کی پوری زندگیاں خود اس قرآن سے آزاد واقع ہوئی ہیں۔ قرآن سے بے نیاز ہو کر جینے والوں کو کیا حق کہ وہ قرآن کے اسرار و رموز پر دخل دیں۔

(باقی)

بھارت کی لادینی ریاست میں اقامتِ دین کا علمبردار

سہ روزہ "الانصاف" الہ آباد

بھارت میں اقامتِ دین کے علمبردار اسلام کے پیغام کو کس طرح اور کن حالات میں اس سرزمین کے باشندوں تک پہنچا رہے ہیں اور اس سے کیا اثرات و نتائج مرتب ہو رہے ہیں؟ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو سہ روزہ "الانصاف" الہ آباد کا مطالعہ فرمائیے۔

علاوہ ازیں "الانصاف" میں آپ کو اسلامی ادب کے شہ پارے ــ واقعاتِ عالم پر بے لاگ تبصرے اور تین دن کی دنیا بھر کی خبروں کے خلاصے ملیں گے۔

سالانہ چندہ بارہ روپے ششماہی چھ روپے سہ ماہی تین روپے ــ پتہ دفتر الانصاف نمبر ۱۰۲ خلد گنج الہ آباد (یوپی)

نوٹ:۔ پاکستانی خریدار ابنامہ رقم ایڈیٹر کوثر لاہور کے نام ارسال فرما کر ہمیں مطلع فرمائیے۔

رسائل و مسائل

اسلام میں مجالس کے ضبط و نظم کے چند پہلو

سوال:

ہمارے شہر کی جماعت اسلامی نے آپ کی تشریف آوری پر مختلف ملاقاتوں کے وفود بنا کر ہر ایک کے لئے وقتِ ملاقات مقرر کر دیا تھا۔ ایک شخص ایک وفد کے ساتھ ملاقات کو حاضر ہوا اور اس نے وقت ختم ہو جانے کے بعد دوسرے وفود کی ملاقاتوں کے دوران میں بھی بیٹھے رہنا چاہا، تاکہ وہ مختلف مسائل و معاملات پر آپ کے خیالات سنے، لیکن منتظمین نے اس کی درخواست ردّ کرتے ہوئے یہ کہا کہ اگر ہر شخص یہی چاہنے لگے گا تو کام نہیں چل سکتا۔

اس طرزِ عمل نے آپ کی طرف جھکنے والوں کا راستہ روک دیا ہے۔ ہم آپ کے ہاں سیّد المرسلینؐ کا فقر تلاش کرنے آتے ہیں، نہ کہ فقر نما شہنشاہی کی نمائش دیکھنے اور ذلت کے دھکے کھانے کے لئے!

داعی کی حیثیت سے آپ کے لئے ضروری تھا کہ ساری ملاقاتیں اور گفتگوئیں کھلے اجلاس میں فرماتے اور ہر شخص کے لئے اذنِ عام ہوتا کہ وہ مجالس میں شریک ہو۔

اس سے پہلے میرے جذبات کو ایک اور موقع پر ٹھیس لگ چکی ہے۔ مجھے اگست میں ضلعی امیر جماعت کا حکم پہنچا کہ میں لوگوں تک یہ اطلاع پہنچا دوں کہ جماعت کے فلاں مقرر تشریف لا رہے ہیں لوگوں نے مجھ سے کہا کہ کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ نام اور کا بتا رہے ہو، اور آ جائے کوئی اور! میں نے ان کو یقین دلایا کہ یہ جماعت ایسی نہیں اور اس طرح کے اعلان اس کی طرف سے نہیں ہوا کرتے، لیکن میری بدقسمتی کہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ اچانک یہ اطلاع ملی کہ صاحبِ مذکور بیمار ہونے کی وجہ سے نہیں آ رہے۔ اب مجھے زمین جگہ نہ دیتی تھی کہ میں اس میں گڑ جاتا۔

اس طرح کی توقعات کی شکستگی کی وجہ سے مجھے جماعت کی منزل اور اس کے طریق کار میں شک پیدا ہو گیا ہے۔

جواب :

سوال بہت ہی سرسری قسم کا تھا اور اس کا جواب دو حرفی دیا جانا چاہیے تھا، لیکن چونکہ یہ ایک خطرناک مرض کا پتہ دیتا ہے اور دین (خصوصاً سنت) کے بہت ہی غلط تصور کو سامنے لاتا ہے، لہٰذا کسی قدر توضیح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں غیر منظم زندگی بسر کرتے کرتے اب اسلام کے بارے میں کچھ اس طرح کا تصور قائم ہو گیا ہے کہ نظم اور باقاعدگی کی دینی قدر و قیمت کچھ بھی باقی نہیں رہی، بلکہ آج جو کوئی انھیں ٹریننگ اور رہبر کے اسلوب سے ہٹا کر نظم و ضبط سکھانا چاہے تو اسے وہ تشبّہ بالاجانب کا مجرم سمجھتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی افسوسناک صورتِ حال ہے کہ غیر منظم زندگی کو سنتِ ختم المرسلین کا نام دیا جائے اور انتشار بھرے اجتماعات کو فقرِ محمدی کی تعریف میں داخل کیا جائے، جیسے بعض جہلاء نے کپڑا باندھے بغیر نہانے کو (نعوذ باللہ) محمدی اشنان کا نام دیا ہے! اس طرح کی باتوں میں دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غیر ارادی صورت میں یہ بہتان باندھا جاتا ہے کہ دُنیا کے اس سب سے بڑے نمونے کے انسان کے ہاں کسی ترتیب و انضباط اور تقسیم کار اور تقسیم اوقات کا سرے سے گزر ہی نہیں تھا۔

جس موقعے کا سائل نے ذکر کیا ہے کم سے کم اس کے تقاضے محسوس کئے ہوتے کہ ایک عارضی قیام کے دوران میں ایک شخص کو گوناگوں فرائض انجام دینے ہیں۔ اس کے پیشِ نظر جہاں دعوت پہنچانا تھا وہاں جماعت کے نظم کا جائزہ بھی لینا تھا، کارکنوں کی مشکلات کو معلوم کر کے انھیں حل کرنا بھی تھا، ان کی کمزوریوں اور کوتاہیوں پہ گرفت بھی کرنی تھی اور انھیں دوسری جماعتوں اور تحریکوں کے بارے میں پالیسی بھی بتانی تھی۔ پھر ایسے موقعوں پہ طبقۂ علماء سے الگ خطاب کی ضرورت ہوتی ہے، علمی و ادبی کام کرنے والے ورکرز کو الگ پروگرام مہیا کرنا ہوتا ہے۔ پھر بعض لوگوں سے علیحدگی میں گفتگو کرنی پڑتی ہے اور بعض کے نجی مسائل کے بارے میں دین کے احکام واضح کرنے ہوتے ہیں ——— لیکن آپ فرماتے ہیں کہ یہ سارے کام ایک مجلسِ عام میں ہونے چاہئیں جس میں ہر شخص کو اذنِ عام ہو۔ ذرا غور تو فرمائیے کہ کیا اس طرح کوئی ایک کام بھی مقررہ وقت میں نپٹایا جا سکتا ہے؟ ایسے مواقع پر تقسیمِ اوقات اور تقسیم کار کا اصول اختیار کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ یہ سنتِ رسول کے خلاف ہے۔ ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ سنت کا یہ تصور آپ نے لیا کہاں سے ہے کہ وہاں ہر کام ہر وقت ہوتا رہتا تھا اور ہر مجلس لازماً عام ہی ہوتی تھی؟ خدا جانے کس صاحبِ ذوق سے آپ نے حدیث و سنت کا درس لیا ہے۔

سنت کی وسعتوں میں تو خیر بعد میں جائیے، پہلے آپ قرآنِ کریم ہی سے مجالس کے بارے میں نظم کے تقاضوں کو معلوم فرمائیے۔ کم سے کم ذیل کے احکام و آداب پر آپ کی نظر ہونی چاہئے تھی:۔

(۱) نمازِ جمعہ کے اجتماع کے بارے میں قرآن نے خاص طور پر یہ حکم دیا کہ "اذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض" یعنی نماز کی کارروائی کے ختم ہوتے ہی منتشر ہو جاؤ اور جاکر اپنے اپنے معمولات میں لگ جاؤ۔ یہ حکم آخر دیا کیوں گیا؟ محض اس لئے کہ نمازِ جمعہ کے بعد ملاقاتیوں کا ہجوم نبی صلعم کو مجبور کر دیتا ہوگا کہ وہ دوسرے فرائض کی ادائی اور پہلے سے طے شدہ پروگراموں کی تکمیل پر متوجہ نہ ہو سکیں، بلکہ مشتاقانِ زیارت اور دلدادگانِ مجلس آرائی کے شخصی جذبات کی تسکین میں لگے رہیں۔ حالانکہ ایک ایسی ہستی جو ایک پورے معاشرے کی انچارج اور ایک ملک گیر تحریک کی عناں بردار تھی اس کے اوقات بہت سے اہم مقاصد کے لئے وقف ہونے تھے۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ نمازِ جمعہ (اور اسی طرح دوسری نمازوں) کے خاتمے پر منتشر ہو جایا کریں، بجز اس صورت کے کہ کوئی ضروری معاملہ ہو یا نبی صلعم خود مجلس کو جاری رکھنا چاہیں۔

(۲) یہ ہدایت نماز ہی تک محدود نہ رہی، بلکہ مسلمانوں کو یہ بھی سکھانا ضروری ہوا کہ نبی صلعم جب انہیں اپنے ہاں کھانے پر بلائیں تو ان کو کھانے کے بعد بیٹھ کر "حدیثِ مائدہ" میں نہ لگ جانا چاہئے، کیونکہ اس طرح رسول اللہ کو مروتاً بیٹھنا پڑے گا، حالانکہ آپ پر مصروفیات اور ذمہ داریوں کا بار بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ صاف صاف کہا گیا کہ کھانے سے فارغ ہوتے ہی گھروں کو چلے جایا کرو۔

(۳) پھر سورۂ نور میں فرمایا کہ "واذا کانوا معہ علیٰ امر جامع لم یذھبوا حتیٰ یستاذنوہ" یعنی خدا اور رسول پر ایمان لانے والے جب رسول اللہ کی خدمت میں کسی اجتماعی ضرورت کے لئے مجتمع ہوتے ہیں تو وہ بدوں اجازت پورا کام ختم ہونے سے پہلے چلے نہیں جاتے۔ یہ ان مجالس کا ذکر ہے جو تفریحاً نہیں بلکہ کسی "امرِ جامع" کے لئے منعقد ہوں۔ ان مجالس میں وہی آئے جس کا تعلق کسی پیشِ نظر "امرِ جامع" سے ہو اور اس

مرجامع" کے بارے میں کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل کارروائی کے دوران میں کوئی اٹھ کر نہ جائے لیکن جب اس مرجامع کی کارروائی ختم ہوجائے تو پھر لوگوں کو اسی طرح منتشر ہوجانا چاہیئے جس طرح جمعہ کے "امرجامع" اور ضیافت کے "امرجامع" کے بارے میں حکم ہے۔ علاوہ بریں چونکہ ہر امرجامع کا تعلق ہر شخص سے ہونا ضروری نہیں، لہٰذا یہ بات ازخود واضح ہے کہ کسی خاص "امرجامع" کے لئے شرکتِ اجلاس وہی لوگ کریں جو اس سے متعلق ہوں اور جن کو ایک خاص وقت کے لئے دعوت یا اذن ملے۔

(۴) قرآن میں آں حضور صلعم کے ساتھ علیٰحدگی میں گفتگو (نجویٰ) کرنے کے بارے میں بھی ہدایات وارد ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک بڑا کام کرنے والوں کو اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ لوگ علیٰحدگی میں ان کے سامنے اپنی رپورٹیں پیش کریں اور اپنی مشکلات میں مشورہ چاہیں، یا تنہائی میں ان سے بازپرس کرنی پڑے۔ ایسے موقعوں کے لئے شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ کسی علیٰحدگی کی گفتگو کو سننے کی کوشش نہ کی جائے اور نہ علیٰحدگی کی مجالس میں گھسنے کے لئے تگ و دو کی جائے۔

واضح رہے کہ اہم معاملات اور اطلاعات کے متعلق قرآن کا یہ حکم کہ ان کو عام طور پر نشر نہ کیا جائے بلکہ صرف متعلقہ اربابِ امر تک انھیں پہنچانا چاہیئے جو ان کے بارے میں رائے قائم کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں، خود اس بات کا داعی ہے کہ بعض ملاقاتوں اور مجالس کو مخصوص کرنا ضروری ہوتا ہے۔

(۵) قانونِ استیذان یوں تو براہِ راست گھروں میں داخلہ سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اوپر کی سطور بتاتی ہیں کہ دفتروں، کارخانوں، سرکاری اداروں اور خصوصیت سے مجالسِ مشاورت میں داخلے کے لئے بھی اس اسلامی ادب کو اختیار کرنا چاہیئے۔ اب اگر کسی خاص موقع پر بہت سے ملاقاتیوں کو منظم طریق پر تقسیم اوقات کر دی جائے تو یہ عین اسی قانون کے تحت ہوگا۔ لیکن فرض کیجئے کہ ایک سلسلۂ مجالس میں اس سرے سے اس سرے تک شرکت کے لئے کوئی شخص خواہش کرتا ہے اور اس کے استیذان کا جواب اثبات میں نہیں ملتا تو قرآن نے اسے یہ سبق دیا ہے کہ اذن نہ ملنے پر وہ بغیر کسی ناخوشگوار تاثر کے لوٹ جائے۔

(۶) سب سے آخر میں ہم اس قطعی حکم کو بیان کرتے ہیں جو مجالس کے بارے میں مقرر کر دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح اللہ لکم ۵ واذا قیل انشزوا فانشزوا۔

یعنی جب کسی مجلس عام کا موقع ہو اور تم سے چاہا جائے کہ مزید آدمیوں کو داخل ہونے کا راستہ اور بیٹھنے کے لئے جگہ دو تو سکڑ سمٹ جاؤ اور مجلس کا حلقہ وسیع ہونے دو، لیکن دوسری طرف جب مجلس کو ختم کرنے کے لئے یا کسی نئی مجلس کو طلب کرنے کے لئے تم کو اشارہ ملے تو پھر خوشدلی کے ساتھ اٹھ جاؤ۔

براہِ کرم ان ہدایات کو سامنے رکھ کر سوچئے کہ ان کی ضرورت پیش کیوں آئی تھی؟ —— محض اس لئے کہ پورا عرب بدنظمی اور انتشار کی زندگی کا پرانا عادی تھا۔ ایک ایک شخص اپنے جذبات کے آبگینے ہوئے تھا جن کو اجتماعی مفاد کا ہر تقاضا ٹھیس لگا دیتا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان کو غیر منظم زندگی بسر کرنے کی کھلی چھٹی حاصل رہے۔ ان کا بھی جی چاہتا تھا کہ وہ اگر کسی مجلس میں آ بیٹھیں تو گھنٹوں بیٹھے رہیں، ہر گفتگو مشورے میں ان کو شامل ہونے کا موقع ملے، وہ رسول اللہ صلعم کا جو وقت بھی لینا چاہیں لے سکیں اور بحث میں شرکت کا اذنِ عام انھیں حاصل رہے، لیکن قرآن نے ان کے جذبات کے آبگینوں کی پروا کئے بغیر ان کو ڈسپلن میں کس دیا، انھیں باقاعدگی کی تعلیم دی اور تقسیم اوقات اور تقسیم کار کا سبق پڑھایا۔ یہ احکام و آداب خود بتاتے ہیں کہ عربوں میں مجالس کے بارے میں کن کن پہلوؤں سے بے ڈھنگا پن موجود تھا، اس پر گرفت کر کے اصلاح کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ یہ عربوں کی سعادت تھی کہ انھوں نے تربیتِ نظم پر ناک بھوں چڑھانے کے بجائے اپنے آپ کو نئے سانچے میں ڈھلنے کے لئے پیش کر دیا۔

شریعت میں جو چیز منع ہے وہ صرف یہ ہے کہ ملاقات کرنے والوں اور اپنے معاملات میں مشورہ لینے والوں یا اسلام کا حکم معلوم کرنے والوں پر بطور کبر اپنے دروازے بند نہ کئے جائیں، نہ ان کو ٹھاٹھ کے مظاہروں سے مرعوب کیا جائے، اور نہ اُن سے اختلاط رکھنے کو اپنے لئے وجہ ذلت سمجھا جائے۔ اگر شخص کے طرزِ عمل میں ایسی کوئی چیز نہیں پائی جاتی، لیکن وہ قرآن کے مذکورہ بالا احکام کے عین مطابق ایک جا قیام کے موقع پر اپنے بے شمار ملاقاتیوں کے لئے ایک نظم اس لئے مقرر کرتا ہے کہ تمام ضروری کام بھی انجام پا جائیں اور کوئی ملاقات سے محروم بھی نہ رہے تو کس سنتِ رسول اور کس معقولیت کی بنا پر اس پر آپ نے "فقیرانہ شہنشاہی" کا پھبتا ہی فقرہ چست فرما دیا اور ذرا سی رنگ آمیزی سے منتظمین کو "دربان" کی تعریف میں داخل کر ڈالا۔

دوسرا معاملہ جو آپ نے پیش فرمایا ہے اس پر بھی آپ نے جذباتیت سے الگ ہوکر غور نہیں کیا۔ جماعت اسلامی یہ کبھی نہیں کرتی کہ وہ دانستہ کسی مقرر کے نام کو اشتہار میں استعمال کرے، درآنحالیکہ تقریر کسی دوسرے کو کرنی ہو لیکن اس کے ساتھ وہ کیسے گارنٹی دے سکتی ہے کہ اس کے پروگرام مشیت کے تصرفات سے بالاتر ہیں اور وہ جس مقرر کا نام اشتہار میں دے دے وہ بیماریوں اور ناگہانی حادثات کے چنگل سے آزاد رہے گا۔ اب جو لوگ خواہ مخواہ جوشیلے پن کی وجہ سے ایسی گارنٹی لوگوں کو اپنی طرف سے دیتے پھریں، ظاہر ہے کہ ان کو مایوسی اور شرمساری سے دوچار ہونے کے مواقع پیش آسکتے ہیں۔

آخری گزارش یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنے کندھوں پر ایسے نازک جذبات کا شیشہ خانہ لاد کر تحریکِ اسلامی کا کھیل کھیلنے کے لئے میدان کا رخ کیا ہو، ان کو تو ہر قدم پر حادثہ ہائے جانکاہ پیش آئیں گے۔ یہ ایک عجیب نمونۂ ایمان ہے کہ آدمی کے مزاج اور اس کی سمجھ بوجھ کے خلاف ذراسی کوئی صورت پیش آئی اور اسے جذبات کا دورہ پڑا اور وہ چلتے چلتے ٹھٹک گیا کہ بس اب مجھے مقصد اور طریقِ کار میں شک پیدا ہوگیا ہے۔ بھائی! اس بساط پر چینی اور بلور کے مہرے کام نہ دیں گے؟ (ن۔ص)
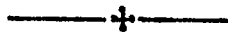
نیکی کی راہ میں مشکلات کیوں؟

سوال:

آج سے ایک سال قبل دُنیا کے جملہ افعالِ بد سے دوچار تھا، لیکن دُنیا کی بہت سی آسانیاں مجھے حاصل تھیں۔ میں نہ کسی کا مقروض تھا اور نہ منت کش۔ اور اب جب کہ میں ان تمام افعالِ بد سے تائب ہوکر بھلائی کی طرف رجوع کرچکا ہوں، دیکھتا ہوں کہ ساری فارغ البالی ختم ہوچکی ہے اور روٹی تک سے محروم ہوں۔ سوال یہ ہے کہ اچھے اور نیک کام کرنے والوں کے لئے دُنیا تنگ کیوں ہوجاتی ہے، اور اگر ایسا ہے تو لوگ آخر بھلائی کی طرف کاہے کو آئیں گے؟ یہ حالت اگر میرے لئے آزمائش ہے کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑے تو یہ منزل میں کس طرح پوری کروں گا؟

میں اس مسئلے میں بہت بے چینی محسوس کر رہا ہوں!

جواب:

آپ جس صورتِ حال سے دوچار ہیں اس میں میری دلی ہمدردی آپ کے ساتھ ہے، اور میں آپ کا د[illegible] دکھانا نہیں چاہتا، لیکن آپ کی بات کا صحیح جواب یہی ہے کہ آپ فی الواقع آزمائش ہی میں مبتلا ہیں، اور اس [illegible] سے بخیریت گزرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ آپ خدا اور آخرت کے متعلق اپنے ایمان کو مضبوط کر کے صبر [illegible] ساتھ نیکی کے راستے پر چلیں۔

آپ کو اس سلسلے میں جو الجھنیں پیش آ رہی ہیں ان کو رفع کرنے کے لئے میں صرف چند اشارات کرنے [illegible] اکتفا کروں گا۔

بدی کی راہ آسان اور نیکی کی راہ مشکل ہونے کی جو کیفیت آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں اس کی ایک بڑ[illegible] وجہ یہ ہے کہ ہمارا موجودہ اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی ماحول بگڑا ہوا ہے۔ اس ماحول نے بکثرت ا[illegible] اسباب پیدا کر رکھے ہیں جو برے راستوں پر چلنے میں انسان کی مدد کرتے ہیں اور بھلائی کی راہ اختیار کرنے وال[illegible] کی قدم قدم پر مزاحمت کرتے ہیں۔ اگر خدا کے صالح بندے مل کر اس کیفیت کو بدل دیں اور ایک صحیح نظامِ زند[illegible] ان کی کوششوں سے قائم ہو جائے تو انشاء اللہ نیکی کی راہ بہت کچھ آسان اور بدی کی راہ بڑی حد تک مشکل ہو جا[illegible] ایسا وقت آنے تک لامحالہ ان سب لوگوں کو تکالیف و مصائب سے دوچار ہونا ہی پڑے گا جو اس بگڑے ماحول میں راہِ راست کو اپنے لئے منتخب کریں۔

تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ نیکی بجائے خود اپنے اندر دشواری کا ایک پہلو رکھتی ہے اور اس کے برعکس بدی کی [illegible] میں ایک پہلو آسانی کا مضمر ہے۔ آپ بلندی پر چڑھنا چاہیں تو بہرحال اس کے لئے کسی نہ کسی حد تک محنت کرنی ہی پڑے گ[illegible] اور کتنا ہی سازگار بنا دیا جائے لیکن پستی کی طرف گرنے کے لئے کسی کوشش اور محنت کی ضرورت نہیں، ذرا اعصاب کی بندش [illegible] کر کے لڑھک جائیے پھر تحت الثریٰ تک سارا راستہ بغیر کسی سعی و محنت کے خود طے ہو جائے گا۔

آپ پوچھتے ہیں کہ اگر اچھے کام کرنے والوں کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے تو دنیا اس طرف رُخ ہی کیو[illegible] کرے گی؟ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اگر اچھے کام کرنے والوں کو دنیا کی تمام سہولتیں اور آسائشیں بہم پہنچ[illegible]

ہوجاتے کام کرنے والوں پر آفتیں ٹوٹ جایا کرتیں تو پھر کون ایسا احمق تھا کہ برائی اختیار کرتا اور بھلائی سے منہ موڑتا۔ پھر تو کامیابی آسان اور ناکامی دشوار ہوتی، جزا سستی اور سزا مہنگی ہو جاتی، انعام مفت ملتا اور عذاب پانے کے لئے محنت کرنی پڑتی۔

کیا اس کے بعد دُنیا کی اس امتحان گاہ میں انسان کو بھیجنے کا کوئی فائدہ تھا؟ اور کیا اس کے بعد نیک انسانوں کی نیکی کسی قدر و قیمت کی مستحق قرار پا سکتی تھی ——— جبکہ ان کو نیکی کے راستے طے کرنے کے لئے قالین بچھا کے دیئے گئے ہوں؟ ——— درحقیقت اگر ایسا ہوتا تو جنت کے بجائے جہنم کی طرف جانے والے زیادہ قابلِ قدر ہوتے!۔

آپ کا یہ سوال ایک اور لحاظ سے بھی عجیب ہے۔ آپ شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ لوگوں کے راہِ راست پر آنے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی اپنی غرض اٹکی ہوئی ہے! اس غلط فہمی کی بنا پر آپ پوچھتے ہیں کہ اگر راہِ راست مشقتوں اور آزمائشوں سے بھری ہوئی ہے تو دنیا اس راہ پر آئے گی ہی کیوں۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ راہِ راست اختیار کرنے میں لوگوں کا اپنا فائدہ ہے، نہ کہ خدا کا، اور اس کے خلاف چلنے میں لوگوں کا اپنا نقصان ہے نہ کہ خدا کا! خدا نے انسان کے سامنے دو صورتیں رکھ دی ہیں اور اسے اختیار دے دیا ہے کہ ان میں سے جسے چاہے انتخاب کر لے۔ ایک یہ کہ وہ اس زندگی کے چند روزہ مزوں کو ترجیح دے کر آخرت کا ابدی عذاب قبول کر لے، دوسرے یہ کہ وہ آخرت کی بے پایاں راحت و مسرت کی خاطر ان تکلیفوں کو گوارا کرے جو دین و اخلاق کے ضابطوں کی پابندی کرنے میں لامحالہ پیش آتی ہیں۔ لوگوں کا جی چاہے تو وہ پہلی صورت کو پسند کریں۔ اگر ساری دُنیا مل کر بھی اپنے انتخاب میں یہ غلطی کر گزرے تو خدا کا کچھ نہ بگاڑے گی۔ خدا اس سے بے نیاز ہے کہ لوگوں کے صحیح انتخاب راہ سے اس کا کوئی مفاد وابستہ ہو۔

ہمیشہ سفر میں رہنے والوں کے لئے حکمِ قصر

سوال[1]: سفر کی حالت میں نماز کو قصر کرنا چاہئے جبکہ اس رخصت سے فائدہ اٹھانا بعض کے نزدیک تو

---

[1] سائل کی حسبِ خواہش سوال، وجواب کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور انھوں نے اس پر ذیل کے الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کی: "جو لوگ اپنی ملازمت یا کاروبار کے سلسلے میں دائماً سفر میں رہتے ہیں وہ مسافر کی تعریف سے خارج نہیں ہو جاتے اور نہ ان رعایات سے محروم کئے جا سکتے ہیں جو شریعت نے مسافروں کے لئے رکھی ہیں"۔ (ا۔ ص)

کفرانِ نعمت کی تعریف میں داخل ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس حکمِ خداوندی کا اطلاق پاکستانی بحری بیڑے (اور اس قسم کی دوسری ملازمتوں) پر بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ جہازوں میں رہن سہن گھر ہی کی طرح ہوتا ہے لیکن جگہ اور اوقات اور آزادی بڑی حد تک محدود ہوتی ہے۔ سات گھنٹے کے روزانہ کام کے بعد سپیشل ڈیوٹیاں بھی دینی پڑتی ہیں۔ پانی بھی احتیاط سے خرچ کرنا ہوتا ہے۔ طوفان کی حالت ہو تو پھر بالکل ایک اضطراری سی کیفیت ہوتی ہے۔

اندریں احوال حکم قصر سے فائدہ اٹھانا درست ہے یا نہیں؟

جواب:

بحری بیڑے (یا جن دوسری ملازمتوں اور پیشوں میں بالعموم حالتِ سفر موجود رہتی ہے) کے ملازمین جو ہمیشہ سفر پر رہتے ہیں، نماز قصر کرسکتے ہیں۔ اسی طرح افطارِ صوم بھی ان کے لئے جائز ہے۔ قرآنِ حکیم میں اس رعایت کو ان تمام لوگوں کے لئے بیان کیا گیا ہے جن کو "علیٰ سفر" کی حالت درپیش ہو، خواہ یہ حالت عارضی ہو خواہ دائمی! اس معاملے میں استثنا یا تخصیص بغیر کسی واضح دلیل اور قوی نص کے کرنا صحیح نہیں ہوسکتا۔ قرآن میں رخصت جس وسعت کے ساتھ دی گئی ہے اس کی تائید مصنف ابنِ ابی شیبہ کی مندرجہ ذیل روایت سے ہوتی ہے: قال حدثنا وکیع عن الاعمش عن ابراھیم قال جاء رجل فقال یا رسول اللہ انی رجل تاجر اختلف الی البحرین فامرہ ان یصلی رکعتین۔ یعنی ایک شخص نے (نماز کے بارے میں سوال کرتے ہوئے) رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں تاجر آدمی ہوں، بحرین کی طرف میری آمد و رفت رہتی ہے (تو میرے لئے کیا حکم ہے) اس پر رسول اللہ صلعم نے اسے (قصر کرکے) دو رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا۔

چنانچہ سوائے امام احمدؒ کے باقی ائمہ ثلاثہ کا یہی مسلک ہے۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: فتح القدیر، شرح ہدایہ)

(ع، خ، ع)

شفاعت کا صحیح تصور

سوال:

کسی مولوی صاحب نے ایک اشتہار[1] شائع کیا ہے جس میں آپ پر معتزلی اور خارجی ہونے کا فتویٰ لگایا گیا ہے بنائے فتویٰ یہ ہے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قیامت کے روز امت کے بارے میں شفاعت کے منکر ہیں۔ اس کا حوالہ ترجمان القرآن جلد ۲۶ عدد ۱، ۲، ص ۳۰ سے لیتے ہوئے آیت "جنگ کرو اہل کتاب میں ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے" کے تشریحی نوٹ کا دیا ہے۔ یہ نوٹ یوں ہے:۔ "وہاں کوئی سعی سفارش، کوئی فدیہ اور کسی بزرگ سے منتسب ہونا کام نہ آئے گا۔" اسی طرح تفہیمات حصہ دوم سے بھی کوئی حوالہ اسی قسم کا اخذ کیا ہے۔

براہ کرم آپ بیان فرمائیں کہ اہل سنت کا عقیدہ شفاعت کے بارے میں کیا ہے، نبی صلعم اپنی امت کی شفاعت کس حیثیت سے کریں گے، نیز آیا وہ ساری امت کی طرف سے شفیع ہوں گے؟

جواب:

خدا ان لوگوں کو نیک ہدایت دے جو دوسروں کی طرف غلط باتیں منسوب کر کے دنیا میں پھیلاتے ہیں اور ان کے اقوال کو ایسے معنی پہناتے ہیں جو قائل کے منشا کے خلاف ہوں۔ اگر الزام لگانے والے بزرگ کے دل میں خدا کا کچھ خوف ہوتا تو وہ اشتہار کی

---

[1] خدا ان مولوی صاحبان کو اپنی ذمہ داریوں کا فہم عطا کرے۔ ان کے سامنے پورے کے پورے اسلام کو دنیا بھر میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً الحاد اور مادہ پرستی کے علمبرداروں کے شدید حملے کا سامنا ہے، لیکن یہ عقیدۂ شفاعت پر مناظروں میں مصروف ہیں۔ ان کے سامنے ایک لادین طاقت پاکستان پر غیر اسلامی دستور مرتب کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہے لیکن یہ اس سے بے خبر اعتزال اور کفر کے فتوے لگانے کے داغی کھیل کھیل رہے ہیں۔ یہاں کا ابراو ران کی بیگمات کا اٹھایا ہوا طوفان بے پردگی ان کے حرموں کے دروازوں اور ان کے وعظ کے منبروں سے ٹکرا رہا ہے اور یہ کلامیات پر اشتہار بازی کر کے دل بہلا رہے ہیں۔ ان کے ہاں اونٹوں کو معافی ہے لیکن ان کی چھلنیاں مچھروں کو خوب چھانتی ہیں۔ کشمکش کے ایک فیصلہ کن لمحہ میں یہ وہ پارٹ ادا کر رہے ہیں جو الحاد اور بے دینی کے لئے موجب تقویت ہو سکتا ہے۔ اسلام دشمن عناصر کا یہ حال ہے کہ وہ دنیا و مرسوں جن کو اپنے مقصد زندگی کے لئے بانگ لگا رہے ہیں اور ادھر اسلام کی یہ فوج ہے جو خود تو کیا کرے گی کام کرنے والوں کا راستہ بھی روکنا چاہتی ہے۔ (ن۔ ص)

شفاعت سے پہلے مجھ سے لکھ کر پوچھ سکتے تھے کہ تیری ان عبارات کا منشا کیا ہے، اور شفاعت کے بارے میں تیرا عقیدہ کیا ہے۔ میری جن عبارتوں کا انھوں نے حوالہ دیا ہے ان میں سے ایک یہود و نصاریٰ کے غلط عقیدۂ شفاعت کی تردید میں ہے، اور اس کا اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ اس غلط عقیدے کی وجہ سے کس طرح اہلِ کتاب کا ایمان بالیوم الآخر باطل ہو گیا ہے جس کی وجہ سے قرآن میں ان پر الزام لگایا گیا وہ یوم آخر پر ایمان نہیں رکھتے۔ دوسری عبارت میں ان تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوتِ رسالت کے آغاز میں اہلِ مکہ کو خطاب کر کے ارشاد فرمائی تھیں۔ دونوں میں سے کسی مقام پر بھی اسلام کے عقیدۂ شفاعت کو بیان کرنے کا موقع نہ تھا ——— (آفرین ہے اعتزال و خارجیت کا فتویٰ نشر کرنے والے پر جسے قرآن سے تنا مس بھی نہ تھا کہ وہ یہ تو دیکھ لیتا کہ کس آیت کا موقع و محل کیا ہے اور خطاب کس سے ہے۔ ن۔م) ——— کیونکہ اسلام جس شفاعت کا قائل ہے اس کے مستحق اہلِ ایمان ہیں، نہ کہ کفار و مشرکین۔ ان دونوں گروہوں کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا ہے وہ وہی کچھ ہے جو قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ "اتقوا یوماً لا تجزی نفس عن نفس شیئاً ولا یقبل منہا عدل ولا تنفعہا شفاعۃ ولا ہم ینصرون ۔"

رہا اسلامی عقیدۂ شفاعت تو وہ قرآن و حدیث کی رو سے یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی عدالت میں شفاعت صرف وہ کر سکے گا جس کو اللہ اجازت دے اور صرف اس شخص کے حق میں کر سکے گا جس کے لئے اللہ اجازت دے۔ ملاحظہ ہو "یومئذٍ لا تنفع الشفاعۃ الا من اذن لہ الرحمٰن و رضی لہ قولاً" "لا تنفع الشفاعۃ الا من اذن لہ" "من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ"۔ اس قاعدے کے تحت نبی صلعم آخرت میں یقیناً شفاعت فرمائیں گے، مگر یہ شفاعت اللہ کے اذن سے ہوگی اور ان اہلِ ایمان کے حق میں ہوگی جو اپنی حدِ وسع تک نیک عمل کرنے کی کوشش کرنے کے باوجود کچھ گناہوں میں آلودہ ہو گئے ہوں۔ جان بوجھ کر خیانتیں اور بدکاریاں کرنے والے اور کبھی خدا سے نہ ڈرنے والے لوگ حضورؐ کی شفاعت کے مستحق نہیں ہیں۔ چنانچہ حدیث میں حضورؐ کا ایک طویل خطبہ مروی ہے جس میں آپ جرمِ خیانت کی شدت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز یہ خائن لوگ اس حالت میں آئیں گے کہ ان کی گردنوں پر ان کا خیانت سے حاصل کیا ہوا مال لدا ہوگا اور وہ مجھے پکاریں گے کہ یا رسول اللہ! اغثنی! (یا رسول اللہ! میری مدد فرمایئے) مگر میں جواب دوں گا کہ لا املک لک شیئاً، قد ابلغتک (میں تیرے لئے کچھ نہیں کر سکتا، میں نے تجھ تک خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا) ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب قسمۃ الغنائم و الغلول فیہا۔ (ا۔م)

مطبوعات

اسلام کا تمدنی و سیاسی نظام

از: نکہت شاہجہاں پوری۔

شائع کردہ: کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور۔

قیمت: مجلد مع رنگین گردپوش (۴۰۸ صفحات) ۵ روپے۔

ان موضوعات پر نئی نئی کتابوں کا مارکیٹ میں آنا بتا رہا ہے کہ ہماری ذہنی فضا میں تبدیلی آ رہی ہے اور اسلامی نظام زندگی پر لٹریچر کی مانگ میں اضافہ ہو رہا ہے۔

نکہت شاہجہاں پوری جانے پہچانے مصنف ہیں اور پہلے بھی انھوں نے اسلامیات پر چند کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی اس تازہ ترین تالیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی اسلام سے وابستگی خاصی گہری ہے اور اسلام و مادیت کی کشمکش کے اس فتنہ زا دور میں اسلام کی صداقت پر آپ کا ایمان قائم ہے۔ بنا بریں ہم کتاب کی خامیوں کے باوجود اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

اس کتاب پر تفصیلی رائے دینے کے لئے تفصیلی مطالعہ کی ضرورت ہے، اور اس پر بہر حال وقت لگے گا۔ سردست ہم ایک سرسری جائزہ لے کر مجملاً اظہارِ خیال کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

کسی بھی تمدنی و سیاسی نظام کو پیش کرنے کے لئے ایک خاص طرح کا سائنٹفک اسلوب اور ترتیب اور تقسیم مباحث کا ایک خاص طرز اختیار کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن جنابِ مولف نے "نظام اسلامی" کی سائنس کو تحقیقی طریق پر بیان کرنے کے بجائے زیادہ تر ایمانیات و معتقدات اور روحانیات کو تذکیری انداز سے بیان فرمایا ہے۔ یہ بجائے خود ایک کارِ خیر ہے لیکن موضوع کے تقاضے دوسرے تھے۔

مثلاً تنظیم حکومت کے ابتدائی اصول کے عنوان (ص ۲۴۰) کے تحت جس طرح کے مباحث کی توقع کرنی چاہئے ان کے بجائے کچھ دوسری طرح کی اچھی باتیں درج ہیں۔ اس فصل میں جو ۱۳ اصول نمایاں کئے گئے ہیں وہ درحقیقت اسلامی نظم حکومت کے اصول نہیں ہیں۔

آیاتِ قرآنی کے ترجمہ میں بے احتیاطی بعض جگہ بہت نمایاں ہے مثلاً "الذین ان مکنٰھم ـــــ الآیۃ

ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

"وہی لوگ بے شبہ اس دنیا میں صاحبِ حکومت و اقتدار ہیں جو نمازیں قائم رکھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں...... الخ"

حالانکہ اگر مؤلف نے خود قرآن میں اس آیت کو پورے سلسلۂ کلام کے ساتھ دیکھا ہوتا تو وہ یہ معنیٰ کبھی نہ کرتے۔ اسی طرح متعدد آیات کے ترجمے محلِ نظر ہیں۔

ایک صاحبِ نظر اس کتاب کو پڑھتے ہی یہ اندازہ کرنے پر مجبور ہوگا کہ مؤلف نے اسلام کے سیاسی و تمدنی نظام کا مطالعہ اصل ماخذ سے منظم طور پر (SYSTEMATICALY) نہیں کیا ہے بلکہ منتشر طریق سے معلومات جمع کی ہیں۔ حالانکہ کتاب کا موضوع باقاعدہ ریسرچ کا متقاضی تھا۔

مجموعی طور پر یہ کتاب اسلام کے حق میں ہے اور تجدد پسندوں کے من گھڑت نظریات سے متصادم ہے۔ اس کا اصل مقصد اسلام کو مسخ کرنا یا اس کو مادہ پرستانہ تہذیب کے سانچے میں ڈھالنا نہیں، بلکہ اس کی اصل قدروں کی ترجمانی کرنا ہے۔ یہ وہ جوہر ہے جو اس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے مقابلے میں زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔

تجدیدِ تصوف و سلوک | از جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی سابق استاذ فلسفہ و دینیات عثمانیہ یونیورسٹی۔
ملنے کا پتہ: مولوی سعید الباری صاحب، شبستانِ قدم رسول، ہارڈنگ روڈ لکھنؤ۔
قیمت: مجلد مع گرد پوش سادہ (صفحات ۲۹۶) ۵ روپے۔

اس کتاب میں فاضل مؤلف نے تصوف کی اہمیت اور اس کے مختلف پہلوؤں کی حقیقت ایک خاص عقلی انداز سے کی ہے اور اس سارے علمی کام میں مولانا اشرف علی مرحوم کے نقطۂ نظر کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ مولانا مرحوم نے تصوف کو عجمیت کے اثرات سے پاک کرنے اور شریعت سے اس کی بے نیازی کو ختم کرنے کے لئے جیسی کچھ کوشش کی ہے وہ مولانا کی تحریروں اور اقوال کے ان تمام حوالوں سے از خود واضح ہوتی ہے جن سے فاضل مؤلف نے کتاب کو مزین کیا ہے۔ بہرحال تصوف و سلوک کی حقیقتوں کی یہ محتاط ترین تعبیر ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

تصوف کی ساری عمارت احسان کے تقاضوں پر کھڑی ہوتی ہے اور یہ وہ اصطلاح ہے جسے ایمان واسلام کے ساتھ نبی صلعم نے خود استعمال فرمایا تھا لیکن آگے چل کے احسان کے سیدھے سادے تقاضے ٹکنیکل شکلیں اختیار کرتے کرتے کچھ کے کچھ بن گئے۔ پیشِ نظر کتاب تصوف کے پورے نظام کا تجزیہ کرکے اس کے مطابق اسلام کے اجزا کو واضح کرنے کے لئے لکھی گئی ہے! ذوقِ تصوف رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ بعض دوسری کتابوں کے مطالعے میں زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

جناب مؤلف اپنی کتاب میں اگرچہ تصوف کا ایک بہتر تصور دلاتے ہیں، لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تاریخ تصوف نے اپنے ساتھ بعض ایسے غیر صحیح اثرات لے لئے ہیں جن سے یہ کتاب بھی بالاتر نہ رہ سکی۔

سب سے پہلی چیز جو کھٹکتی ہے وہ شریعت اور تصوف یا فقہ ظاہر اور فقہ باطن یا علما اور صوفیا کی تقسیم کا ایک مستقل تصور ہے جو دو شعبوں کو الگ الگ کرتا ہے، ان کے ماہرین کو دو صفوں میں بانٹتا ہے اور ان میں علیٰحدگی کا احساس پیدا کرتا ہے حالانکہ خود دینِ برحق نے اپنے سہ گونہ تقاضوں (ایمان، اسلام، احسان) کو ترکیب دے کر شئے واحد کی حیثیت سے پیش کیا تھا، انبیاء نے ہمیشہ ایک ہی جامع دعوت انسانوں کے سامنے پیش کی، اور ان کی تعلیم وتزکیہ کا ایک وحدانی سسٹم اختیار کیا تھا۔

دوسری چیز وہ فراری ذہنیت ہے جو چھٹی صدی ہجری کے دورِ پُر فتن میں سیاست وتمدن کی بازی ہار کر سپا ہونے والوں کے ساتھ خانقاہوں میں داخل ہوگئی اور تصوف کے نظام میں جب وہ رچ بس گئی تو اس نے ایمان، اسلام اور احسان سب کو انفرادی زندگی سے متعلق کر دیا۔ اس طرح جب تصوف پروان چڑھا تو اس کی نگاہ تمدن وسیاست کے اجتماعی فساد سے بے نیاز ہوکر افراد سازی پر ایسی مرتکز ہوئی کہ نظامِ اجتماعی میں انقلاب برپا کرنے کی ذمہ داریاں بالکل پسِ پشت ڈال دی گئیں۔ اچھے سپاہی بنانے کا ٹکنیکل پروگرام جتنا ترقی کرتا گیا وہ اصل معرکہ گاہوں سے اتنا ہی اوجھل ہوتا گیا جس کے لئے ساری سپہ گری شروع کی گئی ہے۔ پیشِ نظر کتاب بھی بڑی حد تک اسی انفرادی تصوف کی حامل ہے۔

تیسری چیز جسے ہم نے محسوس کیا ہے وہ تصوف کے اس اجتہادی قالب، بلکہ اس کے چھوٹے سے چھوٹے فرا کا ضرورت سے بڑھا ہوا احترام ہے جسے ہم نے ایک طویل تاریخ سے ورثے میں پایا ہے۔ بیعت کا سسٹم تعلق و

کرامات کا فلسفہ، مراقبوں اور تربیتِ نفس کی ورزشوں کا پروگرام، اذکار و اوراد کا ضابطہ وغیرہ فنیات جس طرح پروان چڑھ گئے ہیں، اب ان میں سے ہر چیز مقدس اور اٹل بن گئی ہے اور ہر تصوف پسند کا یہ فرض قرار پا گیا ہے کہ وہ اس پورے ورثے کے ایک ایک جز کی قدر و قیمت قائم رکھنے کے لئے عقلی تاویلیں کرے۔ حالانکہ کتاب و سنت سے احسان کا جو اصل جوہر اور اس کے منصوص اصول حاصل ہوتے ہیں، اٹل اور مقدس صرف وہ ہیں اور ان پر جو قالب ایجاد و اختراع کی قابلیتوں کے ساتھ تعمیر کیا گیا ہے، ضروری نہیں کہ تا قیامت اسے شوشہ بشوشہ قائم رکھا جائے اور زمانے کے تقاضوں اور وقت کے ذہن کے پیشِ نظر اس میں کسی ترمیم کی جرأت نہ کی جائے۔ تجدیدِ تصوف و سلوک کے مباحث و مطالب بہرحال تصوف کے مروجہ اجتہادی قالب ہی کے گرد گردش کرتے ہیں۔ یہ قالب اتنا بدنام ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ایسی روایات وابستہ ہو چکی ہیں کہ اس کو جہاں لے کے جایئے وہیں اس کے مخصوص اثرات ظاہر ہو کے رہیں گے۔

چوتھی چیز جس کی طرف ایک تبصرہ نگار اشارہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا، اہلِ تصوف کا وہ مخصوص اندازِ تفلسف ہے جو ہر سیدھی سادی بات کو پُرپیچ اور پُراسرار بناتا رہتا ہے۔ ہر بات میں سے نکتے نکالنا، پھر چند نکتوں کو کسی نئے نکتے سے جوڑنا، پھر ان کے مجموعے سے کوئی اور بہتر خدا برآمد کرنا، پھر اس نکتہ آفرینی کے لئے ایک شاعرانہ سی ابہامی زبان استعمال کرنا ——— کہ وہ بجائے خود مزید نکتوں کو پیدا کرتی ہے ——— اور نہایت درجہ مصنوعی پن کے ساتھ حسن نظامی صاحب کی طرح روحانیات کے محل کھڑے کرنا درحقیقت تقاضائے اسلام نہیں ہے۔ تصوف کی اس روایت کا پرتو بھی کتاب پر پڑا ہے ——— اگرچہ اس کا تناسب ایسا ہے کہ گوارا کیا جا سکے۔

پانچویں چیز اس کتاب کی زبان، اس کا اسلوب اور اس کی اصطلاحات ہیں جو تصوف کے مروجہ قالب سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ جناب مؤلف نے بلاشبہ اپنی بات کو ہمارے دماغوں کے قریب کرنے کی خاص کوشش کی ہے، لیکن ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ آج جس طبقے کو ہم تعلیم یافتہ طبقہ کہتے ہیں اس کے لئے تو بہرحال اس کتاب کو پڑھنے کی ہمت کرنا ہی مشکل ہوگا، کجا کہ وہ اس سے کچھ اپنے لئے اخذ کر سکے۔

ان چند ناقدانہ اشارات کا مدعا کتاب کی قدر و قیمت کو کم کرنا نہیں ہے، بلکہ ہم تصوف کے موضوع پر اسے ایک اہم کتاب سمجھتے ہیں۔

———✣———

جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد

از مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

یہ مکمل مضمون بمعہ اسناد ایک پمفلٹ سائز پر چھپ چکا ہے۔ ضخامت ۴۰ صفحات ہے، مگر قیمت افادۂ عام کے پیش نظر صرف دو آنے رکھی گئی ہے۔ توسیع اشاعت کی خاطر ایک سو یا اس سے زائد نسخوں پر ۲۰ فی صد کمیشن بھی دیا جائے گا۔ وہ حضرات جو جماعت کی انتخابی پالیسی سمجھنا یا دوسروں کو سمجھانا چاہتے ہیں، اُن سے درخواست ہے کہ اس رسالے کو جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں منگوا کر پھیلائیں۔

دستوری سفارشات پر تنقید

اسلامی اور جمہوری نقطۂ نظر سے

از مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

یہ رسالہ مولانا مودودی کی ایک تقریر پر مشتمل ہے جو انھوں نے ۱۴۔ اکتوبر کو مسلمانانِ لاہور کے ایک جلسۂ عام میں کی۔ شروع میں دستور کی اہمیت واضح کرنے کے بعد اسلامی دستور کی چھ بنیادی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ اور پھر ان کی روشنی میں بنیادی حقوق اور بنیادی اصولوں سے متعلقہ سفارشات کی خامیوں کو واضح کیا ہے۔ آخر میں انھیں دُنیا کے مسلمہ جمہوری اصولوں کے معیار پر جانچا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اب آئندہ لائحۂ عمل کیا ہونا چاہیے۔

ضخامت ۴۸ صفحات - قیمت دو آنے (۲/)

ناظم

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، لاہور

دین کی بنیادی تعلیمات سے آگاہی

ریاست پاکستان کے ہر شہری کا اولین فریضہ ہے

رسالۂ دینیات

اس رسالے میں ابتدائی دینی تعلیم کے لئے نیا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ فقہی مسائل کی تفصیلات کے بجائے دین کے بنیادی عقائد اور ان کی صحت و صداقت کے دلائل ترتیب کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ کیوں کہ عقائد کے استحکام کے بعد ہی حرفی احکام دین اطاعت کا جذبہ پیدا ہوسکتا ہے۔

ضخامت ۱۱۲ صفحات - قیمت ۱/۸

خطبات

یہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد سے متعلق انتیس خطبوں کا مجموعہ ہے۔ زبان اور انداز بیان دونوں نہایت سلیس اور عام فہم ہیں، ان خطبوں میں احکام و عبادات کی حکمت اور اُن کے مصالح ذہن نشین کرانے کی خاص طور پر کوشش کی گئی ہے۔ رسالۂ دینیات کے ساتھ خطبات کے مطالعہ سے دین کی راہ اچھی طرح روشن ہوجاتی ہے۔

ضخامت ۲۱٦ صفحات - قیمت -/۳

تجدید و احیاء دین

تجدید اسلام کے موضوع پر یہ ایک تاریخی اور اصولی بحث ہے۔ اس میں اسلام اور جاہلیت کی اصولی کشمکش کا جائزہ لینے کے بعد تجدید کی حقیقت، مجدد کی تعریف اور اس کے کام کی وعیت متعین کی گئی ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز سے لے کر حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید تک کے مجددین کے کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

ضخامت ۸۰ صفحات قیمت -/۱

تفہیمات

(حصہ اول)

اس میں اسلام کے بعض اُن اہم ترین مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کا تصور عام طور پر محدود یا مسخ ہو کر رہ گیا ہے مثلاً عبادت، جہاد، آزادی، رواداری وغیرہ۔ کتاب کے آخر میں خصوصیت کے ساتھ توحید رسالت، اتباع رسالت اور ماخذ دین ہونے کی حیثیت سے حدیث کی اہمیت پر بحث کی گئی ہے حدیث کے متعلق اور منکرین دونوں کے لیے اس بحث کا مطالعہ فائدے سے خالی نہ ہوگا کتاب کا حصہ دوم زیر طبع ہے۔

ضخامت ۳۲۴ صفحات - قیمت ۳/۸

تنقیحات

اس تالیف کے مضامین اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں غیر اسلامی اثرات اور مسلمانوں کی کوتاہیوں پر تنقید بھی ہے اور الجھے ہوئے حقائق کی تنقیح بھی۔ موجودہ تہذیبی دور میں تعلیم یافتہ اذہان جن پیچیدگیوں سے دوچار ہیں۔ انہیں صاف کرنے میں اس کتاب سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

ضخامت ۲۱۲ صفحات - قیمت ۲/۸

رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۱۱۰

جلد ۳۵
عدد ۲
۱۳۷۰ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے　　قیمت فی پرچہ دس آنے

فہرستِ مضامین

جلد ۳۵ | صفر ۱۳۷۰ھ مطابق دسمبر ۱۹۵۰ء | عدد ۲

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے [illegible] پریس [illegible] میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

تحریک اسلامی کے پہلے مرحلے میں کیا کام کس طرح کیا گیا، اور پھر دوسرا مرحلہ جس طرح جن حالات شروع ہوا اس کی تشریح پچھلی اشاعت میں کی جاچکی ہے۔ اس بحث کو اگر آپ نے بغور پڑھا ہے۔ تو اس دو باتیں آپ پر واضح ہوگئی ہوں گی۔

ایک یہ کہ اول روز سے ہمارے پیش نظر ایک ایسی اجتماعی جدوجہد برپا کرنا تھا جو خالص اصولی حیثیت سے اسلام کی دعوت لے کر اٹھے اور اس دین کو ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کی سعی کرے ہمارے نزدیک یہی کام امت مسلمہ کا اصل مقصد وجود تھا اور ہماری تشخیص یہ تھی کہ دنیا کے تمام بگاڑ، اور مسلمانوں کے عالمگیر تنزل، اور خود برعظیم ہند میں مسلمانوں کی قومی مشکلات کی حقیقی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس امت نے وہ کام چھوڑ رکھا ہے جس کے لئے دراصل اس کو پیدا کیا گیا تھا۔ اس غرض کے لئے ہم اپنی کوئی الگ جماعت بنانا نہیں چاہتے تھے بلکہ ہماری خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں میں اس چیز کا صحیح احساس پیدا ہو وہ پہلے خود اسلام کو سمجھیں، پھر اس کے بارے میں اپنے فرض کو پہچانیں، اور پھر قومی حیثیت سے دوسرے مشاغل کو چھوڑ کر اپنی ساری قوت اور اپنی ساری توجہ اپنے دین کی دعوت اور اقامت پر مرکوز کردیں۔ ہمیں یقین تھا کہ صرف یہی ایک صورت ہے جس سے مسلمان اپنی مشکلات کو بھی دور کرسکتے ہیں اور دنیا کی مشکلات کا بھی صحیح حل پیش کرکے اقوام عالم کے امام بن سکتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ہم نے جماعت اس وقت بنائی جب ہماری ۹ سال کی مسلسل تبلیغ و تلقین کے باوجود مسلمانوں نے من حیث القوم اس راہ کو اختیار نہ کیا جسے ہم پیش کر رہے تھے، جب مسلمانوں کی تمام موجود الوقت جماعتوں نے اسے اپنی اجتماعی سعی کی راہ بنانے سے احتراز کیا اور جب تقسیم ہند مسلمانوں کی قومی پالیسی قرار پاگئی جس کے نتیجے میں لازماً آدھے مسلمان بے عمل کے طور پر ہندو قوم پرستی کے حوالے ہو جانے والے تھے اور بقیہ آدھے مسلمانوں

بلکہ ایسی قومی ریاست ابھر آنے والی تھی جس کا ایک حقیقی اسلامی ریاست میں تبدیل ہونا (کم از کم اس کے بانیوں اور لیڈروں کی سیرت و کردار کو دیکھتے ہوئے) سخت مشتبہ نظر آتا تھا۔ ان حالات میں ہم نے یہ ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کے اندر جو مٹھی بھر افراد ایسے موجود ہیں جنھوں نے ہماری دعوت کو سمجھا اور دل سے قبول کیا ہے انھیں لے کر جلدی سے جلدی منظم کر لیا جائے اور ان کی تربیت کا کام شروع کر دیا جائے تاکہ ایک ایسا گروہ تیار ہو جو ایک طرف قومی اغراض سے بالاتر ہو کر خالص اقامتِ دین کی سعی کر سکے، اور دوسری طرف اُن حالات کا مقابلہ کر سکے جو تقسیم ہند کے بعد پیش آتے نظر آرہے تھے۔

اس دوسرے مرحلے کو ہم تنظیم و تربیت کا مرحلہ کہتے ہیں۔ مگر یہ بات ابتدا ہی میں سمجھ لینی چاہئے کہ کسی تحریک کو مراحل میں تقسیم کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ایک مرحلہ کا کام دوسرے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے ختم ہو چکا ہوتا ہے اور پھر بعد کے مراحل میں اسے جاری نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسرے مرحلے میں پہلے مرحلے کے کام کو جاری رکھتے ہوئے کچھ مزید کام بھی شروع کر دیئے جاتے ہیں۔ تشکیل جماعت کے بعد تنظیم و تربیت کے پروگرام کو شروع کرنے کے ساتھ ہم نے تنقید و تعمیر اور تبلیغ و دعوت کے کام کو اسی طرح مسلسل جاری رکھا جس طرح وہ ابتدا سے ہوتا چلا آرہا تھا۔ اس دور میں جو چیزیں شائع کی گئیں ان کو بھی اگر ناظرین تاریخی ترتیب کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں تو انھیں اُس نقشے کو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوگی جس پر ہم اس دعوت کو آگے بڑھا رہے تھے:

سنہ ۴۲ء - سنہ ۴۷ء، تفہیم القرآن، رسائل و مسائل کے بیشتر مضامین۔

سنہ ۴۲ء، سلامتی کا راستہ

سنہ ۴۳ء، دین حق، اسلام میں قتل مرتد کا حکم۔

سنہ ۴۴ء، اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر، حقیقت شرک۔

سنہ ۴۵ء، حقیقت توحید، اشتراکیت اور نظام اسلام۔

ان مطبوعات کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہو سکتی ہے کہ اس مرحلے میں دین کی بنیادی دعوت اور اس میں نظام کی تفہیم و توضیح کا کام پچھلے مرحلے سے کچھ زیادہ وسعت کے ساتھ انجام دیا گیا اور ۱۹۴۷ء کے وسط پہنچتے پہنچتے ایک ایسا وسیع لٹریچر اس ملک کی تعلیم یافتہ آبادی کے لئے فراہم کر دیا گیا جس میں اسلامی نظام حیات کے قریب قریب ہر گوشے کی شکل و صورت قابلِ فہم طریقے سے دیکھی جا سکتی تھی۔ جماعت کی تنظیم و تربیت کا کام اس پر مستزاد تھا، نہ یہ کہ دعوت کو چھوڑ کر اس مرحلے میں صرف جماعت کی تیاری ہی پر سارا وقت صرف کیا گیا ہو۔

اب ہم ذرا وضاحت کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس جماعت کی تاسیس کے وقت کیا مقصد ہمارے پیشِ نظر تھا، کس قسم کے آدمی ہم تیار کرنا چاہتے تھے اور ان سے کیا کام لینا مطلوب تھا۔ اس غرض کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کوئی نئی تشریح و توضیح کرنے کے بجائے انہی عبارات کو پھر ایک مرتبہ لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے جن میں ابتداءً جماعت کے مقصدِ تاسیس کو بیان کیا گیا تھا۔

تشکیلِ جماعت سے چار مہینے قبل اپریل ۱۹۴۱ء میں، ۱۷ صفحات میں ایک مضمون لکھا گیا تھا جو ہماری کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم میں "ایک صالح جماعت کی ضرورت" کے عنوان سے درج ہے۔ اس میں تفصیل کے ساتھ یہ بتلانے کے بعد کہ شرک، رہبانیت اور مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب کی ناکامی کے بعد اب دنیا کا مستقبل صرف ایک ہی نظریہ کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ اسلام کا نظریہ ہے، عرض کیا گیا تھا:

"لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیا بس مفتوح ہونے کے لئے تیار بیٹھی ہے، اسلام کی خوبیوں پر ایک وعظ اور اس پر ایمان لانے کے لئے ایک دعوت نامہ شائع ہونے کی دیر ہے، پھر ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ سب مسخر ہوتے چلے جائیں گے ...... دنیا کو آئندہ دورِ ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں ایک صحیح نظریہ موجود ہے، [illegible] کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر [illegible] رکھتے ہوں۔ ان کو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہوگا اور وہ صرف اسی طرح دیا جا سکتا [illegible]

جس نظام کو باطل کہتے ہیں اس کے قائل بھی ہوں، جس ضابطہ پر ایمان لائے ہیں اس کے خود پابند بھی ہوں، جس چیز کو نیکی کہتے ہیں اس کا خود نمونہ بنیں، جس چیز کو فرض کہتے ہیں اس کا خود التزام کریں، اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اسے خود چھوڑیں۔ پھر اُن کو اِس فاسد نظامِ تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہوگی، اس سے اور اس کے پیرووں سے تعلق توڑنا ہوگا، اُن تمام فائدوں، لذتوں، آسائشوں اور امیدوں کو جو اِس نظام سے وابستہ ہوں چھوڑنا ہوگا، اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات، تکلیفوں، اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو نظامِ غالب کے خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انہیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جدوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہوگا، اپنے اوقاتِ عزیز بھی صرف کرنے پڑیں گے، اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑے گا، قید اور جلاوطنی اور ضبطِ اموال اور تباہی اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی پڑیں گی۔ ان راہوں سے گزرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب ہوا ہے نہ اب ہو سکتا ہے۔ ایک صحیح نظریہ کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو محض نظریہ خواہ کتنا ہی بلند پایہ ہو کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین میں کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتا ...... زمین انتہائی حقیقت پسند ہے کہ جب تک کسان اپنے صبر سے، اپنی محنت سے، اپنے بہتے ہوئے پسینے سے اور اپنی جانفشانی سے اُس پر اپنا حق ثابت نہیں کر دیتا، وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی اگلنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔"

تشکیلِ جماعت کے ایک سال بعد اگست ۱۹۴۲ء میں دربھنگہ کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے جو تقریر کی گئی تھی اس کے چند فقرے یہ ہیں:

"ہمارے [illegible] سے بڑھ کر [illegible] ہے۔ اس [illegible] محض تعلیم اور محض ایک چھوٹے سے [illegible]

[illegible]

[illegible]

رکھتے ہوں کہ تعمیر افکار کے ساتھ اجتماعی قیادت کے دوہرے فرائض سنبھال سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں عوام میں تحریک کو پھیلا دینے کے لئے جلدی نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری تمام تر کوشش اس وقت یہ ہے کہ ملک کے اہل دماغ طبقوں کو متاثر کیا جائے اور ان کو کھنگال کر صالح ترین افراد کو چھانٹ لینے کی کوشش کی جائے جو آگے چل کر عوام کے لئے لیڈر بھی بن سکیں اور تہذیب و تمدن کے معمار بھی۔ ...... یہ اعتراض بجا ہے کہ کثیر التعداد عوام کو اس نقشے کے مطابق بلند سیرت بنانے کے لئے مدت مدید درکار ہے۔ مگر ہم اپنے انقلابی پروگرام کو عوام کی اصلاح کے انتظار میں ملتوی کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے پیش نظر کام کا جو نقشہ ہے وہ یہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لئے ایک ایسی مختصر جماعت فراہم کر لی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کیرکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقے کے عوام کو سنبھال سکے ...... تاکہ ان مرکزی شخصیتوں کے ذریعے سے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم ہو کر اسلامی انقلاب کی راہ میں صرف ہوں۔ ایک ٹھوس، پائیدار اور ہمہ گیر انقلاب کا لازمی ابتدائی مرحلہ یہی ہے۔ اس مرحلے کو صبر سے طے کرنا ہی پڑیگا۔"

(روداد جماعت اسلامی حصہ اول۔ ص ۵۸)

مارچ [illegible] میں اجتماع دارالاسلام کے موقع پر جو تقریر کی گئی تھی اس کے حسب ذیل فقرے بھی قابل ملاحظہ ہیں :

"اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ وہ کم سے کم ضروری صفات کیا ہیں جو اس دعوت کے کام کرنے والوں میں ہونی چاہئیں ...... قبل اس کے کہ آپ باہر کی دنیا میں خدا کے باغیوں کے مقابلے پر نکلیں، اُس باغی کو مطیع بنائیے جو خود آپ کے اندر موجود ہے اور خدا کے قانون اور اس کی رضا کے خلاف چلنے کے لئے ہر وقت تقاضا کرتا رہتا ہے۔ اگر یہ باغی آپ کے اندر پل رہا ہے اور آپ پر اتنا قابو یافتہ ہے کہ آپ سے رضائے الٰہی کے خلاف اپنے مطالبے منوا سکتا ہے تو یہ بالکل ایک بے معنی بات ہے کہ آپ بیرونی باغیوں کے خلاف علم جنگ

کریں۔۔۔۔۔۔۔ حدیث نبوی کے مطابق اپنے آپ کو اس گھوڑے کی طرح بنائیے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ وہ خواہ کتنا ہی گھومے پھرے، بہرحال اس حد سے آگے نہیں جا سکتا جہاں تک اس کی رسّی اسے جانے دیتی ہے، ایسے گھوڑے کی حالت اس آزاد گھوڑے سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو ہر میدان میں گھومتا ہے، ہر کھیت میں گھس جاتا ہے اور جہاں ہری گھاس دیکھتا ہے وہیں پوری بے صبری کے ساتھ ٹوٹ پڑتا ہے۔ آپ آزاد گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر سے نکالیں اور کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کی کیفیت اپنے اندر پیدا کریں۔"

(روداد جماعت اسلامی حصہ دوم۔ صفحہ ۱۷-۱۸)

"آپ بہ حیثیتِ فرد اور بحیثیتِ جماعت اپنے نصب العین کے اتنے دلدادہ اور اپنے اصول کے اتنے پابند ہو جائیں کہ آپ کے گرد و پیش جو لوگ کسی نصب العین کے بغیر بے اصول زندگیاں بسر کر رہے ہیں وہ آپ کی پابند اصول زندگی کو گوارا نہ کر سکیں ۔۔۔۔۔۔ (مگر بگڑی ہوئی سوسائٹی کے ساتھ آپ کی) یہ ساری کشمکش اُس ذہنیت کے ساتھ ہونی چاہیئے جس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بیماروں سے کشمکش کرتا ہے۔ دراصل وہ بیمار سے نہیں بلکہ بیماری سے لڑتا ہے اور اس کی تمام جدوجہد ہمدردی کی روح سے لبریز ہوتی ہے۔" (ایضاً صفحہ ۸-۱۹)

ہمیں مسلسل اور پیہم سعی اور باقاعدگی کے ساتھ کام کرنے کی عادت ہونی چاہیئے۔ ایک مدت دراز سے ہماری قوم اس طریق کار کی عادی رہی ہے کہ جو کام ہو کم سے کم وقت میں ہو جائے، جو قدم اٹھایا جائے ہنگامہ آرائی اُس میں ضرور ہو، چاہے مہینہ دو مہینہ میں سب کیا کرایا غارت ہو کر رہ جائے۔ اس عادت کو ہمیں بدلنا ہے۔ اس کی جگہ بتدریج اور لمبے [illegible] کام کرنے کی مشق ہونی چاہیئے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اگر آپ کے سپرد کیا جائے تو بغیر کسی فوری اور نمایاں نتیجے کے اور بغیر کسی داد کے آپ اپنی پوری عمر صبر کے ساتھ اسی میں کھپا دیں۔ جہاد فی سبیل اللہ میں ہر وقت میدان گرم ہی نہیں ہوا کرتا ہے اور نہ ہر شخص اگلی ہی صفوں میں [illegible] آرائی کے لئے بسا اوقات بیس بیس [illegible] سال تک [illegible]

[illegible]

جتی ضروریات کے اُن چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگے رہتے ہیں جو ظاہر بین نگاہوں میں بہت

حقیر ہوتے ہیں۔" (ایضاً صفحہ ۲۷-۲۸)
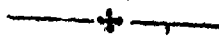
دسمبر [illegible] میں اجتماعِ لاہور کے موقع پر جو تقریر کی گئی تھی اس کے بھی چند اقتباسات ہمارے مدعا پر

اچھی روشنی ڈال سکتے ہیں:-

"ہمارا مطالبہ ہر مومن سے یہ ہے کہ وہ حنیف ہو، یک سو ہو، یک رنگ مومن و مسلم ہو،

ہر اس چیز سے کٹ جائے (اور نہ کٹ سکتا ہو تو پیہم کٹنے کی جدوجہد کرتا رہے) جو ایمان کی ضد

اور مسلمانہ طریقِ زندگی کے منافی ہو، اور اچھی طرح مقتضیاتِ ایمان میں سے ایک ایک تقاضے

کو سمجھے اور اسے پورا کرنے کی پیہم سعی کرتا رہے۔" (دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات ص ۲۱)

"ہماری دعوت صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ دنیا کی زمامِ کار فساق و فجار کے ہاتھ سے

نکل کر مومنین صالحین کے ہاتھ میں آئے، بلکہ ایجابی طور پر ہماری دعوت یہ ہے کہ اہلِ ایمان

و صلاح کا ایک ایسا گروہ منظم کیا جائے جو نہ صرف اپنے ایمان میں پختہ ہو، نہ صرف اپنے اسلام

میں مخلص و یک رنگ ہو، نہ صرف اپنے اخلاق میں صالح اور پاکیزہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ اُن

تمام اوصاف اور قابلیتوں سے بھی آراستہ ہو جو دنیا کی کارگاہِ حیات کو بہترین طریقے پر چلانے

کے لئے ضروری ہیں۔ اور صرف آراستہ ہی نہ ہو بلکہ دُنیا کے موجودہ کارفرماؤں اور کارکنوں سے

اُن اوصاف اور قابلیتوں میں اپنے آپ کو فائق تر ثابت کر دے۔" (ایضاً صفحہ ۲۳-۲۴)

"ہم دراصل ایک ایسا گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف زہد و تقویٰ میں اصطلاحی

زاہدوں اور متقیوں سے بڑھ کر ہو اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت

و صلاحیت بھی عام دنیا داروں سے زیادہ اور بہتر رکھتا ہو۔ ہمارے نزدیک دنیا کی تمام

خرابیوں کا ایک سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نیک لوگ نیکی کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہیں۔"

[illegible]

حق اور باطل

(نعیم صدیقی)

قرآن میں حق و باطل کی آویزش کے سلسلے میں مختلف مواقع پر حسبِ ذیل آیات وارد ہوئی ہیں:۔

(۱) ــــــ وما خلقنا السماء والارض وما بينهما لٰعبين ۝ لو اردنا ان نتخذ لهوا لاتخذنٰه من لدنا ان كنا فٰعلين ۝ بل نقذف بالحق على الباطل فيدمغه فاذا هو زاهق ۝ (الانبیاء)

اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے اندر جو کچھ ہے، اسے کھیل تماشے کی حیثیت سے پیدا نہیں کیا۔ اگر ہم ایسا چاہتے کہ اسے سامانِ تفریح بنائیں تو ہم یقیناً باختیارِ خود (کسی کی مزاحمت کے بغیر) اسے ایسا ہی بنا لیتے ــــ بشرطیکہ ہم یہی کرنے والے ہوتے! لیکن (ہم نے ایسا نہیں کیا ہے، بلکہ کائنات کو ایسے اصول و مقصد کے ساتھ بنایا ہے کہ اس اصول و مقصد کے پیشِ نظر) ہم حق کو باطل سے ٹکراتے ہیں، پھر وہ (حق) اُس کا (باطل کا) سر کچل دیتا ہے) یہاں تک کہ پھر وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔

(۲) ــــــ وقل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا ۝

اور کہہ دو کہ (لو) حق آپہنچا اور باطل میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا اور بلاشبہ باطل تو ہے ہی بھاگ نکلنے والا!

(۳) ــــــ الم تر كيف ضرب الله مثلا كلمة طيبة كشجرة طيبة اصلها ثابت وفرعها في السماء تؤتي اكلها كل حين باذن ربها ــــ ومثل كلمة خبيثة كشجرة خبيثة [illegible]

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے مثال دے کر کہ پاکیزہ اصول ایک ایسے پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ خوب اچھی طرح زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ ہر وقت اپنے رب کے [illegible]

[illegible] بہت ... جنگ تھی، چنانچہ ... اس ... عرب نے جذبۂ یقین ... فرق ... [illegible]

ہونے کے بعد ... اس واقعے سے ہراساں ہوئے کہ مشرکین عرب ہی نہیں، گرد و پیش کی تمام اقوام باطل کی

بنیادوں پر زندگی استوار کئے ہوئے ہیں اور مٹھی بھر لوگ حق کے علمبردار بن کر نکل رہے ہیں، اور بندہ اس صورت

حال سے پریشان ہوئے کہ وہ نظام حق جو کئی صدیوں سے معرض تعطل میں ہے آخر وہ آج کیسے غالب آسکتا ہے۔

چنانچہ ان کی جدوجہد کے نتائج نے ان پر عملاً ثابت کر دیا کہ قرآن نے حق و باطل کی کشمکش کا جو فلسفہ پیش کیا تھا وہ ایک اٹل فلسفہ تھا۔

وہ فلسفہ آج بھی اٹل ہے، اور آج بھی ہم اس سے جذبۂ صادق اخذ کرنے کے ضرورت مند ہیں کیونکہ ہم بھی حق و باطل کی کشمکش کے طوفان میں کھڑے ہیں۔

لیکن ان آیات کے صحیح مفہوم کو نہ پا سکنے کی وجہ سے بعض اصحاب کو سخت غلط فہمی ہوتی ہے۔ چنانچہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب لوگ اسلام اور اس کے اصولوں کو بروئے استدلال پوری طرح حق ماننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں دیکھتے، تو پھر وہ اپنے فوق العقلی عدم اطمینان کو اس دلیل سے ظاہر کرتے ہیں کہ اگر نیکی درحقیقت کوئی مستقل قدر رکھتی ہے اور فطرتِ انسانی سے اسے خصوصی مناسبت ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ نیکی کم ہے اور بدی کا زور ہے، سچائی پر کاربند ہونے والوں کی تعداد قلیل ہے اور جھوٹ کو اختیار کرنے والوں کی بھاری اکثریت ہے؟ ——— اور پھر یہ کہ اگر اسلام نظام حق تھا تو آخر وہ چلا کیوں نہ؟ کل تیس ہی سال؟ پھر آئندہ کے لئے اس سے کیا توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں؟

یہ سوال مسلمان کہلانے والے بعض اشخاص و اقسام کے مخالفین نظام اسلامی کی طرف سے بارہا اٹھایا جاتا ہے، چنانچہ شروع میں جب پاکستان میں نظام اسلامی کا مطالبہ ابھر رہا تھا یہ سوال زور و شور سے سامنے آیا لیکن جواب ... اب پھر جب اسلامی ... تحریک ... مرحلے ... انقلاب قیادت ... [illegible]

[illegible]

مقصود نزول یہ تھا کہ مسلمان جس حق پر عقل و وجدان کے لحاظ سے ایمان لاچکے تھے، اس کے لئے کشمکش کرتے وقت یہ یقین رکھیں کہ کامیابی ہے ہی حق کے لئے، اور اس یقین کی وجہ سے ان کا عزم اور ولولہ تازہ رہے۔ لیکن پیش نظر سوال کو اس لئے استعمال کیا جا رہا ہے کہ آج جو لوگ عقل و وجدان کے لحاظ سے اسلام پر ایمان رکھ کر اس کے قیام کی جدوجہد میں مصروف ہیں کم از کم اُن کے عزم کو متزلزل کر دیا جائے، اور غیر شعوری طور پر وہ اسلام کے متعلق اس بدگمانی میں مبتلا ہو جائیں کہ اس میں کوئی نہ کوئی کمزوری ایسی موجود ہے کہ یہ اول تو اپنے غلبے کے لئے سخت ترین جدوجہد چاہتا ہے اور پھر اگر اسے غلبہ ملے بھی تو اس میں زوال و اختلال بہت جلد نمودار ہو جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ سوال جس سطحی طریق سے اٹھایا جاتا ہے، اسی سطحی سماعت کے ساتھ اُسے سنایا جاتا ہے، پھر نہایت سطحی نگاہ سے اس سوال کی روشنی میں انسانی تاریخ و تمدن کو دیکھا جاتا ہے، اور علیٰ ہذا القیاس بالکل سطحی تفکر کے ساتھ اس سے کوئی نتیجہ برآمد کر لیا جاتا ہے۔ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ اس سوال کے جواب میں ان تمام ضروری امور کو نمایاں کر دیں جن پر اچھی طرح نظر نہ رکھنے کی وجہ سے لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سوال کو دو حصوں میں تقسیم کریں:

ایک یہ کہ کیا حق ناکام ہے اور باطل کامیاب؟

دوسرے یہ کہ نظام حق صرف تیس سال ہی کیوں چلا؟

پہلا سوال

پہلے سوال کے جواب میں جو بات اول قدم پر جان لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ حق کی ناکامی اور باطل کی کامیابی اصولاً کوئی معنیٰ ہی نہیں رکھتی۔ کامیابی اور ناکامی کا تعلق خود انسان سے ہے۔ اگر بالفرض سارے انسان مل کر حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیں تو پھر بھی حق ناکام نہیں ہوتا، ناکام وہ انسان ہی ہوتے ہیں جنھوں نے حق کو قبول کرنے سے گریز کیا اور اس کے فوائد سے بہرہ اندوز نہ ہو سکے۔ سچائی ایک اصول ہے اور اگر وہ اصول حق ہے تو خواہ سارا کا سارا دنیا قبول کر لے، یا کوئی ایک شخص بھی اختیار نہ کرے، ہر حال [illegible]

[illegible] کام ہے صفائی اور طہارت ایک ایسا ہی اصول ہے جو [illegible] خود حق ہے، اسے کوئی مانے تو [illegible]

حق ہے اور کوئی ایک شخص بھی اس پر عمل پیرا نہ ہو تو بھی یہ حق ہی رہے گا۔ کامیاب ہم ان انسانوں کو سمجھیں

جو اس اصول حق کو اپنا [illegible] پھر روشنی کی مثال لی جا سکتی ہے کہ ایک شخص روشنی کو [illegible]

نہیں کرتا اور وہ آنکھیں بند کر کے چلتا ہے تو اس کے نتیجے میں ٹھوکریں وہی خود کھائے گا اور ناکام بھی وہ [illegible]

روشنی کی ناکامی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ روشنی کو نہ کسی خاص منزل پر پہنچنا ہے، نہ پاؤں چلنا ہے

ٹھوکریں کھانے کا کوئی خطرہ درپیش ہے، اور نہ کامیابی و ناکامی کے درمیان . وہ معلق ہے۔ اگر

کوئی پوری طرح گل بھی کر دے تو بھی ناکام وہ خود ہوگا۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر آگے چلیے۔

حق کی گرانی اور باطل کی ارزانی

یہ تو آپ کو معلوم ہے ہی کہ جسے اندھیرا پسند ہو اسے کوئی خاص نہیں کرنا پڑتا، لیکن جو کوئی روشنی چاہے اُسے دیے اور تیل، چراغ دان کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ آپ اپنی صحت بگاڑنا چاہیں تو یہ کام ہر لحاظ سے آسان ہے، [illegible] بگڑی ہوئی صحت کو بنانا ہو یا اچھی صحت کو بحال رکھنا ہو تو تازہ ہوا، ورزش، غسل اور صفائی، غذا کی سونے جاگنے اور کام کے اوقات کی باقاعدگی اور جذبات و اخلاق کی نگہداشت کے لئے خاص طور [illegible] کرنی ہوگی۔ زیادہ آسانی سے یہ بات یوں سمجھی جا سکتی ہے کہ اگر ایک پہاڑ کی اونچی چوٹی سے نیچے لڑ [illegible] ہو تو اس "مقصدِ جلیلہ" کے لئے سوائے اس کے اور کچھ نہ کرنا پڑے گا کہ آپ ایک دفعہ لڑھکنے کے لئے اپنے ڈھیلا چھوڑ دیں، بخلاف اس کے اگر آپ نیچے سے اُس چوٹی تک پہنچنا چاہیں تو آپ کو کششِ زمین کے خلاف زور لگانا پڑے گا، قدم تھکیں گے، دم پھولے گا، اعصاب پر بار پڑے گا، دورانِ خون تیز ہوگا، قلب [illegible] دھڑکے گا، پسینہ آئے گا اور جب کہیں جا کر آپ چوٹی پر پہنچیں گے۔ یہی معاملہ نیکی اور بدی اور حق اور باطل [illegible] بارے میں پیش آتا ہے۔ آپ کو سیرت بد مطلوب ہو تو کسی بڑی محنت کی ضرورت نہ ہوگی، لیکن سیرت نیک [illegible] بڑی محنت کرنی ہوگی اور پھر اس کی حفاظت کا انتظام کرنا ہوگا۔ آپ بدنامی کی متاع خریدنا چا[illegible] [illegible] محنت [illegible] نیک نامی اور عزت و ناموری کی جنس پر عمر بھر کی کمائی کھپا [illegible]

[illegible]

[illegible] کرنا ضروری، بلکہ یہ "قیمتی فصل" خود بخود [illegible] پانی [illegible]
ی ہے کہ آپ کھیتی کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ لیکن اگر آپ کوئی باغ اور چمن اگانا چاہیں، یا اچھے اور زود [illegible]
لہ جنس کی فصل اٹھانا چاہیں تو اس کے لئے زمین جوتیں گے، بوئیں گے، پانی اور کھاد دیں گے، [illegible]
[illegible] کریں گے، جب کہیں جا کر مدعا حاصل ہوگا۔ حق کے لئے مشقت ضروری ہے اور باطل بغیر مشقت کے بھی
سل ہو سکتا ہے۔ خیر پر بہت بڑی قیمت صرف ہوتی ہے اور شر کوڑیوں کے مول، بلکہ مفت لٹایا جاتا ہے۔
انی صفائی اور طہارت کے لئے بڑا انتظام ضروری ہے، لیکن اخلاقی غلاظت کے لئے صرف تغافل و تساہل کا
ام کافی ہے۔

اب فرض کیجئے کہ ایک شخص اچھی فصل لینے کے لئے محنت کرنے سے کتراتا ہے اور زمین کو بنجر چھوڑ دیتا ہے
ناکامی اس کی ہوئی یا اچھی فصل کی؟ ایک شخص حفظانِ صحت کی فکر نہیں کرتا اور بیمار پڑتا ہے تو ناکامی صحت
اصول کی ہوئی یا بیمار پڑنے والے کی؟ ایک شخص حق اور راستی کی دولت اور نیکی اور خوش خلقی کی متاعِ
بہا کو خریدنے کے لئے محنت کی قیمت صرف کرنے پر تیار نہیں ہوتا تو ناکامی حق اور نیکی کی نہ ہوگی، خود
رکی ہوگی۔

ت وقلت کا معیار

یہ بات کہ حق قیمتی ہے اور باطل ارزاں ہے یا نیکی کے لئے محنت کی ضرورت ہوتی
ہے اور بدی کے لئے تن آسانی سے زیادہ کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی، اس
لئے [illegible] لوگ جب اس امر واقعہ کو دیکھتے ہیں کہ اہلِ حق کم ہیں اور بندگانِ باطل کی کثرت پائی جاتی ہے اور
ار بند ہونے والوں کا تناسب بدی میں مبتلا ہونے والوں سے زیادہ نہیں ہے تو وہ سوچتے ہیں کہ یہ حق کیسا
اور یہ نیکی کیسی نیکی ہوئی جسے قبول کرنے والے ہمیشہ اقلیت میں رہتے ہیں اور اکثریت باطل کے خدمت
ل اور بدی کے مسلک کے علمبرداروں کی رہتی ہے۔

مگر اس کا کیا علاج کہ نظامِ فطرت تمام تر اس طرز پر مبنی ہے کہ اس میں جو چیز قیمتی ہے وہی کم [illegible]
اس سے حصہ پانے والے خوش نصیب لوگ بھی ہمیشہ کم ہوتے ہیں، لیکن دوسری طرف [illegible]
[illegible] زیادہ ہوتی ہے اور اس سے واسطہ رکھنے والوں کی ہمیشہ اکثریت [illegible]

[illegible]

خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا میں اونٹ کٹارا بہت کثیر اور جھاڑ جس کثرت سے اگتی ہیں اتنا [illegible]

[illegible] یاسمین و گلاب اور لالہ و نرگس ہمیشہ کم ہوتے ہیں۔ یہاں بہت سے کنار کے انبار پائے جاتے ہیں

ور ریحان کا جمال کمیاب ہے۔ یہاں سنگ ریزوں کی بے پناہ اکثریت ہے لیکن ہیرے اور جواہر انتہائی

کم ہیں۔ یہاں تانبے، پیتل اور ٹین کی بڑی بڑی مقداریں ہر روز کانوں سے برآمد ہوتی ہیں لیکن سونا

تھوڑی مقدار میں نکلتا ہے۔ یہاں سمندر کی ہر موج سینکڑوں خزف ریزے اچھالتی رہتی ہے لیکن وہ

جس سے موتی برآمد ہوں شاذ و نادر ہی ہاتھ آتا ہے۔ یہاں جب دودھ کو بلویا جاتا ہے تو چھاچھ کی بہت

مقدار حاصل ہوتی ہے لیکن مکھن جو اس سے نکلتا ہے مقدار کے لحاظ سے چھاچھ کا مقابلہ نہیں کر سکتا

جنگلوں میں ہزاروں ہرن چھلانگتے پھرتے ہیں لیکن مشکِ ختن جو ان کے نافوں سے حاصل ہوتی ہے وہ قلیل اتنی

یہاں یاوہ گوئی کے نمونے دن رات سڑکوں اور بازاروں اور مجلسوں میں سامنے آتے رہتے ہیں لیکن ادب

کے حسین و جمیل نمونوں کا تناسب بہت ہی کم ہوتا ہے۔ یہاں بیماری جیسی نامطلوب شئے عام ہے لیکن

صحت جیسی جنسِ مطلوب کم ہی لوگوں کو حاصل ہے لیکن آخر اس سے نتیجہ یہ کیسے نکل آئے گا کہ یاسمین و

سنبل و ریحان، سونے، موتی، جواہرات، مکھن، آہوئے ختن، ادب و شعر اور صحت کے لئے ناکامی ہے

وہ مقدار و تعداد کے لحاظ سے کم ہیں، اور دوسری طرف اونٹ کٹارے، جھاڑ جھنکاڑ، ہیرے، تانبے

ٹین، خزف، چھاچھ، آہوئے بے نافہ، یاوہ گوئی اور بیماریوں کے لئے کامیابی ہے کیونکہ وہ تعداد

کے لحاظ سے بیش بیشتر ہیں؟

یہ فیصلہ کہ قیمتی چیز کی کم مقدار گھٹیا چیز کی زیادہ مقدار کو شکست دے سکتی ہے جب دونوں [illegible]

[illegible] سامنے رکھی جائیں تو حق [illegible] کی قلت باطل اور شر کی اکثریت سے زیادہ قیمت پا

[illegible]

فطرت نے ہر گھٹیا چیز کو اس لئے عام کیا ہے کہ اس کی قیمت گرا دے اور اسے ذلت کے مقام پر رکھے اور اُس نے ہر اعلیٰ چیز کو اس لئے کم رکھا ہے کہ اس کی قدر بڑھے، وہ گراں بہا ہو اور وہ تمام اہل عزم کی نگاہوں میں عزت حاصل کرے۔

کیا آپ چاہتے ہیں کہ فطرت اس ترتیب کو الٹ دیتی اور اُس کی مارکیٹ میں سونا ارزاں ہوتا اور لوہا اور ٹین گراں بہا ہوتا؟ وہ یاسمین و گلاب کو ہر طرف اگاتی پھرتی اور جھاڑ جھنکاڑ اگانے کے لئے محنت و مشقت کا مطالبہ کرتی؟ - - - - - - - - - - - - - - - - -

ادب و شعر کی صلاحیت اس کے ہاں سے ہر کس و ناکس کو ارزانی ہوتی اور یاوہ گوئی کا آرٹ پیدا کرنے کے لئے اعلیٰ درجے کے مخصوص دماغ کم تعداد میں فراہم کئے جاتے؟ صحت و تندرستی کے لئے کسی اہتمام کی ضرورت نہ ہوتی، بلکہ محنت و اہتمام کی ضرورت بیمار ہونے کے لئے پڑتی؟ تعمیر مفت میں ہوتی اور تخریب کے لئے انسان کو قوتیں صرف کرنی پڑتیں؟ آدمی روشنی بہم پہنچانے کے لئے کسی ساز و سامان کا منت کش نہ ہوتا بلکہ الٹا اسے چراغوں اور بجلی کے قمقموں کی جگہ ایسے آلات کی احتیاج ہوتی جو اندھیرا پھیلا سکیں؟ بلندی کی طرف لپکنے کے لئے کوئی جسمانی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی، بلکہ پستی کی طرف لڑھکنے کے لئے زور لگانا پڑتا؟ نیک بننے کے لئے کسی طرح کے تکلف کی حاجت نہ ہوتی بلکہ الٹا برا بننے کے لئے لٹریچر، تعلیم، تبلیغ، جماعت بندی اور نظام ہائے حکومت کے قیام سے مدد لینی پڑتی؟ حق پرچلنے کے لئے انسان کسی تکلیف اٹھانے کا ذمہ دار نہ ہوتا اور نہ انبیاء و کتب کا سلسلہ جاری کرنا پڑتا، بلکہ یہ سب کچھ ہوتا تو فروغِ باطل کے لئے ہوتا؟

دوسرے لفظوں میں یہ کہیئے کہ آدمی کو جنت تو ملتی مفت میں، البتہ جو شخص دوزخ میں جانے کا خواہشمند ہوتا اس کو خاص طور پر اس مقصد کے لئے ریاضتیں کرنی پڑتیں!

ذرا موجودہ نظامِ فطرت کی ترتیب کو الٹ کر غور تو فرمائیے کہ کس طرح کا نقشہ مترتب ہوتا ہے!

اس نظامِ فطرت کے اندر عالمِ انسانی میں بھی اعلیٰ خدمات انجام دینے کی صلاحتیں رکھنے والے کم ہوتے ہیں اور معمولی قسم کے افراد زیادہ ہوتے ہیں۔ اہلِ حکمت، موجدین، مصلحین، ہنرور، مفکر، ادیب، شعرا، لیڈر اور اس طرح کے افراد کی تعداد کہیں بھی عامیوں ... ! سے زائد تو کجا برابر بھی نہیں ہوا کرتی

حسب پر کرنے کے لئے جہاں غیر معمولی فطری صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں وہاں اکتسابی لحاظ سے بھی تحقیق اور
محنتیں کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن حامی بننے کے لئے کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ ٹھیک یہی صورت حق کے اصولوں پر
، نیکی کو مشعلِ راہ بنانے اور اعلیٰ سیرت تعمیر کرنے والوں کی بھی ہے کہ انھیں کچھ تو فطری طور پر سلامتیٔ طبع
ضرورت ہوتی اور پھر اکتسابی طور پر بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہی بات تھی جسے علامہ اقبال نے یوں پیش
اکہ :—

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پس حق پر چلنے والوں اور نیکی پر کاربند ہونے والوں کی کمی یہ معنیٰ نہیں رکھتی کہ حق اور نیکی ناکام قوت
، اور نہ باطل اور بدی کی راہ پر چلنے والوں کی کثرت اس کی دلیل ہے کہ باطل اور بدی کامیاب قوت
صحیح طرزِ استدلال یہ ہے کہ کامیاب وہ لوگ ہیں جو حق کی رفعتوں کی طرف بڑھنے کے لئے ضروری محنت
ہیں اور ناکام وہ لوگ ہیں جو حق کی منزلِ بلند کی طرف بڑھنے کی ہمت نہ کرسکے اور باطل کے گڑھوں میں
ست پسندی کی وجہ سے پڑے رہ گئے۔ زیادہ لوگ اگر گڑھے میں پڑے رہیں تو گڑھا پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں
بلند نہیں قرار دیا جاسکتا اور کم لوگ اگر چوٹی پر پہنچے ہوں تو چوٹی گڑھے سے پست نہ ہوجائے گی۔

بھلائی کے روپ میں

فرض کیجئے کہ "لپٹن چائے" بہت ہی کامیاب اور مقبول ہوجائے اور اس کا
مقابلہ کرنے کے لئے ایک دوسری فرم جو لپٹن کے درجے کی چائے فراہم نہیں
کی، بلکہ وہ اپنی چائے کو گھٹیا پاتی ہے، اگر میدان میں آنا چاہے تو وہ کونسی چال چلے گی ؟ —— وہ
ے گی کہ اپنے ہاں کی چائے کا نام لپٹن سے ملتا جلتا رکھے گی، ٹریڈ مارک اس کے مشابہ بنائے گی، لیبل بھی
لے انداز کا بنائے گی، اور کوشش کرے گی کہ بہت سے لوگ محض فریبِ نظر کی وجہ سے اس کا مال خریدیں
پ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ان طریقوں کو اختیار کرکے یہ نئی فرم خود اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ واقعی لپٹن
ئے بہت ہی اعلیٰ درجے کی چائے ہے اور پھر وہ اپنا کاروبار جتنا بھی پھیلائے گی، درحقیقت اتنا ہی
او خود لپٹن چائے کے لئے میدان ہموار کرے گی۔ اسی طرح جو صراف پیتل کی انگوٹھی پر سونے کا ملمع کرکے
پیش کرتا ہے وہ خود سونے کی قدر و قیمت کا اعتراف کرتا ہے۔

بالکل ایسے ہی اگر آپ انسانی تاریخِ تمدن اور تاریخِ اخلاق کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ باطل اور برائی جب کبھی بھی میدان میں لائے گئے ہیں حق اور نیکی کے روپ میں لائے گئے ہیں۔ گناہ کو ہمیشہ کامیاب ہونے کے لئے صواب کا جامہ آراستہ کرنا پڑا ہے اور شر کو فروغ حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ خیر کی نقل اتارنی پڑی ہے۔ باطل اور بدی کے اس طریقِ کار کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ہر باطل اور بدی اور نظامِ فاسد اور ان کے علمبرداروں نے اس بات کا خود اعتراف کر کے اپنی مساعی شروع کی ہیں کہ قدر و قیمت اگر ہے تو حق اور خیر کے لئے ہے اور کامیابی اگر حاصل ہو سکتی ہے تو راستی اور نیکی اور نظامِ فلاح ہی کو حاصل ہو سکتی ہے۔

آپ نے ہر جھوٹے کو دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو سچا ثابت کرتا ہے، لیکن کسی سچے کو بھی آپ نے دیکھا کہ وہ اپنے آپ کو جھوٹا ثابت کرے؟ آپ نے ہر دعوتِ شر دینے والے کو خیر کی علمبرداری کا اعلان کرتے ہوئے پایا ہوگا، لیکن کبھی آپ نے ایسا بھی منظر دیکھا کہ کوئی دعوتِ خیر دینے والا شر کی علمبرداری کا اعلان کر رہا ہو؟ آپ نے ہر خادمِ باطل کو اپنے برسرِ حق ہونے کے دلائل دیتے ہوئے ملاحظہ فرمایا ہوگا، لیکن کبھی کسی صاحبِ حق کو بھی یہ استدلال کرتے دیکھا ہے کہ میں خادمِ باطل ہوں؟ آپ نے غیر اسلامی نظاموں کے قیام کی جدوجہد کرنے والوں کو بارہا دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو عین حاملِ اسلام حیثیت سے پیش کرتے ہیں لیکن کیا کبھی آپ نے اسلامی نظام کے کسی داعی کو بھی غیر اسلامی نظام کے خادم کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرتے دیکھا ہے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ پیتل پر لوگ سونے کا ملمع کر کے لاتے ہیں لیکن سونے پر کسی صراف نے پیتل کا ملمع کبھی نہیں کیا؟ کیا وجہ ہے کہ گھٹیا مال بیچنے والے لوگ اعلیٰ مال بنانے والوں کی نقل کرتے ہیں، لیکن اعلیٰ مال بنانے والے نقلی مال بیچنے والوں کی نقل نہیں کرتے؟

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ دراصل فطرت کے نظام میں اور انسانی تاریخ کے بازار میں، اصل کامیابی حق اور نیکی ہی کے لئے مقدر ہے، یہی وجہ ہے کہ باطل اور برائی کے سوداگر جب بھی اپنا مال لاتے ہیں تو اسے حق اور نیکی کے رنگ میں رنگ کر لاتے ہیں۔ وہ جھوٹ کو لاتے ہیں لیکن سچائی کے لیبل کے ساتھ، وہ ذلت کو لاتے ہیں لیکن عزت کے سائن بورڈ کے ساتھ، وہ شر کو لاتے ہیں لیکن خیر کے ٹریڈ مارک کے ساتھ وہ فساد پیش کر

ہیں لیکن خدمت کا عنوان دے کر، وہ معزت کوٹتے ہیں لیکن افادیت کا رنگ روغن چڑھا کر!

نیکی اپنے نام کے ساتھ آتی ہے، بدی کے نام کے ساتھ نہیں آتی، لیکن دوسری طرف بدی کبھی اپنے کے ساتھ نہیں آتی، نیکی کے نام کے ساتھ آتی ہے۔ خیر ٹھیک ٹھیک اپنے روپ میں آتا ہے، شر کے روپ نہیں آتا، لیکن شر اپنے روپ میں نہیں آتا بلکہ خیر کے روپ میں آتا ہے۔ حق پوری طرح بے نقاب ہو کر زار ہوتا ہے، اپنے چہرے پر باطل کی نقاب نہیں ڈالتا، لیکن باطل میں بے نقاب ہو کر آنے کی جرأت نہیں ، وہ مجبور ہے کہ حق کی نقاب اوڑھ کر آئے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق اور نیکی ہی کے لئے اصل کامیابی ہے۔ وہ خود تو کجا ان کا نام اتنا کامیاب ہے کہ باطل اور بدی بھی اسی نام کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس نام کا سہارا لئے بغیر بسر ناکام ہیں۔ باطل اور بدی کا حق اور نیکی کے نام یا روپ کو استعمال کرنا خود اس بات کی شہادت کہ بازارِ حیات میں سارا فروغ حق اور نیکی کے لئے ہے۔

رہی یہ بات کہ حق کے روپ میں جو باطل لایا گیا ہو اس سے کتنے گاہک دھوکا کھا گئے یا نیکی کے لیبل سے ری پیش کی گئی تھی اس سے کتنے خریداروں کی نظر بندی ہو گئی، اس سے حق کی قدر و قیمت اور نیکی کی کامیابی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اگر کسی بازارِ صرافہ میں ہزاروں گاہک بھی روزانہ ملمع کی انگوٹھیاں سونے کے خرید لے جائیں تو اس سے سونے کی کامیابی ناکامی سے اور پیتل کی کم قدری قیمت کی گرانی سے نہیں بدل ۔ کامیابی اور ناکامی تو ساری خریداروں کی ہو گی کہ وہ کھرے اور کھوٹے کی تمیز کرنے میں چابک دستی تے ہیں یا کوتاہی!

حق اٹل ہے، باطل متغیر ہے

حق ——— اس کے جو جو بھی اصول ہیں، وہ ازل سے تا ابد یکساں اور ایک ہی رہے ہیں۔ لیکن باطل ان اصولوں کے جواب میں کوئی ایسے اصول نہ کے آتا جو شروع سے اب تک ایک ہی رہے ہوں۔ باطل ہر دور میں نئے اصول لے کر آتا ہے، نیا فلسفہ نیا استدلال گھڑتا ہے، نیا روپ دھارتا ہے، نئی قدریں لے کے آتا ہے اور پھر حق [illegible]

[illegible] چھوڑ دیتا ہے پھر بالکل نیا [illegible]

ہے اور فلسفہ گھڑتا ہے، کبھی وہ استدلال بناتا ہے اور پھر نئے لاؤ لشکر کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے۔ پھر شکست کھاتا ہے تو کسی نئے رنگ میں ابھرتا ہے۔ اس کا کوئی اصول پائدار نہیں، کوئی رنگ پختہ نہیں، کوئی فلسفہ اٹل نہیں، کوئی استدلال ایسا نہیں جو پائے چوبیں نہ رکھتا ہو۔

بخلاف اس کے حق ہر دور میں ایک ہی اصول رکھتا ہے، ایک ہی فلسفہ سامنے لاتا ہے، ایک ہی استدلال پیش کرتا ہے، ایک ہی اس کا روپ ہوتا ہے، اور باطل کے ہر حملے کے جواب میں وہ اپنے ایک ہی ناقابل فسخ ہتھیاروں سے جنگ آزما ہوتا ہے۔ حق کی فرم کے مقابلے میں ہزاروں فرمیں قائم ہوتی ہیں اور ٹوٹ جاتی ہیں پھر بنتی ہیں، پھر ٹوٹتی ہیں، لیکن وہ فرم بدستور اپنی جگہ جمی رہتی ہے۔

حق نے کہا خدا ایک ہے، لیکن باطل نے اس کے جواب میں کبھی دو خداؤں کا فلسفہ پیش کیا، کبھی تین خداؤں کا، کبھی بے شمار دیوتاؤں کا، کبھی ہمہ اوست کا، کبھی الحاد و دہریت کا، کبھی "اندھی قوت" کی خدائی کا، اور وہ برابر نت نئے فلسفے گھڑتا جا رہا ہے، لیکن حق آج بھی یہی کہتا ہے کہ اس کائنات کا ایک ہی خدا ہے۔ حق نے کہا کہ سچائی، دیانت، پاسِ عہد، حفظِ عصمت، احترامِ ملکیت، ہمدردی و اخوت، انسانی جان کا احترام انسانی اخلاق کے بنیادی اصول ہیں۔ باطل نے اس کے جواب میں قسم قسم کے اخلاقی نظریئے گھڑے، لیکن حق آج بھی اپنے اصولوں کی طرف بدستور دعوت دیتا ہے اور وہی اصول آج بھی فطرتِ انسانی سے مطابقت رکھتے ہیں۔

باطل کی ناکامی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ آج تک وہ کوئی اٹل اصول انسانیت کے سامنے نہ رکھ سکا۔ وہ کوئی دعویٰ فطرتِ انسانی سے مستقل طور پر منوا نہ سکا۔ آج ایک چیز پیش کی اور کل خود ہی اس کی تردید کر دی، آج ایک نظریہ بنایا اور کل خود ہی اسے توڑ کے پھینک دیا، آج ایک تحریک کھڑی کی اور کل وہ نسیاً منسیا ہو گئی، آج ایک نظام بنایا اور کل اسے خود ہی ناکارہ قرار دے کر فراموشی کے گڑھے میں پھینک دیا۔ باطل تو ایک ایسا مبتدی آرٹسٹ ہے جو اپنے بنائے ہوئے ہر نقشِ فن پر پھر خود ہی تھوکتا ہے، لیکن حق کے آرٹسٹ نے جو نمونۂ فن ایک مرتبہ پیش کر دیا وہ پھر ہمیشہ کے لئے انسانی تاریخ کے عجائب گھر کی زینت بن گیا۔

کامیابی آخر وہ ہے یا یہ!

رہا یہ سوال کہ حق کے مسلک اور سادہ خوش کار آرٹسٹ کم ملے اور باطل کے سہل اور غیر لطیف آرٹ کو آرٹسٹ بہت

ل نگے تو اس سے نہ کسی فنِ لطیف کی قدر و قیمت گھٹتی ہے اور نہ کسی احمقانہ فن کی قدر و قیمت بڑھتی ہے۔ دامن
لدیں رکھنے والے آرٹ کے تھوڑے سے آرٹسٹ مٹا مٹا کے بنانے اور بنا بنا کے مٹانے والے آرٹسٹوں کے
یے سے بڑے لشکر پر بھی بھاری رہیں گے۔

ق قائم بالذات ہے
اطل "طفیلی" ہے

آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ کسی کاشتکار نے پیازی یا گوکھروؤں کی فصل بوئی ہو
اور کوئی کھیت اسی فصل کو حاصل کرنے کے لئے جوتا اور سیراب کیا جائے، بلکہ
تا یہ ہے کہ آپ کارآمد فصلیں بوتے ہیں اور ان کی اوٹ میں زمین کی زرخیزی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کچھ
بر مطلوب قسم کی بوٹیاں اور گھاس پھونس بھی اُگ آتی ہے۔ محنتی کسان ان کا استیصال کرنے کے لئے گوڑی اور
ائی کرتا رہتا ہے، پھر بھی کچھ نہ کچھ طفیلی پودے مطلوبہ فصل کے حصے کی غذا اڑا کر پل جاتے ہیں۔ پھر آپ نے
بھی نہ دیکھا ہوگا کہ تنہا آکاس بیل کہیں اُگی ہوئی پائی جائے، اس کی نہ جڑ ہوتی ہے، نہ زمین براہِ راست اسے
دئی غذا دینے پر تیار ہوتی ہے، بلکہ ہمیشہ آپ دیکھیں گے کہ آکاس بیل کسی دوسرے درخت یا جھاڑی
ے طفیل پرورش پاتی ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ حق اور باطل کا ہے۔ باطل جہاں بھی پایا جاتا ہے کسی حق کے سہارے پایا جاتا ہے
الص باطل دُنیا میں کہیں بھی وجود نہیں رکھتا، انسانی فطرت کی کھیتی میں وہ اگر اُگتا ہے تو حق کی اوٹ میں
تا ہے، اور اس کے حصے کی غذا کے بل پر پلتا ہے یہ آکاس بیل کی طرح دوسرے درختوں اور پودوں
ے اوپر پھیلتا اور پھولتا ہے۔

دُنیا میں ہر برائی کسی نیکی کا سہارا لے کر جیتی ہے اور ہر گناہ کو کسی صواب کی اوٹ لینی پڑتی ہے۔
ب تک جتنے نظام ہائے باطل پیش کئے گئے ہیں اور دنیا میں قائم ہو سکے ہیں، ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا
خالص باطل اور خالص برائیوں پر مشتمل ہو، بلکہ باطل اور برائی جب بھی چلی ہے تو اس حق اور نیکی کے
ے پر چلی ہے جس کا کچھ نہ کچھ جزو ہر نظام باطل میں شامل رہتا ہے۔

تمام نظام ہائے باطل خالص باطل ہونے کے بجائے حق و باطل کے مرکبات ہوتے ہیں اور ان
[illegible] کا [illegible] ان کا [illegible] حق کی اس مقدار کے اوپر منحصر ہوتا ہے

ـــــــ بھی جانتے ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری میں بھی باطل موجود ہے اور نظامِ اشتراکی میں بھی باطل کا
شامل ہے، لیکن حق کی ایک مقدار اس کے ساتھ بھی ہے اور ایک اس کے ساتھ بھی ہے اور یہی حق
ہے جس کے سہارے دونوں کے باطل جی رہے ہیں۔ اُس کے پاس بھی بعض بھلائیاں ہیں جن میں
کے لئے اپیل موجود ہے، اور اس کے پاس بھی کچھ خوبیاں ہیں جن میں فطرتِ آدم کے لئے کشش ہے۔
جب بھی بلاتے ہیں تو اپنے بھلائی کے پہلو سامنے لاکر بلاتے ہیں اور لوگ اگر انھیں قبول کرتے ہیں تو
ئیوں ہی کے لئے قبول کرتے ہیں ـــــــ ان کی برائیاں تو ان بھلائیوں کے اوپر آکاس بیل کی طرح
ہیں کہ ان کو قبول کیجئے تو از خود ساتھ آئیں گی۔

جب کوئی نظامِ باطل حق کی کم سے کم مطلوبہ مقدار کو بھی کھو بیٹھتا ہے تو پھر اس کا پنپنا محال ہو جاتا ہے
ں باطل کے لئے تو دنیا میں کوئی چانس ہی نہیں!

تاریخ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کسی نظامِ باطل کے قیام و بقا کا
بھی اس کے جزوِ حق پر ہوتا ہے اور اس وجہ سے اُس کی کامیابی دراصل حق کی کامیابی ہی کا نتیجہ ہے۔
بہرحال، ہر اصول اور فلسفہ اور نظام اپنے جزوِ حق کی وجہ سے مقبول اور قیام پذیر ہوتا ہے۔

طل کے مرکبات کا تصادم

تاریخ اصولوں، فلسفوں اور نظاموں کے تصادم کی جولانگاہ ہے
اس تصادم میں کامیابی اور ناکامی جس اصول پر ہوتی ہے وہ خود
بتاتا ہے کہ کامیاب حق ہے اور باطل بہرحال ناکام ہے۔

یہ تو واضح ہے ہی کہ خالص باطل کے لئے دنیائے انسانیت میں کوئی جگہ نہیں۔ حق و باطل کے مرکبات
تے ہیں۔ ان مرکبات میں تصادم ہوتا ہے اور ہر تصادم میں بازی اُس اصول، فلسفے اور نظام کے ہاتھ
جس میں باطل کا تناسب کم اور حق کا تناسب زیادہ ہو۔ ۵ فی صدی حق اور ۱۰ فی صدی حق رکھنے
ول و نظام کے درمیان اگر ٹکر ہو گی تو ۱۰ فی صدی حق رکھنے والا نظام میدان مار لے گا۔ وہ ساری
قرآن کی ذیل کی آیت کی رو سے ہوتی، اسی اصول پر ہوتی ہے :۔

ولولا دفع اللّٰہ الناس بعضھم ببعض   اگر اللہ تعالیٰ ان (اہلِ باطل) میں سے بعض کو بعض کے

ذریعے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ لفسدت الأرض۔

پھر قانونِ تصادم کے تحت قرآن کا فلسفہ یہ بتاتا ہے کہ مرکباتِ حق و باطل میں سے کوئی بھی جب خالص حق کے سامنے آتا ہے تو اس کے لئے آخر کار لازماً شکست مقدر ہوتی ہے۔ جن آیات کو اس مضمون کے آغاز میں درج کیا گیا ہے ان میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ جب بھی کوئی گروہ خالص حق کو لے کر اٹھتا ہے اور اس کے لئے کامل جدوجہد کرتا ہے تو آخر کار کامیابی اسی کو حاصل ہوتی ہے۔ العاقبة للمتقین انجام کار اہلِ تقویٰ ہی کے لیے ہے۔

خالص حق کے علمبرداروں کی کمی کیوں؟

اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ جب حق انسانی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے، جب نظام کامیاب پوری طرح سازگار اسی کے لئے ہے، جب حقیقی اور پائدار کامیابی بھی اسی کے لئے مقدر ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس کے علمبردار اقلیت میں رہتے ہیں؟ اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔ تاہم ایک مرتبہ پھر ہم اس جواب کو تازہ کر دینا چاہتے ہیں۔

صفائی انسانی فطرت کے مطابق بھی ہے اور صفائی میں پوری پوری افادیت بھی ہے، لیکن پھر بھی صفائی کے تقاضے پورا کرنے والوں کی تعداد کم ہے۔ اور صفائی کی نمائش کی اوٹ میں ہر طرح کی غلاظتوں کو چھپا چھپا کر رکھنے والوں کی اکثریت ہے! صحت ہر شخص کو محبوب ہے اور بیماری کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا، لیکن وہ لوگ جو حفظانِ صحت کے اصولوں پر پوری طرح کاربند ہوں اور بیماری سے بچنے کی تدابیر اختیار کریں بلحاظ تناسب اقلیت میں رہتے ہیں۔ جو صورت معاملہ یہاں ہے وہی حق کے اختیار کرنے میں بھی ہے۔

انسان میں ایک طرف بھلائی اور فائدے کی خواہش موجود ہے اور دوسری طرف اس میں سہولت پسندی اور آرام طلبی کا رجحان بھی کارفرما ہے۔ بھلائی اور فائدے پر محنت صرف ہوتی ہے اور محنت صرف کرنے میں آرام طلبی کا رجحان مانع ہوتا ہے۔ ان دونوں رجحانات کی کشمکش کے تحت آدمی کو عجیب قسم کے ذہنی احوال پیش آتے ہیں۔ وہ کبھی قریب کے چھوٹے فائدے کو دور کے بڑے فوائد پر ترجیح دیتا ہے، وہ کسی فوری مشقت سے بچنے کے لیے بعد کی تکلیف کو گوارا کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، وہ تھوڑی سی محنت کر کے تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لے کو اس سے زیادہ پسند کرنے لگتا ہے کہ زیادہ محنت کر کے زیادہ بڑا فائدہ حاصل کرے۔

اب چونکہ ... یا عمل کر فیصلہ کرنے پر انسان کو فطری جبریت میں مبتلا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ...

کردہ آزادی سے خود انتخاب کرے۔ اس وجہ سے خالص حق کی گراں بہا دولت کو حاصل کرنے کے لئے محنت و ایثار کی بھاری قیمت ادا کرنے والے مردانِ جری کم ہوتے ہیں اور حق و باطل کے سستے مرکبات کے لئے محنت و ایثار کی تھوڑی پونجی صرف کرنے والے زیادہ نکلتے ہیں۔ جیسے سستے مال کے گاہک ہمیشہ زیادہ پائے جاتے ہیں۔

اگر انسانوں کو آزادی دی گئی ہے کہ وہ حق و باطل میں سے خود کسی ایک کو انتخاب کریں اور ساری زندگی اس کی خدمت میں صرف کر دیں تو ظاہر بات ہے کہ اس آزادی کے تحت یہ واقعہ ہونا کچھ بھی بعید نہیں کہ ایک بڑی اکثریت خالص حق سے اعراض کرے، پھر وہ کسی غلط اصول اور باطل نظام کی علمبردار بنے، وہ اس کے لئے دعوت پھیلائے، وہ اس کے لئے منظم ہو، وہ اس کے لئے ذرائع و وسائل جمع کرے، وہ اس کے لئے لڑائیاں لڑے، وہ اس کے لئے لٹریچر اور نظامِ تعلیم فراہم کرے، وہ اس کے سامنے ساری دُنیا کی گردن جھکانے میں مصروف ہو جائے ——— یہاں تک کہ اس کا غلبہ عالمگیر ہو اور وہ تاریخ کے ایک طویل دور پر چھا جائے۔

ایسا ہی ایک دور ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں، اور اس میں باطل کا غلبہ دیکھ کر بظاہر اتنی مرعوبیت طاری ہوتی ہے کہ غلبۂ حق کے امکان سے مایوسی ہوتی ہے حالانکہ یہ دوسرا امکان بھی اسی طرح موجود ہے!

• باطل کے غلبے کے لئے اس کے حامیوں کی بہت بڑی اکثریت جتنا کام کرتی ہے، وہی کام حق کے حامیوں کی نسبۃً بہت کم تعداد سرانجام دے سکتی ہے اور اہلِ حق کا ایک مختصر گروہ اگر معیاری درجے کا ہو تو وہ ساری انسانیت کو اپنے آگے بھیڑ بکریوں کے ایک ریوڑ کی طرح ہانک سکتا ہے۔ یہ وہ فرق ہے جو اُدھر کی کثرت اور اِدھر کی قلت کا توازن (BALANCE) برابر کر دیتا ہے۔

(باقی آئندہ)

———+———

انفرادی ملکیت اسلام میں

(۳)

نعیم صدیقی

...ہیں املاک کے لئے مقداری تحدید نہیں!

سوشلزم کے تحت ملکیت کے جو نظریات تشکیل پذیر ہوتے ہیں، ان میں سے اشتمالیت ہی سوشلزم کے اصولوں کا منطقی تقاضا معلوم ہوتی ہے، جس نے پیدائش دولت کا پورا نظام ہی ...لہ صرف دولت کے تمام انفرادی اختیارات سے بھی فرد کو محروم کرنا ضروری سمجھا ہے لیکن سوشلزم کے اس منطقی تقاضے کو عملاً ...چلنا ممکن نہ تھا اس لئے افراد کے داعیہ ملکیت کی تسکین کے لئے انفرادی ملکیت کے حقوق کو مختلف طریقوں ...رود کر دینے پر اکتفا کیا گیا۔

بعد میں سوشلزم کے اصول اور انفرادی ملکیت کے جذبے کے درمیان ہونے والی کشمکش نے ان کے سمجھوتے ...(COMPRO) کے لئے مختلف ڈھیلی شکلیں پیدا کیں۔ انہی شکلوں میں سے نمایاں یہ تھیں کہ افراد کو نجی املاک کا حق ...ائے لیکن املاک پر مقداری اور استعمالی تحدیدات لگا دی جائیں، نیز سرمایہ، زمین یا دوسرے ذرائع پیداوار بھی ...لے پاس رہنے دیئے جائیں مگر ان کی ایک خاص زائد سے زائد مقدار کو متعین کر دیا جائے کہ انفرادی حقِ ملکیت ...ے زائد وسعت نہیں اختیار کر سکتا۔

علاوہ بریں سوشلزم کے داعی جب کسی انفرادی ملکیت پر چلنے والے نظامِ زندگی کو اجتماعی ملکیت کے نظام میں ...ہتے ہیں اور اس قسم کی ہمہ گیر تبدیلی کے لئے وہ یک دم جست لگانے میں رکاوٹیں محسوس کرتے ہیں تو پھر ایک ...طریق کار اختیار کرتے ہیں۔ وہ پہلا قدم یہ اٹھاتے ہیں کہ مثلاً زمین کی ایک خاص مقدار سے زائد کی ملکیت ...ضبذریعہ قانون ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اس طرح افراد کی املاک میں ریاست کی جابجانہ مداخلت کا دروازہ ...کھل جاتا ہے تو پھر اس دروازے سے اجتماعی ملکیت کا اصول یک ...

یہاں [illegible] داخل ہوتا ہے اور فرد کے حقوق کا قتلِ عام شروع ہو جاتا ہے۔

تحدیدِ املاک کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص حد سے (جو بھی طے کی گئی ہو) زائد املاک —— سرمایہ، زمین، آلات یا نجی املاک —— سوسائٹی میں معاشی و تمدنی مفاسد پھیلانے کا موجب ہوتے ہیں، اور جب اس حد سے ان کے بڑھنے کو روک دیا جاتا ہے تو مفاسد کی روک تھام ہو جاتی ہے۔ یہ نظریہ کہتا ہے کہ فی نفسہ املاک کی ایک خاص مقدار ہے جو لازماً انسان کو اخلاقاً پست اور معاشرتی لحاظ سے سوسائٹی کے لئے مضر بنا دیتی ہے۔ اس مقدار کے ساتھ انسان آدمُشر بن جاتا ہے اور یہ مقدار نہ ہو تو پھر وہ آدمُخیر ہو جاتا ہے۔ گویا مفاسد انسان کے اندر سے نہیں ابھرتے کہ اس کی اصلاح کی جائے، بلکہ اس کے باہر سے —— املاک کی مقدار کے بڑھنے کی وجہ سے —— آکر اس پر چھا جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظریئے کو انسان کے خیالات، اس کے جذبات اور اس کے اخلاق کی تربیت سے کوئی مطلب نہیں، بلکہ وہ املاک کی مقداروں کو ناپنے تولنے اور ان کی قطع و برید کرنے کو انسانی فلاح کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا ایک اسلامی معاشرہ میں جس میں ایک اسلامی اسٹیٹ اسلام کے نظامِ تربیت اور نظامِ قانون کے ساتھ کارفرما ہو، املاک کی کوئی مقدار فی نفسہٖ کسی فرد کے اخلاق کے لئے موجبِ فساد ہو سکتی ہے؟

آپ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں! وہ بے شمار لوگوں کی محنت کو روپے، زمین اور آلات کے زور سے ناجائز کمائی کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

مگر جس اسلامی ریاست کی طرف سے معاشی نظام کے اصولیات میں یہ طے کیا گیا ہو کہ کسی کی محنت سے استفادہ کرنے والے کے لئے واجب ہوگا کہ وہ اس کی بنیادی ضروریات کو پورا کرے (ورنہ ریاست خود ضامن ہے کہ ہر شہری کی ضروریات کا انتظام کرے اور اس مقصد کے لئے وہ بہرحال زائد املاک رکھنے والوں پر ہی بار ڈالے گی) اس کے زیرِ سایہ یہ کیسے ممکن ہے کہ محنت کار سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے؟

پھر اسے اپنے کاروبار میں سے ۲½ فی صدی زکوٰۃ بھی دینی ہے، حکومت کے دوسرے ٹیکس بھی دینے ہیں اور دوسرے چندے اور صدقات بھی ادا کرنے ہیں جو افادۂ عام پر صرف ہوں گے۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ محنت کے جائز معاوضے دے کر اور جملہ حقوق ادا کر کے بھی اتنا زیادہ بچا سکتا ہے کہ مزید سرمایہ، مزید زمین، مزید [illegible]

یہ ٹھیک ہے ——— وہ یقیناً زیادہ ذرائع جمع کر کے زیادہ کمائی کرنے لگتا ہے اور بہت سارا روپیہ جمع کر لیتا ہے، لیکن اس روپے سے وہ کرے گا کیا؟

آپ کہتے ہیں کہ وہ اس کو عیاشی میں جھونک دے گا اور عوام ضروریات سے محروم ہو جائیں گے۔

لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ اسلام میں نہ شراب جائز، نہ موسیقی جائز، نہ رقص جائز، نہ قمار کی تفریح جائز، نہ ریشمی لباس جائز، نہ سونے چاندی کے برتنوں کا رکھنا جائز، نہ تصاویر اور مجسموں کا وجود جائز، نہ تقاریب پر بینڈ باجے اور دوسری فضول رسوم جائز ——— عیاشی کے بڑے بڑے شادرے تو یہاں بند ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے فالتو روپے کو کرائے پر چڑھا کر دولت کا بہاؤ روک کر اس سے اپنے حوض بھرتا رہے گا۔

لیکن آپ کو یہ بھی جاننا چاہیئے کہ اسلامی معاشرہ میں سود اور سود کے اصول پر بینک کاری اور سٹہ کے اصول پر تجارت وغیرہ کے سارے طریقے ممنوع ہیں۔

پھر آپ یہ خدشہ ظاہر فرماتے ہیں کہ وہ دولت کو بے کار ڈالے رکھے گا۔

حالانکہ جمع شدہ روپے پر زکوٰۃ عائد کر کے اسلام نے جمع کرنے والے کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اسے پیدا آور مقاصد میں لگائے، لہٰذا وہ بے کار نہیں ڈال سکتا نیز اس کے باوجود بھی اگر وہ کچھ جمع کر کے رکھے تو اس کی موت پر اس کے سرمائے اور ذرائع پیداوار کے ساتھ اس کا بے کار پڑا ہوا روپیہ بھی متعدد مستحقین میں بٹ جائے گا۔

اندریں حالات املاک کی مقداری تحدید کا نظریہ ایک مسلمان کی نگاہ میں بالکل فضول اور بے سروپا قرار پاتا ہے۔

اب آئیے اور معاملہ رکھیئے اسلامی قانون کے سامنے!

فرض کیجئے کہ ایک شخص سو ایکڑ زمین کا مالک ہے، آپ کہتے ہیں کہ ہم اس کو صرف ۵۰ ایکڑ زمین رکھنے کا حق دینا چاہتے ہیں، بقیہ پچاس کو اس سے سلب کر لینا چاہیئے۔ اسلامی قانون آپ سے پوچھتا ہے کہ ۵۰ ایکڑ کی ملکیت کو جائز اور ۱۰۰ کی ملکیت کو ناجائز قرار دینے کے لئے آپ کے پاس قانونی دلائل کیا ہیں؟ آپ کو ثابت کرنا ہے کہ اس نے پچاس ایکڑ ناجائز کمائے ہیں یا کسی دوسرے سے زبردستی چھینے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ شخص چونکہ ۱۰۰ ایکڑ [illegible] جب تک ۵۰ ایکڑ سے زائد رقبہ اس کے پاس رہے یہ سوسائٹی اور دوسرے افراد کی

[illegible]

اس کی طرف سے سوسائٹی پر ہو رہی ہے تاکہ اس کی تلافی کی جائے۔ قصور اگر کوئی ہے تو اس شخص کا ہے یا ۵۰ ایکڑ زمین کا؟ اگر قصور ۵۰ ایکڑ زمین کا ہو تو اس کا حل سوچا جائے اور اگر قصور اس شخص کا ہو تو اس کی اصلاح کی جائے۔

اب آپ بگڑ کر کہتے ہیں کہ یہ قانون تو دراصل ملاؤں کی بنائی ہوئی پرانی فقہ ہے جو آج کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔

بہت اچھا! آپ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو سامنے رکھ کر کوئی دلیل اس بات کی دیجئے کہ سونے چاندی، مویشیوں، زمین، مکانات، لباس اور دوسرے ضروریات و آلات میں سے کسی ایک کے بارے میں اشارۃً بھی کہیں مقداری تحدید کے لئے کوئی قانونی نکتہ ملتا ہے ——— کوئی نظیر، کوئی مثال، کوئی قانونی فیصلہ، کوئی اجتہادی اجماع!

اگر آپ کو ایسی کوئی دلیل نہ ملے تو پھر آپ کو حق کیا ہے کہ آپ تحدید املاک کے نظریے کو اسلام سے کوئی نسبت دیں۔ ——— ایک فکر جو پیدا ہی سوشلزم کے گھر ہوئی، اس کا شجرۂ نسب اسلام سے ملانے کے لئے سوائے دین کی مضحکہ انگیز تاویل کرنے کے اور کوئی راستہ آپ کو نہ مل سکے گا۔

اسلام میں ساری تحدیدات کمانے کے ذریعوں، خرچ کرنے کے راستوں اور دوسروں سے معاملہ کرنے کے طور طریقوں کی غلط نوعیتوں پر ہیں، نہ کہ کمانے اور خرچ کرنے اور املاک رکھنے کی مقداروں پر۔ اگر فساد مقداروں کا ہوتا تو پھر ساری تحدیدیں مقداروں پر ہونی چاہیئے تھیں اور اصولوں اور طور طریقوں کو آزاد ہونا چاہیئے تھا، لیکن چونکہ اسلام کے نزدیک سب فساد غلط اصول اور غلط طریقے ہوتے ہیں، لہٰذا اس نے ساری تحدیدیں اسی پہلو سے عائد کی ہیں اور مقداروں کے لئے کوئی ضابطہ بندی نہیں کی، سرمائے، وسائل اور ذرائع آمدنی کا کوئی راشننگ سسٹم اس نے جاری نہیں کیا۔

نمونے کی سوسائٹی جو نبی صلعم نے صحابہؓ کی تربیت سے خود بنائی تھی وہ املاک کی مقداری تحدید سے پاک تھی۔ کسی چیز پر بھی تحدید نہ تھی کہ اتنے سے زائد درہم و دینار رکھنا حرام، اتنے سے زیادہ بھیڑ بکریاں اور اونٹ پالنا ممنوع اور اتنے سے زائد زمین پر قبضہ ناجائز ——— جو زائد ہو وہ ریاست کی ملکیت!

قرآن میں اللہ نے رزق اور دوسری نعمتوں کے بارے میں آخر یہ بات جو کہی ہے کہ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر تو اس کے کیا معنی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کی بخشش کے معاملے

منشا الٰہٰی نہیں رکھا کہ تمام افرادِ انسانی کے لئے پیمانہ ایک ہوگا، نہ کسی کو اُس سے کم ملے گا، نہ زائد۔

کہا جاتا ہے کہ بلاشبہ "تحدیدِ املاک" کا نظریہ عالمِ انسانی کی تازہ ایجاد ہے، لیکن یہ اُن حالات کا نتیجہ ہے جو قرآن کے نزول کے بہت بعد پیدا ہوئے ہیں۔ مگر سوچئے تو سہی کہ یہ حالات بہرحال غیر اسلامی نظام کی ایک بدترین صورت ——— سرمایہ داری ——— کے تحت ہی تو پیدا ہوئے ہیں، خود اسلامی نظام کے اندر تو اس طرح کے مفاسد کا امکان نہیں کہ باہر سے ان کے لئے سامانِ علاج خرید کے لانا پڑے۔ یہ مفاسد غیر اسلامی نظام کے ہیں اور وہ ان کے لئے غیر اسلامی علاج ایجاد کرتا رہے ہمیں اس سے کیا دلچسپی! ہمارا کام تو موجودہ نظام کو اسلامی نظام سے بدلنا ہے۔

کیا اسلام کاروباری سرمائے کی ملکیت پر کوئی پابندی لگاتا ہے؟

اشتراکی اسٹیٹ نے کاروباری سرمائے اور ذرائع پیداوار کی ملکیت کو افراد کے لئے حرام ٹھیرا دیا ہے۔ آپ اپنا روپیہ عیاشی میں صرف کرسکتے ہیں لیکن اس کو کاروبار میں لگانے یا اس کے ذریعے ذرائع پیداوار حاصل کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔

شریعتِ اسلامیہ کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ خدا کے حلال ٹھیرائے ہوئے کو حرام قرار دینا اپنے آپ کو خدا کی ہمسری کے مقام پر لانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنی زمین میں بھیجتے ہوئے مجاز ٹھیرایا کہ وہ جائیں اور رزق حاصل کریں اور رزق کے ذرائع بھی۔ متاع کی تعریف میں یہ بھی داخل ہے وہ بھی! لیکن اس سرزمین پر کچھ ایسے فلسفی پیدا ہوجاتے ہیں جو کہتے ہیں کہ رزق تو حاصل کرسکتے ہو لیکن ذرائع رزق پر حکمران طاقت کا قبضہ ہوگا اور جو کچھ تم کو ملے گا براہِ راست خدا کے خزائن سے نہیں بلکہ اس حکمران طاقت کے واسطے سے ملے گا۔ تم پہلے کما کے سب کچھ اس طاقت کے حوالے کرو، پھر یہ طاقت جس طرح مناسب سمجھے گی تم میں بٹوارہ کرے گی۔

اس فلسفے کو ماننے والے جائز ہی نہیں، لازم قرار دیتے ہیں کہ فرد کو ذرائع پیداوار کی ملکیت سے محروم کردیا جائے۔ ——— آئیے یہ سوال خود اسلام کے سامنے لے جاکے رکھا جائے۔ ہم خدا کی کتاب اور اس کے رسول سے پوچھتے ہیں کہ ایک شخص اس کا مجاز ہے یا نہیں کہ وہ اپنے روپے سے تجارت کرے، ایک خراس [illegible] کی پسائی کا کام [illegible] کرے اور [illegible] ہوئے [illegible] مشین مہیا کرے اور معاوضہ لے کر لوگوں کی [illegible]

جا ئیے کوئی زمین مول لے اور اجرت دے کر کاشت کرائے، باغ لگائے اور بالیوں کو ملازم رکھ کر پھل پیدا کرے، مکان تعمیر کرے اور کرائے پر دے، یا بیل گاڑیاں چلائے اور لوگوں کے بوجھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائے؟

اب فرمائیے کہ خدا کی کتاب، اس کے رسول کی سنّت (قول اور عمل دونوں) اور ان کا اتباع کرنے والے خلفائے راشدین کا نظام حکومت اس سوال کا جواب کیا دیتے ہیں؟ بغیر اس کے کہ بیچ میں آپ اپنی کوئی "اگر مگر" شامل کریں، آپ وہاں سے کیا جواب پاتے ہیں؟

جب بات یہاں پہنچتی ہے تو لوگ "یہ زمانہ" اور "آج کل کے حالات" کا ذکر چھیڑ کر کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو بات ایسے موقع پر پیش کی جاتی ہے وہ "الارض للّٰہ" کے قرآنی الفاظ سے زبردستی نکالی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن ہی نے تو زمین کو بندوں کی ملک کے بجائے اللہ کی ملک قرار دیا ہے، اور اسی لئے قرار دیا ہے کہ یہ مرکزی ذریعۂ پیدائش دولت ہے۔

ناواقف آدمی اس استدلال کو سن کر چوکنا ہو جاتا ہے، لیکن اگر کوئی قرآن پڑھنے والا یہ مطالبہ کر بیٹھے کہ اچھا ذرا قرآن کھول کر دیکھیں تو سہی کہ یہ الارض للّٰہ کس کلام کا ایک جزء ہے تو اس دلیل بازی کی ساری عمارت ڈھے جاتی ہے۔ یہ کلمہ اپنے موقع پر قطعاً دوسرے مطالب کے ساتھ وارد ہے۔ قرآن کا بیان یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے سامنے جب ان کی قوم فرعون کے مظالم کا ذکر کرکے مایوسی اور بددلی کا اظہار کرتی ہے تو وہ اس کو جدوجہد جاری رکھنے کی ترغیب دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

استعینوا باللّٰہ واصبروا ۚ ان الارض للّٰہ یورثھا من یشآء من عبادہ ط والعاقبۃ للمتقین ۝

اللہ سے مدد طلب کرو، اور ثابت قدم رہو۔ زمین کا مالک (فرعون نہیں) اللہ تعالیٰ ہے۔ اور وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وارث بنا دے، اور اس معاملے میں انجام کار کامیابی اہل تقویٰ کے لئے ہے۔

اپنے صاف صاف مفہوم کی رو سے یہ آیت خالص "سیاسی" ہے اور ایک فی صدی بھی "معاشی" نوعیت نہیں رکھتی۔ اگر یہ آیت معاشی مسائل کے تحت آتی تو قدرتی طور پر الارض کے معنی "کھیتی" یا زیر کاشت زمین کے ہوتے۔ اور اس مقام پر "الارض للّٰہ" سے مجتہدین کرام جو استدلال کرتے ہیں اگر اللہ میاں کو اسی کے مطابق بات کہنی ہوتی تو

کسی کھیت پر مالکانہ زمین کا حق ملکیت تسلیم نہیں کیا جا سکتا بلکہ جو کاشت کرے صرف وہ کاشت کے زمانے تک اس کا مالک ہے تو پھر گویا ان حضرات کے نزدیک وہ ایسی ہستی ہے جسے (نعوذ باللہ) ایک سیدھی سی بات کہنا بھی نہیں آتا اور اس کے لئے اسے مناسب الفاظ نہیں ملتے۔

پھر یہ حضرات مفسرین آیت کو اپنی جگہ چھوڑ کر دوڑتے ہیں اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب اٹھا لاتے ہیں کہ دیکھو اس میں "الارض للہ" کی شرح میں یہ لکھا ہے کہ زمین ایک کارواں سرائے کی حیثیت رکھتی ہے کہ جو آئے اس میں بسیرا لے اور رخصت ہو جائے، یہاں مالک بننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اسی کتاب میں "الارض للہ" کی اس تعبیر کے پیش کرنے والے، امام نے جہاں واضح طور پر ملکیت کے انسانی حق کے بارے میں قلم اٹھایا ہے اور جہاں دوسرے کی محنت خریدنے کا اصول واضح کیا ہے اور جہاں زمین کو دوسروں سے کاشت کرانے کا قاعدہ بیان کیا ہے، وہاں ان کی نگاہ نہیں جاتی اور نہ یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان دونوں باتوں میں وجہ تطبیق کیا ہے۔

اگر "الارض للہ" کا مفہوم یہی تھا کہ ذرائع پیداوار ملت کے دست تصرف میں رہیں گے اور افراد کو سارا رزق خدا کے خزانوں سے براہ راست نہیں، بلکہ ریاست کے "قومی ملکیت" کے نظام کی معرفت ملے گا تو پھر قرآن کے مصنف (خدا تعالیٰ) اور اس کے شارح (نبی صلعم) کے بارے میں آپ کی رائے اس کے سوا کیا قرار پائے گی کہ (نعوذ باللہ) نہ حکم دینے والے کو اپنی بات واضح کرنا آیا اور نہ شرح کرنے والے کی عقل میں اصل بات بیٹھی، اور نہ ان دونوں کے ماننے والوں کو نظام زندگی قائم کرنے والوں کو ایک حکم کی تعمیل کا سلیقہ آیا۔

سوال یہ ہے کہ انفرادی ملکیت کے ایک معروف طریق کو بدلنے کے لئے ویسا ہی انقلابی اعلان اور انقلابی عملی اقدام ضروری قرار پاتا ہے جیسا شراب اور سود اور بیٹیوں کے قتل اور کعبہ کے ننگے طوافوں اور بت پرستی کے خاتمے کے لئے کیا گیا تھا، پھر کیوں اس طرح کا تبدیلی پیدا کرنے والا اعلان و اقدام نہ کیا گیا؟ پھر اس میں رکاوٹ کیا تھی کہ اس وقت کی ساری زمین اور سرمایہ اور ذرائع پیداوار صاف صاف طریق سے افراد سے لے کر اجتماعی تنظیم کے حوالے کر کے جمہوری سسٹم پر زندگی استوار کر دی جاتی۔ پورے عرب کو ایک یا متعدد کمیون (COMMUNE) کی صورت

[illegible]

موقع اس وقت پیدا ہوا تھا جب مدینے میں مہاجرین کی ایک بڑی تعداد وارد ہوئی تھی لیکن اس وقت بھی نبی صلعم نے کوئی قانونی حکم جاری کئے بغیر محض اخلاقی اپیل کرتے ہوئے انصار سے صرف یہ چاہا کہ وہ اپنے انفرادی املاک کو برقرار رکھتے ہوئے مہاجرین کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد کریں اور انصار نے اس اپیل پر اس حد تک عمل کر کے دکھایا جس حد تک انسان فراخدلی اور ایثار میں آگے جا سکتا ہے۔ لیکن بہرحال یہ نہیں ہوا کہ نبی صلعم نے صدرِ ریاست ہونے کی حیثیت سے سرمایہ و وسائل پر سے کچھ انفرادی ملکیت کو ساقط کر کے بروئے قانون حکومت کو دولت کا انچارج بنا کر افراد کے لئے مشترک کمائی اور مشترک صرف کی صورت قائم کر دی ہو۔ آپ پوری دولت پر حکومت کے قانونی تصرف کو بھی چھوڑ دیجئے، اس کا کوئی ثبوت نکال کے دکھائیے کہ مہاجرین کا وقتی مسئلہ حل کرنے کے لئے بھی کسی ایک فرد کی کسی نوعیت کی کسی ایک مِلک کے خلاف بھی قانونی کارروائی کی گئی ہو کہ اس کو تم اپنے پاس رکھنے کے مجاز نہیں ہو۔ تمہاری زمین، یا مکان، یا اونٹ اور مویشی بحقِ سرکار اجتماعی مِلک میں داخل کرنے کے لئے ضبط کئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ منافقین جنھوں نے اسلامی اخوت کے اخلاقی تقاضوں کو پورا کرنے سے اپنے اموال کو ہمیشہ بچا کے رکھا، ان سے بھی نہ مہاجرین کے مسئلے کا مقابلہ کرتے ہوئے اور نہ قریشِ مکہ کی جنگی کارروائیوں کی ٹکر سہتے ہوئے قانونی جبر سے کوئی مِلک سلب نہیں کی گئی۔ بخلاف اس کے خلیفہ اول نے زکوٰۃ کا حق روکنے والوں کے خلاف سرکاری طور پر سخت ترین اقدام کر کے واضح کر دیا کہ اللہ کے مطالبے کو روکنے کا مجاز کوئی نہیں۔ پھر اگر انفرادی مِلک کا خاتمہ ہی خدا کے دین کو مطلوب تھا تو اس معاملے میں کوئی کھُلا کھُلا اقدام کیوں نہ کیا گیا؟

مدینے کے معیاری اسٹیٹ کے تحت بڑے سرمائے کے تجار بھی موجود رہے، بڑے زمیندار بھی موجود رہے، اونٹوں کی بڑی تعداد کو کرایوں پر چلانے والے بھی موجود رہے، پھلوں کا وسیع کاروبار کرنے والے بھی موجود رہے ——— لیکن کسی نے ان کے ذرائع و وسائل اور سرمایوں کے خلاف قانونی کارروائی سے کبھی کام نہ لیا۔

پھر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب "الحکم للہ" میں حکومت کو اللہ کا حق قرار دیا گیا ہے اور جائز حکومت صرف قرار پاتی ہے جو اس کی نیابت میں پوری ملت کے اشتراک سے چلے اور اس کو کسی فرد کی مِلک قرار نہیں دیا گیا

اگر یہ بھی "الارض للہ" کے فقرے کا مطلب یہی سمجھ لیا جائے کہ چونکہ زمین مشترکہ ملک ہے لہٰذا "ان الحکم" کی طرح انفرادی ملک میں دینا ناجائز ہے اور اس پر ملت کی اجتماعی ملکیت قائم ہونی لازم ہے۔

حالانکہ یہ کہنے والوں کو دونوں کا فرق نظر نہیں آتا کہ سرمایہ، زمین، آلات و وسائل وغیرہ کمائی کے ذرائع ہیں لیکن حکومت کسی کاروبار یا کمانے کے ذریعے کا نام نہیں بلکہ ایک مشترکہ نظم ونسق کا نام ہے۔ رزق اور کمائی کے ذرائع پر فرد کے لئے شریعت نے مِلک و قبضے کا حق تسلیم کیا ہے لیکن حکومت کے لئے نہیں۔ اپنے اپنے ذرائع و وسائل سے افراد الگ الگ کام لے سکتے ہیں، لیکن ہر فرد اپنی اپنی جگہ حکومت نہیں چلا سکتا۔ ذرائع رزق ہر فرد کو الگ الگ درکار ہیں اور حسبِ صلاحیت و ضرورت درکار ہیں، لیکن حکومت بہت سے افراد کو مشترکہ طور پر ایک ہی قائم کرنی ہوتی ہے اور وہ ہوتی ہی ہے زندگی کے اجتماعی تقاضوں کے لئے۔

پھر معاملہ یوں نہیں ہے کہ آپ "ان الحکم الا للہ" کے ایک کلمے کو سامنے رکھ کر اس میں سے حکومت کے بارے میں سارے ضابطے اور نظریے نکالتے چلے جائیں۔ اسی طرح "الارض للہ" کے کلمے کو سامنے رکھ کر اس پر ایک معاشی فلسفے کا محل کھڑا کرنا درست نہیں ہے۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ خدا کی حکومت کے لئے جس طرح آپ کو خدا ہی کی طرف سے کچھ اصول، دستوریات، ضوابط اور عملی نظائر ملتے ہیں، اسی طرح آپ زمین اور دوسرے املاک کے بارے میں خدا سے یہ معلوم کریں کہ وہ کیا اصول، قانون اور ضوابط دیتا ہے، اور ان کی رو سے وسائل کی انفرادی ملکیت حرام ہے یا حلال! اگر حلال ہے تو اسے حرام کرنے کے لئے اختیار کونسا ہے؟ خدا تعالیٰ نے اگر اپنے آپ کو زمین کا مالک قرار دینے کے بعد حکومت کے واسطے کے بغیر افراد کو حقِ ملکیت دیا ہو تو آپ کون ہوتے ہیں جو بیچ میں آکودیں اور کہیں کہ یہ "حق" تو اسلامی نہیں ہے اسے سلب کر لینا چاہیئے۔ خدا کا دعوائے ملکیت تو یہی ہے اس لئے کہ وہ چاہتا ہے کہ میں اپنی مِلک پر جسے تصرف دینا چاہوں اس میں کوئی دوسرا مانع نہ ہو۔ آپ گویا اسی کی نفی کرتے ہیں۔

یہ وہ ذہنی پیچ کے طریقے ہیں جن سے سوشلزم کے جدید نظریے کو اسلام کا جامہ پہنا کر درحقیقت یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جس حقیقت کو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت دنیا کے سامنے واضح کر چکی [illegible] ختم کر گیا، ملکیت [illegible]

کہ حکومت ٹھیک ٹھیک طریق سے نافذ نہ کرسکی اسے قائم کرنے کا حق ادا کیا تو لینن اور اشتراکیوں نے! جو کام دین نہ کرسکا وہ کفر نے کر دکھایا اور اب اس دین کی تکمیل بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ اس کفر سے مانگ تانگ کے کچھ اصول لائے جائیں اور اس میں فٹ کئے جائیں۔

اسلام اس سے بری ہے کہ اس نے ذرائع و وسائل اور کاروباری سرمائے کو کسی صورت میں بھی افراد کے لئے شجر ممنوعہ قرار دیا ہو۔ اس کی پالیسی تو البتہ یہ رہی ہے کہ اس نے کاروبار سے اپنی حکومت کو الگ رکھا ہے اور افراد کی آزادیٔ کسب اور آزادیٔ انتفاع کو پوری طرح برقرار رکھا ہے۔

اس دین کے لانے والے نے تو دوسرے کے سرمائے پر خود محنت کی ہے اور شراکتِ منافع پر کاروبار کیا ہے۔ حضرت خدیجہ سرمایۂ وافر کی مالک تھیں اور آپؐ ان کے سرمائے سے کاروبار کرکے پوری کمائی ان کے سامنے لا رکھتے تھے، لیکن آپؐ نے اپنی زوجۂ محترمہ تک کو خدا کی طرف سے یہ حکم نہ سنایا کہ سرمائے کی ملکیت حرام کر دی گئی ہے لیکن کچھ لوگوں پر نئی وحی اتری ہے جس کے تحت وہ نبی صلعم کی تعلیم کی اصلاح فرمانے لگے ہیں۔

کاروباری سرمائے (کاروباری زر، آلات، ذرائع و وسائل) پر شریعت کی پابندیاں صرف حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) جائز طریق سے اس کی ملکیت حاصل کی گئی ہو۔

(۲) اسے صرف کمائی کے جائز طریقوں میں استعمال کیا جائے۔

(۳) اس پر اگر دوسروں کی محنت لی جائے تو فراخدلی سے ان کے واجب الادا حقوق ادا کئے جائیں۔

(۴) اس میں سے (اور اس کی آمدنی میں سے) صدقاتِ واجبہ اور نظامِ اسلامی کے مالی مطالبات دیانتداری سے ادا کئے جائیں۔

شریعتِ اسلامی کی طرف سے ان پابندیوں سے زائد کوئی پابندیاں کاروباری سرمائے اور ذرائع و وسائل پر ثابت نہیں ہیں۔ جو لوگ کچھ الفاظ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے کتاب و سنت کی ساری تصریحات کو ایک طرف سے الگ رکھ کر ان الفاظ سے شاعرانہ[1] اور فلسفیانہ قسم کے فقرے برآمد کرتے ہیں، پھر اپنے ان فقروں سے کچھ اور نتائج نکالتے ہیں،

---

[1] بطور مثال اس طرح کا ایک فقرہ یہاں درج کیا جاتا ہے: "قانونِ خداوندی کے مطابق قائم کردہ نظام میں افراد کی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس میں افراد کا فریضہ نوعِ انسانی کی ربوبیت (نشو و نما) ہے"۔۔۔۔۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

پھر ان نتائج سے ایک معاشی نظام گھڑتے ہیں، پھر اس معاشی نظام کے مطابق احکام نکالتے ہیں، وہ اپنی خیال آرائیوں کے خود ذمے دار ہیں۔

اس بحث کو جاری رکھنے کے لئے جب اور کوئی راستہ نہیں ملتا تو آخر کار لوگ آیتِ کنز کو لے کر آتے ہیں کہ دیکھا اس کی رو سے سونے چاندی کی کوئی مقدار جمع کر کے رکھنا ممنوع ہے۔

آیتِ کنز سورۂ توبہ میں ایک ایسے محلِ کلام میں آئی ہے جس میں حق و باطل کی کشمکش کا ذکر کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ احبار و رہبان یعنی (بنی اسرائیل کے) صوفیا و علما جنہیں دینِ حق کا ہمہ تن خادم ہونا چاہیئے تھا اب اس پستی میں آگرے ہیں کہ اسی دین کے نام سے حرام کمائیاں کرتے ہیں اور پھر ان کمائیوں سے سونے چاندی کے جو انبار جمع کرتے ہیں ان کو بھی خود دینِ حق کو غالب کرنے والی تحریک کا راستہ روکنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اب ان لوگوں پر بات کو بالکل چسپاں کرتے ہوئے یہ کہا جا رہا ہے کہ مال و دولت کی قوت کو جو لوگ اس طرح سمیٹے بیٹھے ہیں، ان کو جان لینا چاہیئے کہ جب تک وہ اسے راہِ حق میں استعمال نہ کریں، وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کو عذابِ الیم کی "بشارت" دی جائے۔

اس سے بلاشبہ یہ بات بھی نتیجۃً اخذ ہوتی ہے کہ مسلم سوسائٹی میں جو لوگ اپنے اموال کو سینت سینت کر ان پر سانپ بنے بیٹھے رہیں، درانحالیکہ ان کے روبرو خدا کا دین موت و حیات کی کشمکش سے دوچار ہو اور یہ کشمکش کہہ رہی ہو کہ اغنیاء اپنے اموال کو لائیں اور کوڑی کوڑی "فی سبیل اللہ" صرف کر دیں تو وہ آخرت میں سخت گرفت کے مستحق ہوں گے۔ چنانچہ اس تنبیہ کا یہ اثر صحابہ کی سوسائٹی پر رونما ہوا تھا کہ مالدار لوگ متفکر ہو ہو کر آنحضور صلعم سے دریافت کرنے لگے کہ کیا سونے چاندی کی کوئی مقدار رکھنا ان کے لئے جائز نہیں رہا اور "کنز" ہر حال میں حرام ہے۔ اس کے جواب میں

(بقیہ صفحہ گزشتہ) "نوعِ انسانی کی ربوبیت" کی اصطلاح کو، اب اس اصطلاح سے ذہن میں جو شاعرانہ فضا بنتی ہے اس کے پیٹ سے عجیب و غریب تصورات و تخیلات جنم لیتے ہیں، یہاں تک کہ آدمی خدا اور اس کی کتاب کو بھول کر ہمہ تن "نوعِ انسانی کی ربوبیت" کے خوشنما فلسفہ کی گورکھ دھندوں میں کھو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ اسلام ہی ہوگا۔ کبھی ذرا سوچئے تو سہی کہ [illegible] "نوعِ انسانی کی ربوبیت" آخر آپ نے کہاں سے لے لئے!

[illegible] باقی رکھا گیا کہ زکوٰۃ دینے کے بعد (جائز کمائی سے حاصل کردہ) سیم و زر کا کنز کی اس ممنوعہ صورت سے خارج ہو جاتا ہے جس کے لئے اس آیت میں وعید آئی ہے۔ ورنہ اگر حدیث کی اس وضاحت کو نہ مانا جائے تو حسب ذیل نتائج برآمد کئے جاسکتے ہیں :-

ایک یہ کہ سونے چاندی کی کوئی چھوٹی یا بڑی مقدار (سکے، زیور یا ڈلی کی شکل میں) کسی کم یا زیادہ مدت کے لئے پاس رکھنا موجب وعید ہے۔

دوم یہ کہ سونے چاندی کی جو مقدار جس صورت میں بھی ہاتھ آئی ہو اسے پورے کا پورا صرف اللہ کے راستے میں خرچ ہونا چاہئیے اور اپنی ضروریات پر اس میں سے کچھ خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

سوم یہ کہ مستقبل کی ضروریات کے لئے کوئی شخص کسی مقدار میں سیم و زر کو پس انداز کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

چہارم یہ کہ سونے چاندی کے اوپر جو زکوٰۃ لگائی گئی ہے وہ بالکل فضول کارروائی تھی۔

چونکہ ان نتائج سے کوئی شخص بھی ہوش و خرد کی بحالی کے ساتھ اتفاق نہیں کرسکتا، اس لئے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اور علمائے متاخرین نے بالاتفاق نبی صلعم کی اس تفسیر پر ایمان لانے کا اقرار کیا ہے جو آنحضور نے اس آیت کی فرمائی اور جو عملاً نظام اسلامی میں رائج ہوئی۔ اس آیت کے تقاضے صرف یہ ہیں :-

اوّل احبار و رہبان کے لئے جائز نہیں کہ وہ دین کے نام پر کچھ تقریبات پر، کچھ رسموں کی انجام دہی کے لئے فیسوں اور نذروں کے تعین سے فتویٰ فروشیوں کے کاروبار سے اور اہلِ اقتدار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دین کے مقاصد میں تحریف کر کے ناجائز کمائیاں کریں۔

دوم : احبار و رہبان کے لئے خصوصاً اور دین کا نام لینے والوں کے لئے عموماً یہ طرزِ عمل انتہائی مکروہ ہے کہ وہ اپنے قویٰ ــــ خصوصاً مالی قوت ــــ کو خود دین کے غلبے کی کوششوں کو روکنے پر صرف کریں۔

سوم : اموالِ کنز میں سے باقاعدگی سے صدقاتِ واجبہ ادا کئے جائیں، نیز خدا کا دین اپنے بقا و استحکام کے لئے اہلِ مال سے جو مطالبہ رکھتا ہو اور اسلامی ریاست کی سرگرمیاں ان پر جو مالی بار ڈالیں ان کو وہ پورا کریں۔

بس ان تقاضوں سے آگے بڑھ کر اگر کوئی تحدید ایسی لگائی جائے جو سونے چاندی کی ملک کا حق ساقط کر دے یا اس کو کسی خاص مقدار سے زائد کو حرام ٹھیرا دے تو وہ شریعت اسلامی کے اندر کی چیز نہ ہوگی، باہر کی ہوگی۔

کیا قومی ملکیت کا اصول نظام اسلامی میں اختیار کیا جا سکتا ہے؟

قومی ملکیت کے اصول کو نظامِ اسلامی میں فٹ کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہے اور اس حرکت سے مفید نتائج نکلیں گے یا مضر، اس سوال کا مفصل جواب میں اپنے پمفلٹ "قومی ملکیت" میں دے چکا ہوں۔

یہاں اصل میں سوال کی پیشِ نظر نوعیت یہ ہے کہ افراد کو جو حقوقِ ملکیت (مقید پابندیوں اور حدود کے ساتھ) خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی تصریحات کے مطابق عطا کئے ہیں، کیا بروئے دستور آئندہ ان کو مسلمانوں کی ایک ریاست ان سے سلب کر سکتی ہے؟

اسلامی اسٹیٹ میں پورا نظامِ حکومت درحقیقت اصل حاکم (خدا) کے مقابلے میں وائسرائے (نائب) کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کی ریاست کے دستور میں حکومت کے مقابلے میں افراد کو جو حقوق خود اصل حکمران کی طرف سے دے دیئے گئے ہیں ان کو اگر بیچ میں کام کرنے والا نائب کالعدم قرار دینا چاہے تو بجائے اس کے کہ اس نائب کو اپنا من مانا فیصلہ نافذ کرنے کا مجاز مانا جائے اسے تو اصل حکمران کا باغی قرار دیا جائے۔ وہ اگر ایسا کوئی فیصلہ کرے تو اس کے خلاف اسلامی عدلیہ (جو انتظامیہ کے مقابلے میں آزاد حیثیت رکھتا ہے اور اصل حکمران کے قانون کو نافذ کرنے کے لئے براہِ راست جوابدہ ہے) سے فیصلۂ استرداد اور حکمِ امتناعی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ملک کا حق اسلامی ریاست کے تسلیم کردہ بنیادی حقوقِ شہریت میں شامل ہے اور اسے بروئے دستور پورا پورا تحفظ اور پوری پوری گارنٹی چاہتا ہے۔ کیا اس بنیادی حقِ شہریت کے خلاف ہے کوئی دلیل؟

خدا کی کتاب اور اس کے رسول کے فرمودات میں کوئی دلیل نہیں!

لیکن کہا جاتا ہے کہ ایک نظیر خلافتِ راشدہ کے دور کی ایسی موجود ہے جو بتاتی ہے کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت اسلامی ریاست کو مجاز قرار دیتی ہے کہ وہ بہت سے لوگوں کے عمومی مفاد کے لئے بعض کے خصوصی مفاد کو اور اسی طرح آئندہ نسلوں کے مفاد کے لئے موجودہ نسل کے مفاد کو نظر انداز کرکے اپنی پالیسی بنائے۔

واقعہ یہ ہے کہ عراق کی زمین جب فتح ہوئی تو سوال پیدا ہوا کہ آیا [illegible]

[illegible]

اپنی کی حیثیت دے کر پوری طرح عوامی مفاد کے لئے محفوظ کر دیا جائے۔ اس پر اسلامی حکومت کی مجلس شوریٰ میں دونوں قسم کی رائیں سامنے آئیں اور مسلسل بحثیں ہوتی رہیں، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ دینے میں بہت تامل کیا۔ پھر کھلا اجلاس طلب کیا اور مسلمانوں کے سامنے سارا معاملہ رکھتے ہوئے تقریر کی کہ:۔

فانی واحد کاحدکم وانتم الیوم تقرون بالحق خالفنی من خالفنی و وافقنی من وافقنی ولست ارید ان اتبعوا ھذا الذی ھوای معکم من اللہ کتاب ینطق بالحق، فواللہ لئن کنت نطقت بامر اریدہ ما ارید بہ الا الحق۔ (کتاب الخراج ص ۲۵)

میں تمہاری ہی طرح کا ایک فرد ہوں، اور آج جبکہ تم کو ایک حق کا فیصلہ کرنا ہے، بعض لوگ میری رائے کے حامی ہیں، بعض مجھ سے اختلاف رکھتے ہیں، میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میری خواہش کے پیچھے چلو۔ تمہارے پاس خدا کی کتاب موجود ہے جو ہر معاملے میں حق کو ظاہر کرتی ہے۔ خدا شاہد ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں بجز حق کو چاہنے کے میرا کوئی دوسرا مدعا نہیں ہے۔

اسی تقریر میں آپ نے قرآن سے اپنا استدلال پیش کیا، لوگوں نے اس سے اتفاق کیا اور اس پر اجماع سے یہ فیصلہ ہوا کہ عراق کی زمین مسلمان لشکریوں میں تقسیم کرنے کے بجائے مجموعی مفاد کے لئے حکومت کے تصرف میں رہے گی۔

کہنے والا یہ سنتے ہی کہتا ہے کہ ثابت ہو گئی ناں قومی ملکیت؟

ہم گزارش کرتے ہیں کہ یہ سارا معاملہ تھا غنیمت اور فئے کے قانون کی تعبیر اور اس کے انطباق کا، اس میں انفرادی ملکیت اور قومی ملکیت کی بحث نہ تھی۔

قرآن میں دو قانون الگ الگ بیان ہوئے ہیں، ایک غنیمت کا ایک فئے کا۔

غنیمت کے قانون کے اہم اجزا سورۂ انفال میں یوں بیان ہوئے ہیں:۔

(۱) الانفال للہ والرسول ——— غنائم اصلاً خدا اور رسول کے ہیں، یعنی وہی ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں (ضمناً یہ مفہوم خود اخذ ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد غنائم کے بارے میں ذمہ داری اس حکومت صالحہ کے سر عائد ہوتی ہے جو خدا اور رسول کے احکام کی اطاعت میں چلے)

(۲) واعلموا انما غنمتم من شئ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمساکین

وابن السبیل ——— یعنی غنائم کا پانچواں حصہ لازماً حسبِ ذیل مقاصد کے لئے وقف رہنا چاہئے :-

(ا) خدا کے دین کی اقامت کے لئے۔

(ب) رسول اللہ (بحیثیت صدرِ حکومت کے) کی ضروریات اور آپؐ کی طرف سے اقربا کے حقوق کی ادائیگی

(ج) یتیموں اور اہلِ حاجت کی کفالت کے لئے۔

(د) مسافروں کو امداد اور سہولت دینے کے لئے۔

اب لیجئے قانونِ فے کو، جس سے ذیل کی دفعات اخذ ہوتی ہیں :-

(۱) فے کی تعریف ——— "ما افاء اللہ علیٰ رسولہ" جو کچھ خدا اپنے رسول (بحیثیت صدرِ حکومتِ اسلامی) کو (بفضلِ خاص) ہاتھ لگا دے یعنی خاص اس عطیۂ الٰہی کے لئے جدوجہد نہ کی گئی ہو، نہ کرائی گئی ہو، بلکہ بلا شئے زائد کے حاصل ہو جائے۔

(۲) فے کا مصرف ——— (ا) للہ۔ یعنی اللہ کے دین کے فروغ میں (ب) وللرسول ولذی القربیٰ۔ رسول اللہ (بحیثیت صدرِ حکومت) کی ضروریات اور آپؐ کے اقربا کے حقوق ادا کرنے میں (ج) والیتمیٰ والمساکین، یتیموں اور حاجتمندوں کی کفالت میں، (د) وابن السبیل، مسافروں کی اعانت و خدمت میں (س) للفقراء المھاجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلاً من اللہ، خمرمان وطن چھوڑنے والے بے سروساماں لوگوں کی بحالی میں جو گھروں اور املاک سے نکال دیئے گئے ہیں اور اب وہ اللہ کے فضل (رزق) کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، (س) والذین تبوّؤ الدار والایمان من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا ویؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ ——— ان لوگوں کی مالی اعانت میں، جو اس گھر (مدینہ) میں مقیم ہیں اور اُن (مہاجرین) سے پہلے ایمان لائے ہوئے ہیں، جو ہر اس شخص پر فدا ہیں جو ہجرت کر کے ان تک آتا ہے، اور وہ اپنے مال سے (ان کی خاطر) بے نیاز ہیں اور ان کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے خود ان پر فاقہ ہی کیوں نہ مسلط ہو رہا ہو؛ (ص) والذین جاؤ من بعدھم، اور ان لوگوں کے مفاد میں، جو ان سب کے بعد آئندہ نسلوں میں آنے والے ہیں۔

(۳) حکومت کا تصرفِ خاص ——— وما آتٰکم الرسول فخذوہ وما نہٰکم عنہ فانتہوا ———

اور رسول (بہ حیثیت صدرِ حکومت) مالِ فئے میں سے اگر کوئی حصہ دے تو وہ جتنا دے اسے قبول کرلو، اور جس حصے سے تمہیں روک کر اسے بیت المال میں مفادِ عامہ کے لئے داخل کرنا چاہے، اُس سے رُک جاؤ۔

(۴) اس ضابطۂ فئے کی غایت ——— کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم ———

یہ اموالِ فئے کہیں دولتمندوں کے اوپر اوپر کے طبقے ہی میں گردش کرتے نہ رہ جائیں۔

اب سنیئے کہ معاملہ تھا کیا؟

دراصل شورائے فاروقی میں مسئلہ زیرِ بحث یہ تھا کہ عراق کی مفتوحہ زمین کا فیصلہ ان دونوں میں سے کس قانون کے تحت ہونا چاہیئے۔ غنیمت کے قانون کے تحت یا فئے کے قانون کے تحت؟ لمبی بحثوں کے بعد قانونِ فئے کو زمینِ عراق پر منطبق کیا گیا اور اسے غنیمت کی تعریف سے خارج قرار دیا گیا۔

آپ ہی بتایئے کہ یہاں انفرادی ملکیت اور قومی ملکیت کی بحث کا کیا مقام؟ ——— اور پھر سوچیئے کہ جن لوگوں کو یہی معلوم نہ ہو کہ شورائے فاروقی میں بحث تھی کس سوال پر، وہ جب اس شوریٰ کے فیصلے سے اجتہادی احکام نکالنے پر اتر آئیں تو کیا کیا عجائبات ظہور میں نہ آئیں گے۔

اس سارے معاملے کو اور مختصر کر کے ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عراق کی زمین پر جو بھی فیصلہ دیا ہو اور جس طرح بھی دیا ہو آخر اس سے یہ کیسے قیاس کر لیا جائے کہ مسلم افراد کی ملک میں پہلے سے جو اموال ہوں ان کو بھی قومی ملکیت میں منتقل کیا جا سکتا ہے؟ اس کی کوئی نظیر اگر ہو تو اسے سامنے لایئے۔ پھر گفتگو سیدھے راستے پر چل سکتی ہے۔

یہاں آ کر جب نصوص و نظائر کے ترکش خالی ہو جاتے ہیں تو پھر ایک اور دروازہ بنایا جاتا ہے کہ اس راستے سے قومی ملکیت کا اصول اسلام میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ وہ دروازہ ہے اسلامی شوریٰ کے اجماع کا لیکن جب ہم گزارش کرتے ہیں کہ شوریٰ تو ریاست کا ایک عضو (ORGAN) ہے، اور جب پوری حکومت خدا کے دیئے ہوئے حق کو سلب کرنے کی مجاز نہیں ہے تو مجلسِ شوریٰ کا اجماع دستورِ اسلامی کی رو سے جائز (VALID) کیسے ہو گا اسے تو عدالت کا فیصلہ رد کا کے پرزے میں بدل سکتا ہے۔ اب ایک صورت اور سامنے [illegible]

ںواب عام کرکے ہر شہری کا اتفاقِ رائے حاصل کر لیا جائے تو؟

یقیناً دستوراً جائز ہے کہ اسلامی ریاست کے کچھ یا بیشتر شہری اپنی کسی مِلک سے خود دست بردار ہو کر
بحکومت کر دیں، لیکن دوسری طرف اگر کچھ شہری اس پر تیار نہ ہوں تو ان کو مجبور کرنے کا حق کسی کو نہیں
ہ اگر ایک شہری بھی چاہے کہ اپنی مِلک پر قبضہ قائم رکھے تو وہ رکھ سکتا ہے اور عدالت اس کی حفاظت
(PROTE) کی ضامن ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ اکثریت کا فیصلہ اقلیت کو ماننا لازم ہے، جیسا کہ "اجماع" کے متعلق
ہا جاتا ہے کہ اسے واجب سمجھا جائے لیکن "اجماع" کسی متعین و منصوص حق کو (خصوصاً حقوقِ شہریت کو)
ردینے کا مجاز نہیں ہے، ورنہ اگر نصوص کو منسوخ کرنے کے لئے اجماع کو مؤثر مان لیا جائے تو پھر
کوئی اصولی اور تفصیلی حکم اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتا۔

لاک رکھنے کا حق جو فرد کو حاصل ہے، وہ خدا کا اپنا قائم کردہ ہے اور اس کے بارے میں رسول اللہ نے
پر وصیت فرمائی ہے کہ اعراضکم حرام علیکم۔ تمہارے اموال و املاک حرام قرار دیئے گئے ہیں۔
یہ ہیں کہ سو آدمیوں میں سے ۹۹ کے ووٹوں سے طے کردہ فیصلہ بھی بقیہ ۱ کے حقِ ملک کو ساقط کرنے کے لئے
ہے، کیونکہ یہ فیصلۂ اکثریت خود دستور سے ٹکراتا ہے بالفرض ایک وقت میں اگر اپنے املاک کو سارے
ست کے حوالے کرنے پر رضامند ہو بھی جائیں تو بھی دستور نے املاک رکھنے کا جو حق ان کو دیا ہے اسے بدلا
تا۔ وہ از سرِ نو املاک بہم پہنچا سکتے ہیں۔

ں یہ معاملہ رضاکارانہ ایثار اور اخلاقی فیاضی سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ دستوری و قانونی کے جبری ذرائع سے!
سوال یہ بھی اٹھایا جاتا ہے کہ مِلک رکھنے کا حق ہی تو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، آخر افراد کے لئے اسے واجب تو
لہٰذا نا املاک رکھو پس جو چیز ضروری نہیں اسے جاری رکھنے کی ذمہ دار ریاست کیوں ہو گی؟

یہ حق اللہ تعالیٰ نے شہریوں کو عطا کیا ہے کہ وہ چاہیں تو ضرورتِ تعدی پر برابر سرابر کا بدلہ لیں اور چاہیں تو دیت پر صالحہ کر لیں
یا معاف کر دیں [illegible] افراد کے لئے مباح غیر واجب قرار دیکر کیا استصوابِ عام کے ذریعہ اکثریت کے
[illegible] حقوق پر تنسیخ کر سکے دیکھئے!

ہم سمجھتے ہیں کہ بنیادی حقوق میں سے "ہر حق" کو قائم رکھنا ضروری اور واجب ہے، اس میں خلل ڈالنا

لازماً ختم ہوتا ہے جو ریاست اور عوام یا سوسائٹی اور افراد کے درمیان قائم کیا گیا ہے، اور جو اسلامی نظام
کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ورنہ اگر دوسری طرح سوچا جائے تو پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ
مثلاً گھر میں کھانا پکوانا، لباس کے لئے کوئی جائز تراش منتخب کرنا، اپنے لئے پیشہ پسند کرنا، علم و ادب میں
کرنا نئی نئی ایجادات کرنا، کسی سفر پر نکلنا وغیرہ سارے امور مباحات ہی تو ہیں، واجب تو نہیں کہے۔
اگر ریاست ان چیزوں پر پابندی عائد کرنا چاہے یا ان کو روک دے تو اس کا یہ اقدام جائز ہوگا، اگر معاملہ
طرح آگے بڑھتا جائے تو پھر کہنا یہ چاہیئے کہ آزادی ـــــ سوائے حق بات کہنے اور عبادات کی بجاآ
کے ـــــ اور ہر معاملے میں محض مباح حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا حکومت چاہے تو اسے سلب کرے، ک
کو اعتراض کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

اگر غور سے کام لیا جائے تو یہ نظریہ کہ مباحات غیر واجب کو حکومت حرام قرار دے سکنے کی مجاز
سارے حقوقِ شہریت کا خاتمہ کر سکتا ہے اور پورے نظام دین میں ہر طرح تاویل و تحریف کے دروازے
کھول دیتا ہے۔

بالفرض کچھ مباحات اگر ایسے ہوں بھی کہ ان میں ریاست کی مداخلت کی گنجائش ہو تو ان کے بارے م
بھی شریعت کا مزاج غیر معمولی ضابطہ بندی (CODIFICATION) کے خلاف اور انفرادی آزادی کو زیادہ سے
حد تک برقرار رکھنے کی طرف ہے۔ قرآن میں مسلمانوں کو سوال بازی سے روکنے کی علت یہ بیان کی گئی تھی کہ ا
طرح تم اپنے لئے بہت سی جکڑ بندیاں فراہم کر لو گے اور پھر اپنا بوجھ اتنا بڑھا لو گے کہ ایک دن سارے کا
اتار کے پھینک دو گے۔ پس ان مباحات میں بھی جن کا تعلق "بنیادی حقوق" سے نہیں ہے حکومت کو شدید ا
کے تحت کم سے کم ناگزیر حد تک ہی تصرف کرنا چاہیئے اور جب بھی پابندیوں کو ہٹانے کے لئے حالات سا
ہو جائیں تو انہیں ہٹا دینا چاہیئے۔

اسلام دراصل نظامِ اجتماعی کی عام فضا ایسی رکھنا چاہتا ہے کہ اس میں کلمۂ حق بلند کرنے اور امر بالمعروف
اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کے لئے پوری سہولتیں [illegible]

کے لئے چند حقوقِ شہریت عوام کے لئے مقرر کرتا ہے وہ خصوصیت سے آج کی [illegible]

دیا ہم لازم ملزوم کی حیثیت دیتا ہے۔ قومی ملکیت کے تحت یہ فضا ختم ہو جاتی ہے۔

پ بتلایئے کہ اگر اظہارِ خیال کے ذرائع (پریس، اخبارات، کتبے، دارالاشاعت، ہال، میدان، ریڈیو)

سب حکومت کے تصرف میں ہوں، نیز جملہ ذرائع پیداوار اور جملہ پیشے اس کے تحت ہوں، قیمتوں کا

نظم اس کے قبضے میں ہو تو کیا یہ ممکن ہے کہ حکومت کی روش کے خلاف (جسے بہر حال حکمران طاقت

روحِ شریعت قرار دے گی) کوئی آواز اٹھائی جا سکے ——— جبکہ حکمران طاقت اس کو رد کرنا چاہتا

الیس قومی ملکیت کا نظام اپنی فطرت کے لحاظ سے غیر اسلامی ہے۔

ں یہ کہا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت (خود تمہارے عندیے کے مطابق بھی) صالحین کے ہاتھوں میں

راس بات کا خدشہ کیوں ہو کہ صالحین ظلم کریں گے اور حق کی آواز کو دبا دیں گے۔

م عرض کرتے ہیں کہ اول تو ایک دستور بننے کے بعد اسلامی ریاست کو ایک عبوری دور طے کرنا ہوگا جس میں

ن، چند ادھ کچرے اور بہت سے عامیانہ قسم کے کارکن مل جل کر کام کریں گے۔ اس عبوری دور میں

کہہ سکتا کہ قومی ملکیت کا نظریہ اختیار کرنے والی ریاست کیسے ارتقا کرے گی۔ پھر صالحین بلا کسی مزاحمت

ن کے تو نہیں چلیں گے۔ ان کی مزاحمت کرنے کے لئے غیر اسلامی رجحانات بھی کام کریں گے اور قومی

ے نظام کو اشتراکی لحدانہ خطوط کی طرف دھکیلنے والے عوامل بھی موجود ہوں گے۔ اب اگر اس کشمکش میں

ت" کے نظام ہمہ گیر کی باگ ڈور کسی ذریعے سے غلط ہاتھوں میں منتقل ہو گئی تو آپ اس کا راستہ

ہ کن ذرائع سے؟

ر فرض کیجئے کہ شیشہ قسم کے صالحین قومی ملکیت کے نظام پر متمکن ہونے ہیں اور رہتے ہیں لیکن اس بات

انت کہ ایک صالح طاقت کے بعد دوسری طاقت جو جانشین کرے گی صالح ہی ہو گی؟ ——— اگر کبھی

بیس سال یا پچاس سال میں آپ کے ملک کے صالح ترکیبز (قومی ملکیت کے نظام میں) کوئی [illegible]

[illegible] اس کی کرسی میں [illegible] دماغ [illegible]

[illegible]

ایسے موقعوں پر ایک طریقہ ہوتا ہے رائے عام کے احتجاج کا اور اس کا راستہ روک دیا جائے تو دو
راستہ ہوتا ہے بغاوت کا۔ اب سوچ کر بتائیے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے لئے کبھی قو
ملکیت کے نظام میں آپ کو ذرائع و وسائل مل سکتے ہیں ــــــ اگر حکمران خود ہی بطور فیاضی اپنے خلاف استعم
کرنے کے لئے کوئی قوت عطا نہ کر دے؟

اب پلٹ کے جواب دیا جاتا ہے کہ تم نظام اسلامی کا جو خاکہ پیش کرتے ہو اس میں بھی تو خیر و فلاح حکمرانو
کے صالح ہونے سے مشروط ہے۔ یہی بات ہمارے قومی ملکیت کے نظام میں بھی ہوگی۔ یہاں بھی شرط یہی ہے
لیکن ہم جو نظام دیتے ہیں اس میں حکمران بگڑ جائے تو منظم احتجاج، بلکہ آئینی انقلاب کے دروازے کھلے رہتے ہیں
اور اتنے ہی سے کام نہ چلے تو پھر "خروج" تک کی گنجائش رہتی ہے۔

آخر کار اس بحث کے خاتمے پر ایک بات اور سامنے لائی جاتی ہے کہ ہم سارے ذرائع و وسائل کو قومی ملکیت میں
دیں گے ہی نہیں، بعض دیں گے۔ لیکن ہم عرض کرتے ہیں کہ اس طرح کا ادھورا قومی ملکیت کا نظام دنیا میں کبھی بھی کامیاب
نہیں ہو سکا، حتیٰ کہ برطانیہ جیسے منظم ملک میں وہ موجب نقصان (پیدائش دولت کی کمی) ثابت ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
جہاں اس اصول کو اختیار کیا جاتا ہے وہاں آغاز اس کے محدود انطباق سے ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ وسعت
اختیار کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذرائع و وسائل کا باہمی ربط اتنا گہرا ہے کہ ایک شعبے پر کنٹرول کرنے کے لئے
دوسرے پر کنٹرول کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام نظام حق کو جاری رکھنے کے لئے آزادی کی فضا چاہتا ہے اور وہ قومی ملکیت کے
اصول کے تحت ختم ہو جاتی ہے۔

ان دلائل کے ساتھ ہم اس نتیجے میں پہنچتے ہیں کہ اسلامی نظام میں قومی ملکیت کا اصول داخل نہیں کیا جا سکتا
جو اس نتیجے سے اختلاف کرنا چاہے کرے، لیکن ہم اس سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے موقف کے حق میں کوئی ایسا
استدلال کرے، جس کی بنیاد کتاب و سنت پر ہو۔

(باقی آئندہ)

بقیہ اشارات

بے سے گوشہ گیر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور دنیا کے کاروبار اُن بُرے لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیتے ہیں
جن کی زبان پر نیکی کا نام اگر کبھی آتا بھی ہے تو صرف خلق خدا کو دھوکا دینے کے لئے آتا ہے۔ اس
رابی کا علاج صرف یہی ہے کہ صالحین کی ایک جماعت منظم کی جائے جو خدا ترس بھی ہو راستباز
ور دیانتدار بھی ہو، خدا کے پسندیدہ اخلاق و اوصاف سے بھی آراستہ ہو، اور اس کے ساتھ دُنیا
کے معاملات کو دنیا داروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھے اور خود دنیا داری ہی میں اپنی مہارت
قابلیت سے ان کو شکست دے سکے۔ ہمارے نزدیک اس سے بڑا اور کوئی سیاسی کام نہیں
و سکتا اور نہ اس سے زیادہ کامیاب سیاسی تحریک اور کوئی ہو سکتی ہے کہ ایسا ایک صالح گروہ
منظم کر لیا جائے۔ بداخلاق اور بے اصول لوگوں کے لئے دنیا کی چراگاہ میں بس اُسی وقت
ہ چرچُگ لینے کی مہلت ہے جب تک ایسا گروہ تیار نہیں ہو جاتا جب ایسا گروہ تیار ہو جائیگا
آپ یقین رکھیئے کہ نہ صرف آپ کے اس ملک کی، بلکہ بتدریج ساری دنیا کی سیاست، معیشتؔ
یات، علوم و آداب اور عدل و انصاف کی باگیں اُسی کے ہاتھ میں آجائیں گی اور فساق و فجار کا
راغ ان کے آگے نہ چل سکے گا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ انقلاب کس طرح رونما ہو گا۔ لیکن جتنا
ھ کل سورج کے طلوع ہونے کا یقین ہے اتنا ہی اس بات کا یقین بھی ہے کہ یہ انقلاب
رحال رونما ہو کر رہے گا بشرطیکہ ہمیں صالحین کے ایسے گروہ کو منظم کرنے میں کامیابی حاصل
ہو جائے۔" (ایضاً صفحہ ۲۸-۲۹)

ویل اقتباسات جو سب کے سب تشکیل جماعت کے ابتدائی دور کی تحریروں اور تقریروں سے
ہ اُس مقصد کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں جس کے لئے جماعت کی تاسیس اور کارکنوں کی
بیت کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ جو حضرات اس کام کو سمجھنا
اہیں حسب ذیل مطبوعات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں:
[illegible] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم۔

سنہ ۴۱ء تا سنہ ۴۲ء، روداد جماعت حصہ اول۔

سنہ ۴۴ء، روداد جماعت حصہ دوم۔

سنہ ۴۵ء، دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات، تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں، روداد جماعت حصہ سوم۔

سنہ ۴۷ء، روداد جماعت حصہ پنجم، ہندوستان میں تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحۂ عمل۔

ان چیزوں کے مطالعے سے ناظرین کو نہ صرف یہ معلوم ہو جائے گا کہ تشکیل جماعت سے ہمارا مقصد کیا تھا، بلکہ وہ یہ بھی جان لیں گے کہ اگست سنہ ۴۱ء سے اگست سنہ ۴۷ء تک کے پورے چھ سال ہم نے کس کام میں گزارے، ہمارا طریقِ تنظیم کیا تھا، ہم نے اپنی جماعت میں کس قسم کا ڈسپلن قائم کیا تھا، ہم کس طریقے سے آدمیوں کو چھانٹ چھانٹ کر لیتے اور کس طرح ناکارہ اشخاص کو چھانٹ کر الگ کرتے رہے، اور مردانِ کار کی تربیت کے لئے کس نوعیت کی تدبیریں ہم نے اختیار کیں اور کیا کچھ کرنا چاہتے تھے جسے عمل میں نہ لا سکے۔ یہ سب کچھ ان مطبوعات کے آئینے میں تفصیل کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

ایک شخص چاہے تو جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس سارے کام پر چند طعن آمیز فقروں سے یا چند جھوٹے الزامات سے پانی پھیر سکتا ہے، لیکن یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نے اس دنیا کے نظام کو قائم ہی کچھ ایسے قوانین پر فرما دیا ہے کہ یہاں پھونکوں سے پہاڑ نہیں اڑائے جا سکتے اور الفاظ سے حقیقتیں نہیں بدلی جا سکتیں۔

رسائل و مسائل

اسلام کے مآخذِ قانون اور تعبیر و اجتہاد

سوال:

ڈاکٹر محمصانی، بیروت کے پروفیسر برائے قانون، جو حکومت پاکستان کی دعوت پر اس ملک میں تشریف لائے تھے، انھوں نے اسلامی قانون پر کراچی میں ایک تقریر کی۔ عرب ممالک میں قانونی ارتقا کے تین ادوار، خلافت، دورِ عثمانی اور جدید زمانے کا تذکرہ کر کے انھوں نے اس پر بحث کی کہ زمانے کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق اسلامی قانون میں تبدیلی ممکن ہے یا نہیں۔ ان کی بحث کا ماحصل یہ تھا کہ اسلامی قانون کے دو حصے ہیں: ایک خالص مذہبی، دوسرے معاشرتی۔ جہاں تک مذہبی قانون کا تعلق ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ کبھی نہ بدلنے والے حقائق پر مشتمل ہے، مثلاً توحید، عبادات وغیرہ۔ معاشرتی قانون دو مآخذ پر مبنی ہے: ایک اجتہاد، اور دوسرے قرآن و حدیث۔ اجتہاد ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق بدلتا رہتا ہے اور بدلنا چاہیے۔ احادیث میں سب سے پہلے سوال صحیح و غیر صحیح کا ہے، پھر صحیح احادیث بھی دو قسم کی ہیں: لازمی (OBLIGATERY) اور اختیاری یا مشاورتی (PERMISSIVE) پس آخر کار بحث ان احکام کی رہ جاتی ہے جو یا تو قرآن پر یا صحیح لازمی احادیث پر مبنی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا ان دونوں چیزوں کے ـــــ الفاظ نہیں (کیونکہ وہ حتمی عالم موجود ہیں اور تبدیل نہیں کیے جا سکتے) ـــــ سوسائٹی کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق نئی تعبیر (INTERPRETATION) دی جا سکتی ہے؟ ڈاکٹر محمصانی نے کہا کہ اس بارے میں فقہا کے دو گروہ ہیں۔ (۱) اکثریت کی رائے یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ صحیحہ کو نئے معنی نہیں پہنائے جا سکتے (۲) ایک [illegible]

[illegible]

وہ اس کی خصوصیات باقی نہیں رہتیں تو اگر ہم اس بارے میں قدامت کا رویہ اختیار کریں۔ لیجئے اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے دو مثالیں بطور نمونہ پیش کیں اور بتایا کہ نہایت کثرت سے انھوں نے ایسی نظیریں اپنی کتاب (PHILOSOPHY OF ISLAMIC JURISPRUDANCE) میں دی ہیں۔

پہلی مثال یہ تھی کہ ایک حدیث صحیح میں گیہوں اور جو کو رفیق اشیاء کے پیمانے سے ماپنے کا تذکرہ ہے کیونکہ اس زمانے میں یہی رواج تھا، بعد کو جب وزن کے حساب سے یہ چیزیں فروخت ہونے لگیں تو ایک شخص نے امام ابو یوسف سے استفسار کیا، انھوں نے کہا کہ وہ معاہدہ جو وزن کے پیمانے سے ہوا ہو جائز ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ رواج کے بدل جانے سے احادیث کی تعبیر یا اطلاق میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

دوسری مثال جس کے ذریعے ڈاکٹر صاحب نے استدلال کیا کہ نہ صرف حدیث بلکہ قرآن کے الفاظ کو سوسائٹی کی ضروریات بدل جانے پر نئی تعبیر دی جا سکتی ہے، یہ تھی کہ قرآن میں صدقات کے مصارف میں مؤلفۃ القلوب کا بھی ایک حصہ رکھا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب نومسلموں کو صدقات میں سے کچھ دینے سے انکار کر دیا تو انھوں نے قرآن کی آیت سند میں پیش کی کہ یہ تو ہمارا حق ہے جو قرآن نے مقرر کیا ہے، آپ اسے کیسے ختم کر سکتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواباً کہا کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت اسلام کمزور تھا، اس لئے اس کی ضرورت تھی، اب اسلام خدا کے فضل سے قوی ہے، لہٰذا اب ضرورت باقی نہیں رہی، پس میں تم کو یہ حصہ نہیں دوں گا۔

اس قسم کی مثالوں میں ایک معاملہ قطع ید کا بھی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو جس نے بیت المال میں چوری کی تھی، اور دوسرے کو جس نے اپنے آقا کا مال چرایا تھا، قطع ید کی سزا نہیں دی، اس دلیل سے کہ ان کا اس مال میں حصہ تھا۔ اسی طرح قحط کے زمانے میں آپ نے اس سزا کو موقوف کر دیا۔

ڈاکٹر بھسانی نے دورانِ تقریر میں قانون کے چار ماخذ بتائے، قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔

میرے ذہن میں ان کی تقریر کے بعد مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہوئے ہیں:۔

(۱) مذکورہ بالا چار ماخذ کے علاوہ اور کونسی چیزیں ماخذ قانون ہیں؟ کیا علت، دوسرے ممالک کے رواجات، عرف، عادت، تعامل، سنن النبی، عموم البلوی، صاحب امر کی ہدایات، مصالح وغیرہ کو ماخذ قانون

بنایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ فقہاء نے ان تمام کو مآخذِ قانون کی فہرست میں تو نہیں لکھا لیکن دورانِ بحث میں ان تمام کا تذکرہ مآخذِ قانون کی حیثیت سے کیا ہے، اور خلفائے راشدین کے عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے زراعت و مالیاتی قانون میں شامی، مصری اور ایرانی قانون کی پیروی کی، رجسٹر اور حساب رکھنے کے طریقے ان سے اخذ کئے، غیر اسلامی حکومت کے تاجروں پر اتنا محصول عائد کیا جتنا کہ ان کی حکومتیں مسلمان تاجروں پر عائد کرتی تھیں ——— تو کیا اس سے یہ اصول مستنبط نہیں ہوتا کہ قرآن و حدیث کی مقرر کردہ حدود کے اندر دوسرے ممالک کے قانون سے استفادہ، اور نہ صرف استفادہ بلکہ اس کو بعینہٖ اخذ کیا جاسکتا ہے؟ حضرت عثمانؓ کا عمل تو کم از کم یہی ثابت کرتا ہے۔ آج اگر اسلامی حکومت وجود میں آئے تو کیا وہ مغربی ممالک کی سیاسی، معاشرتی، ادبی، اقتصادی اور سائنٹفک ترقیات کو نظر انداز کر کے نئے سرے سے اپنی عمارت کی بنیاد رکھے گی، محض اس غلط تصور اور تعصب کی بنا پر کہ جو کچھ مغرب سے آیا ہے وہ غلط ہے؟ کیا یہ تصور بالکل اسی طرح غلط نہیں کہ جو کچھ مغرب سے آیا وہی صحیح ہے؟ اگر یہ ایک انتہا ہے تو وہ دوسری انتہا ہے۔ پھر کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ مغرب کی جو باتیں شریعت کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہیں ان کو بعینہٖ، یا ان میں ادل بدل کر کے، لے لیا جائے؟

(۲) بزرگانِ سلف اور ائمہ نے جو اجتہادات کئے، اگر ان مسائل میں کوئی تبدیلی و اضافہ ممکن نہیں تو ان کو اختیار کر لیا جائے، ورنہ زمانہ کی بدلی ہوئی ضروریات کے مطابق ان کا اجتہاد کچھ مسائل میں اگر سازگار نہ رہا ہو تو آج کے فقہا از سرِ نو اجتہاد کریں جو دورِ حاضر کی ضروریات کے مطابق ہو۔

(۳) کیا قرآن و حدیث کے الفاظ کو تبدیل کئے بغیر سوسائٹی اور معاشرت کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق ان دو مآخذ کے الفاظ کی تعبیر میں تبدیلی، اضافہ یا کمی کی جاسکتی ہے؟ مثلاً جیسا کہ مؤلفۃ القلوب کی مثال سے ثابت ہوتا ہے اس قسم کے مسائل آج بھی پیدا ہو سکتے ہیں، اگرچہ ان کی تعداد کم ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں ان احکام و مسائل میں جو نصوصِ قرآنی یا احادیثِ لازمی پر مبنی ہیں، زمانے کی ضروریات اور ان احکام کی علت بدل جانے پر ایسے نئے احکام مستنبط کئے جاسکتے ہیں جو اسلام کی روح کے مطابق ہوں سا[illegible]
[illegible] کی ایک حالت ہے اور [illegible] مقدم ہے

مثلاً زکوٰۃ کا حکم قرآن شریف میں مذکور ہے لیکن زکوٰۃ کی کوئی شرح مذکور نہیں۔ احادیث میں جو شرح مذکور ہے وہ اس زمانے کی ضروریات کے مطابق تھی۔ اب ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا زکوٰۃ کو ملک کے عام ریوینیو یا ٹیکس کی حیثیت حاصل ہے (جبکہ حکومت اسلامی ہو)؟ اگر ہے تو دوسرا سوال شرح کا ہے کہ آج کے مالیاتی تقاضے قدیم شرح سے پورے نہیں ہو سکتے۔

ان سوالات سے ہٹ کر ایک دریافت طلب امر یہ ہے کہ قرآن آیا ایک کوڈ ہے یا نہیں؟ بظاہر قانونی اعتبار سے قرآن ایک ترمیمی ضابطہ (AMENDING CODE) کی حیثیت رکھتا ہے جس نے بہت سے اُن رواجوں اور دستوروں کو قائم رکھا جو عرب میں جاری تھے، سب میں انقلاب پیدا نہیں کیا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ قرآن ایک مکمل کوڈ ہے، کس حد تک درست یا غلط ہے؟

جواب:

آپ نے جن مسائل کے متعلق اظہارِ رائے کی فرمائش کی ہے میں اُن پر "حقوق الزوجین"، "سود" اور "[اس]لامی قانون" میں ایک حد تک مفصل بحث کر چکا ہوں۔ آپ ان کتابوں کو ملاحظہ فرمائیں کہ کون سے پہلو تشنہ رہ گئے [ہیں جن] پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ باقی رہے آپ کے سوالات تو ان کے متعلق مختصر طور پر اپنے خیالات [ع]رض کئے دیتا ہوں۔

(۱) علت، عرف، عادت، تعامل، سنن القبل، عموم بلویٰ، صاحبِ امر کی ہدایات، معاہدات اور [م]لکِ غیر کے رواجات بجائے خود ماخذِ قانون نہیں بن سکتے، بلکہ یہ سب اجماع اور قیاس کے ضمن ہی میں داخل [ہو جا]ئیں گے۔ اور خود اجماع و قیاس بھی اصل ماخذِ قانون نہیں ہیں بلکہ قرآن و سنت کے تابع ہیں! اجماع ہو یا قیاس [ب]الکل صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتے ہیں جبکہ استدلال کی بنا قرآن و سنت کے امر و نہی یا اباحت پر رکھی [illegible] امر و نہی کے معاملے میں قیاس و اجتہاد کو لامحالہ نصوص کا پابند ہونا پڑے گا، اور جس قیاس و اجتہاد پر [اج]ماع ہو جائے یا جمہور متفق ہو جائیں وہی ملک کا قانون بن جائے گا۔ رہے مباحات تو ان کے دائرے میں [illegible] بیرونی ممالک کے طریقوں سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں، اپنے ملک کے عرف و رواج کو بھی برقرار رکھ سکتے ہیں، [عمو]م بلویٰ کا لحاظ بھی کر سکتے ہیں اور رفع حرج سے آخذ کی طرف بھی رجوع کر سکتے ہیں، بشرطیکہ جو قوانین [illegible]

ہیں وہ بہ حیثیت مجموعی اسلامی زندگی سے مطابقت رکھتے ہوں۔

(۲) بزرگانِ سلف کے اجتہادات نہ تو اٹل قانونی قرار دیئے جا سکتے ہیں، اور نہ سب کے سب رد کر دینے کے لائق ہیں۔ صحیح اور معتدل مسلک یہی ہے کہ ان میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے، مگر صرف بقدرِ ضرورت اس شرط کے ساتھ کہ جو رد و بدل بھی کیا جائے دلائلِ شرعیہ کی بنا پر کیا جائے۔ نیز نئی ضروریات کے لئے نیا اجتہاد بھی کیا جا سکتا ہے مگر اس کے لئے بھی شرط یہی ہے کہ اس اجتہاد کا ماخذ کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ ہو اور اجتہاد وہ لوگ کریں جو علم و بصیرت کے ساتھ جذبۂ اتباع و اطاعت بھی رکھتے ہوں۔ رہے وہ لوگ جو دورِ جدید کے رجحانات سے مغلوب ہو کر دین میں تحریف کرنا چاہتے ہیں، تو ان کے حقِ اجتہاد کو تسلیم کرنے سے ہمیں قطعی انکار ہے۔

(۳) اصولی طور پر تو یہ بات صحیح ہے کہ احکامِ شرعیہ کے اجرا و نفاذ میں حالات کا لحاظ کرنا ضروری ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ نصوص کے الفاظ کی تعبیر میں اختلاف کی کافی گنجائش ہے، لیکن بحث اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اجمال کو چھوڑ کر ہم تفصیلات کی طرف آتے ہیں۔ یہاں متعدد تفصیلات ہمارے سامنے ایسی آتی ہیں جن میں تغیر پسند اصحاب کی تجاویز ہم کو حدِ جواز سے متجاوز نظر آتی ہیں۔ مثلاً یہی زکوٰۃ کا معاملہ ہے جسے آپ نے مثال میں پیش کیا ہے۔ ہمارے نزدیک زکوٰۃ کو ملک کے عام ریونیو یا ٹیکس کی حیثیت حاصل نہیں ہے، یہ ایک مالی عبادت ہے، اور اس کے لئے شارع نے جو نصاب، شرح اور مصارف مقرر کئے ہیں ان میں رد و بدل نہیں کیا جا سکتا۔ اور جن چیزوں پر زکوٰۃ عائد کی گئی ہے ان میں بھی کمی بیشی ممکن نہیں ہے، اِلّا یہ کہ کسی چیز کو شارع کی مقرر کردہ اشیاء پر قیاس کر لیا جائے۔ رہیں حکومت کی ضروریات تو ہم اس بات کے قائل ہیں کہ ایک اسلامی حکومت جمہور کی خدمت کے جن جن کاموں کو اپنے ہاتھ میں لے ان کی انجام دہی کے لئے وہ جمہور پر ٹیکس لگا کر اپنے مصارف پورے کر سکتی ہے، بشرطیکہ ٹیکس انصاف کے ساتھ لگائے جائیں اور دیانتداری کے ساتھ خرچ کیا جائے۔

(۴) آپ کا دوسرا سوال کہ قرآن ایک "کوڈ" تھا یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کوڈ نہیں بلکہ کتاب [illegible]

[illegible]

قانونی ہدایات بھی ہیں، اس کو "کوڈ" کہہ دینا درست نہیں ہے۔ اور "مکمل کوڈ" کے لفظ سے اس کو تعبیر کرنا اور بھی زیادہ غلط ہے جو بات صحیح طور پر کہی جا سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ قرآن ایک مکمل کتاب ہدایت ہے۔ (ا-م)

برطانیہ میں ایک مسلمان طالبعلم کے لئے مشکلات

سوال :

یہاں آکر میں کچھ عجیب سی مشکلات میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ سب سے زیادہ پریشانی کھانے کے معاملے میں پیش آرہی ہے۔ اب تک گوشت سے پرہیز کیا ہے، صرف سبزیوں پر گزارہ کر رہا ہوں۔ سبزی بھی یہاں آپ جانتے ہیں صرف ابلی ہوئی ملتی ہے اور وہ بھی زیادہ تر آلو۔ انڈا یوں بھی کمیاب ہے اور پھر اس پر راشن بندی ہے۔ ہفتے میں دو تین انڈے مل سکتے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ صاحب امام ووکنگ مسجد (لندن) سے ملا۔ انھوں نے یہ بتایا کہ کلام پاک کی رو سے ایک تو سؤر کا گوشت حرام ہے، دوسرے خون، تیسرے مردار اور چوتھے وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر ذبح کیا جائے۔ پھر انھوں نے یہ بھی کہا کہ جہاں تک یہاں کے طریقۂ ذبح کا تعلق ہے اس سے شہ رگ کٹ جاتی ہے اور سارا خون نکل جاتا ہے، چونکہ اس خون کا نکلنا طبی نقطۂ نظر سے ضروری ہے، لہٰذا اس کا یہاں خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ البتہ یہ ضرور صحیح ہے کہ گردن پوری طرح الگ کر دی جاتی ہے، لیکن کلام پاک میں اس سلسلے میں کوئی ممانعت وارد نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہاں جانور کسی کے نام پر ذبح نہیں کئے جاتے، بلکہ وہ تجارتی مال کی حیثیت سے سینکڑوں کی تعداد میں روزانہ ذبح ہوتے ہیں۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اللہ کا نام تو نہیں لیا جاتا لیکن کسی اور کا بھی نام نہیں لیا جاتا۔ پس وہ غیر اللہ سے منسوب نہ ہونے کی وجہ سے کھایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ان سے بہت کچھ بحث رہی مگر میری طبیعت نہیں مانتی کہ یہ گوشت جائز ہو سکتا ہے۔

پھر کھانے میں جو سوپ دیا جاتا ہے وہ بھی کبھی تو صرف سبزیوں سے بنا ہوا ہوتا ہے، مگر آج ہی اتفاق سے اس میں ایک ٹکڑا گوشت کا نکل آیا۔ شکایت کی تو معلوم ہوا کہ کبھی کبھی گوشت اور سبزی ملا کر بھی شوربہ

بتایا جاتا ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ جہاں تین دو سو آدمی اطمینان سے یہ سب کچھ کھا پی رہے ہوں وہاں دو چار آدمیوں کا لحاظ کون کرے گا؟ پھر مکھن، پنیر اور میٹھا کھانا بھی دسترخوانوں پر آتا ہے۔ ان چیزوں میں بھی حرام دودھ یا چربی کی آمیزش ہونے کے بارے میں قوی شبہ ہوتا ہے۔ علاوہ بریں باورچی حرام کھانوں میں استعمال ہونے والے چمچے اٹھا کر دوسرے کھانوں میں ڈالتے رہتے ہوں گے۔ یہ کچھ عجیب پیچیدگی ہے جسے حل کرنے میں مشورہ مطلوب ہے۔

دوسری بات نمازوں کے متعلق دریافت طلب ہے۔ صبح کی نماز کا وقت ۶ بج کر ۳۲ منٹ تک رہتا ہے یہ تو اللہ کے فضل و کرم سے ادا کر لیتا ہوں۔ ظہر کے لئے مشکل سے وقت ملتا ہے۔ ½۱۲ سے لے کر ½۱ تک کھانے کے لئے وقت ملتا ہے۔ اسی ایک گھنٹہ میں کلاس سے MESS تک آنے جانے میں بھی وقت لگتا ہے اور اس میں سے وضو اور نماز کے لئے بھی وقت نکالتا ہوں، لیکن بہت ہی دقت ہوتی ہے۔ عصر کے لئے سرے سے وقت ملتا ہی نہیں، کیونکہ فرصت ½۴ بجے ہوتی ہے اور ½۴ بجے سے ۵ بجے تک ناشتہ ہوتا ہے اور ۴ بج کر ۴۸ منٹ پر مغرب ہو جاتی ہے۔ ناشتہ کے فوراً بعد مغرب تو ادا کر لیتا ہوں، لیکن عصر رہ جاتی ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ظہر اور عصر اور مغرب اور عشا کی نمازوں کو ملا کر پڑھنے کا قاعدہ کیا ہے۔ ووکنگ مسجد کے امام صاحب بعض اوقات نمازوں کو ملا کر پڑھتے ہیں۔

یہاں ہم بارہ طلبا آئے ہوئے ہیں جن میں سے مجھ سمیت کل پانچ لڑکے ایسے ہیں جو دین کا لحاظ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، اور بقیہ ایسے ہیں کہ ہم کو طرح طرح سے بیوقوف بناتے ہیں۔ تاہم اللہ کا شکر ہے کہ میں ان باتوں سے کبھی نہیں گھبراتا بلکہ صحیح بات معلوم کر کے اس پر عمل بھی کرنا چاہتا ہوں اور دوسروں کو دلائل سے جواب بھی دینا چاہتا ہوں۔ ان مسائل پر میں نے ہمیشہ اللہ کو حاضر و ناظر جان کر غور کیا ہے اور اس سے ہمیشہ یہی توقع رکھی ہے کہ وہ مجھے ضرور صحیح راستے کی طرف ہدایت دے گا، مگر بشری کمزوریوں کی وجہ سے ڈرتا ہوں کہ کوئی غلط صورت نہ اختیار کر بیٹھوں۔ اس لئے آپ سے یہ سوال کر رہا ہوں۔

جواب:

آپ نے جن مسائل کے متعلق میری رائے دریافت کی ہے ان کے بارے میں مختصراً عرض کرتا ہوں۔

[illegible] ذبیحہ کے صحیح ہونے کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ جانور کی شہ رگ کاٹ کر [illegible]

بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس پر خدا کا نام لیا جائے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ "جس پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو اسے نہ کھاؤ"۔ اب یہ ظاہر ہے کہ انگلستان میں جو جانور قتل کئے جاتے ہیں ان پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا، اس لئے ان کے حلال ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سورۂ مائدہ میں "طعامِ اہلِ کتاب" کو ہمارے لئے جائز قرار دیا گیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو چیزیں خدا نے ہمارے لئے ناجائز ٹھیرائی ہیں انھیں بھی ہم اہلِ کتاب کے ہاتھ سے لے کر کھا سکتے ہیں۔ اس بنا پر میرے لئے ڈاکٹر عبداللہ صاحب کی رائے سے اتفاق کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ البتہ آپ کو اپنی خوراک کے معاملے میں جو مشکل پیش آرہی ہے اس کا حل ضروری ہے۔ سو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ غیر لحمی یا نباتی غذا (VEGETARIAN DIET) پر اکتفا کریں جس کا انتظام انگلستان میں ہو سکتا ہے، اور اگر گوشت کا کوئی ٹکڑا اس میں نکل آئے تو کھانے کے منتظم سے اس کی شکایت کر کے اس کا سدِ باب کرائیں۔ دوسرے یہ کہ وہم کو دل سے نکال دیں۔ جو چیز آپ کے سامنے دسترخوان پر پیش ہو اس میں اگر کوئی حرام شئے موجود نہ ہو تو اسے اطمینان کے ساتھ کھائیے اور اس اندیشے سے اپنے ذہن کو پریشان نہ کیجئے کہ اس میں کسی حرام کھانے کا چمچہ ڈال دیا گیا ہوگا، یا اس میں کسی حرام جانور کی چربی شامل کر دی گئی ہوگی۔ آپ کو اپنے عمل کی بنیاد علم اور یقین پر رکھنی چاہئے نہ کہ گمان اور اندیشے کی بنا پر۔ آپ صرف اس غذا سے پرہیز کریں جس میں کسی حرام چیز کے شمول کا آپ کو علم ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ جب کبھی گوشت کو دل چاہے تو مچھلی پکوالیں، یا یہودیوں کا ذبیحہ حاصل کریں جس کا ملنا انگلستان میں مشکل نہیں ہے۔

(۲) نمازوں کے بارے میں جس مشکل کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کا حل یہ ہے کہ ظہر کی نماز میں اگر سنتیں ادا کرنے کا وقت نہ مل سکے تو صرف فرض پڑھ لیا کریں، اور عصر کے لئے وقت ملنے کی اگر کوئی صورت ممکن نہ ہو تو مغرب کے ساتھ قضا پڑھ لیا کریں۔ دو وقت کی نمازوں کو ملا کر پڑھنے کے معاملے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ظہر اور مغرب کے آخر وقتوں میں عصر کو ظہر کے ساتھ اور عشاء کو مغرب کے ساتھ ملا کر پڑھا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ایک وقت کی نماز کے ساتھ دوسرے وقت کی نماز پیشگی بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ لیکن اس بات کو قریب قریب تمام علمائے اہلِ سنت نے ناجائز قرار دیا ہے کہ کوئی شخص دو وقت کی نمازوں کو ملا کر پڑھنے کی عادت بنا لے۔ کیونکہ اس طرح تو مستقل [illegible]

وقت بھی ہو گزر جاتے ہیں۔ لہٰذا آپ اس سے تو پرہیز کریں۔ البتہ جب کبھی عصر کی نماز پڑھنا ممکن نہ ہو اسے قضا

پڑھ لیا کریں۔

مجھے افسوس ہے کہ ہماری حکومت جو لوگوں کو تعلیم و تربیت کے لئے باہر بھیجتی ہے ان کی مذہبی ضروریات کا

کوئی اہتمام نہیں کرتی۔ اگر سرکاری طور پر اس کی فکر کی جاتی تو انگلستان میں ہمارے طلباء کے لئے حلال غذا کا

انتظام ہو سکتا تھا اور نمازوں کے لئے بھی ان کو وقت دلوایا جا سکتا تھا۔

(ا۔م)

اخلاقی اقدار کو پیش کرنے کے لئے قرآن کا طرزِ بیان

سوال:

آپ کا مضمون بعنوان "ادب اور اخلاقی اقدار" جو ماہنامہ "بُرہان" (شمارہ ستمبر و اکتوبر) میں شائع ہوا

میری نظر سے گزرا۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اخلاقی اقدار کو لٹریچر میں پیش کرنے کا سب سے بہتر طریقہ

وہی ہے جو قرآنِ حکیم نے اختیار کیا۔ قرآنِ حکیم حُسنِ کلام اور تاثیرِ کلام کا سب سے مکمل نمونہ ہے۔ ہمیں چاہیئے

کہ قرآنِ حکیم نے انسانیت کو سنوارنے کے لئے لٹریچر میں اخلاقی اقدار کو جس طرح پیش کیا ہے، اس طرزِ بیان

کو اختیار کریں۔

میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اخلاقی اقدار کو پیش کرنے کے لئے قرآن کا طرزِ بیان کونسا ہے؟

جواب:

قرآنِ حکیم اخلاقی اقدار کو فلسفۂ اخلاق کی زبان میں پیش نہیں کرتا، بلکہ حکایات، تمثیل، تشبیہ، استعارہ، تعریض

[illegible] کی زبان میں پیش کرتا ہے۔ یا اس طرزِ بیان سے انسان کا نفس بھی متاثر ہوتا ہے

[illegible] بہت سے [illegible]

[illegible]

بلند نمونہ ہے، اور اس کے مقابلے میں برادرانِ یوسفؑ، امرأۃ العزیز، زنانِ مصر اور حکامِ مصر تصویرِ انسانیت
کے برے نمونے ہیں۔ یہ چیز آپ سے آپ چند اخلاقی قدروں کو انسان کے ذہن میں جاگزین کر دیتی ہے اور ان کا
فلسفیانہ زبان کی بہ نسبت زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

یہ تاریخی قصہ جس ماحول میں بیان کیا گیا تھا، اس پر یہ پوری طرح منطبق بھی ہو رہا تھا اور اس کے نزو
وقت میں اس طرح کے سارے کردار عملاً موجود تھے جن کی اس قصے میں کوئی حصہ داری تھی۔ سورۂ یوسف
آئینے میں دراصل قرآن نے اہلِ مکہ کو ان کی صورتیں دکھلانے کا خاص اہتمام کیا تھا۔

پھر قرآن میں انسان کے اخلاقی کرداروں کو تمثیلی پیرایہ دے کر جا بجا اس طرح سامنے لایا گیا۔
بعض اخلاقی قدروں کی اہمیت اور بعض کا قابلِ نفرت ہونا پوری طرح محسوس ہو جاتا ہے۔ کسی خاص
انسانی سیرت کو مرئی شکل میں سامنے لانے کے لئے جو مثالیں قرآن میں مذکور ہیں ان میں سے ایک سو
میں ہے۔ یہاں دکھایا گیا ہے کہ ایسے لوگ جو آیاتِ الٰہی سے منہ موڑ کر اپنی ہوائے نفس کی رو میں بہہ
ہیں ان کے کیرکٹر کی تصویر کیا ہے۔ فرمایا: فمثله كمثل الكلب ج ان تحمل عليه يلهث او تتر
يلهث (یعنی ہوا پرست آدمی اپنی اخلاقی ذہنیت کے اعتبار سے ایک کتے کی طرح ہوتا کہ جس کا نہ
اصول ہوتا ہے اور نہ جس میں غیرت و حمیت ہی ہوتی ہے، اسے دھتکاریئے تو بھی زبان لٹکا دے گا او
سے نگاہ پھیر لیجئے تو بھی زبان لٹکائے رکھے گا۔ پھر اس تمثیل میں جس کردار کو بیان کیا گیا ہے اس کی زبان کا
کر دیا گیا ہے کہ اس سے خود بخود ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ کردار پیٹ کا بندہ ہے۔

ایک دوسری تمثیل سورۂ المدثر میں مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو: فما لهم عن التذكرة معرضين
كأنهم حمر مستنفرة فرت من قسورة۔ اس مختصر تمثیل سے ان مشرکینِ عرب کا کردار دکھا
ہے جو دعوتِ حق سے خود بھی اعراض کئے ہوئے تھے اور دوسروں کو بھی اس سے دور بھگاتے تھے۔ اب ق
استعارے کے طور پر ان کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ جیسے کچھ گدھے جنگل میں چر رہے تھے کہ کچھ آواز (خاص
شیر کی دہاڑ) ان کے کانوں میں پڑی، اور وہ بغیر سوچے سمجھے کہ آواز کیا ہے، کدھر سے آ رہی ہے، بھاگ
بھاگ کھڑے ہوئے، اور اس انداز سے بھاگے کہ بس جو ملا اسے بھی خوف و اضطرار کی حالت میں [illegible]

پیشِ نظر مثال گدھے کی جن صفات کو سامنے رکھ کر پیش کی گئی ہے ان میں سے ایک صفت حمق کی ہے یعنی گدھا جانوروں میں اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ حواس سے پوری طرح کام نہیں لیتا۔ دوسری صفت ڈرنے اور بدکنے کی ہے کہ ذرا کھٹکا ہوا اور اس نے کان کھڑے کر لئے۔ تیسری صفت بھاگ کھڑے ہونے کی ہے کہ خطرے کا سامنا کرنے یا پیش آمدہ صورت سے نمٹنے کے بجائے اس کا طریقہ کار ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ فوراً بھاگ کھڑا ہو اور اس طرح بھاگے گا کہ اس کا انداز دوسرے ساتھیوں کو بھی بھاگنے کی دعوت دینے والا ہو۔

تمثیل میں یہ اشارہ لطیف چھپا ہوا ہے کہ جس طرح شیر کی آمد پر گدھے کا اندھا دھند بھاگ کھڑے ہونا ذریعۂ نجات نہیں ہے، بلکہ اگر شیر تعاقب کر رہا ہے تو وہ بہرحال آ ہی لے گا، اسی طرح مشرکین جس دعوت پر غور کئے بغیر اس سے بھاگے پھر رہے ہیں وہ ایک دن ان کو آ لے گی۔

قرآن کے اندازِ بیان میں ایک پہلو یہ بھی پایا جاتا ہے کہ وہ نفسِ انسانی کا تجزیہ کر کے اس کے چھپے پہلو ... پھر وہ مختلف اخلاقی قدروں کو کرداروں کے پیرائے میں لا کر ان کا تقابل کرتا جاتا ہے۔ پھر وہ ماضی کے واقعات کو حال پر چسپاں کرتا ہے۔ پھر وہ مستقبل (خصوصاً عالمِ آخرت) کو حال بلکہ ماضی بنا کر دکھاتا ہے تاکہ مخاطب کا ذہن پیش آنے والے احوال کو زیادہ آسانی سے قبل از وقت سمجھ سکے۔

اس طرح اگر قرآن کے طرزِ بیان کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ طرزِ بیان نہ تو فلسفیانہ ہے نہ شاعرانہ بلکہ اعلیٰ درجے کا ادبی طرزِ بیان ہے۔ (ل۔ ص)

قرآن میں چوری کی سزا

سوال:

اس خط کے ہمراہ ایک مضمون "قرآن میں چوری کی سزا" کے عنوان سے بھیج رہا ہوں۔ اگر ... ہو تو آپ اسے ترجمان القرآن میں شائع فرما دیں ... میرا مقصد یہ ہے کہ ... اس پر ... خیال کریں، اور اگر ... [illegible]

مجلسِ دستور ساز پاکستان کے سامنے زنا اور چوری، دو فوجداری جرم ایسے ہیں جن کی قرآنی سزا موجودہ رجحانات کے خلاف ہے۔ میرے مضمون کا منشا یہ ہے کہ مجلس مذکورہ کے لئے یہ ممکن ہو جائے کہ وہ اپنے قانون کو ایک طرف قرآن کی سزاؤں کے مطابق بنا سکے اور دوسری طرف لوگوں کے خیالات کا لحاظ بھی رکھ سکے۔ جہاں تک ہو سکے کسی جرم میں قید کی سزا نہ دی جائے اور بید، جرمانہ، جلاوطنی وغیرہ سزاؤں کو رواج دیا جائے تو یہ عین قرآن کے منشا کے مطابق ہوگا۔

نوٹ:۔ جناب سائل کے محولہ بالا مضمون کے چند ضروری اقتباس یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ یہ اقتباس اخبار پیغام صلح مورخہ یکم نومبر ۱۹۵۰ء کے تراشے سے لئے گئے ہیں جو خط کے ساتھ موصول ہوا ہے۔ (ن۔ ص)

"اس آیت (سورۂ مائدہ — ۳۸، ۳۹) میں چوری کے جرم کی سزا بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ چوروں کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ السارق کے ساتھ السارقہ کے لفظ سے تمام مفسرین نے یہی سمجھا ہے کہ اس سے مراد چور عورت ہے" ——— "مگر سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کبھی نوعِ انسان کے لئے کسی انعام یا سزا کا ذکر کرتا ہے تو شاذونادر حالتوں کے بغیر صرف مذکر کے لئے کرتا ہے اور مؤنث خود بخود اس میں شامل سمجھی جاتی ہے" ——— "حقیقت یہ ہے کہ یہاں سارقہ سے مراد چور کا معین و مددگار ہے۔ دنیا میں دو قسم کے آدمی ہیں: ایک وہ جو کام کر رہے ہیں اور دوسرے وہ جو ان کے مددگار ہیں۔ مرد اور عورت میں سے بالعموم مرد کام کرنے والا ہوتا ہے اور عورت اس کی مددگار ہوتی ہے، اس لئے مددگاروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے مؤنث کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ قرآن مجید نے بالعموم جہاں کہیں کسی کام یا نتیجہ میں مرد کے ساتھ عورت کا صیغہ استعمال کیا ہے وہاں ہمیشہ اس سے مراد اس کام میں معین و مددگار رہی ہے، خواہ وہ عورت ہو یا مرد۔ فعلِ زنا میں مرد کا پہلا مددگار زانیہ ہوتی ہے اور دوسرا مددگار وہ دلال ہوتے ہیں جو بیچ میں پیغام رساں ہو کے اسے وقوع میں لاتے ہیں اور تکمیل کراتے ہیں۔ اسی لئے زانیہ کے لفظ میں وہ سب شامل ہیں۔ اسی طرح چوری کا کام بالعموم انجام نہیں پا سکتا، جب تک تاڑ بازی کرنے والے، چور کے پناہ دہندہ اور چوری کے مال کے چھپانے والے نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے سارقہ کے لفظ میں ان سب کو شامل کیا ہے، اور چونکہ

ایک ہی سزا یعنی ہاتھ کاٹنا مقرر کی ہے "۔۔۔۔۔ "یہ بات کہ یہاں سارقہ سے چور کے مددگار مراد ہیں، اس سے بھی ظاہر ہے کہ سارق اور سارقہ کے درمیان واؤ کا لفظ لایا گیا ہے۔ حالانکہ اگر مراد چور عورت ہوتی تو واؤ کے بجائے اَو کا لفظ ہوتا" ۔۔۔۔۔ "دوسری بات جو یہاں قابلِ غور ہے، یہ ہے کہ اللہ نے چوروں کو بھی توبہ کرنے کی مہلت دے کر سزا سے معاف فرمایا ہے، حالانکہ اسلامی فقیہوں کی تعزیرات میں معافی کا کوئی ذکر نہیں" (اس موقع پر توبہ کے بارے میں چند احادیث نقل کی گئی ہیں۔ ن۔ س) "پس میری رائے میں قرآن کی رو سے چور کو بھی توبہ کرنے کا ایک دفعہ موقع ملنا چاہیئے۔ اگر باوجود توبہ کے وہ پھر چوری کرے تو اس کو ضرور سزا ملنی چاہیئے" ۔۔۔۔۔ "قرآن جب ایک طرف چور کی معافی کا ذکر کرتا ہے اور دوسری طرف ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا ہے تو اس کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ چوری کے لئے کم سے کم سزا یعنی معافی سے لے کر زیادہ سے زیادہ سزا یعنی ہاتھ کاٹنا بتاتا ہے۔ اس واسطے یہ کہنا کہ اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنے کے سوا کچھ نہیں، میرے نزدیک اصولِ قرآن کی غلط تعبیر کرنا ہے" ۔۔۔۔۔ "قرآن کی رو سے قاضی کو چور اور اس کے مددگاروں کے بارے میں پورا اختیار حاصل ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ وہ ان سے توبہ کرا کے بالکل کورا بھی چھوڑ سکتا ہے اور بید، جرمانہ، قید کی سزا بھی دے سکتا ہے۔ انتہائی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ اس تشریح کے ساتھ اس چیخ و پکار کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ قرآن کی سزائیں وحشیانہ سزائیں ہیں جو موجودہ متمدن دنیا میں قابلِ قبول نہیں"۔

جواب:

آپ نے چور کی سزا کے بارے میں جو استدلال فرمایا ہے مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ سارقہ اور زانیہ سے "سرقہ اور زنا میں مدد کرنے والے" لینا محض ایک تکلف ہے جس کے لئے عربی میں کوئی گنجائش نہیں ہے، اور اس طرح قرآنی الفاظ میں زبردستی ایک معنی پیدا کرنے کو میں جائز نہیں سمجھتا۔ رہی یہ بات کہ سارق کے ساتھ سارقہ تصریح کرنے کی اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت تھی؟ تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کے معاملے میں سزا کی ... لفظ لوگوں کو ویسے بھی اچھا خاصا پریشان کرتا ہے لیکن مرد کی بہ نسبت عورت کے حق میں یہ خیال زیادہ ... ہو سکتا ہے اس لئے صراحت کی گئی کہ ... [illegible]

کی جائے یہی مصلحت زانی کے ساتھ زانیہ کی تصریح میں بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔

واوِ عطف سے جو معنی آپ نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان میں واوِ عطف معیت ہی کے معنی میں نہیں آتا کہ آپ لازماً اس کے معنی یہ کریں کہ معطوف اور معطوف علیہ دونوں پر ایک ساتھ حکم جاری ہو۔ "واو" مطلق جمع کے لئے بھی آتا ہے اور اس سے مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ جو حکم بیان کیا جا رہا ہے اس میں معطوف اور معطوف علیہ دونوں یکساں ہیں۔ اس صورت میں اس کا فائدہ قریب قریب وہی ہوتا ہے جو "او" کا ہے، یعنی خواہ معطوف یا معطوف علیہ، دونوں میں سے جو بھی ہو اس کا وہی حکم ہوگا جو بیان کیا گیا ہے۔ اسی لئے تو آیت فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کا مطلب آپ یہ لیتے ہیں کہ دو دو، یا تین تین، یا چار چار، نہ کہ یہ سب ایک ساتھ۔ لہٰذا السارق والسارقۃ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چور خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں پر یہی قطعِ ید کا حکم جاری ہوگا۔

چور کی توبہ کے معاملے میں آپ نے جو بحث فرمائی ہے اس میں آپ یہ بھول گئے ہیں کہ آخر کونسا چور ہوگا جسے اگر سزا سے بچنے کی امید ہو تو وہ توبہ نہ کرلے گا؟ اور آپ کس جگہ یہ حد مقرر کریں گے کہ اتنی بار توبہ کرلینے پر بھی جو شخص چوری سے باز نہ آئے تو پھر اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا؟

آپ کا یہ سوال بھی صحیح نہیں ہے کہ چوری اور زنا میں مدد کرنے والوں کے لئے قرآن میں کیا سزا مقرر کی گئی؟ ایک یہی معاملہ کیا، قرآن میں تو قانونِ تعزیرات کی بہت سی دفعات کے بارے میں سکوت کیا گیا ہے۔ پھر کیا یہ ضروری ہے کہ ہم یا تو ہر جرم کی سزا قرآن ہی سے نکالیں، یا پھر قرآن کے ذکر کردہ جرائم اور سزاؤں کے سوا کسی مجرم پر سزا نہ دیں؟ قرآن تو صرف حدود مقرر کرتا ہے۔ باقی رہا تعزیرات کا معاملہ، تو شریعت میں یہ مسلّم ہے کہ اس باب میں حسبِ ضرورت احکام مدوّن کئے جاسکتے ہیں۔ (ا۔م)
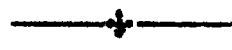
مطبوعات

A GIDE TO THE DIVIN[E] TRUTHS OF ISLAM

مؤلفہ: محمد عبداللہ راجپوت، ایم۔ اے۔

ملنے کا پتہ: وچھبنی روڈ، پشاور چھاؤنی۔

قیمت: مجلد تین روپے، آٹھ آنے۔

ایک سو چالیس صفحے کی اس انگریزی کتاب میں مؤلف نے اجمالاً اسلام کے ایمانیات، عبادات اور اخلاقی معاشرتی اصولوں کو سادہ عقلی استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے، مؤلف کے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے کو جو دین سے جذباتی بُعد پیدا ہو گیا ہے اسے کم کیا جائے اور قوم کے نوجوانوں کو اُس دین کے متعلق جس سے وہ اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں کم از کم بنیادی معلومات بہم پہنچا دی جائیں۔

مؤلف نے اس کتاب میں اسلام کے اصولوں کی تشریح و تعبیر جس طرزِ فکر کے تحت کی ہے وہ حسب ذیل متبرک کتابوں پر مبنی ہے:-

(۱) غنیۃ الطالبین (سید عبدالقادر جیلانیؒ) (۲) احیاء العلوم الدین (امام غزالی) (۳) مشکوٰۃ المصابیح (شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ تبریزی کا)

زبان آسان اور خصوصاً طلباء کے معیار کی ہے۔

[طب] قدیم اور طب جدید

مؤلف ڈاکٹر سید ممتاز حسین صاحب ایم بی بی ایس، نگراں شاہ دین روڈ، لاہور۔

قیمت درج نہیں ہے۔

جس طرح دینیات میں دیوبندی اور بریلوی وغیرہ مدارس فکر کے درمیان مدت سے مناظرانہ بحثیں جاری ہیں اسی طرح ہمارے ہاں طب قدیم اور طب جدید کے درمیان برابر دماغی تصادم ہوتا رہتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس علمی اختلاف نظر میں کاروباری رقابت کا خمیر بھی آ ملا ہے جس نے فضا بہت خراب کر دی ہے۔

[illegible]

توضیحات کا بڑے سنجیدہ طریق سے جواب دیا ہے۔ آپ کے دلائل معقول اور انداز بیان بہت سنجیدہ ہے اور بہت سے پہلوؤں میں راقم الحروف کو ان سے اتفاق بھی ہے۔ اس امر سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے کہ طب قدیم اور طب جدید دونوں کا سرچشمہ یونانی علم الاعضا اور علم الادویہ کا ہے، لیکن یونانی علم طبابت کا ارتقا مسلمانوں کے ہاں ایک خاص مدت تک جاری رہنے کے بعد ان کے سیاسی زوال کے ساتھ رک گیا، اور قرونِ مابعد میں اس علم کی پرورش مغرب کی فضا میں ہوئی۔ اب یہ ظاہر ہے کہ دنیا کی مقتدر اقوام کی حکومتوں کی سرپرستی میں جو علم و فن مسلسل ترقی کر کے عروج پر پہنچ چکا ہے، اس سے اسی علم و فن کی وہ شاخ کیسے آنکھوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے جو پس ماندہ مشرقی اقوام کے ہاں حکومتوں کی سرپرستی سے محروم پڑی سسک رہی ہے۔

ڈاکٹر ممتاز صاحب نے پمفلٹ کی تمہید میں ایک دلچسپ سوال چھیڑا ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت، اسلامی شرع اور اسلامی فقہ کی ترکیبیں تو بامعنیٰ ہیں لیکن "اسلامی طب" کی اصطلاح بے معنیٰ ہے، کیونکہ علوم و فنون کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ایک حد تک یہ بات صحیح ہے، لیکن یونانی طب کو جس معنیٰ میں اسلامی طب کہا جاتا ہے وہ اگر پیشِ نظر رہیں تو آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس اصطلاح کے اندر بھی کچھ معنویت موجود ہے۔ آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ طب کے دو شعبے "علم" اور "فن" اسلامی اور غیر اسلامی ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک علم کا تعلق ہے انسان کے بدن اور اعضا اور ادویات کے مطالعے میں ایک نقطۂ نظر یہ ہو سکتا ہے کہ موجودات محض مادہ کی ایک صورت گری ہیں، کسی بارادہ خالق کا کرشمۂ قدرت نہیں ہیں اور ان میں خواص اور حرکات اور تغیر و تبدل اور اثر و تاثر کے جو قوانین برسرِ عمل ہیں وہ بھی محض اندھی فطرت کی طرف سے مسلط کردہ ہیں، کسی "الٰہ" کی حکومت کا مظاہرہ نہیں ہیں۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہو سکتا ہے کہ موجودات ایک خالق کی اسکیم کے تحت وجود میں آتے ہیں اور ایک "الٰہ" کی حکمت ہے جو ان کے لئے قوانین بنانے والی ہے۔ اگر آپ بالکل ایک ہی علمِ حقائق کا ان دو مختلف نقطہ ہائے نظر سے مطالعہ کریں۔ - - - - - - - - - - - اور ان کو دونوں مختلف نقطہ ہائے نظر سے قلمبند کریں تو ایک ہی علم پہلے نقطۂ نظر کے زیرِ اثر غیر اسلامی ہو جائے گا اور وہی علم دوسرے نقطۂ نظر کی وجہ سے اسلامی شمار ہوگا۔ یہ نہ خیال کیجئے کہ یہ محض نظری فرق ہوگا، جی نہیں! نقطۂ نظر کا یہی اختلاف انسان کے بارے میں آپ کے پورے طرزِ عمل کو بدل کے رکھ دے گا۔ پہلی قسم کا علم آدمی کو آپ کے سامنے ایک "ترقی

فتہ حیوان" کی حیثیت سے لائے گا، اور دوسری قسم کا علم اسے آپ کے سامنے خدا کے ایک بندے اور
بنے ایک بھائی کی حیثیت سے پیش کرے۔ آج لوگ اسلامی علم طب کے نام سے جس علم کو موسوم کرتے ہیں اس
تدوین میں جو مخصوص نقطۂ نظر اختیار کیا گیا تھا اس کی وجہ سے ہی اسے اسلامی علم طب کہا جاتا ہے! اسی طرح
ای تک فن کا معاملہ ہے، دواسازی میں حرام و حلال کی حدود کا خاص لحاظ، معائنہ و تشخیص کے مراحل سے
رتے ہوئے حیا داری کا اہتمام مریضوں اور ان کے تیمار داروں کے جذبات و احساسات کا احترام، معاوضہ
ات کی وصولی میں موکلوں کی مالی حالت کا پاس اور پھر از اول تا آخر کاروباریت کے بجائے خدمت کی روح
ر عمل رکھنا نیز خدا کے سامنے جواب دہی کا احساس بیدار رکھنا، یہ وہ خاص روایات تھیں جن کو مسلم اطبا نے
یہاں فروغ دیا اور انھی روایات کی وجہ سے ان کا فن اسلامی فن کہلایا۔ چنانچہ اساتذہ اپنے شاگردوں کو
ب کی تعلیم دیتے ہوئے متعلقہ اسلامی حدود اور آداب و اخلاق کا خمیر اس میں ملا دیتے تھے۔ پس ہمارے نزدیک
اسلامی طب" بالکل بے معنیٰ اصطلاح نہیں ہے۔

طب قدیم جسے" اسلامی طب" کہا جاتا ہے، وہ مغرب کی جدید طب کے مقابلے میں ایک جداگانہ مکتب
حیثیت رکھتی ہے۔ اپنے اس مکتب فکر کی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے اگر اس طب کے حامی جدید
سے بغیر کسی تعصب کے استفادہ کریں اور اپنی طب کو UP-TO-DATE بنانے کی کوشش کریں، یا دوسری
میں جدید طب کو اپنے مکتب فکر کے مخصوص سانچے میں ڈھال لیں تو یہ ایک قابل یادگار کارنامہ ہوگا۔ لیکن یہ
ی صورت میں ممکن ہے کہ جدید طب اور قدیم طب کے علمبرداروں کے درمیان حریفانہ مناظروں کے بجائے
کی اسپرٹ کام کرنے لگے اور خاص طور پر حکومت اس معاملے میں براہ راست دلچسپی لے۔

بہر حال جو پمفلٹ ہمارے سامنے ہے یہ دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

تفہیم القرآن کے متعلق ضروری اعلان

تفہیم القرآن کے متعلق شائقین کی طرف سے بار بار پوچھا جا رہا ہے کہ دیر کیوں ہو رہی ہے۔ آپ کی بے چینی بجا
لیکن واقعہ یہ ہے کہ ناشر آپ سے زیادہ بے چین ہے اور اس کی طرف سے کوئی تاخیر نہیں ہے۔ تاخیر بعض غیر اختیا
وجوہ سے ہے، لیکن انشاء اللہ یہ تاخیر مفید ثابت ہوگی کیونکہ کتاب کی خوبیوں میں اضافہ کرنے کی تجاویز برابر اختیار
جا رہی ہیں۔ ضروری تفصیلات درج ذیل ہیں:-

جلد اول میں اضافہ پہلی جلد سابق اعلان کے بموجب سورۂ فاتحہ سے سورۂ مائدہ تک تھی، لیکن اب محترم مؤلف
سورۂ انعام کا اس میں اضافہ فرما دیا ہے۔

کتابت پہلی جلد کی کتابت مکمل ہو چکی۔ دوسری جلد کی کتابت شروع کرا دی گئی ہے۔

تصحیح کاپیاں دو تین مرتبہ پڑھنے کے بعد مولانا کی خدمت میں لائی جاتی ہیں اور آپ پوری طرح ان کی آخری تص
فرماتے ہیں۔ اسی طرح پروف بھی اچھی طرح دیکھنے کے بعد آخری مرتبہ مولانا کے سامنے لائے جاتے ہیں۔

انڈیکس پوری جلد کے مندرجات کے انڈیکس کی تیاری مولانا نے اپنے ذمے لی ہے حالانکہ ان کی مصروفیات بہت زیادہ ہیں

نقشے ضروری جغرافی نقشوں کی تیاری ایک خاص رفیق کے ذمے کی جا چکی ہے، ابھی کام ختم نہیں ہوا۔

کاغذ ایک ہزار جلد (قسم دوم) کے لئے کراچی سے کاغذ مل گیا ہے، بقیہ کاغذ انشاء اللہ فروری تک موصول ہو جائے
انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔

طباعت پریس میں صرف چند روز کے لئے فہرست رائے دہندگان (الیکشن) کی طباعت کے کام کی
ہے، اس کام کے ختم ہوتے ہی جلد اول کی طباعت شروع ہو جائے گی۔

ترسیل جیسے کہ پہلے اعلان کیا جا چکا ہے، انڈیا اور پاکستان دونوں ملکوں کی فرمائشوں کی تعمیل اسی ترتیب
سے ہوگی جس سے فرمائشیں موصول ہو رہی ہیں۔

شیخ قمر الدین پبلشر، گوجر گلی - اندرون موچی دروازہ - لاہور۔

سی فرد یا جماعت کے نظریات کا براہ راست
اور تفصیلی مطالعہ کئے بغیر

جماعت اسلامی

رکزی مکتبہ جماعت اسلامی لاہور

پاکستانی عورت دوراہے پر

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، لاہور

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

[illegible]

[illegible]ریات ، پاکستان کے ہر شہری کا اولین فریضہ

رسالۂ دینیات

اس رسالے میں ابتدائی دینی تعلیم کے لئے نیا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں مسائل کی تفصیلات کے بجائے دین کے بنیادی عقائد اور ان کی صحت و صداقت کے دلائل ترتیب کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، کیوں کہ عقائد کے استحکام کے بعد ہی جزوی احکام میں اطاعت کا جذبہ بیدار ہوسکتا ہے۔

ضخامت ۱۱۲ صفحات ۔ قیمت ۸/۱

خطبات

یہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد سے متعلق انتیس خطبوں کا مجموعہ ہے۔ زبان اور انداز بیان دونو نہایت سلیس اور عام فہم ہیں، ان خطبوں میں احکام و عبادات کی حکمت اور اُن کے مصالح ذہن نشین کرانے کی خاص طور پر کوشش کی گئی ہے۔ رسالۂ دینیات کے ساتھ خطبات کے مطالعہ سے دین کی راہ اچھی طرح روشن ہوجاتی ہے۔

ضخامت ۲۱۶ صفحات ۔ قیمت ‎-/۲

تجدید و احیاءِ دین

تجدید اسلام کے موضوع پر یہ ایک تاریخی اور اصولی بحث ہے۔ اس میں اسلام اور جاہلیت کی اصولی کشمکش کا جائزہ لینے کے بعد تجدید کی حقیقت، مجدد کی تعریف اور اس کے کام کی نوعیت متعین کی گئی ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز سے لے کر حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید تک کے مجددین کے کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

تفہیمات

(حصہ اول)

اس میں اسلام کے بعض اُن اہم ترین مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کا تصور عام طور پر محدود یا مسخ ہوکر رہ گیا ہے۔ مثلاً عبادت، جہاد، آزادی، روا داری وغیرہ۔ کتاب کے آخر میں خصوصیت کے ساتھ توحید رسالت، اتباع رسالت اور ماخذ دین ہونے کی حیثیت سے حدیث کی اہمیت پر بحث کی گئی ہے۔ حدیث کے متبعین اور منکرین دونو کے لئے اس بحث کا مطالعہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ کتاب کا حصہ دوم زیر طبع ہے۔

ضخامت ۴۲۴ صفحات ۔ قیمت ۸/۳

☆

تنقیحات

اس تالیف کے مضامین اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں غیر اسلامی اثرات اور مسلمانوں کی کوتاہیوں پر تنقید بھی ہے اور ابھرتے ہوئے حقائق کی توضیح بھی۔ [illegible] تہذیبی دور میں تعلیم یافتہ [illegible] مجید کیوں سے دوچار ہیں [illegible] کرنے میں اس کتاب سے

فہرست مضامین

جلد ۳۵، عدد ۳ ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ مطابق جنوری، فروری ۱۹۵۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

پچھلی اشاعت میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا تھا کہ اگست ۱۹۴۱ء میں تحریکِ اسلامی سے متأثر ہونے والوں کی تنظیم و تربیت کا سلسلہ کس غرض کے لئے شروع ہوا تھا، کس طرح کے لوگوں کو اکٹھا کرنا مطلوب تھا، کس قسم کی تربیت ان کو دینے کی فکر تھی، اور کیا کام ان سے لینا پیشِ نظر تھا۔ ان سب امور کی توضیح جماعت کے ابتدائی دور کی مطبوعات کے حوالوں سے کی جا چکی ہے تاکہ کوئی شخص یہ شبہ نہ کر سکے کہ آج اس جماعت کے وجود کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اس کے مقاصد نئے سرے سے تصنیف کئے جا رہے ہیں۔ تاہم اگر اس کے بعد بھی کسی مزید توضیح کی ضرورت ہے تو ہمیں امید ہے کہ اس کے لئے وہ چند فقرے کافی ہوں گے جو تقسیم ہند سے صرف تین مہینے پہلے مئی ۱۹۴۷ء کی ایک تقریر میں کہے گئے تھے۔

— — ✝ — —

یہ تقریر "بناؤ اور بگاڑ" کے نام سے شائع ہو چکی ہے اور ہماری مطبوعات میں موجود ہے۔ اس میں ملک کے عام اخلاقی بگاڑ اور اس کے ہولناک نتائج کا نقشہ کھینچنے کے بعد عرض کیا گیا تھا:

"اس تاریکی میں ہمارے لئے امید کی ایک ہی شعاع باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری پوری آبادی بگڑ کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس میں کم از کم چار پانچ فی صدی ایسے لوگ ضرور موجود ہیں جو اس عام اخلاقی بگاڑ سے بچے ہوئے ہیں۔ یہ وہ سرمایہ ہے جس کو اصلاح کی ابتدا کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اصلاح کی راہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ اس صالح عنصر کو چھانٹ کر منظم کیا جائے۔

ہماری بدقسمتی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے ہاں بدی تو منظم ہے اور پوری باقاعدگی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے مگر نیکی منظم نہیں ہے .... اب اس صورتِ حال کو ختم ہو جانا چاہیے اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا ملک خدا کے عذاب میں مبتلا ہو اور اس عذاب میں نیک و بد سب گرفتار

ہوجائیں تو ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے اندر جو صالح عناصر اس اخلاقی وبا سے بچے رہ گئے ہیں وہ اب مجتمع اور منظم ہوں اور اجتماعی طاقت سے اُس بڑھتے ہوئے فتنے کا مقابلہ کریں جو تیزی کے ساتھ ہمیں تباہی کی طرف لئے جارہا ہے۔

آپ اس سے نہ گھبرائیں کہ یہ صالح عنصر اس وقت بظاہر بہت ہی مایوس کن اقلیت میں ہے۔ یہی تھوڑے سے لوگ اگر منظم ہوجائیں، اگر ان کا اپنا ذاتی اور اجتماعی رویہ خالص راستی، انصاف، حق پسندی اور خلوص و دیانت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو، اور اگر یہ مسائل زندگی کا ایک بہتر حل اور دنیا کے معاملات کو درست طریقے پر چلانے کے لئے ایک اچھا پروگرام بھی رکھتے ہوں تو یقین جانیئے کہ اس منظم نیکی کے مقابلے میں منظم بدی اپنے لشکروں کی کثرت اور اپنے گندے ہتھیاروں کی تیزی کے باوجود شکست کھا کر رہے گی۔ انسانی فطرت شر پسند نہیں ہے۔ اسے دھوکا ضرور دیا جاسکتا ہے، اور ایک بڑی حد تک مسخ بھی کیا جاسکتا ہے، مگر اس کے اندر بھلائی کی قدر کا جو مادہ خالق نے ودیعت کر دیا ہے اسے بالکل معدوم نہیں کیا جاسکتا...... اگر خیر کے علمبردار سرے سے میدان میں آئیں ہی نہیں اور ان کی طرف سے عوام الناس کو بھلائی کی راہ پر چلانے کی کوئی کوشش ہی نہ ہو تو لامحالہ میدان علمبردارانِ شر ہی کے ہاتھ رہے گا اور وہ عام انسانوں کو اپنی راہ پر کھینچ لے جائیں گے۔ لیکن اگر خیر کے علمبردار بھی میدان میں موجود ہوں اور وہ اصلاح کی کوشش کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کریں تو عوام الناس پر علمبردارانِ شر کا اثر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ ان دونوں کا معرکہ بلا آخر کار اخلاق کے میدان میں ہوگا، اور اس میدان میں نیک انسانوں کو برے انسان کبھی شکست نہیں دے سکتے۔ سچائی کے مقابلے میں جھوٹ، ایمانداری کے مقابلے میں بے ایمانی اور پاکبازی کے مقابلے میں بدکرداری کا خواہ کتنا ہی زور لگ لے، آخر جیت بہرحال سچائی، پاکبازی اور ایمانداری کی ہوگی۔ دنیا اس قدر بے حس نہیں ہے کہ اچھے اخلاق کی مٹھاس اور برے اخلاق کی تلخی کا مزہ چکھ لینے کے بعد آخرکار اس کا فیصلہ مٹھاس کے خلاف تلخی کے حق میں ہو۔

([illegible])

پچھلے اقتباسات کے ساتھ اس آخری اقتباس کو اگر کوئی شخص بغور پڑھے گا تو ہمیں توقع ہے کہ اسے اس جماعت کی تاسیس کا مقصد اور اس کی ضرورت سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی، بشرطیکہ وہ دوسروں کی عبارتوں میں اپنے خیالات یا اپنی خواہشات پڑھنے کا مریض نہ ہو۔

اس مقصد کے لئے معاشرے کے صالح عناصر کو چھانٹنے اور ان کو ایک نظم میں پرونے کا کام ایک نہایت صبر آزما کام تھا جو کئی سال تک خاموشی کے ساتھ، اور بڑی آہستہ رفتار کے ساتھ ہوتا رہا۔ جماعت کا لٹریچر ملک کے بے شمار آدمیوں تک پہنچا۔ ان میں سے لاکھوں نے اسے اسلام کی صحیح ترجمانی سمجھا۔ اُن میں سے ہزاروں آدمی کم و بیش اس سے متأثر ہوئے۔ اور ان میں سے سینکڑوں آدمیوں کے دل نے گواہی دی کہ فی الواقع یہی کرنے کا کام ہے۔ مگر یہ سینکڑوں آدمی بھی بیک وقت اس طرح جماعت کے نظم میں داخل نہیں کر لئے گئے کہ انھوں نے کسی رکنیت کے فارم پر دستخط کر دیئے ہوں اور بس وہ رکنِ جماعت قرار پا گئے ہوں۔ وقتاً فوقتاً تھوڑے تھوڑے آدمی یہ فیصلہ کر کے آگے بڑھتے رہے کہ اب اُن کا جینا اور مرنا اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ ان کے قول کو ان کے عمل کی گواہی سے جانچا اور پرکھا گیا کہ فی الواقع جس فیصلے کا وہ زبان سے اظہار کر رہے ہیں، ان کی عملی زندگی بھی اس کی شہادت دیتی ہے یا نہیں۔ بسا اوقات ایک ایک شخص کئی کئی مہینے تک امیدواری اور امتحان کی منزل میں رکھا گیا پھر جب اچھی طرح اطمینان کر کے اسے جماعت میں لیا گیا تو اس کے بعد بھی پوری جماعت یہ دیکھتی رہی کہ اس کے اخلاق، اس کے معاملات، اور خدا کے دین کی سربلندی کے لئے اس کی سرگرمیاں اس کم سے کم معیار کے مطابق ہیں یا نہیں جو دعوت الی الخیر کی خدمت انجام دینے کے لئے مطلوب ہے۔ جہاں کوئی شخص معیارِ مطلوب سے نیچے اترا، جماعت کے پورے نظم نے اس کو سنبھالنے اور اٹھانے کی کوشش کی، مگر جب وہ نہ اٹھ سکا تو اسے جماعت سے الگ کر دینے میں کبھی تامل نہ کیا گیا، تاکہ ایک شخص کی کمزوری پوری جماعت کو کمزور نہ کر دے۔ اس طرح ۱۲ سال کی طویل مدت میں اکروڑ کی عظیم الشان قوم میں سے جو لوگ اس تنظیم کے لئے چھانٹے جا سکے ان کی تعداد تقسیم ہند کے وقت صرف [illegible] تھی۔ ان لوگوں کو چھانٹنے میں جتنی خدمت جماعت کے لٹریچر نے اور جماعت کے معیارِ انتخاب نے انجام دی، [illegible] کے حالات نے بھی اس سے کچھ کم خدمت انجام نہیں دی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہماری قوم سخت [illegible]

اس وقت یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی ہنگامہ پسند، شہرت طلب، جاہ پرست، جوشیلا، اور جذباتی آدمی ایسی
...ش اور بے لذت تحریک میں حصہ لینے کا خیال کرتا۔ اس وجہ سے ہماری دعوت کی طرف وہی لوگ
...ئے جن کے دلوں میں دینِ حق کے لئے اخلاص موجود تھا اور جن کے اندر ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر
...ح کا ایک نصب العین طے کرنے اور پھر اس کے لئے مدت العمر خاموشی کے ساتھ لگاتار کام کرتے رہنے کی
...ت تھی۔

...س طریقے سے جو لوگ معاشرے میں سے چھانٹے گئے ان کی تربیت کے لئے ہمیں کوئی خانقاہ یا تربیت گاہ
...ہ کی ضرورت پیش نہیں آئی، اول روز سے ہمارا اعتماد تربیت کے اس فطری طریقے پر رہا جس سے
...ائی مسلمان تیار کئے گئے تھے۔ اُن کے لئے اُن کے اپنے گھر اور ان کی اپنی بستی کے کوچہ و بازار ہی تربیت گاہ
...گی کی آزمائشیں ہی ان کو بنانے اور نکھارنے کے لئے کافی تھیں۔ دعوتِ حق کو قبول کرکے جب انھوں نے
...، کی پابندی کا فیصلہ کر لیا تو انھیں تربیت دینے کے لئے کسی جنگل یا کھوہ میں لے جانے کی ضرورت پیش
...ان کی سیرتوں کی تیاری کے لئے کوئی الگ ادارہ قائم کرنا پڑا۔ وہی معاشرہ جس کے اندر وہ رہتے تھے، ان
...سے اصولِ حق کی پابندی کا اعلان سنتے ہی، اور ان کی زندگی میں اس اعلان کا اثر محسوس کرتے ہی اُن کو
...مانجھنے اور تپا تپا کر پختہ کرنے میں لگ گیا اور اسی تربیت گاہ سے وہ لوگ تیار ہو کر نکلے جو اگرچہ مٹھی بھر تھے
...نے چند سال کے اندر عرب کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ ٹھیک یہی طریقہ تھا جس کی ہم نے تقلید کی۔ جو شخص بھی ہماری
...ہ داخل ہوا، اس سے بس یہ عہد لے کر چھوڑ دیا گیا کہ اب وہ اللہ رب العالمین کا مطیع فرمان اور محمد صلی اللہ
...علیہ وسلم کی ہدایت کا پیرو بن کر رہے گا اور اس مقصد کے لئے کام کرے گا کہ اللہ اور رسول کا دین دنیا میں
...ہے۔ اس کے بعد جس ماحول میں تھا وہی اس کے لئے ایک ہمہ گیر اور ہمہ وقت تربیت گاہ کا کام کرتی
...ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہا تھا جس میں کسی کو بھی اللہ کی الوہیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی
...تھا اور کوئی [illegible] کے لئے تیار نہ تھا کہ اسلام کے بجائے کفر دنیا میں غالب [illegible]
[illegible]

اطاعت، امر بنی برحق کی عملی پیروی اور جاہلیت کے طریقوں پر اسلامی طریقوں کی عملی ترجیح بخوشی برداشت کر

گئی ہے یہ روش اختیار کرتے ہی ہر شخص کو ہر جگہ ایک کشمکش سے سابقہ پیش آیا جس کی ابتدا اس کے اپنے نفس سے

ہوئی اور پھر اس کا دائرہ ان تمام گوشوں تک پھیلتا چلا گیا جہاں اس کی اس نئی روش کا اس بگڑی ہوئی سوسائٹی

کے طور طریقوں سے تصادم ہوتا تھا جو لوگ اپنی سیرت کے جس گوشے میں بھی خامی رکھتے تھے وہ اسی گوشے میں

شکست کھا گئے اور اس کشمکش نے ان کو آپ ہی آپ چھانٹ کر الگ پھینک دیا۔ مگر جو رَبُّنَا اللّٰہ کہہ کر اپنے امر

قول پر مضبوطی کے ساتھ جم گئے ان کے لئے یہی کشمکش ایک بہترین مربی اور مزکّی ثابت ہوئی۔ اس نے ان کو صبر کی

تحمل کی، ایثار اور قربانی کی مشق کرائی۔ اس نے ان کو دھن کا پکا اور ارادے میں پختہ بنایا۔ اس نے ان میں اپنے

نصب العین سے عشق اور اس کے لئے جدوجہد کرنے کا ولولہ پیدا کیا۔ اس نے ان کو جذبات اور خواہشات پر

قابو رکھنا سکھایا۔ اس نے ان کو اس قابل بنایا کہ جس چیز کو حق سمجھیں اس کے لئے کسی خارجی دباؤ یا لالچ کے

بغیر اپنے ایمان کے تقاضے سے اپنا وقت، اپنی محنتیں اور اپنے اوقات صرف کریں۔ اور اسی نے ان میں یہ

طاقت پیدا کی کہ اپنے مقصد کی راہ میں نقصانات اٹھائیں، خطرات سہیں، مشکلات کا مقابلہ کریں، اور ہر

کے مراحل کی شدید تر آزمائشوں کا سامنا کر سکیں۔

تربیت کے اس فطری کورس کی مدد پر تین چیزیں اور تھیں جو اس کی کسر پوری کرنے والی تھیں، ایک

دعوت و تبلیغ۔ دوسرے نظم جماعت۔ اور تیسرے روح تنقید۔

دعوت و تبلیغ کا صرف یہی ایک فائدہ نہیں ہے کہ آدمی دوسروں کی اصلاح کا فریضہ انجام دیتا ہے جو

اس کی عاقبت کے لئے مفید ہے، بلکہ اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی کی اپنی اصلاح بھی ساتھ ساتھ ہوتی

جاتی ہے۔ جو شخص کسی چیز کو حق مان کر اپنی جگہ بیٹھا رہ جاتا ہے اور صرف اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے

پر قانع ہو جاتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک سرمایہ لے کر گھر بیٹھ جائے اور بس اسی پر گزر کرتا رہے

ایسے شخص کا سرمایہ صرف یہی نہیں کہ بڑھتا نہیں ہے، بلکہ کام میں نہ لگنے کی وجہ سے اور گھٹتا چلا جاتا ہے

یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ بخلاف اس کے

ت کو پاکر اسے چھپانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے اس کی مثال اس تاجر کی سی ہے جو اپنے سرمایے کو کام میں

د سے اس طرح وہ دوسرے بہت سے لوگوں کی رزق رسانی کا موجب بھی بنتا ہے اور اس کا اپنا سرمایہ بھی

تا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ تبلیغِ حق کی یہ خاصیت ہے کہ جو شخص اس میں مشغول ہو اس کی اپنی ذات پر وہ حق خود بڑ

ہوتا چلا جاتا ہے جس کی تبلیغ میں وہ سرگرم ہوتا ہے۔ اس کا چرچا کرنے، اس کی اشاعت کی راہیں تلاش کرنے

تائید میں دلائل ڈھونڈنے، اور اس کی راہ کی رکاوٹیں دور کرنے کی فکر جتنی زیادہ اس کو لاحق ہوتی ہے اس

دہ وہ اس میں مستغرق ہوتا چلا جاتا ہے۔ اُس کی خاطر جب وہ طرح طرح کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرتا ہے،

سنتا ہے، طعنے سہتا ہے، الزامات اور اعتراضات برداشت کرتا ہے، اور بسا اوقات چوٹیں کھاتا اور

اتا ہے، تو یہ ساری تکلیفیں اُس حق کے ساتھ اس کے عشق کو اور زیادہ بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ پھر یہ تبلیغ اس کی

ایک اور طرح سے بھی مددگار ہوتی ہے، جب وہ کہتا ہے کہ اپنی پوری زندگی خدا کی بندگی میں دیدو، اپنی

سے تضاد اور منافقت کو دور کرو، اور جاہلیت کے ایک ایک اثر کو اپنے اندر سے نکالو، تو اس کے گرد د

دنیا میں سے سینکڑوں نگاہیں خوردبین لگا لگا کر اس کی اپنی زندگی کا جائزہ لینا شروع کر دیتی ہیں اور اُس کی

امی ایسی نہیں رہ جاتی جس کی نشاندہی کرنے سے زبانیں چوک جائیں۔ اس طرح ایک آدمی کو مانجھنے اور صاف

ں بہت سے بندگانِ خدا، دانستہ یا نادانستہ لگ جاتے ہیں۔ جو اپنے معترضین کی اس خدمتِ بے مزد سے فائدہ

ہے اُس کی تکمیل آپ سے آپ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور جو اس تنقیدِ عام سے شکست کھا کر بھاگ نکلتا ہے

ابت کر دیتا ہے کہ وہ دعوتِ حق کے کام کا آدمی نہیں ہے۔

لیم جماعت کے لئے ہم نے اول روز سے جو بات لوگوں کے ذہن نشین کی وہ یہ تھی کہ اس جماعت میں وہی شخص

ل ہو جائے بلکہ پہلے اچھی طرح اس بات کا اطمینان کر لے کہ یہ جماعت فی الواقع اقامتِ دین کے لئے قائم ہوئی

دعوت، طریقِ کار اور اصولِ تنظیم وہی ہیں جو قرآن و سنت کے مطابق اقامتِ دین کی سعی کرنے والی ایک جماعت کے

[illegible] طرح مطمئن ہو جانے کے بعد وہ جماعت میں آئے [illegible]

[illegible]

ڈسپلن کو توڑنا محض یہ معنی نہیں رکھتا کہ آدمی نے ایک پارٹی کے ڈسپلن کی خلاف ورزی کی ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے
اپنی حیثیت سے جس کام کو خدا کا کام سمجھا تھا اس کو جان بوجھ کر خراب کیا اور قصداً خدا و رسول کی نافرمانی کی۔

جماعت اسلامی نے اس قاعدے کی پابندی سے پہلا فائدہ تو یہ اٹھایا کہ اس میں ایسے لوگ بہت کم داخل ہوئے
اس کے برحق ہونے پر مطمئن نہ ہوں اور محض کسی دماغی لہر کی وجہ سے، یا کسی عارضی کشش کے باعث جماعت کی ط
مائل ہو گئے ہوں۔ اور دوسرا فائدہ یہ اٹھایا کہ جو لوگ بھی جماعت میں آئے وہ ڈسپلن کی پابندی کے لئے کسی خارج
کے محتاج نہ تھے۔ انھوں نے زیادہ تر خود اپنے ایمان کے تقاضے سے ڈسپلن کو قبول کیا اور انھیں باقاعدگی، نظم او
کے ساتھ کام کرنے کا عادی بنانے میں کچھ زیادہ زحمت پیش نہیں آئی۔ اب اگر ہمارا ڈسپلن ایک اسلامی جماعت
معیار مطلوب سے کم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ایمان اُس درجہ کا نہیں ہے جیسا صحابۂ کرامؓ کا ایمان تھا۔
اس لحاظ سے اپنی ساری خامیوں کے باوجود ہم بلا شائبۂ مبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی اپنے نظم و ضبط او
کارکنوں کی باقاعدگی کے اعتبار سے اس ملک کی دوسری تمام جماعتوں کے مقابلے میں نمایاں امتیاز رکھتی ہے او
حقیقت ہے جس کو اب جماعت کے مخالفین بھی ماننے پر مجبور ہیں۔

جماعت کی اندرونی خرابیوں کی اصلاح اور اس کے کارکنوں کی تربیت اور تکمیل کے لئے تیسری اہم چیز
سے ہم نے مدد لی وہ یہ تھی کہ اول روز سے ہم نے جماعت کے اندر روحِ تنقید کو بیدار رکھنے کی کوشش کی۔
یہی وہ چیز ہے جو ہر خرابی کی بروقت نشان دہی کرتی اور اس کی اصلاح کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اجتماعی ز
کے لئے اخلاقی حیثیت سے تنقید کی وہی اہمیت ہے جو مادی حیثیت سے صفائی کی اہمیت ہے جس
نجاست و طہارت کی حس مٹ جانے اور صفائی کی کوشش بند ہو جانے سے ایک بستی کا سارا ماحول گندا
ہے اور اس کی فضا ہر طرح کے امراض کے لئے سازگار بن جاتی ہے، ٹھیک اسی طرح تنقیدی نگاہ سے خرابیو
دیکھنے والی آنکھیں، بیان کرنے والی زبانیں اور سننے والے کان اگر بند ہو جائیں تو جس قوم، سوسائٹی یا جماعت
میں یہ حالت پیدا ہو گی وہ خرابیوں کی آماجگاہ بن کر رہے گی اور پھر اس کی اصلاح کسی طرح نہ ہو سکے گی۔ اس حقیقت
سے ہم کبھی غافل نہیں ہوئے۔ ہم نے عالمِ انسانیت کی، اپنے ملک کی اور اپنی ملت کی خرابیوں پر تنقید و صفائی ا

تفہیم القرآن

[یہ سلسلہ ایک مدت کے بعد اب دوبارہ ان صفحات میں شروع کیا جا رہا ہے۔ اس موقع پر
...مرتبہ پھر ناظرین کو اس بات سے آگاہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تفہیم القرآن کو کتابی
...صورت میں شائع کرنے سے پہلے ان صفحات میں محض مسودے کی حیثیت سے درج کیا جاتا ہے تاکہ
...اہل علم اور عام ناظرین مجھے میری غلطیوں پر مطلع فرمائیں اور اس تفسیر کو زیادہ بہتر بنانے میں مجھے مدد
...دیں۔ اسی لئے اس مسودے کے ساتھ قرآن مجید کا اصل متن درج نہیں کیا جا رہا ہے]

الرعد

نام آیت نمبر ۱۳ کے فقرے ویسبح الرعد بحمدہ والملٰئکۃ من خیفتہ کے لفظ الرعد
...کو اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ عنوان نہیں ہے کہ اس سورۃ میں بادل کی گرج کے مسئلے سے بحث کی
...گئی ہو بلکہ یہ محض نام ہے جو علامت کے طور پر رکھا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورۃ جس میں
...لفظ الرعد آیا ہے، یا جس میں رعد کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول رکوع ۴ اور رکوع ۶ کے مضامین شہادت دیتے ہیں کہ یہ سورۃ بھی اسی دور کی
...ہے جس میں سورۃ یونس، ہود، اور اعراف نازل ہوئی ہیں، یعنی زمانۂ قیام مکہ کا آخری دور۔ انداز بیان سے
...صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے ایک مدت دراز گزر چکی ہے
...مخالفین آپ کو زک دینے اور آپ کے مشن کو ناکام کرنے کے لئے طرح طرح کی چالیں چلتے رہے ہیں، مومنین
...بار بار تمنائیں کر رہے ہیں کہ کاش کوئی معجزہ دکھا کر ہی ان لوگوں کو راہ راست پر لایا جائے، اور اللہ
...تعالیٰ ان کو سمجھا رہا ہے کہ ایمان کی راہ دکھانے کا یہ طریقہ ہمارے ہاں رائج نہیں ہے اور اگر دشمنان
...حق کی رسی دراز کی جا رہی ہے تو یہ ایسی بات نہیں ہے جس سے تم گھبرا اٹھو۔ پھر آیت ۳۱ سے یہ بھی معلوم

ہوتا ہے کہ بار بار کفار کی ہٹ دھرمی کا ایسا مظاہرہ ہو چکا ہے جس کے بعد یہ کہنا بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ اگر قبروں سے مُردے بھی اٹھ کر آ جائیں تو یہ لوگ نہ مانیں گے بلکہ اس واقعہ کی بھی کوئی نہ کوئی تاویل کر ڈالیں گے۔ ان سب باتوں سے یہی گمان ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مکہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون سورۃ کا مدعا پہلی ہی آیت میں پیش کر دیا گیا ہے، یعنی یہ کہ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں وہی حق ہے، مگر یہ لوگوں کی غلطی ہے کہ وہ اسے نہیں مانتے۔ ساری تقریر اسی مرکزی مضمون کے گرد گھومتی ہے۔ اس سلسلے میں بار بار مختلف طریقوں سے توحید، معاد اور رسالت کی حقانیت ثابت کی گئی ہے، ان پر ایمان لانے کے اخلاقی و روحانی فوائد سمجھائے گئے ہیں، ان کو نہ ماننے کے نقصانات بتائے گئے ہیں، اور یہ ذہن نشین کیا گیا ہے کہ کفر سراسر ایک حماقت اور جہالت ہے۔ پھر چونکہ اس تمام بیان کا مقصد محض دماغوں کو مطمئن کرنا ہی نہیں ہے، دلوں کو ایمان کی طرف کھینچنا بھی ہے، اس لئے نرے منطقی استدلال سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ ایک ایک دلیل اور ایک ایک شہادت کو پیش کرنے کے بعد ٹھیر ٹھیر کر طرح طرح سے تخویف، ترہیب، ترغیب، اور مشفقانہ تلقین کی گئی ہے تاکہ نادان لوگ اپنی گمراہانہ ہٹ دھرمی سے باز آ جائیں۔

دورانِ تقریر میں جگہ جگہ مخالفین کے اعتراضات کا ذکر کئے بغیر ان کے جوابات دیئے گئے ہیں، اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں پائے جاتے تھے یا مخالفین کی طرف سے ڈالے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ اہلِ ایمان کو بھی، جو کئی برس کی طویل اور سخت جدوجہد کی وجہ سے تھکے جا رہے تھے اور بے چینی کے ساتھ غیبی امداد کے منتظر تھے، تسلی دی گئی ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

ا۔ل۔م۔ر۔ یہ کتابِ الٰہی کی آیات ہیں، اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے

ت ہے، مگر تمہاری قوم کے اکثر لوگ مان نہیں رہے ہیں۔[1]

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہاروں کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں،[2] پھر تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا[3] اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا

ا سورۃ کی تمہید ہے جس میں مقصودِ کلام کو چند لفظوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور آپ کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی! تمہاری قوم کے اکثر لوگ اس تعلیم کو قبول کرنے ر رہے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ اسے ہم نے تم پر نازل کیا ہے اور یہی حق ہے خواہ لوگ اسے مانیں یا نہ مانیں۔ اس ید کے بعد اصل تقریر شروع ہو جاتی ہے جس میں منکرین کو یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیم کیوں حق ہے ا کے رد میں ان کا رویہ کس قدر غلط ہے۔ اس تقریر کو سمجھنے کے لیے ابتدا ہی سے یہ پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف لوگوں کو دعوت دے رہے تھے وہ تین بنیادی باتوں پر مشتمل تھی۔ ایک یہ کہ خدائی پوری کی پوری اللہ کی ہے اس لیے وئی بندگی و عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں تم کو اپنے اعمال کی رنی ہوگی۔ تیسرے یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور جو کچھ پیش کر رہا ہوں اپنی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے پیش کر رہا ہوں۔ یہی باتیں ہیں جنہیں ماننے سے لوگ انکار کر رہے تھے، انہی کو اس تقریر میں بار بار طریقے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور متعلق لوگوں کے شبہات و اعتراضات کو رفع کیا گیا ہے۔

[2] بالفاظِ دیگر آسمانوں کو غیر محسوس اور غیر مرئی سہاروں پر قائم کیا۔ بظاہر کوئی چیز فضائے بسیط میں ایسی نہیں ہے جو ان بے شمار فلکی کو تھامے ہوئے ہو مگر ایک غیر محسوس طاقت ایسی ہے جو ہر ایک کو اس کے مقام و مدار پر روکے ہوئے ہے اور اجسام کو زمین پر یا ایک دوسرے پر گرنے نہیں دیتی۔

[3] تشریح سورۂ اعراف رکوع ۷ کے حواشی میں گزر چکی ہے۔ مختصراً یہاں اتنا اشارہ کافی ہے کہ عرش (یعنی سلطنتِ کائنات کے مرکز) پر متمکن ہونے کا ذکر قرآن میں جہاں جہاں جس غرض کے لیے بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو صرف پیدا ہی نہیں کر دیا ہے بلکہ وہ آپ ہی اس کی سلطنت پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ یہ جہانِ ہست و بود کوئی خود بخود چلنے والا کارخانہ نہیں ہے، جیسا کہ بہت سے جاہل خیال کرتے ہیں، نہ مختلف خداؤں کی جولان گاہ ہے جیسا کہ بہت سے دوسرے جاہل سمجھے بیٹھے ہیں، بلکہ یہ ایک باقاعدہ نظام ہے جسے اس کا پیدا کرنے والا خود چلا رہا ہے۔

پابند بنایا۔[٣] اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقتِ مقرر تک کے لئے چل رہی ہے[٤]، اور اللہ ہی اس سارے

---

[٣] یہاں یہ امر ملحوظ رہنا چاہیئے کہ مخاطب وہ قوم ہے جو اللہ کی ہستی کی منکر نہ تھی، نہ اس کے خالق ہونے کی منکر تھی، اور نہ یہ گما[ن رکھتی تھی] کہ یہ سارے کام جو یہاں بیان کئے جا رہے ہیں، اللہ کے سوا کسی اور کے ہیں۔ اس لئے بجائے خود اس بات پر دلیل لانے کی کوئی [illegible] کی گئی کہ واقعی اللہ ہی نے آسمانوں کو قائم کیا ہے اور اسی نے سورج اور چاند کو ایک ضابطے کا پابند بنایا ہے۔ بلکہ ان واقعات کو جنہیں وہ بھی مانتے تھے، ایک دوسری بات پر دلیل قرار دیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اس نظامِ کائنات میں صاحبِ اختیار [نہیں] ہے جو معبود قرار دیئے جانے کا مستحق ہو۔ رہا یہ سوال کہ جو شخص سرے سے اللہ کی ہستی کا اور اس کے خالق و مدبر ہونے ہی کا قائل نہ [ہو اس کے] مقابلے میں یہ استدلال کیسے مفید ہو سکتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکین کے مقابلے میں توحید کے لئے جو دلائل [دیتا ہے] وہی دلائل ملاحدہ کے مقابلے میں وجودِ باری کے اثبات کے لئے بھی کافی ہیں۔ توحید کا سارا استدلال اس بنیاد پر قائم ہے [کہ زمین سے] لے کر آسمانوں تک ساری کائنات ایک مکمل نظام ہے اور یہ پورا نظام ایک زبردست قانون کے تحت چل رہا ہے جس میں ہمہ گیر اقتدار، ایک بے عیب حکمت، اور بے خطا علم کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ آثار جہاں اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس نظام کے [بہت سے] فرمانروا نہیں ہیں، وہیں اس بات پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ اس نظام کا ایک فرمانروا ہے۔ نظم کا تصور ایک ناظم کے بغیر، قانون کا تصور [ایک حکمران] کے بغیر، حکمت کا تصور ایک حکیم کے بغیر، علم کا تصور ایک عالم کے بغیر، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خلق کا تصور ایک خالق کے بغیر صرف وہی [شخص کر سکتا] ہے جو ہٹ دھرم ہو، یا پھر وہ جس کی عقل ماری گئی ہو۔

[٤] یعنی یہ نظام صرف اسی امر کی شہادت نہیں دے رہا ہے کہ ایک ہمہ گیر اقتدار اس پر فرمانروا ہے اور ایک زبردست حکمت اس میں [کار فرما ہے]، بلکہ اس کے تمام اجزا اور ان میں کام کرنے والی ساری قوتیں اس بات پر بھی گواہ ہیں کہ اس نظام کی کوئی چیز غیر فانی نہیں ہے۔ [ہر چیز کے] لئے ایک وقت مقرر ہے جس کے اختتام تک وہ چیز چلتی ہے اور جب اس کا وقت آن پورا ہوتا ہے تو وہ مٹ [جاتی ہے]۔ یہ حقیقت جس طرح اس نظام کے ایک ایک جز کے معاملے میں صحیح ہے اسی طرح اس پورے نظام کے بارے [میں بھی صحیح] ہے۔ اس عالمِ طبیعی کی مجموعی ساخت یہ بتا رہی ہے کہ یہ ابدی و سرمدی نہیں ہے، اس کے لئے بھی کوئی وقت مقرر ہے جب یہ ختم ہو جائے گا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا عالم برپا ہوگا۔ لہٰذا قیامت، جس کے آنے کی خبر دی گئی ہے، [اس کا] آنا مستبعد نہیں بلکہ نہ آنا مستبعد ہے۔

...ہے وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔

...یعنی اس امر کی نشانیاں کہ رسولِ خدا جن حقیقتوں کی خبر دے رہے ہیں وہ فی الواقع سچی حقیقتیں ہیں۔ کائنات میں ہر طرف اُن پر
...دلالت کرنے والے آثار موجود ہیں۔ اگر لوگ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انھیں نظر آجائے کہ اس کتاب میں جن جن باتوں پر ایمان لانے کی
...دعوت دی گئی ہے زمین و آسمان میں پھیلے ہوئے بے شمار نشانات ان کی تصدیق کر رہے ہیں۔

...اور جن آثارِ کائنات کو گواہی میں پیش کیا گیا ہے اُن کی یہ شہادت تو بالکل ظاہر و باہر ہے کہ اس عالم کا خالق و مدبّر ایک ہی
...لیکن یہ بات کہ موت کے بعد دوسری زندگی اور عدالتِ الٰہی میں انسان کی حاضری اور جزا و سزا کے متعلق رسول اللہؐ نے جو خبریں
...دی ہیں ان کے برحق ہونے پر بھی یہی آثار شہادت دیتے ہیں، ذرا مخفی ہے اور زیادہ غور کرنے سے سمجھ میں آتی ہے۔ اس لیے پہلی حقیقت
...ظاہر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی، کیونکہ سننے والا محض دلائل کو سن کر ہی سمجھ سکتا ہے کہ ان سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ البتہ دوسری حقیقت پر خصوصیت
...کے ساتھ متنبہ کیا گیا ہے کہ اپنے رب کی ملاقات کا یقین بھی تم کو انھی نشانیوں پر غور کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

...مذکورۂ بالا نشانیوں سے آخرت کا ثبوت دو طرح سے ملتا ہے۔ ایک یہ کہ جب ہم آسمانوں کی ساخت اور شمس و قمر
...وغیرہ پر غور کرتے ہیں تو ہمارا دل یہ شہادت دیتا ہے کہ جس خدا نے یہ عظیم الشان اجرامِ فلکی پیدا کیے ہیں، اور جس کی قدرت اتنے
...بڑے بڑے کُروں کو فضا میں گردش دے رہی ہے، اس کے لیے نوعِ انسانی کو موت کے بعد دوبارہ پیدا کر دینا کچھ بھی مشکل
...نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی نظامِ فلکی سے ہم کو یہ شہادت بھی ملتی ہے کہ اس کا پیدا کرنے والا کمال درجے کا حکیم ہے
...اور اس کی حکمت سے یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے کہ وہ انسان کو ایک ذی عقل و شعور اور صاحبِ اختیار
...مخلوق بنانے کے بعد، اور اپنی زمین کی بے شمار چیزوں پر تصرف کی قدرت عطا کرنے کے بعد اس کے کارنامۂ زندگی
...کا حساب نہ لے، اس کے ظالموں سے باز پرس اور اس کے مظلوموں کی دادرسی نہ کرے، اس کے نیکوکاروں کو جزا اور اس کے بدکاروں
...کو سزا نہ دے، اور اس سے کبھی یہ پوچھے ہی نہیں کہ جو بیش قیمت امانتیں میں نے تیرے سپرد کی تھیں ان کے ساتھ تو نے کیا معاملہ
...[illegible] ایک بادشاہ تو بے شک اپنی سلطنت کے معاملات اپنے کارپردازوں کے حوالے کر کے خوابِ غفلت میں سرشار ہو سکتا
...[illegible] ایک حکیم و دانا ہستی سے ایسی نادانی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس طرح آسمانوں کا مشاہدہ ہم کو [illegible]
...[illegible] کی جو ایک سمجھ میں آسکتی ہے اس [illegible] آخرت کا یقین دلا دیتا ہے۔

اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے، اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیے ہیں۔ اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں، اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔[3] ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔

---

[3] اجرامِ فلکی کے بعد عالمِ ارضی کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے اور یہاں بھی خدا کی قدرت اور حکمت کے نشانات سے انہی دونوں حقیقتوں (توحید اور آخرت) پر استشہاد کیا گیا ہے جن پر پچھلی آیات میں عالمِ سماوی کے آثار سے استشہاد کیا گیا تھا۔ ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اجرامِ فلکی کے ساتھ زمین کا تعلق، زمین کے ساتھ سورج اور چاند کا تعلق، زمین کی بیشمار مخلوقات کی ضرورتوں سے پہاڑوں اور دریاؤں کا تعلق، یہ ساری چیزیں اس بات پر کھلی شہادت دیتی ہیں کہ ان کو نہ تو الگ الگ خداؤں نے بنایا ہے اور نہ مختلف با اختیار خدا ان کا انتظام کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ان سب چیزوں میں باہم اتنی مناسبتیں اور ہم آہنگیاں اور موافقتیں نہ پیدا ہو سکتی تھیں اور نہ قائم رہ سکتی تھیں۔ الگ الگ خداؤں کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مل کر پوری کائنات کے لیے تخلیق و تدبیر کا ایسا منصوبہ بنا لیتے جس کی ہر چیز زمین سے لے کر آسمانوں تک ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کھاتی چلی جاتی اور کبھی ان کی مصلحتوں کے درمیان تصادم واقع نہ ہوتا۔

(۲) زمین کے اس عظیم الشان کُرے کا فضائے بسیط میں معلّق ہونا، اس کی سطح پر اتنے بڑے بڑے پہاڑوں کا ابھر آنا، اس کے سینے پر ایسے ایسے زبردست دریاؤں کا جاری ہونا، اس کی گود میں طرح طرح کے بے حد و حساب درختوں کا پھلنا، اور اس پر پیہم انتہائی باقاعدگی کے ساتھ رات اور دن کے حیرت انگیز آثار کا طاری ہونا، یہ سب چیزیں اُس خدا کی قدرت پر گواہ ہیں جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ ایسے قادرِ مطلق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندگی عطا نہیں کر سکتا، عقل و دانش کی نہیں، حماقت و بلادت کی دلیل ہے۔

(۳) زمین کی ساخت میں، اس پر پہاڑوں کی پیدائش میں، پہاڑوں سے دریاؤں کی روانی کا انتظام کرنے میں، پھلوں کی ہر قسم میں دو دو طرح کے پھل پیدا کرنے میں، اور رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات باقاعدگی کے ساتھ لانے میں جو بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں پائی جاتی ہیں وہ پکار پکار کر شہادت دے رہی ہیں کہ جس خدا نے تخلیق کا یہ نقشہ بنایا ہے وہ کمال درجے کا حکیم ہے۔ یہ ساری چیزیں خبر دیتی ہیں کہ یہ نہ تو کسی بے ارادہ طاقت کی کارفرمائی ہے اور نہ کسی کھلنڈرے کا کھلونا۔ ان میں سے ہر ہر چیز کے اندر ایک حکیم کی حکمت اور انتہائی بالغ حکمت کام کرتی نظر آتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد صرف ایک نادان ہی ہو سکتا ہے جو یہ گمان کرے کہ زمین پر انسان کو پیدا کر کے اور اسے ایسی ہنگامہ آرائیوں کے مواقع دے کر وہ اس کو یونہی خاک میں گم کر دے گا۔

اور دیکھو، زمین میں الگ الگ خطّے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل بھی ہیں اور پھر الگ الگ بھی۔ انگور کے
کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے۔ سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے
میں ہم نے کسی کو بہتر بنا دیا ہے اور کسی کو کمتر۔ ان سب چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے
لیتے ہیں۔

ساری زمین کو اس نے یکساں بنا کر نہیں رکھ دیا ہے بلکہ اس میں بے شمار خطّے پیدا کر دیے ہیں جو متصل ہونے کے باوجود شکل میں، رنگ میں،
میں، خاصیتوں میں، قوتوں اور صلاحیتوں میں، پیداوار اور کیمیاوی یا معدنی خزانوں میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ان مختلف
پیدائش اور ان کے اندر طرح طرح کے اختلافات کی موجودگی اپنے اندر اتنی حکمتیں اور مصلحتیں رکھتی ہے کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔
مخلوقات سے قطع نظر، صرف ایک انسان ہی کے مفاد کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی مختلف
مصالح اور زمین کے ان خطّوں کی گوناگونی کے درمیان جو مناسبتیں اور مطابقتیں پائی جاتی ہیں اور ان کی بدولت انسانی تمدن کو پھلنے
کے جو مواقع بہم پہنچے ہیں وہ یقیناً کسی حکیم کی فکر اور اس کے سوچے سمجھے منصوبے اور اس کے دانشمندانہ ارادے کا نتیجہ ہیں۔ اسے محض
اقی حادثہ قرار دینے کے لیے بڑی ہٹ دھرمی درکار ہے۔

کے درختوں میں بعض ایسے ہوتے ہیں جن کی جڑ سے ایک ہی تنا نکلتا ہے اور بعض میں ایک جڑ سے دو یا زیادہ تنے نکلتے ہیں۔

آیت میں اللہ کی توحید اور اس کی قدرت و حکمت کے نشانات دکھانے کے علاوہ ایک اور حقیقت کی طرف بھی لطیف اشارہ کیا گیا ہے اور
ہے کہ اللہ نے اس کائنات میں کہیں بھی یکسانی نہیں رکھی ہے۔ ایک ہی زمین ہے، مگر اس کے قطعے اپنے اپنے رنگوں، شکلوں اور خاصیتوں میں
یک ہی زمین اور ایک ہی پانی ہے مگر اس سے طرح طرح کے غلّے اور پھل پیدا ہو رہے ہیں۔ ایک ہی درخت ہے اور اس کا ہر پھل دوسرے
عیت میں متحد ہونے کے باوجود شکل اور جسامت اور مزے میں مختلف ہے۔ ایک ہی جڑ ہے اور اس سے دو الگ تنے نکلتے ہیں جن کے
ک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان چیزوں پر جو شخص غور کرے گا وہ اس بات پر کبھی پریشان نہ ہوگا کہ انسانی طبائع اور میلانات اور
میں اتنا اختلاف کیوں ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر اسی سورۃ میں فرمایا گیا ہے، اگر اللہ چاہتا تو سب انسانوں کو یکساں بنا سکتا تھا، مگر جس حکمت پر
اس کائنات کو پیدا کیا ہے وہ یکسانی کی نہیں بلکہ تنوّع اور رنگا رنگی کی متقاضی ہے۔ سب کو یکساں بنا دینے کے بعد تو یہ سارا
وجود ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا۔

اب اگر تمہیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ "جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔[10] یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں۔[11] یہ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

یہ لوگ بھلائی سے پہلے برائی کے لئے جلدی مچا رہے ہیں[12] حالانکہ ان سے پہلے (جو لوگ اس روش پر چلے ہیں ان پر خدا کے عذاب کی) عبرتناک مثالیں گزر چکی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود اُن کے ساتھ چشم پوشی سے کام لیتا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تیرا رب سخت سزا دینے والا ہے۔

یہ لوگ جنہوں نے تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیا ہے کہتے ہیں کہ "اس شخص پر اس کے رب کی طرف سے

---

[10] یعنی ان کا آخرت سے انکار دراصل خدا سے اور اس کی قدرت اور حکمت سے انکار ہے۔ یہ صرف اتنا ہی نہیں کہتے ہیں کہ ہمارا مٹی میں مل جانے کے بعد دوبارہ پیدا ہونا غیر ممکن ہے، بلکہ ان کے اسی قول میں یہ خیال بھی پوشیدہ ہے کہ معاذ اللہ وہ خدا عاجز و درماندہ اور نادان و بےخبر ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔

[11] گردن میں طوق پڑا ہونا قیدی ہونے کی علامت ہے۔ ان لوگوں کی گردنوں میں طوق پڑے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی جہالت کے، اپنی ہٹ دھرمی کے، اپنی خواہشاتِ نفس کے، اور اپنے آباواجداد کی اندھی تقلید کے اسیر بنے ہوئے ہیں۔ یہ آزادانہ غور و فکر نہیں کر سکتے

[12] کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ اگر تم واقعی نبی ہو اور تم دیکھ رہے ہو کہ ہم نے تم کو جھٹلا دیا ہے تو اب آخر ہم پر وہ عذاب آ کیوں نہیں جاتا جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو؟ اُس کے آنے میں خواہ مخواہ دیر کیوں لگ رہی ہے؟ کبھی وہ چیلنج کے انداز میں کہتے کہ رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ (خدایا ہمارا حساب تو ابھی کر دے، قیامت پر نہ اٹھا رکھ) اور کبھی کہتے کہ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (خدایا اگر یہ باتیں جو محمد پیش کر رہا ہے حق ہیں اور تیری ہی طرف سے ہیں تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی اور دردناک عذاب نازل کر دے) اس آیت میں کفار کی انہی باتوں کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ نادان خیر سے پہلے شر مانگتے ہیں، اللہ کی طرف سے ان کو سنبھلنے کے لئے جو مہلت دی جا رہی ہے اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مہلت کو جلدی ختم کر دیا جائے اور ان کی باغیانہ روش پر فوراً گرفت کر ڈالی جائے۔

ل نازل کی گئی؟ — تم تو محض خبردار کرنے والے ہو، اور ہر قوم کے لئے ایک رہنما ہے۔

ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے۔ جو کچھ اُس میں بنتا ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اس
ہوتی ہے اس سے بھی وہ باخبر رہتا ہے۔ ہر چیز کے لئے اس کے ہاں ایک مقدار مقرر ہے۔ وہ غیب
ہر چیز کا عالم ہے۔ وہ بزرگ ہے اور ہمیشہ ہر چیز پر بالاتر رہنے والا ہے۔ تم میں سے کوئی شخص خواہ

اُن کی مراد اِس نشانی سے تھی جسے دیکھ کر ان کو یقین ہو جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ وہ آپ کی بات کو اُس کی
دلائل سے سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ آپ کی سیرتِ پاک سے سبق لینے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ اُس زبردست اخلاقی
کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے لئے تیار نہ تھے جو آپ کی تعلیم کے اثر سے آپ کے صحابہ کی زندگیوں میں رونما ہو رہا تھا۔ وہ اُن معقول دلائل پر
کے لئے تیار نہ تھے جو ان کے مشرکانہ مذہب اور ان کے اوہامِ جاہلیت کی غلطیاں واضح کرنے کے لئے قرآن میں پیش کیے جا رہے تھے۔
کو چھوڑ کر وہ چاہتے تھے کہ انہیں کوئی کرشمہ دکھایا جائے جس کے معیار پر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو جانچ سکیں۔۔

مطالبے کا مختصر سا جواب ہے جو براہِ راست ان کو دینے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے دیا ہے۔ اس کا مطلب
تم اس فکر میں نہ پڑو کہ ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے آخر کونسا کرشمہ دکھایا جائے۔ تمہارا کام ہر ایک کو مطمئن کر دینا نہیں ہے۔ تمہارا کام تو
غفلت میں سوئے ہوئے لوگوں کو چونکا دو اور ان کو غلط روی کے بُرے انجام سے خبردار کر دو۔ یہ خدمت ہم نے ہر زمانے میں ہر قوم میں
کو مقرر کی ہے اور اب تم سے بھی یہی خدمت لے رہے ہیں۔ اس کے بعد جس کا جی چاہے آنکھیں کھولے اور جس کا جی چاہے غفلت میں
مر جواب دے کر اللہ تعالیٰ ان کے مطالبے کی طرف سے رخ پھیر لیتا ہے اور ان کو متنبہ کرتا ہے کہ تم کسی اندھیر نگری میں نہیں رہتے ہو جہاں کسی
راج ہو۔ تمہارا واسطہ ایک ایسے خدا سے ہے جو تم میں سے ایک ایک شخص کو اس وقت سے جانتا ہے جبکہ تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں
اور زندگی بھر تمہاری ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس کے ہاں تمہاری قسمتوں کا فیصلہ ٹھیٹھ عدل کے ساتھ تمہارے اوصاف
تا ہے اور زمین و آسمان میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔

یہ ہے کہ حاملہ کے رحم میں جو بچہ ہے اس کے اعضاء، اس کی قوتوں اور قابلیتوں، اور اس کی صلاحیتوں اور استعدادوں میں جو کمی یا زیادتی
براہِ راست نگرانی میں ہوتی ہے۔

وہ سب کچھ جو انسان کے لئے [illegible] ہے۔

[illegible]

زور سے بات کرے یا آہستہ، اور کوئی رات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہو یا دن کی روشنی میں چل رہا ہو، اس کے لیے سب یکساں ہیں۔ ہر شخص کے آگے اور پیچھے اس کے مقرر کیے ہوئے نگراں لگے ہوئے ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔[1] حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔ اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کر لے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی، نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے۔[2]

وہی ہے جو تمہارے سامنے بجلیاں چمکاتا ہے جنہیں دیکھ کر تمہیں اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں اور امیدیں بھی بندھتی ہیں۔ وہی ہے جو پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھاتا ہے۔ بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتی ہے[3] اور فرشتے اس کی ہیبت سے لرزتے ہوئے اس کی تسبیح کرتے ہیں۔[4] وہ کڑکتی ہوئی بجلیوں کو بھیجتا ہے اور (بسا اوقات)

---

[1] یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو ہر حال میں براہِ راست خود دیکھ رہا ہے اور اس کی تمام حرکات و سکنات سے واقف ہے، بلکہ مزید برآں اللہ کے مقرر کیے ہوئے نگراں کار بھی ہر شخص کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اور اس کے پورے کارنامۂ زندگی کا ریکارڈ محفوظ کرتے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ایسے خدا کی خدائی میں جو لوگ یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں کہ انہیں شترِ بے مہار کی طرح زمین پر چھوڑ دیا گیا ہے اور کوئی نہیں جس کے سامنے وہ اپنے نامۂ اعمال کے لیے جواب دہ ہوں، وہ دراصل اپنی شامت آپ بلاتے ہیں۔

[2] یعنی اس غلط فہمی میں بھی نہ رہو کہ اللہ کے ہاں کوئی پیر یا فقیر، یا کوئی اگلا پچھلا بزرگ، یا کوئی جن یا فرشتہ ایسا زور آور ہے کہ تم خواہ کچھ ہی کرتے رہو، وہ تمہاری نذروں اور نیازوں کی رشوت لے کر تمہیں تمہارے برے اعمال کی پاداش سے بچا لے گا۔

[3] یعنی بادلوں کی گرج یہ ظاہر کرتی ہے کہ جس خدا نے یہ ہوائیں چلائیں، یہ بھاپیں اٹھائیں، یہ کثیف بادل جمع کیے، اس بجلی کو بارش کا ذریعہ بنایا اور اس طرح زمین کی مخلوقات کے لیے پانی کی بہم رسانی کا انتظام کیا، وہ سبوح و قدوس ہے، اپنی حکمت اور قدرت میں کامل ہے، اپنی صفات میں بے عیب ہے، اور اپنی خدائی میں لاشریک ہے۔ جانوروں کی طرح سننے والے تو ان بادلوں میں صرف گرج ہی کی آواز سنتے ہیں، مگر جو ہوش کے کان رکھتے ہیں وہ بادلوں کی زبان سے توحید کا یہ اعلان سنتے ہیں۔

[4] فرشتوں کے جلالِ خداوندی سے لرزنے اور تسبیح کرنے کا ذکر خصوصیت کے ساتھ یہاں اس لیے کیا کہ مشرکین ہر زمانے میں فرشتوں کو دیوتا اور معبود قرار دیتے رہے ہیں اور ان کا یہ گمان رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی خدائی میں شریک ہیں۔ اس غلط خیال کی تردید کے لیے فرمایا گیا کہ وہ اقتدارِ اعلیٰ میں خدا کے شریک نہیں ہیں بلکہ فرمانبردار خادم ہیں اور اپنے آقا کے جلال سے کانپتے ہوئے اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔

ن پھر چاہتا ہے عین اُس حالت میں گرا دیتا ہے جبکہ لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ فی الواقع اُس
بی سخت ہے۔

اسی کو پکارنا برحق ہے[۱۵]۔ رہیں وہ دوسری ہستیاں جنھیں اس کو چھوڑ کر یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ ان کی دعاؤں کا کوئی جواب
ے سکتیں۔ اُنھیں پکارنا تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک
حالانکہ پانی اُس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس اسی طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیرِ بے ہدف۔ اور وہ تو اللہ ہی
وزمین وآسمان کی ہر چیز طوعاً و کرہاً سجدہ کر رہی ہے[۱۶] اور سب چیزوں کے سائے صبح و شام اس کے آگے جھکتے ہیں[۱۷]۔
اِن سے پوچھو، آسمان و زمین کا رب کون ہے؟ ——— کہو، اللہ[۱۸]۔ پھر ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو کیا

نے سے مراد اپنی حاجتوں میں مدد کے لئے پکارنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حاجت روائی و مشکل کشائی کے سارے اختیارات اسی
ہ ہیں، اس لئے صرف اُسی سے دعائیں مانگنا برحق ہے۔

ے سے مراد اطاعت میں جھکنا، حکم بجالانا اور سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ زمین و آسمان کی ہر مخلوق اس معنی میں اللہ کو سجدہ کر رہی ہے کہ وہ
نون کی مطیع ہے اور اس کی مشیت سے بال برابر بھی سرتابی نہیں کر سکتی۔ مومن اسے برضا و رغبت سجدہ کرتا ہے تو کافر کو مجبوراً کرنا
کیونکہ خدا کے قانونِ فطرت سے ہٹنا اس کی مقدرت سے باہر ہے۔

یوں کے سجدہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ اشیاء کے سایوں کا صبح و شام مغرب اور مشرق کی طرف گرنا اس بات کی علامت ہے
چیزیں کسی کے امر کی مطیع اور کسی کے قانون سے مسخر ہیں۔

ا یہ ہے کہ وہ لوگ خود اس بات کے قائل تھے کہ زمین و آسمان کا رب اللہ ہے۔ وہ اس سوال کا جواب انکار کی صورت میں نہیں دے سکتے
یہ انکار خود ان کے اپنے عقیدے کے خلاف تھا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پوچھنے پر وہ اقرار کی صورت میں بھی اس کا جواب دینے سے کتراتے
ہو کہ بعد توحید کا ماننا لازم آ جاتا تھا اور شرک کے لیے کوئی معقول بنیاد باقی نہیں رہتی تھی۔ اس لئے اپنے موقف کی کمزوری کو محسوس کر کے وہ
اب میں چپ سادھ جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ ان سے پوچھو زمین و آسمان کا
ہے، انسانوں کا رب کون ہے، تم کو رزق دینے والا کون ہے، پھر حکم دیتا ہے کہ تم خود کہو کہ اللہ۔ اور اس کے بعد استدلال کرتے
[illegible] اللہ کے سوا دوسرے کون ہیں جن کی تم بندگی کیے جا رہے ہو۔

[illegible] نے چھوڑ کر اپنے معبودوں کو اپنا کارساز ٹھہرا لیا ہے جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں [illegible]

کہو، کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے؟[1] کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں؟[2] اور اگر ایسا نہیں [illegible]

ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے بھی اللہ کی طرح کچھ پیدا کیا ہے کہ اس کی وجہ سے ان پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا[3]

---

[1] اندھے سے مراد وہ شخص ہے جس کے آگے کائنات میں ہر طرف اللہ کی وحدانیت کے آثار و شواہد [illegible] ہوئے ہیں مگر وہ ان میں سے کسی چیز کو بھی نہیں دیکھ رہا ہے۔ اور آنکھوں والے سے مراد وہ ہے جس کے لیے کائنات کے ذرے ذرے اور پتے پتے میں معرفتِ کردگار کے دفتر کھلے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس [illegible] مطلب یہ ہے کہ عقل کے اندھو! اگر تمہیں کچھ نہیں سوجھتا تو آخر چشمِ بینا رکھنے والا اپنی آنکھیں کیسے پھوڑ لے؟ جو شخص حقیقت کو آشکار دیکھ رہا ہے اس کے لیے کس طرح ممکن ہے کہ بے بصیرت لوگوں کی طرح ٹھوکریں کھاتا پھرے؟

[2] روشنی سے مراد علمِ حق کی وہ روشنی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کو حاصل تھی۔ اور تاریکیوں سے مراد جہالت کی وہ تاریکیاں ہیں جن میں منکرین بھٹک رہے تھے۔ سوال کا مطلب یہ ہے کہ جس کو روشنی مل چکی ہے وہ کس طرح اپنی شمع بجھا کر اندھیروں میں ٹھوکریں کھانا قبول کر سکتا ہے؟ تم اگر نور کے قدر شناس نہیں ہو تو نہ سہی، لیکن جس نے اسے پا لیا ہے، جو نور و ظلمت کے فرق کو جان چکا ہے، جو دن کے اجالے میں راہِ راست کو صاف دیکھ رہا ہے، وہ روشنی کو چھوڑ کر تاریکیوں میں بھٹکتے پھرنے کے لیے کیسے آمادہ ہو سکتا ہے؟

[3] اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ اگر دنیا میں کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہوتیں اور کچھ دوسروں نے، اور یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا کہ خدا کا تخلیقی کام کونسا ہے اور دوسروں کا کونسا، تب تو واقعی شرک کے لیے کوئی معقول بنیاد ہو سکتی تھی۔ لیکن جب یہ مشرکین خود مانتے ہیں کہ ان کے معبودوں میں سے کسی نے ایک تنکا اور ایک بال تک پیدا نہیں کیا ہے، اور جب انہیں خود تسلیم ہے کہ خلق میں ان جعلی خداؤں کا ذرہ برابر بھی کوئی حصہ نہیں ہے، تو پھر یہ خالق کے اختیارات اور حقوق میں آخر کس بنا پر شریک ٹھہرا لیے گئے؟

ـ کہو ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے اور وہ یکتا ہے، سب پر غالب!

اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا، پھر جب سیلاب [illegible] پر جھاگ بھی آ گئے۔ اور ایسے ہی جھاگ اُن چیزوں پر بھی اٹھتے ہیں جنھیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لیے پگھلایا کرتے ہیں۔ اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے، جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھیر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے۔

اس میں لفظ قہّار استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں "وہ ہستی جو اپنے زور سے سب پر حکم چلائے اور سب کو مغلوب کر کے [رکھے"۔ یہ] بات کہ "اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے" مشرکین کی اپنی تسلیم کردہ حقیقت ہے جس سے انھیں کبھی انکار نہ تھا اور یہ بات [کہ "وہ یکتا] اور قہّار ہے" اس تسلیم شدہ حقیقت کا لازمی نتیجہ ہے جس سے انکار کرنا، پہلی حقیقت کو مان لینے کے بعد کسی [صاحبِ] عقل کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ جو ہر چیز کا خالق ہے، وہ لامحالہ یکتا و یگانہ ہے، کیونکہ دوسری جو چیز بھی ہے وہ [اس کی مخل]وق ہے، پھر بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی مخلوق اپنے خالق کی ذات، یا صفات، یا اختیارات، یا حقوق میں اس کی شریک ہو۔ [اسی طرح] وہ لامحالہ قہّار بھی ہے، کیونکہ مخلوق کا اپنے خالق سے مغلوب ہو کر رہنا عین تصورِ مخلوقیت ہی میں شامل ہے۔ [غلبۂ کامل] اگر خالق کو حاصل نہ ہو تو وہ خلق ہی کیسے کر سکتا ہے۔ پس جو شخص اللہ کو خالق مانتا ہو اس کے لئے ان دو [عقلی و م]نطقی نتیجوں سے انکار کرنا ممکن نہیں رہتا، اور اس کے بعد یہ بات سراسر غیر معقول ٹھیرتی ہے کہ کوئی شخص خالق کو چھوڑ کر [مخلوق کی] بندگی کرے اور غالب کو چھوڑ کر مغلوب کو مشکل کشائی کے لیے پکارے۔

[اس تمث]یل میں اُس علم کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعے سے نازل کیا گیا تھا، آسمانی بارش سے تشبیہ دی گئی ہے اور ایمان [لانے والے] سلیم الفطرت لوگوں کو اُن ندی نالوں کے مانند ٹھیرایا گیا ہے جو اپنے اپنے ظرف کے مطابق بارانِ رحمت سے بھرپور ہو کر [رواں ہو] جاتے ہیں، اور اس ہنگامہ و شورش کو جو تحریکِ اسلامی کے خلاف منکرین و مخالفین نے برپا کر رکھی تھی اُس جھاگ اور اُس خس و [خاشاک] سے تشبیہ دی گئی ہے جو ہمیشہ سیلاب کے اٹھتے ہی سطح پر اپنی اچھل کود دکھانی شروع کر دیتا ہے۔

[illegible] بھٹی میں گرم کی جاتی ہے تو [illegible] خالص دھات [illegible] [illegible] اور اس [illegible] میل کچیل [illegible] نظر آتا ہے۔

جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت قبول کر لی ان کے لئے بھلائی ہے، اور جنہوں نے اسے قبول نہ کیا وہ اگر زمین کی ساری دولت کے بھی مالک ہوں اور اتنی ہی اور بھی فراہم کر لیں تو وہ خدا کی پکڑ سے بچنے کے لئے اس سب کو فدیہ میں دے ڈالنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے بری طرح حساب لیا جائیگا[1] اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، بہت ہی برا ٹھکانا۔

بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا

---

[1] بری طرح حساب فہمی یا سخت حساب فہمی سے مطلب یہ ہے کہ آدمی کی کسی خطا اور کسی لغزش کو معاف نہ کیا جائے، کوئی قصور اس نے کیا ہو بلا مواخذہ کے بغیر نہ چھوڑا جائے۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کا محاسبہ اپنے ان بندوں سے کرے گا جو اس کے باغی بن کر دنیا میں رہے ہیں۔ بخلاف اس کے جنہوں نے اپنے خدا سے وفاداری کی ہے اور اس کے مطیع فرمان بن کر رہے ہیں ان سے "حساب یسیر" یعنی ہلکا حساب لیا جائے گا، ان کی خدمات کے مقابلے میں ان کی خطاؤں سے درگزر کیا جائے گا اور ان کے مجموعی طرزِ عمل کی بھلائی کو ملحوظ رکھ کر ان کی بہت سی کوتاہیوں سے صرفِ نظر کر لیا جائے گا۔ اس کی مزید توضیح اس حدیث سے ہوتی ہے جو حضرت عائشہ سے ابوداؤد میں مروی ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے نزدیک کتاب اللہ کی سب سے زیادہ خوفناک آیت وہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ "جو شخص کوئی برائی کرے گا وہ اس کی سزا پائے گا۔" اس پر حضور نے فرمایا عائشہ! کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ خدا کے مطیع فرمان بندے کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی کانٹا بھی اس کو چبھتا ہے تو اللہ اسے اس کے کسی نہ کسی قصور کی سزا قرار دے کر وہ قصور اس کے حساب سے ساقط کر دیتا ہے؟ آخرت میں تو جس سے بھی محاسبہ ہوگا وہ سزا پا کر رہے گا۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا پھر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب کیا ہے کہ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا؟ "جس کا نامۂ اعمال اس کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔" حضور نے جواب دیا، اس سے مراد ہے پیشی (یعنی اس کی بھلائیوں کے ساتھ اس کی برائیاں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ضرور ہوں گی) مگر جس سے باز پرس ہوئی وہ تو بس سمجھ لو کہ مارا گیا۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص اپنے وفادار اور فرمانبردار ملازم کی چھوٹی خطاؤں پر کبھی سخت گرفت نہیں کرتا بلکہ اس کے بڑے بڑے قصوروں کو بھی اس کی خدمات کے پیشِ نظر معاف کر دیتا ہے لیکن اگر کسی ملازم کی غداری و خیانت ثابت ہو جائے تو اس کی کوئی خدمت قابلِ لحاظ نہیں رہتی اور اس کے چھوٹے بڑے سب قصور شمار میں آ جاتے ہیں۔

نہیں جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے، دونوں یکساں ہو جائیں؟ نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا

یا ہے اور ان کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں، اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ

تے۔ ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے[۴۳] انھیں برقرار رکھتے ہیں،

سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔ ان کا حال

کہ اپنے رب کی رضا کے لئے صبر سے کام لیتے ہیں[۴۵]، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیئے ہوئے رزق سے

۔ دنیا میں ان دونوں کا رویہ یکساں ہو سکتا ہے اور نہ آخرت میں دونوں کا انجام یکساں۔

خدا کی بھیجی ہوئی اس تعلیم اور خدا کے رسول کی اس دعوت کو جو لوگ قبول کیا کرتے ہیں وہ عقل کے اندھے نہیں بلکہ ہوش گوش

بیدار مغز لوگ ہی ہوتے ہیں، اور پھر دنیا میں ان کی سیرت و کردار کا وہ رنگ اور آخرت میں ان کا وہ انجام ہوتا ہے جو بعد

بیان ہوا ہے۔

مراد وہ ازلی عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش میں تمام انسانوں سے لیا تھا کہ وہ صرف اسی کی بندگی کریں گے

سورۂ اعراف رکوع ۲۲ کے حواشی ملاحظہ ہوں) یہ عہد ہر انسان سے لیا گیا ہے، ہر ایک کی فطرت میں مضمر ہے، اور اسی وقت

جب آدمی اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے وجود میں آتا اور اس کی ربوبیت سے پرورش پاتا ہے۔ خدا کے رزق سے پلنا، اس

چیزوں سے کام لینا اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں کو استعمال کرنا آپ سے آپ انسان کو خدا کے ساتھ ایک میثاقِ بندگی میں باندھ دیتا

جرأت کوئی ذی شعور اور نمک حلال آدمی نہیں کر سکتا الّا یہ کہ نادانستہ کبھی احیاناً اس سے کوئی لغزش ہو جائے۔

معاشرتی اور تمدنی روابط جن کی درستی پر انسان کی اجتماعی زندگی کی صلاح و فلاح منحصر ہے۔

خواہشات کو قابو میں رکھتے ہیں، اپنے جذبات اور میلانات کو حدود کا پابند بناتے ہیں، خدا کی نافرمانی میں جن جن فائدوں

نظر آتا ہے انھیں دیکھ کر پھسل نہیں جاتے، اور خدا کی فرمانبرداری میں جن جن نقصانات اور تکلیفوں کا اندیشہ ہوتا

ثابت قدم رہتے چلے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے مومن کی پوری زندگی درحقیقت صبر کی زندگی ہے، کیونکہ وہ رضائے

آخرت کے پائدار نتائج کی توقع پر اس دنیا میں ضبطِ نفس سے کام لیتا ہے اور گناہ کی جانب نفس کے

ساتھ صبر کرتا ہے۔

علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں، اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔[51] آخرت کا گھر انہی لوگوں کے لیے ہے، یعنی ایسے باغ جو ان کی ابدی قیام گاہ ہوں گے۔ وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اجداد اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو جو صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے اور ان سے کہیں گے کہ "تم پر سلامتی ہے[52]۔ تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس

[51] یعنی وہ بدی کے مقابلے میں بدی نہیں بلکہ نیکی کرتے ہیں۔ وہ شر کا مقابلہ شر سے نہیں بلکہ خیر ہی سے کرتے ہیں۔ کوئی ان پر خواہ کتنا ہی ظلم کرے، وہ جواب میں ظلم نہیں بلکہ انصاف ہی کرتے ہیں۔ کوئی ان کے خلاف خواہ کتنا ہی جھوٹ بولے، وہ جواب میں سچ ہی بولتے ہیں۔ کوئی ان سے خواہ کتنی ہی خیانت کرے، وہ جواب میں دیانت ہی سے کام لیتے ہیں۔ اسی معنی میں ہے وہ حدیث جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے:

لا تکونوا امّعۃ تقولون ان احسن الناس احسنا وان ظلمونا ظلمنا۔ ولکن وطّنوا انفسکم ان احسن الناس ان تحسنوا وان اساءوا فلا تظلموا۔	تم اپنے طرز عمل کو لوگوں کے طرز عمل کا تابع بنا کر نہ رکھو۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اگر لوگ بھلائی کریں گے تو ہم بھلائی کریں گے اور لوگ ظلم کریں گے تو ہم بھی ظلم کریں گے۔

تم اپنے نفس کو ایک قاعدے کا پابند بناؤ۔ اگر لوگ نیکی کریں تو تم نیکی کرو۔ اور اگر لوگ تم سے بدسلوکی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔

اسی معنی میں ہے وہ حدیث جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے۔ اور ان میں سے چار باتیں آپؐ نے یہ فرمائیں کہ میں خواہ کسی سے خوش ہوں یا ناراض ہر حالت میں انصاف کی بات کہوں، جو میرا حق مارے میں اس کا حق ادا کروں، جو مجھے محروم کرے میں اس کو عطا کروں، اور جو مجھ پر ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں۔ اور اسی معنی میں ہے وہ حدیث جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ لا تخن من خانک "جو تجھ سے خیانت کرے تو اس سے خیانت نہ کر"۔ اور اسی معنی میں ہے حضرت عمرؓ کا یہ قول کہ "جو شخص تیرے ساتھ معاملہ کرنے میں خدا سے نہیں ڈرتا اس کو سزا دینے کی بہترین صورت یہ ہے کہ تو اس کے ساتھ خدا سے ڈرتے ہوئے معاملہ کر"۔

[52] اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ ملائکہ ہر طرف سے آ آ کر ان کو سلام کریں گے، بلکہ یہ بھی ہے کہ ملائکہ ان کو اس بات کی خوشخبری دیں گے کہ اب تم ایسی جگہ آ گئے ہو جہاں تمہارے لیے سلامتی ہی سلامتی ہے۔ اب یہاں تم ہر آفت سے، ہر تکلیف سے، ہر مشقت سے، اور ہر خطرے و اندیشے سے محفوظ ہو۔

[illegible] ... دیکھ کیسا اچھا ہے یہ آخرت کا گھر۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے

[کے بع]د توڑ ڈالتے ہیں، جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اور جو زمین میں فساد

[پھیلا]تے ہیں وہ لعنت کے مستحق ہیں اور ان کے لئے آخرت میں بہت برا ٹھکانا ہے۔

اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا رزق دیتا ہے۔ لوگ دنیوی

[زندگی می]ں مگن ہیں، مگر دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاعِ قلیل کے سوا

[کچھ بھی] نہیں۔

یہ لوگ جنہوں نے (رسالتِ محمدی کو ماننے سے) انکار کر دیا ہے کہتے ہیں "اس شخص پر اس کے رب

[کی طرف] سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری؟" ——— کہو، اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف

[اس] آیت کا پس منظر یہ ہے کہ عام جہلا کی طرح کفارِ مکہ بھی عقیدہ و عمل کے حسن و قبح کو دیکھنے کے بجائے

[امیری] و غریبی کے لحاظ سے انسانوں کی قدر و قیمت کا حساب لگاتے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ جسے دنیا میں

[خوب س]امانِ عیش مل رہا ہے وہ خدا کا محبوب ہے، خواہ وہ کیسا ہی گمراہ و بدکار ہو، اور جو تنگ حال ہے وہ خدا کا

[مغضوب] ہے خواہ وہ کیسا ہی نیک ہو۔ اسی بنیاد پر وہ قریش کے سرداروں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غریب

[ساتھیو]ں پر فضیلت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھ لو، اللہ کس کے ساتھ ہے۔ اس پر متنبہ فرمایا جا رہا ہے کہ رزق

[کی کمی و بیش]ی کا معاملہ اللہ کے ایک دوسرے ہی قانون سے تعلق رکھتا ہے جس میں بے شمار دوسری مصلحتوں کے لحاظ

[سے کسی کو زی]ادہ دیا جاتا ہے اور کسی کو کم۔ یہ کوئی معیار نہیں ہے جس کے لحاظ سے انسانوں کے اخلاقی و معنوی حسن و قبح کا

[فیصلہ کیا] جائے۔ انسانوں کے درمیان فرقِ مراتب کی اصل بنیاد اور ان کی سعادت و شقاوت کی اصل کسوٹی یہ ہے

[کہ کس نے] فکر و عمل کی صحیح راہ اختیار کی اور کس نے غلط، کس نے عمدہ اوصاف کا اکتساب کیا اور کس نے برے اوصاف کا۔

[مگر نادان لوگ اس] کے بجائے یہ دیکھتے ہیں کہ کس کو دولت زیادہ ملی اور کس کو کم۔

[illegible]

[illegible]

آنے کا راستہ اُسے دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے[1]۔ ایسے ہی لوگ ہیں وہ جنھوں نے (اس نبی کی دعوت کو) مان لیا ہے اور اُن کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔ پھر جن لوگوں نے دعوتِ حق کو مانا اور نیک عمل کیے وہ خوش نصیب ہیں اور ان کے لئے اچھا انجام ہے۔

اے محمدؐ! اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے[2]، ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں، تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے، اس حال میں کہ یہ اپنے نہایت مہربان خدا کے کافر بنے ہوئے ہیں[3]۔ ان سے کہو کہ وہی میرا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اسی پر میں نے بھروسہ

---

[1] یعنی جو اللہ کی طرف خود رجوع نہیں کرتا اور اس سے روگردانی اختیار کرتا ہے اسے زبردستی راہِ راست دکھانے کا طریقہ اللہ کے ہاں رائج نہیں ہے۔ وہ ایسے شخص کو انہی راستوں میں بھٹکنے کی توفیق دے دیتا ہے جن میں وہ خود بھٹکنا چاہتا ہے۔ وہی سارے اسباب جو کسی ہدایت طلب انسان کے لیے سببِ ہدایت بنتے ہیں، ایک ضلالت طلب انسان کے لیے سببِ ضلالت بنا دیے جاتے ہیں۔ شمع روشن بھی اس کے سامنے آتی ہے تو راستہ دکھانے کے بجائے اس کی آنکھیں خیرہ ہی کرنے کا کام دیتی ہے۔ یہی مطلب ہے اللہ کے کسی شخص کو گمراہ کرنے کا۔

نشانی کے مطالبے کا یہ جواب اپنی بلاغت میں بے نظیر ہے۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی نشانی دکھاؤ تو ہمیں تمہاری صداقت کا یقین آئے۔ جواب میں کہا گیا کہ نادانو! تمہیں راہِ راست نہ ملنے کا اصل سبب نشانیوں کا فقدان نہیں ہے بلکہ تمہاری اپنی ہدایت طلبی کا فقدان ہے۔ نشانیاں تو ہر طرف بے حد و حساب پھیلی ہوئی ہیں، مگر ان میں سے کوئی بھی تمہارے لیے نشانِ راہ نہیں بنتی، کیونکہ تم خدا کے راستے پر جانے کے خواہشمند ہی نہیں ہو۔ اب اگر کوئی اور نشانی آئے تو وہ تمہارے لئے کیسے مفید ہو سکتی ہے۔ تم شکایت کرتے ہو کہ کوئی نشانی نہیں دکھائی گئی۔ مگر جو خدا کی راہ کے طالب ہیں انہیں نشانیاں نظر آ رہی ہیں اور وہ انھیں دیکھ دیکھ کر راہِ راست پا رہے ہیں۔

[2] یعنی کسی ایسی نشانی کے بغیر جس کا یہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں۔

[3] یعنی اس کی بندگی سے منہ موڑے ہوئے ہیں، اس کی صفات اور اختیارات اور حقوق میں دوسروں کو اس کا شریک بنا رہے ہیں اور اس کی نعمتوں کے شکریے دوسروں کو ادا کر رہے ہیں۔

اختیار کر رکھا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت آتی ہی رہتی ہے یا ان کے گھر کے قریب کہیں نازل ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پورا ہو، یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے، مگر میں نے ہمیشہ منکرین کو ڈھیل دی اور آخرکار ان کو پکڑ لیا، پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔

پھر کیا وہ جو ایک ایک متنفس کی کمائی پر نظر رکھتا ہے[51] (اس کے مقابلے میں یہ جسارتیں کی جا رہی ہیں[52] کہ) لوگوں نے اس کے کچھ شریک ٹھیرا رکھے ہیں۔ اے نبی، ان سے کہو، (اگر واقعی وہ خدا کے اپنے بنائے ہوئے شریک ہیں تو) ذرا ان کے نام لو کہ وہ کون ہیں؟ یا تم اللہ کو ایک نئی بات کی خبر دے رہے ہو جسے وہ اپنی زمین میں نہیں جانتا؟ یا تم لوگ بس یونہی جو منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہو؟[53] حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے دعوتِ حق کا ماننے

---

[51] یعنی جو ایک ایک شخص کے حال سے فرداً فرداً واقف ہے اور جس کی نگاہ سے نہ کسی نیک آدمی کی نیکی چھپی ہوئی ہے نہ کسی بد کی بدی۔

[52] جسارتیں یہ کہ اس کے ہمسر اور مدِمقابل تجویز کیے جا رہے ہیں، اس کی ذات اور صفات اور حقوق میں اس کی مخلوق کو شریک کیا جا رہا ہے اور اس کی خدائی میں رہ کر لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم جو کچھ چاہیں کریں ہم سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں۔

[53] یعنی اس کے شریک جو تم نے تجویز کر رکھے ہیں اُن کے معاملے میں تین ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارے پاس کوئی مستند اطلاع آئی ہو کہ اللہ نے فلاں فلاں ہستیوں کو اپنی صفات، یا اختیارات یا حقوق میں شریک قرار دیا ہے۔ اگر یہ صورت ہے تو ذرا ہمیں بھی بتاؤ کہ وہ کون کون اصحاب ہیں اور ان کے شریکِ خدا مقرر کیے جانے کی اطلاع آپ کو کس ذریعہ سے پہنچی ہے۔ دوسری ممکن صورت یہ ہے کہ اللہ کو خود خبر نہیں ہے کہ زمین میں کچھ حضرات اس کے شریک بن گئے ہیں اور اب آپ اس کو یہ اطلاع دینے چلے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو صفائی کے ساتھ اپنی اس پوزیشن کا اقرار کرو، پھر ہم بھی دیکھ لیں گے کہ دنیا میں کتنے ایسے احمق نکلتے ہیں جو تمہارے اس سراسر لغو مسلک کی پیروی پر قائم رہتے ہیں۔ لیکن اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو پھر تیسری ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تم بغیر کسی سند اور بغیر کسی دلیل کے یونہی جس کو چاہتے ہو خدا کا رشتہ دار ٹھیر لیتے ہو، جس کو چاہتے ہو داتا اور فریاد رس کہہ دیتے ہو، اور جس کے متعلق چاہتے ہو دعویٰ کر دیتے ہو کہ فلاں علاقے کے سلطان فلاں صاحب ہیں اور فلاں کام فلاں حضرت کی تائید و امداد سے بر آتے ہیں۔

[illegible]

[illegible] ہمیشہ رہے گا۔ اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے دنیا کی زندگی ہی میں عذاب

اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کوئی ایسا نہیں جو انہیں خدا سے بچانے والا ہو۔ خدا ترس

لوگوں کے لئے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، اس کے

پھل دائمی اور اس کا سایہ لازوال۔ یہ انجام ہے متقی لوگوں کا۔ اور منکرینِ حق کا انجام یہ ہے کہ ان کے

لئے دوزخ کی آگ ہے۔

شرک کو مکاری کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ دراصل جن اجرامِ فلکی یا فرشتوں یا ارواح یا بزرگ انسانوں کو خدائی صفات و اختیارات کا حامل قرار دیا گیا ہے، اور جن کو خدا کے مخصوص حقوق میں شریک بنا لیا گیا ہے اُن میں سے کسی نے بھی کبھی نہ ان اختیارات کا دعویٰ کیا، نہ ان حقوق کا مطالبہ کیا، اور نہ لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ تم ہمارے آگے پرستش کے مراسم ادا کرو، ہم تمہارے کام بنایا کریں گے۔ یہ تو چالاک انسانوں کا کام ہے کہ انہوں نے عوام پر اپنی خدائی کا سکہ جمانے اور ان کی کمائیوں میں حصہ بٹانے کے لئے کچھ بناوٹی خدا تصنیف کیے، لوگوں کو اُن کا معتقد بنایا اور اپنے آپ کو کسی طور پر ان کا نمائندہ ٹھیرا کر اپنا الو سیدھا کرنا شروع کر دیا۔ دوسری وجہ شرک کو مکر سے تعبیر کرنے کی یہ ہے کہ دراصل یہ ایک فریبِ نفس ہے اور ایک چور دروازہ ہے جس کے ذریعے سے انسان دنیا پرستی کے لئے اخلاقی پابندیوں سے بچنے کے لیے اور غیر ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے کے لئے راہِ فرار نکالتا ہے۔ تیسری وجہ جس کی بنا پر شرک کو مکر سے تعبیر کیا گیا ہے آگے آتی ہے۔

واضح رہے کہ جب انسان ایک چیز کے مقابلہ میں دوسری چیز کو اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے نفس کو مطمئن کرنے [illegible] کے لئے اپنی اختیار کردہ چیز کو ہر طریقے سے مستدل کرنے کی [illegible]

[illegible]

اے نبی! جن لوگوں کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس کتاب سے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے خوش ہیں اور
مختلف گروہوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی بعض باتوں کو نہیں مانتے۔ تم صاف کہہ دو کہ "مجھے تو صرف اللہ کی
بندگی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھیراؤں۔ لہٰذا میں اسی کی طرف
دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے"۔[51] اسی ہدایت کے ساتھ ہم نے یہ فرمانِ عربی تم پر نازل کیا ہے۔ اب
اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آچکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ
کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے۔

تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا۔[52] اور کسی رسول کی
بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی خود لا دکھاتا۔[53] ہر دور کے لیئے ایک کتاب ہے۔ اللہ جو

---

۵۱ یہ ایک خاص بات کا جواب ہے جو اُس وقت مخالفین کی طرف سے کہی جا رہی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر یہ صاحب واقعی وہی تعلیم لے کر آئے ہیں جو پچھلے انبیاء لائے تھے، جیسا کہ اِن کا دعویٰ ہے، تو آخر کیا بات ہے کہ یہود و نصاریٰ، جو پچھلے انبیاء کے پیرو ہیں، آگے بڑھ کر ان کا استقبال نہیں کرتے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ اس پر خوش ہیں اور بعض ناراض، مگر اے نبی، خواہ کوئی خوش ہو یا ناراض، تم صاف کہہ دو کہ مجھے تو خدا کی طرف سے یہ تعلیم دی گئی ہے اور میں بہر حال اسی کی پیروی کروں گا۔

۵۲ یہ ایک اور اعتراض کا جواب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ اچھا نبی ہے جو بیوی اور بچے رکھتا ہے، بھلا پیغمبروں کو بھی خواہشاتِ نفسانی سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔

۵۳ یہ بھی ایک اعتراض کا جواب ہے۔ مخالفین کہتے تھے کہ موسیٰؑ یدِ بیضا اور عصا لائے تھے۔ مسیحؑ اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کر دیتے تھے۔ صالحؑ نے اونٹنی کا نشان دکھایا تھا۔ تم کیا نشانی لے کر آئے ہو؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جس نبی نے جو چیز بھی دکھائی ہے اپنے اختیار اور اپنی طاقت سے نہیں دکھائی ہے۔ اللہ نے جس وقت جس کے ذریعہ سے جو کچھ ظاہر کرنا مناسب سمجھا وہ ظہور میں آیا۔ اب اگر اللہ کی مصلحت ہوگی تو جو کچھ وہ چاہے گا دکھائے گا۔ پیغمبر خود کسی خدائی اختیار کا مدعی نہیں ہے کہ تم اس سے نشانی دکھانے کا مطالبہ کرتے ہو۔

ئاب ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے، ام الکتاب اسی کے پاس ہے۔[61]

اور اے نبیؐ! جس برے انجام کی دھمکی ہم ان لوگوں کو دے رہے ہیں اس کا کوئی حصہ خواہ ہم تمہارے

دکھا دیں یا اس کے ظہور میں آنے سے پہلے ہم تمہیں اٹھا لیں، بہرحال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے

اب لینا ہمارا کام ہے۔[62] کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم اس سرزمین پر چلے آرہے ہیں اور اس کا دائرہ ہر طرف

تے چلے جاتے ہیں؟[63] اللہ حکومت کر رہا ہے، کوئی اس کے فیصلوں پر نظرِ ثانی کرنے والا نہیں ہے، اور

بھی مخالفین کے ایک اعتراض کا جواب ہے۔ وہ کہتے تھے کہ پہلے آئی ہوئی کتابیں جب موجود تھیں تو اس نئی کتاب کی کیا ضرورت

م کہتے ہو کہ ان میں تحریف ہو گئی ہے، اب وہ منسوخ ہیں اور اس نئی کتاب کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر خدا کی کتاب میں تحریف

ہو سکتی ہے؟ خدا نے اس کی حفاظت کیوں نہ کی؟ اور کوئی خدائی کتاب منسوخ کیسے ہو سکتی ہے؟ تم کہتے ہو کہ یہ اسی خدا کی

ہے جس نے توراۃ و انجیل نازل کی تھیں۔ مگر یہ کیا بات ہے کہ تمہارا طریقہ توراۃ کے بعض احکام کے خلاف ہے؟ مثلاً

یزیں جنہیں توراۃ والے حرام کہتے ہیں تم انہیں حلال سمجھ کر کھاتے ہو۔ ان اعتراضات کے جوابات بعد کی سورتوں میں زیادہ

کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ یہاں ان کا صرف ایک مختصر جامع جواب دے کر چھوڑ دیا گیا ہے۔

م الکتاب" کے معنی ہیں "اصل کتاب" یعنی وہ منبع و سرچشمہ جس سے تمام کتبِ آسمانی نکلی ہیں۔

طلب یہ ہے کہ تم اس فکر میں نہ پڑو کہ جن لوگوں نے تمہاری اس دعوتِ حق کو جھٹلا دیا ہے ان کا انجام کیا ہوتا ہے اور کب

ر میں آتا ہے۔ تمہارے سپرد جو کام کیا گیا ہے اسے پوری یکسوئی کے ساتھ کیے چلے جاؤ اور فیصلہ ہم پر چھوڑ دو۔ یہاں بظاہر

صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر دراصل بات ان مخالفین کو سنانی مقصود ہے جو چیلنج کے انداز میں بار بار حضورؐ سے کہتے تھے کہ

جس شامت کی دھمکیاں تم ہمیں دیا کرتے ہو آخر وہ آ کیوں نہیں جاتی۔

یعنی کیا تمہارے مخالفین کو نظر نہیں آ رہا ہے کہ اسلام کا اثر سرزمینِ عرب کے گوشے گوشے میں پھیلتا جا رہا ہے اور

ہر طرف سے ان پر حلقہ تنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ ان کی شامت کے آثار نہیں ہیں تو کیا ہیں؟ اللہ تعالیٰ کا یہ

"ہم اس سرزمین پر چلے آ رہے ہیں" ایک نہایت لطیف اندازِ بیان ہے۔ چونکہ دعوتِ حق اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور اللہ اس کے

اہل کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے کسی سرزمین میں اس دعوت کے پھیلنے کو اللہ اس طرح تعبیر فرماتا ہے کہ ہم خود اس سرزمین میں بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔

اسے حساب لینے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ ان سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں وہ بھی بڑی بڑی چالیں چل چکے ہیں[51] مگر اصل فیصلہ کن چال تو پوری کی پوری اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کیا کچھ کمائی کر رہا ہے، اور عنقریب یہ منکرینِ حق دیکھ لیں گے کہ انجام کس کا بخیر ہوتا ہے۔

یہ منکرین کہتے ہیں کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہو۔ کہو "میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے اور پھر ہر اُس شخص کی گواہی جو کتابِ آسمانی کا علم رکھتا ہے"[52]

---
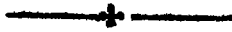
[51] یعنی آج کوئی نئی بات نہیں ہے کہ حق کی آواز کو دبانے کے لئے جھوٹ اور فریب اور ظلم کے ہتھیار استعمال کئے جا رہے ہیں۔ تاریخ میں بارہا ایسی ہی چالوں سے دعوتِ حق کو شکست دینے کی کوششیں کی جا چکی ہیں۔

[52] یعنی ہر وہ شخص جو واقعی آسمانی کتابوں کے علم سے بہرہ ور ہے اس بات کی شہادت دے گا کہ جو کچھ میں پیش کر رہا ہوں یہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاء لے کر آئے تھے۔

منشور جماعت اسلامی برائے انتخابات پنجاب

حصہ اول

توضیحات

جماعت اسلامی پاکستان جس مقصد کے لئے پنجاب کے انتخابات میں حصہ لے رہی ہے اور جس پروگرام کو وہ
اس صوبے میں نافذ کرنا چاہتی ہے اس کی تشریح سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند امور کو واضح طور پر بیان
کر دیا جائے تاکہ سب لوگ ہمارے موقف کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

(۱)

یہ جماعت اُن محدود معنوں میں کوئی سیاسی یا مذہبی یا اصلاحی جماعت نہیں ہے جن میں عام طور پر یہ الفاظ بولے
جاتے ہیں، بلکہ یہ جامع معنوں میں ایک اصولی جماعت ہے جو پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع اور عالمگیر نظریۂ
حیات پر یقین رکھتی ہے اور اُس نظریہ کو انسانی عقائد و افکار میں، اخلاق و عادات میں، علوم و فنون میں، ادب
اور آرٹ میں، تمدن و تہذیب میں، مذہب اور معاشرت میں، معاشی معاملات میں، سیاست اور نظم مملکت
میں، اور بین الاقوامی تعلقات اور روابط میں عملاً نافذ کرنا چاہتی ہے۔ اس جماعت کے نزدیک دُنیا کے بگاڑ کا
حقیقی سبب خدا کی اطاعت سے انحراف، آخرت کی جواب دہی سے بے نیازی اور انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی
سے روگردانی ہے اور دنیا میں جب کبھی، جہاں کہیں، جس شعبۂ زندگی میں بھی بگاڑ رونما ہوا ہے یہی اس کا
بنیادی سبب رہا ہے کیونکہ یہ طرزِ فکر و عمل حق کے خلاف ہے۔ اس جماعت کے عقیدے میں "حق" یہ ہے کہ
خدا اس پوری کائنات کا مالک و حاکم ہے، انسان اس کے سامنے جواب دہ ہے، اور صرف انبیاء کی تعلیم ہی
ہدایت کا اصل سرچشمہ ہے۔ لہٰذا یہ جماعت نوعِ انسانی کے لئے فلاح کی صرف ایک ہی صورت دیکھتی ہے اور
وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کا پورا نظام اپنے تمام شعبوں اور گوشوں سمیت خدائے واحد کی بندگی و اطاعت پر قائم

اصول پر قائم ہو، اس بندگی و اطاعت کے لیے انبیاء علیہم السلام کی اُس رہنمائی کو سند مانا جائے جو آج اپنی مکمل و کامل صورت میں صرف سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہی میں موجود ہے، اور افراد کی سیرتوں سے لے کر قوموں کے اجتماعی طرزِ عمل تک ہر چیز کو اُس اخلاقی رویّہ پر قائم کیا جائے جس کی بنیاد آخرت کی جوابدہی کے احساس پر رکھی گئی ہو۔

(۲)

یہ جماعت قوم پرست اور وطن پرست جماعتوں کی طرح اپنے مطمح نظر کو اپنے ہی ملک کے حدود تک محدود نہیں رکھتی بلکہ پوری انسانیت کی فلاح اِس کے پیشِ نظر ہے۔ پاکستان میں اس کی کوششیں محض برائے پاکستان نہیں ہیں بلکہ وہ چاہتی ہے کہ سب سے پہلے ہم اپنے ملک کے نظامِ زندگی کو مذکورہ بالا نظریہ کے مطابق درست کریں، پھر اُس کو تمام دنیا کے لیے نمونۂ ہدایت اور ذریعۂ اصلاح بنائیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا مقصدِ زندگی ساری دنیا میں حق کا بول بالا کرنا ہے۔ مگر دنیا میں ہم یہ خدمت اس وقت تک انجام نہیں دے سکتے جب تک سب سے پہلے خود اپنے گھر میں حق کا بول بالا نہ کر دیں۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس سے ہم دنیا پر یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ہم خود عملاً اس حق کی پیروی کر رہے ہیں جس کی طرف دوسروں کو دعوت دینا چاہتے ہیں، اور صرف اسی صورت سے دنیا کے سامنے اس امر کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے کہ حق پرستی اس چیز کا نام ہے اور یہ اس کے نتائج اور فوائد ہیں۔

(۳)

اس جماعت کے نزدیک پاکستان میں دراصل کسر اس چیز کی نہیں ہے کہ یہاں خدا اور آخرت اور رسالت کے ماننے والوں کی کمی ہے، بلکہ اس چیز کی ہے کہ جس حق کو یہاں کی اکثریت مانتی ہے وہ عملاً نافذ ہو اور اسی پر ہمارے ملک کا پورا نظامِ زندگی قائم ہو۔ یہ کوئی معمولی کسر نہیں ہے بلکہ ایک بہت بڑی کسر ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے ہمارا یہ ملک ایک اسلامی ملک ہونے کے باوجود نہ اسلام کی نعمتوں اور برکتوں سے خود فائدہ اٹھا رہا ہے نہ دنیا کے لیے اسلام کی حقانیت کا گواہ بن رہا ہے۔ اور یہ کسر اس لحاظ سے کوئی ہلکی کسر بھی نہیں ہے کہ اسے پورا کر دینا آسان ہو۔ اس کی پشت پر بہت سے طاقتور اسباب ہیں جنھیں بڑی سخت جدوجہد کے

مددور کیا جا سکتا ہے۔

ایک طرف ہمارے عوام کی اسلام سے ناواقفیت ہے جس کی وجہ سے وہ اس دین کے عقیدت مند ہونے کے باوجود اس کی صحیح پیروی سے قاصر ہو رہے ہیں۔

دوسری طرف ہمارے اندر بہت سے [illegible] اصلاح طبقوں کی موجودگی ہے جو اپنے تعصبات کی وجہ سے یا اپنی اغراض کی خاطر مختلف پرانی یا نئی جاہلیتوں سے چمٹے ہوئے ہیں اور خالص اسلام کے قیام کی راہ روک رہے ہیں۔

تیسری طرف ہمارا ماضی قریب ہے جو ہمیں اس حال میں چھوڑ گیا ہے کہ انگریزی اقتدار نے اپنی تعلیم سے، اپنے تہذیبی و تمدنی اثرات سے، اپنے قوانین سے، اور اپنی انتظامی پالیسی سے ہماری زندگی کے ہر شعبے کو غیر اسلامی سانچوں میں ڈھال دیا، حتیٰ کہ ہمارے مذہبی عقائد اور ہمارے اخلاق تک کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔

ان سب پر مزید یہ کہ اب جن لوگوں کے ہاتھ میں ہماری قومی زندگی کی باگیں آئی ہیں اور جن کو اس نوخیز ریاست کی تعمیر و تشکیل کے اختیارات ملے ہیں وہ اگرچہ اسلام ہی کا نام لے کر برسر اقتدار آئے ہیں اور دعویٰ یہی کرتے ہیں کہ ہم یہاں اسلامی نظام زندگی کو از سر نو قائم کریں گے، لیکن نہ تو وہ اسلام کو جانتے ہیں، نہ ان کی اپنی زندگیاں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ وہ اسلام کے طریقے پر خود عامل ہیں، اور نہ ان کا اب تک کا طرزِ عمل یہ امید دلاتا ہے کہ ان کے ہاتھوں یہ ملک کبھی فرنگیت کے راستے سے ہٹ کر اسلام کے راستے پر چل سکے گا۔

یہ ہیں وہ بڑے بڑے بنیادی اسباب جن کی وجہ سے پاکستان میں اس کسر کو پورا کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ یہاں کی اکثریت جس چیز کو حق جانتی اور مانتی ہے وہ یہاں عملاً نافذ ہو اور اسی پر یہاں کا پورا نظام زندگی قائم ہو۔

(۴)

جماعت اسلامی ان تمام اسباب کو دور کرنے کے لئے ایک مدت سے کوشاں ہے۔ وہ تحریر اور تقریر کے ذریعہ عوام میں اسلام کا علم پھیلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ ان تمام نئی اور پرانی جاہلیتوں کے خلاف بھی نبرد آزما [illegible] جنہوں نے ہماری قومی زندگی کے مختلف گوشوں میں ڈیرے جما رکھے ہیں۔ وہ انگریزی اقتدار کے ان تمام

خیالات پر بھی تنقید کر رہی ہے جنہوں نے اخلاق اور نظریات سے لے کر معاشرت اور معیشت اور سیاست تک ہر
ہر چیز کو اسلامی نقطۂ نظر سے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ علمی حیثیت سے یہ بھی بتا رہی ہے کہ اسلامی اصولوں پر
ہر شعبۂ حیات کی تعمیرِ جدید کس طرح کی جاسکتی ہے اور اس وقت کے مسائلِ زندگی کا حل کیا ہے۔ وہ عملی حیثیت
سے اس بات کی کوشش بھی کر رہی ہے کہ لوگوں کے اندر خدا کی بندگی اور انبیاء کی پیروی کا جذبہ اور ایمانی اخلاق
رنگ پیدا ہو اور ایسی سیرتیں تیار ہوں جن میں آخرت کی جواب دہی کا احساس کار فرما ہو۔ لیکن ان سب باتوں کے
ساتھ وہ یہ بھی ضروری سمجھتی ہے کہ پاکستان کا دستورِ حکومت خالص اسلامی بنیادوں پر بنایا جائے اور اس حکومت
انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دیا جائے جو اسلام کے مطابق کام کرنا جانتے بھی ہوں اور چاہتے بھی ہوں۔ یہ چیز
اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر ہماری قومی حکومت کے ذرائع و وسائل اور حاکمانہ اختیارات اسلامی زندگی
کی تعمیر میں استعمال نہیں کئے جاسکتے۔ اور یہ چیز اس بنا پر بڑی اہمیت بھی رکھتی ہے کہ اگر ایک طرف یہاں اسلامی
اصلاح و انقلاب کے خواہشمند لوگ غیر سیاسی تدبیروں سے اسلامی زندگی کی تعمیر کے لئے کوششیں کریں، اور دوسری
طرف ہماری قومی حکومت کا انتظام ایسے فرنگیت مآب لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو اپنی پوری سیاسی طاقت اس ملک کو
انگلستان، امریکہ یا روس کی نقل مطابق اصل بنانے کی کوشش میں صرف کر دیں، تو اس سے یہاں ایک سخت کشمکش
رونما ہوگی جو کسی حیثیت سے بھی اس ملک کے لیے مفید نہیں ہے۔ اس طرح ہر ایک جو کچھ بنانے کی کوشش کرے گا
دوسرا اسے بگاڑنے میں اپنی طاقت صرف کرتا رہے گا اور فی الواقع یہاں کچھ بھی نہ بن سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ
جماعت اپنی دوسری کوششوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کی سیاسی قیادت کو ایک صالح قیادت سے بدلنے
کی جد و جہد بھی کر رہی ہے۔

(۵)

جماعت اسلامی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہے کہ پنجاب یا کسی دوسرے صوبے کے انتخابات میں صالح
لوگوں کے منتخب ہو جانے سے کسی جگہ بھی اسلامی زندگی کی تعمیر اور موجودہ خرابیوں کی اصلاح کا کوئی بڑا کام
ہوسکے گا۔ وہ اس بات کو خوب جانتی ہے کہ حقیقی تعمیر و اصلاح کا کوئی کام بھی مرکزی قیادت کی تبدیلی کے بغیر نہیں
کیا جاسکتا۔ موجودہ دستور کی رو سے حکومت کے سارے اختیارات مرکز کے ہاتھ میں ہیں اور صوبائی حکومتیں

.... بظاہر حاصل ہیں وہ بھی دراصل کسی صوبے کی اسمبلی یا وزارت
قبضے میں نہیں ہیں بلکہ اُس گورنر کے قبضے میں ہیں جو مرکز کے ایجنٹ کی حیثیت سے صوبے پر مسلط ہے اس لئے
زادہ اس کے مقرر کیے ہوئے گورنر کے ساتھ ساز باز رکھنے والی پارٹی تو ایک صوبے میں سب کچھ کر سکتی ہے
جو پارٹی مرکز کی منظور نظر نہ ہو اس کے راستے میں مرکز اور گورنر مل کر اتنی رکاوٹیں ڈال سکتے ہیں کہ وہ مشکل ہی
ہی کام کر سکتی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود یہ جماعت جن مقاصد کے لیے پنجاب کے
زہ انتخابات میں حصہ لے رہی ہے اور آئندہ ہر ایسے انتخاب میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتی ہے جو ملک میں کسی جگہ

مقصود یہ ہیں :-

(۱) انتخابات میں ملک کے عام رائے دہندوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کا جو موقع ملتا ہے اس سے
را فائدہ اٹھایا جائے۔ عوام کو اس طرح تیار کیا جائے کہ وہ اپنے ملک کے معاملات سے دلچسپی لینے، مجملہ
ر یہ سے کو سمجھنے اور خود رائے قائم کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ان کو یہ بتایا جائے کہ جس اسلامی نظام کے لئے
ہوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا وہ دراصل کیا ہے، اس کو قائم کرنے اور چلانے کے لئے کس اخلاق اور کس
بلیت کے لوگ درکار ہیں، اس کے قائم ہونے کے فائدے اور قائم نہ ہونے کے نقصانات کیا ہیں، ووٹ کا
تیار حاصل ہونے سے ان پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اس ذمہ داری کو وہ کس طرح صحیح طریقہ
ے ادا کر سکتے ہیں۔

(۲) عام رائے دہندوں کی تربیت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو اس حد تک منظم بھی کر دیا جائے کہ وہ
د اپنی پنچائتیں بنا کر اپنی نمائندگی کے لیے ایسے آدمیوں کو چنیں جن کی دینی و اخلاقی حالت اور قابلیت پر ان کو اعتماد
۔ اس تنظیم کو ہم عارضی و ہنگامی حیثیت دینے کے بجائے مستقل حیثیت دینا چاہتے ہیں تاکہ ہمیشہ کے لئے
یندواری کا غیر اسلامی طریقہ متروک ہو کر وہ طریقۂ انتخاب رائج ہو جائے جو اسلام کی روح سے قریب تر
ہے اور رفتہ رفتہ اُس پارٹی سسٹم کا بھی خاتمہ کیا جا سکے جو اسلامی نظام سے مناسبت نہیں رکھتا اور
عوام کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ صرف ایک انتخاب کا معاملہ ہی نہیں، اپنی اجتماعی زندگی کے دوسرے
معاملات بھی باہم مل کر طے کر لیا کریں۔

(۳) انتخابی جد و جہد کے ان غلط طریقوں کو، جن میں جھوٹ، فریب، جوڑ توڑ، غنڈہ گردی، گالم گلوچ، زرپاشی اور ضمیروں کی خرید و فروخت کے سارے ہی ناپاک ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں، بند کیا جائے اور ان کی جگہ ایسے معقول اور مہذب طریقے رائج کیے جائیں جن سے قوم کے شریف عناصر کے لئے انتخابات میں حصہ لینا ممکن ہو اور عوام آزادی کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنی رائے استعمال کر سکیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وقت ہماری قومی زندگی پر کس قسم کے پست اخلاق لوگ چھائے ہوئے ہیں اور وہ اصلاح کی کوشش کرنے والوں پر کیسی کچھ غلاظت اچھال سکتے ہیں، لیکن ہمیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ اگر شریف لوگ منظم ہو کر اور ایک دفعہ جی کڑا کر کے اس گندگی کو صاف نہ کر دیں گے تو یہاں کی فضا کبھی ستھری نہ ہو سکے گی۔

(۴) پنچائتی نظام کے ذریعے سے جو صالح آدمی منتخب ہو کر کسی صوبے کی اسمبلی میں جائیں وہ ایک اسلامی پارٹی کی صورت میں منظم ہوں اور اصلاح کے اس پروگرام کو سامنے لائیں جسے اس منشور میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ پارٹی اپنے صوبے کی اسمبلی میں قلیل التعداد ہو تو اس پروگرام کے پیش کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمام ملک کے سامنے وہ حق بھی آ جائے گا جسے ہم قائم کرنا چاہتے ہیں اور وہ باطل بھی آ جائے گا جس پر برسرِ اقتدار طبقہ ملک کا نظام چلا رہا ہے۔ دونوں کا فرق جتنا جتنا واضح ہوتا جائے گا رائے عام حق کی تائید میں ہموار ہوتی چلی جائے گی! اور اگر اس پارٹی کو اکثریت حاصل ہو تو یہ مرکز اور اس کے گورنر کی ہر مزاحمت کے باوجود اپنے پروگرام کو نافذ کرنے کی کوشش کرے گی اور جب اسے کام نہ کرنے دیا جائے گا تو وہ مستعفی ہو کر تمام ملک کے سامنے اس حقیقت کو بے نقاب کر دے گی کہ یہاں دراصل کون ساری خرابیوں کا پشت پناہ ہے اور کس کی وجہ سے اصلاح و تعمیر کا راستہ بند ہے۔ یہ چیز ان شاء اللہ مرکزی قیادت کی تبدیلی میں مددگار ثابت ہوگی۔

(۶)

جماعت اسلامی اپنا یہ منشور ان حدود کو ملحوظ رکھ کر مرتب کر رہی ہے جن میں ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت ایک صوبے کی حکومت کے اختیارات محدود کیے گئے ہیں۔ اس لئے اس میں ان مسائل و معاملات سے بحث نہیں کی گئی ہے جو براہِ راست مرکزی حکومت کے اختیارات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس منشور میں وہ اصلاحی لائحہ عمل نہیں دیا گیا ہے جسے ہم پورے پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے ہیں، بلکہ صرف پنجاب کی صوبائی حکومت میں نافذ کرنے کے

جماعت اسلامی اس منشور کو اس حیثیت سے پیش نہیں کر رہی ہے کہ وہ خود اسے نافذ کرنے کی ذمہ داری
ی ہے۔ جماعت نے انتخابات میں جو طریقِ کار اختیار کیا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے ٹکٹ پر اپنے ارکان کو
مبلی کی رکنیت کے لئے کھڑا کر رہی ہو اور اسمبلی میں خود اپنی ایک پارلیمنٹری پارٹی بنانے کا ارادہ رکھتی ہو۔ اس کے
بائے اس نے مختلف حلقہائے انتخاب کے رائے دہندوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنی پنچائتیں ......
...... بنا کر خود جن لوگوں کو صالح سمجھیں انہیں اپنی نمائندگی کے لئے منتخب کریں۔ جہاں جہاں یہ پنچائتیں
ں ہیں، وہ اپنے فیصلے میں بالکل آزاد ہیں اور وہ ہمارے جماعتی نظم کا کوئی جز نہیں ہیں۔ ہم یہ منشور انہی پنچائتوں
ے سامنے پیش کر رہے ہیں، تاکہ اگر وہ اسے اپنے منشور کی حیثیت سے قبول کر لیں تو اپنے چنے ہوئے نمائندوں
و اس پر عمل کرنے کا پابند بنائیں۔ اگر پنچائتوں کے چنے ہوئے نمائندوں میں جماعت اسلامی
ے ارکان اور ہمدردوں کی اکثریت ہو تو جماعت خود اس پروگرام پر عمل درآمد کرانے کا
مہ لے گی۔ لیکن اگر ان میں اکثریت ایسے اصحاب کی ہو جو ہمارے جماعتی نظم کے پابند
یں ہیں تو ان سے اپنے پروگرام پر عمل کرانا پنچائتوں کا اپنا کام ہوگا۔ اسی لئے یہ منشور
م جماعتوں کے منشوروں سے مختلف طرز پر مرتب کیا جا رہا ہے۔ اس میں ہم صرف یہ بتا رہے ہیں کہ صوبائی
بلی میں ایک اسلامی پارٹی کو کس طرح کام کرنا چاہئے اور کیا کام کرنا چاہیے۔

حصۂ دوم

لائحۂ عمل

اس لائحۂ عمل میں وہ طریقِ کار بیان کیا جا رہا ہے جس پر پنچایتی نظام کے منتخب کئے ہوئے نمائندوں کو
ائی اسمبلی کے اندر اور باہر کاربند ہونا چاہیے۔

ندوں کا عہد نامہ | ہر اس شخص کو جسے کسی حلقے کے پنچایتی نظام نے اپنا نمائندہ نامزد کیا ہو صرف

نامزد کرنے والی پنچایت کے سامنے بلکہ ایک مجمع عام میں لوگوں کے سامنے بھی یہ عہد کرنا چاہیئے کہ :-

(۱) وہ خدا اور رسول کی وفاداری کو ہر چیز پر مقدم رکھے گا اور پوری خدا ترسی و ایمانداری کے ساتھ کوشش کرے گا کہ ملک کا انتظام شریعتِ خداوندی کے احکام اور اس کی روح کے مطابق چلایا جائے۔

(۲) وہ اسمبلی کے اندر یا اس کے باہر اپنی پوزیشن سے اپنی ذاتی اغراض یا اپنے خاندان اور احباب کی اغراض، یا کسی خاص طبقے اور گروہ کی اغراض کے لیے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے گا۔

(۳) وہ اپنے حلقۂ انتخاب کے عوام سے قریب تر رہے گا، عام لوگوں کی شکایات و مشکلات اور ضروریات و احساسات سے باخبر رہنے کی کوشش کرے گا، اور اسمبلی کے اندر اور باہر اپنی حد تک پوری کوشش کرے گا کہ آئینِ انصاف کے مطابق بے لاگ طریقے سے عوام کی خدمت کرے۔

(۴) اگر کسی وقت اس کے حلقۂ انتخاب کے عام لوگ اسی پنچایتی نظام کے ذریعے سے اس پر اظہار بے اعتمادی کریں جس کے ذریعے سے آج وہ اس پر اظہارِ اعتماد کر رہے ہیں تو وہ اپنی نشست سے استعفا دیدیگا۔

(۵) وہ اسمبلی کے اندر دھڑے بندیوں، سازشوں اور وزارت کے جوڑ توڑ سے الگ رہے گا اور صاف صاف ایماندارانہ طریقہ سے اس منشور کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گا جو اسے پنچایتوں کی رضامندی سے دیا جا رہا ہے۔

(۶) وہ اسمبلی کے اندر ایک آزاد رکن کی حیثیت سے تنہا نہ رہے گا بلکہ اُن لوگوں کے ساتھ ایک پارٹی میں شامل ہو جائے گا جو اس منشور کو عملی جامہ پہنانے کا عہد کریں۔

نمائندوں کے انفرادی فرائض

ہر ایسے نمائندے کا، جو عوامی پنچایتوں کی طرف سے نامزد ہو اور عوام کے ووٹوں سے اسمبلی کی رکنیت کے لئے منتخب ہو جائے، یہ فرض ہونا چاہیئے کہ :

(۱) وہ پوری پابندی کے ساتھ اسمبلی کے اجلاسوں میں شریک ہو اور اس کی کارروائیوں میں دلچسپی لے۔ شدید مجبوری کے بغیر اسمبلی کے اجلاسوں سے غیر حاضر رہنا اس کے لئے جائز نہیں ہے۔

(۲) وہ اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق آزادی کے ساتھ اظہارِ رائے کرے، جس چیز کو حق اور

...ہلے حق و انصاف رکھے اور اس کی تائید میں آواز اٹھائے، اور جس چیز کو غلط اور خلاف انصاف سمجھتا
...س کی مخالفت کرے۔ حق کو حق جانتے ہوئے اس کی تائید نہ کرنا، اور غلط کو غلط جانتے ہوئے اس
...لے میں خاموش رہنا اُن لوگوں کے ساتھ خیانت ہے جنھوں نے ایک شخص کی دیانت پر بھروسہ کر کے
...انمائندہ نامزد کیا ہے۔

(۳) وہ علم و فن کے مختلف شعبوں سے واقفیت بہم پہنچانے کی کوشش کرے تاکہ وہ اسمبلی میں پیش آنیوالے
...پر زیادہ سے زیادہ علم و بصیرت کے ساتھ رائے دینے کے قابل ہو۔

(۴) وہ اپنے آپ کو صرف انہی لوگوں کا نمائندہ نہ سمجھے جنھوں نے اس کو رائے دی ہو بلکہ اپنے پورے
...اب کی عام آبادی کا نمائندہ سمجھے اور ان کی فلاح کے لئے کام کرے۔ اسے اپنے حلقۂ انتخاب کی مقامی
...ے بندیوں سے الگ رہنا چاہئے اور ایک غیر جانبدار خادم خلق ہونے کی حیثیت سے عام لوگوں
...مدنظر رکھنی چاہئے۔

(۵) وہ اپنے فرائض کو صرف اسمبلی کے کام تک محدود نہ رکھے بلکہ اسمبلی کے باہر بھی اپنے حلقۂ انتخاب
...معلی کی دینی، اخلاقی، معاشرتی اور معاشی حالت درست کرنے کی کوشش کرے۔ وہ عوام کا صحیح
...نہیں ہے اگر عوام کے دکھ درد میں ان کا شریک نہ ہو، اجتماعی مصائب کے موقع پر ان کی خدمت کے لئے
...رہے، اور اجتماعی فلاح و بہبود کے کاموں میں دلچسپی نہ لے۔

...پارٹی کی تشکیل پنچائتی نظام کے تحت منتخب ہونے والے نمائندوں کو اسمبلی میں جا کر ایک اسلامی پارٹی کی صورت میں منظم ہونا چاہئے جس کا عقیدہ، مقصد، اصول اور پالیسی
...فصیل ذیل ہو۔

...عقیدہ اس پارٹی کا عقیدہ یہ ہونا چاہئے:

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے قانون کا ماخذ اور ہدایت کا سرچشمہ خدا
کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہے۔ ہم زندگی کے ہر معاملہ میں بنیادی تصورات اور
...اصول قرآن و سنت کی تعلیمات سے اخذ کریں گے اور عملی تفصیلات اگر دوسرے مآخذ سے

ہیں گے بھی تو اس شرط کے ساتھ کہ وہ قرآن وسنت کی تعلیمات کے خلاف نہ ہوں۔ ہمارے نزدیک ملک میں کسی قانون کو جاری کرنے یا جاری رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یا تو اس قانون کے جواز کا ثبوت قرآن وسنت سے ملتا ہو، یا کم از کم اس کے ناجائز ہونے کا ثبوت نہ ملتا ہو۔ ہم حکومت کے لیئے حدود اللہ کی پابندی کو ضروری سمجھتے ہیں، اور ہمارے نزدیک یہ بات حکومت کے بنیادی فرائض میں سے ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق معاشرے کی اخلاقی، مذہبی، تعلیمی، تمدنی اور معاشی حالت کو درست کرے۔"

مقصد اس پارٹی کا مقصد، جس کے لئے وہ اسمبلی میں کام کرے گی، یہ ہونا چاہیئے:

"صوبے کے قوانین اور نظم ونسق کو، جہاں تک بھی موجودہ دستور کے اندر اس کی گنجائش ہے، اسلامی اصولوں پر ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ حکومت کی انتظامی مشینری کے اندر جو اخلاقی خرابیاں پائی جاتی ہیں ان کو دور کیا جائے۔ حکومت کے ذرائع ووسائل کو اسلامی اصولوں کے مطابق صوبہ کی اخلاقی، مذہبی، معاشرتی اور معاشی حالت کی اصلاح کے لیے استعمال کیا جائے۔ اور جہاں تک ممکن ہو ایسی تدابیر عمل میں لائی جائیں جن سے اس صوبہ ہی میں نہیں، پورے پاکستان میں اسلامی نظام زندگی کے قیام وارتقاء کے لئے زمین ہموار ہو سکے۔"

اصول اس پارٹی کی تشکیل اِن اصولوں پر ہونی چاہیئے:۔

(۱) صوبائی اسمبلی کا ہر وہ رکن اس پارٹی میں شامل ہو سکے جو مذکورہ بالا عقیدے اور مقصد کو قبول کر کے اُس لائحۂ عمل پر کام کرنے کا اقرار کرے جو اس منشور میں دیا گیا ہے، خواہ وہ پنچائتی نظام کے کسی اور طریقے سے منتخب ہو کر آیا ہو۔

(۲) اُس کا پارٹی ڈسپلن اس قاعدے پر مبنی ہو کہ خدا اور رسول کے احکام کی پابندی اور راستی و انصاف میں تعاون کیا جائے مگر کوئی شخص حق اور انصاف کے خلاف کاموں میں اپنی پارٹی کی حمایت کا پابند نہ ہو۔ بلکہ پارٹی کے ہر رکن کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی پارٹی کو حق و انصاف کے خلاف کوئی کام نہ کرنے دے۔

(۳) پارٹی کا داخلی نظم مغربی جمہوریت کے بجائے اسلامی جمہوریت پر مبنی ہوگا۔

اسمبلی کے اندر اس پارٹی کی پالیسی یہ ہونی چاہیئے:۔

(۱) وہ احکام اسلامی کے اجراء اور انصاف کے قیام میں اسمبلی کی تمام دوسری پارٹیوں کے ساتھ تعاون کرے تاہم بُرے امور میں یا نارو الاغراض کی تکمیل میں کسی کی مددگار نہ بنے۔

(۲) اگر وہ اکثریت میں ہو تو وہ اپنی وزارت بنائے گی اور اس صورت میں اس کی پالیسی یہ ہوگی:

(الف) مخالف پارٹیوں کے مقابلے میں اُس ضد اور ہٹ دھرمی اور جماعتی تعصب سے کام نہ لیا جائے جو بالعموم اکثریت رکھنے والی جماعتوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ کھلے دل سے مخالف و موافق سب کی بات سنی جائے، ہر صحیح بات کو قبول کیا جائے اور معقول دلائل کے مقابلے میں کبھی اپنی تجویزوں اور تدبیروں پر بیجا اصرار نہ کیا جائے۔

(ب) حاکمانہ زعم میں پبلک کی تنقیدوں سے بے پروائی نہ برتی جائے۔

(ج) پبلک کی شکایات کی طرف، خواہ وہ اخبارات کے ذریعے سے شائع ہوں یا کسی دوسرے ذریعہ سے پہنچیں، پوری توجہ کی جائے اور ان کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔

(د) حکومت کے کاموں میں پبلک کے اہلِ فکر و نظر اور واقف کار لوگوں کا تعاون حاصل کیا جائے اور ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

(ھ) وزراء بڑی بڑی تنخواہیں لے کر وزارت کے ٹھاٹھ نہ جمائیں اور نہ پبلک سے دور رہیں۔ ان کو اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کے بجائے اپنا معیارِ اخلاق اور معیارِ خدمت بلند کرنا چاہیئے اور عوام سے دور ہونے کے بجائے اور زیادہ قریب ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنی حکومت کے تحت ملک کے حالات سے براہِ راست واقف ہوں اور حالات کی اصلاح کریں۔

(و) پبلک کے روپے اور حکومت کی مشینری کو پارٹی کی اغراض کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ نہ کام

اصولوں کے تحت اپنے تفصیلی ضوابط بنانا پارٹی کا اپنا کام ہے۔

اختیارات سے کسی اور طرح کا ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔

(ز) حکومت کے اختیارات کو مخالف سیاسی پارٹیوں کے خلاف استعمال نہ کیا جائے۔

(ح) مغربی ڈپلومیسی کے طریقے ترک کرکے حکومت کا کام سچائی اور راستبازی کے ساتھ چلایا جائے۔

(ط) ہر قیمت پر وزارت سے چمٹے رہنے کی کوشش نہ کی جائے۔ مرکز اور اس کے گورنر کا آلۂ کار بننے سے قطعی انکار کر دیا جائے۔ اپنے عقیدہ و مقصد کے مطابق اپنے اصلاحی پروگرام کو نافذ کرنے پر اصرار کیا جائے۔ اور اگر اس کا موقع نہ ہو تو وزارت سے استعفا دے دیا جائے۔

(۳) اگر یہ پارٹی اقلیت میں ہو لیکن دوسری پارٹیوں کے ساتھ مشترکہ وزارت بنانے کا امکان ہو صرف اس صورت میں اس امکان سے فائدہ اٹھایا جائے جبکہ

(الف) مشترکہ وزارت میں شریک ہونے والی پارٹیاں اس پارٹی کے عقیدہ و مقصد سے اور اس منشور کے اصلاحی پروگرام یا کم از کم اس کے اصولوں سے متفق ہوں۔

(ب) وہ اُسی پالیسی پر عمل کرنے کا اقرار کریں جو اوپر نمبر ۲ میں بیان کی گئی ہے۔

(۴) اگر اس پارٹی کو اپوزیشن میں رہنا پڑے تو وہ کبھی اختلاف برائے اختلاف نہ کرے بلکہ حق کی موافقت اور باطل کی مخالفت کے اصول پر عامل ہو۔

اصلاحی پروگرام

جن اصلاحات کو نافذ کرنے کی کوشش اس پارٹی کو لازماً کرنی چاہیے، خواہ یہ برسراقتدار ہو یا اپوزیشن میں رہے، وہ حسب ذیل ہیں۔

اصلاح قوانین

(۱) صوبائی سیفٹی ایکٹ کو ختم کرنا اور کسی ایسے قانون کو باقی نہ رہنے دینا جو انتظامی حکام کو کھلی عدالت میں کسی شخص کا جرم ثابت کئے بغیر، اور اس کو صفائی کا موقع دیئے بغیر شخصی آزادی، یا آزادیٔ نقل و حرکت، یا آزادیٔ تقریر و تحریر، یا آزادیٔ اجتماع سے محروم کر دینے کا اختیار دیتا ہو یا انھیں افراد اور گروہوں کی جائز آئینی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے، یا ان کو اپنے ایمان و ضمیر کے خلاف کسی کام پر مجبور کرنے کے اختیارات دیتا ہو۔ نیز ایسے قوانین کو بھی تبدیل کرنا جو حکومت کو وہ حقوق دیتے ہیں جو دراصل ریاست کے حقوق ہیں۔

(۲) پریس کو ان تمام نارو اپابندیوں سے آزاد کرنا جو انگریزی حکومت نے اپنے استبداد کی حفاظت کے لیے عائد کی تھیں۔

(۳) صوبائی اسمبلی کے اختیارات کی حد تک ایسے تمام قوانین میں ترمیم کرنا جن میں کوئی چیز اسلامی شریعت کے خلاف ہو۔

(۴) ۱۹۳۵ء کے موجودہ ترمیم شدہ ایکٹ کی ایسی تمام دستوری رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے دستور ساز اسمبلی پر زور ڈالنا جن کی موجودگی میں شریعت کے منشا کے مطابق اصلاحی قوانین بنانا اور نافذ کرنا مشکل ہے۔

(۵) شرعی قوانین کو عدالتوں میں نفاذ کے قابل بنانے کے لئے ان قوانین کی تدوین و ترتیب اور تعلیم کا انتظام کرنا۔

(۶) شریعت کے منشا اور احکام کے مطابق معاشرے کی اصلاح کے لیے نئے قوانین بنانا۔

اصلاح نظم ونسق

(۱) سرکاری محکموں سے رشوت، خیانت، اور دوسری بداخلاقیوں اور بے ضابطگیوں کو دور کرنے کی تدبیریں اختیار کرنا۔

(۲) تمام ایسے اداروں میں جہاں سرکاری ملازموں کے لیے کارکنوں کی تربیت کی جاتی ہے، اخلاقی تعلیم و تربیت لازم کرنا تاکہ ان سے ایسے افسر تیار ہو کر نکلیں جو صرف قابل ہی نہ ہوں بلکہ خدا ترس، امین اور فرض شناس بھی ہوں۔

(۳) پبلک کے ساتھ سرکاری ملازموں کے رویہ کو درست کرنا۔

(۴) سرکاری ملازموں کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ تنخواہوں کے لئے ایک منصفانہ حد مقرر کرنا۔

(۵) انگریزی دور کے ضوابط ملازمت میں ایسی اصلاحات کرنا جن سے وہ معقول، منصفانہ اور اسلامی اخلاقی تقاضوں کے مطابق ہو جائیں۔

(۶) انگریزی زبان کو سرکاری محکموں سے رخصت کرنا اور اس کی جگہ اردو کے استعمال کو رواج دینا۔ اس سلسلہ میں اسمبلی کی اسلامی پارٹی کا اولین قدم یہ ہوگا کہ وہ خود اسمبلی میں صرف اردو کے استعمال پر اصرار کرے۔

(۷) سرکاری افسروں کے لیے سرکاری ڈیوٹی کے وقت انگریزی لباس کے استعمال کو ممنوع کرنا۔

ایسے تمام آثار کو مٹانا جن کی وجہ سے عوام الناس ابھی تک انگریز کے دور کی ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔

(۸) پولیس کے عام طور طریقوں کو درست کرنا اور خصوصاً تفتیش کے تمام وحشیانہ اور غیر مہذب طریقوں کو بند کر دینا۔

(۹) سی، آئی، ڈی کو سیاسی کارکنوں کے پیچھے لگانے کے بجائے جرائم کی روک تھام، تحقیقات، اور رشوت خور سرکاری ملازموں کی نگرانی میں استعمال کرنا۔

(۱۰) پولیس کے شعبۂ احتساب (PROSECUTION) اور شعبۂ تفتیش (INVESTIGATION) کو عملاً علیحدہ کرنا (جو اب محض برائے نام الگ ہیں)

(۱۱) جیل کے تمام وحشیانہ اور غیر مہذب ضابطوں کو مہذب اسلامی طریقوں کے مطابق بدلنا، اسے دارالعذاب اور جرائم کی تربیت گاہ کے بجائے قیدیوں کی اخلاقی و ذہنی اصلاح کی جگہ بنانا، اور اس میں ایسے طریقے رائج کرنا جن سے مجرمین شریفانہ زندگی کے قابل بن سکیں۔

(۱۲) عدالتی ضوابط کو اسلام کے مطابق بدلنا۔

(۱۳) اسلام کے منشا کے مطابق کورٹ فیس کو بتدریج ختم کر کے انصاف کی بلا معاوضہ بہم رسانی کا انتظام۔

(۱۴) عدالتوں کو انتظامی حکومت کی دخل اندازیوں سے محفوظ کرنا۔

(۱۵) انتظامی حکومت اور اس کے عملے کی ان تمام امتیازی خصوصیات کو ساقط کرنا جن کی وجہ سے انصاف کے معاملے میں عدالتوں کے اختیارات محدود ہوتے ہیں۔

(۱۶) اسلام کے منشا کے مطابق پیشۂ وکالت کی اصلاح۔

اصلاحِ تعلیم

(۱) نظریۂ تعلیم، طریقۂ تعلیم، نصابِ تعلیم، اور درسگاہوں کے ماحول میں ایسی بنیادی تبدیلیاں کرنا کہ اس صوبے کا نظامِ تعلیم ایک طرف پاکستانی معاشرے کے لیے خدا پرست اور نیک سیرت شہری، کارکن اور لیڈر فراہم کرنے کے قابل ہو، اور دوسری طرف پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر بھی ہو۔

(۲) اساتذہ کی ٹریننگ کے موجودہ انتظامات کو جلدی سے جلدی اس طرح درست کرنا کہ وہ مذکورۂ بالا مقصد کے لئے مناسب استاد تیار کر سکیں۔

(۳) صوبے کی موجودہ تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لیے مدارس کی توسیع اور مفت جبری ابتدائی تعلیم
پلےلائنگ کرنے کی طرف بتدریج اقدام۔

(۴) تعلیم بالغان کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی کوشش۔

(۵) مخلوط تعلیم کا قطعی انسداد اور لڑکیوں کے لیے جداگانہ تعلیم کا اطمینان بخش انتظام۔

(۶) اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی کوشش۔ اس غرض کے لیے حیدرآباد میں اب تک جو کام ہو چکا
اس سے پورا فائدہ اٹھایا جائے اور آئندہ مزید کام کے لئے ایک محکمۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا جائے۔

(۷) صوبے کے معیارِ تعلیم کو بلند کرنے کے لیے اس امر کی کوشش کہ زیادہ سے زیادہ قابل لوگ مدرسوں
کالجوں کو حاصل ہو سکیں اور اطمینانِ قلب کے ساتھ تعلیمی خدمات انجام دیں۔

(۸) عربی مدارس کو موجودہ کس مپرسی کی حالت سے نکالنا اور ان کے معیار کو بلند کر کے ہر حیثیت سے
ری درسگاہوں کے برابر لانا نیز اس امر کی کوشش کہ بالآخر دینی و دنیوی تعلیم کے دائرے الگ نہ رہیں بلکہ
یک تعلیمی نظام ہم کو دین و دنیا کے جامع آدمی فراہم کرنے لگے۔

(۹) صوبے کی خاص اور ملک کی عام ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک منصوبے کے مطابق مختلف
م کی فنی (TECHNICAL) تعلیم کا انتظام۔

عی اصلاحات

(۱) زرعی املاک کی تحقیقات اور جدید بندوبست کے لیے اسلامی قانون کے مطابق
ایک ایسا با اختیار بورڈ مقرر کرنا جو اسلامی شریعت کے علما اور محکمۂ مال کے تجربہ کار
ردں پر مشتمل ہو اور حسبِ ذیل اصولوں پر موجود الوقت جاگیروں اور زمینداریوں کی تحقیقات کر کے ان کا
بندوبست کرے:

(الف) تمام ایسی جاگیریں واپس لے لی جائیں جو کسی سابق حکومت نے کسی ناجائز (یعنی پاکستان
کے اسلامی یا قومی مفاد کے خلاف) خدمت کے صلے میں عطا کی ہوں۔

(ب) ایسی جاگیریں بھی واپس لے لی جائیں جو کسی سابق حکومت نے سرکاری املاک میں سے عطا کرنے
کے بجائے لوگوں کی ملکیتیں غصب کر کے جاگیردار کو بخش دی ہوں، یا پرانے مالکوں کو زیردستی جاگیردار

منزا بنا دیا ہو۔

(ج) وہ جاگیریں بھی واپس لی جائیں جو بعض مخصوص خدمات کی انجام دہی کے لیے عطا کی گئی ہوں مگر یا تو وہ خدمات اب انجام نہ دی جا رہی ہوں، یا ان خدمات کی اب ضرورت نہ ہو۔

(د) جن جاگیرداروں کو جائز خدمات کے صلے میں سرکاری املاک واجبی حدود سے زائد مقدار میں دی گئی ہوں، ان سے وہ زائد مقدار واپس لے لی جائے۔ واجبی حدود سے مراد اس قدر رقبۂ اراضی ہے جو کسی علاقے میں ایک خاندان کی متوسط خوشحال زندگی کے لیے کافی ہو)

(۲) ایسی تمام زمینیں بھی واپس لے لی جائیں جو اگرچہ جائز سرکاری عطیہ ہوں مگر تین سال یا زائد مدت سے غیر آباد پڑی ہوں۔

(ر) وہ تمام زمینداریاں بھی منسوخ کر دی جائیں جن پر شرعی نقطۂ نظر سے زمیندار کا حق ملکیت ثابت نہ ہو۔

(س) مذکورۂ بالا طریقوں سے جو زمینیں واپس لی جائیں ان میں سے آباد زمینوں پر انھی لوگوں کو حقوق ملکیت دے دیئے جائیں جو فی الحال انھیں آباد کر رہے ہیں، اور غیر آباد زمینوں کو انصاف کے ساتھ مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

(۲) تمام ایسے چشمہ زاروں، چراگاہوں، اور جنگلات کو پبلک مفاد کے لیے عام کرنا جن کو اسلامی شریعت کی رو سے پبلک مفاد کے لیے عام ہونا چاہیے لیکن ابھی تک وہ کسی کی ملکیت میں ہوں۔

(۳) قابل کاشت افتادہ زمینوں کی آبادکاری کا انتظام، اور ناقابل کاشت زمینوں کی اصلاح کے لئے ایک منصوبے کے مطابق سعی۔

(۴) زرعی املاک پر اسلامی قانون میراث کا فوری اور عملی نفاذ۔ یہ نفاذ صرف آئندہ ہی کے لئے نہ ہونا چاہیے بلکہ جن زندہ مستحقین کے حقوق وراثت پہلے سلب ہو چکے ہیں ان کی حق رسانی بھی ہونی چاہیے۔

(۵) زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ کی تقسیم کا قطعی خاتمہ۔

(۶) مالکان اراضی اور کاشت کاروں کے درمیان انصاف قائم کرنے کے لئے حسب ذیل اصلاحات کا نفاذ:

(الف) کاشتکار کو کم سے کم اتنا قطعۂ زمین اور اتنا حصۂ پیداوار لازماً دیا جائے جو لحاظ اوسط اس کی بنیادی ضروریات کے لئے کفایت کر سکے۔

(ب) پیداوار کے مقررہ حصے یا طے شدہ لگان کے سوا مالکان زمین کو کاشتکاروں سے کوئی ٹیکس، یا کوئی بلامعاوضہ خدمت لینے کا حق نہ ہو۔

(ج) مخصوص قانونی وجوہ کے سوا کسی کاشتکار کو زمین سے بے دخل نہ کیا جاسکے (یہ مخصوص قانونی وجوہ پورے انصاف کے ساتھ ماہرین شریعت اور زرعی معاملات کا تجربہ رکھنے والے افسروں اور وکلاء کی ایک مجلس تجویز کرے، اور اس تجویز میں جہاں تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر مالکان زمین اور کاشتکاروں کے نقطۂ نظر کا جائزہ لے لیا جائے۔

(د) مالکوں اور کاشتکاروں کی باہمی شکایات رفع کرنے کے لئے ان کی مشترک پنچائتیں قائم کی جائیں۔

(ہ) کاشتکاروں کو علم زراعت کی جدید ترقیات سے مستفید ہونے کے مواقع زیادہ سے زیادہ ت کے ساتھ بہم پہنچائے جائیں۔

(۸) امداد باہمی کے اصولوں پر وسیع پیمانے کی کاشت (LARGE SCALE FARMING) کا طریقہ رائج ئے تاکہ لوگوں کے شخصی حقوق بھی محفوظ رہیں اور سائنٹفک ذرائع سے استفادہ بھی ممکن ہو۔

ی اصلاحات

(۱) تمام ایسی صنعتوں کی بحالی جنہیں تقسیم ملک سے نقصان پہنچا ہے۔

(۲) تمام ایسی صنعتوں کے قیام کی کوشش جن کے کاریگر صوبے میں موجود ہیں مگر صنعت کا آغاز کرنے یا اسے قابلِ اطمینان طریقے سے بڑھانے کے قابل نہیں ہیں۔

(۳) ایسی نئی صنعتوں کا اجراء جن کے لئے خام اجناس ملک میں موجود ہیں اور جنہیں کم سرمائے سے شروع کیا جاسکتا ہے۔

(۴) صوبے کی مصنوعات کو غیر ملکی مقابلے سے بچانے کی کوشش۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ حکومت پاکستان خود اپنی ضروریات کے لیے ایسی غیر ملکی اشیاء نہ خریدے جن کا بدل ملک میں بہم پہنچ سکتا ہو۔

(۵) نظام صنعت میں جہاں تک ممکن ہو اجارہ داری (MONOPOLY) کا سدباب۔

(۶) محنت پیشہ لوگوں کو اسلامی اصولِ عدل کے مطابق واجبی حقوق دلوانے، اور اجیر و مستاجر کے درمیان
ان قائم کرنے کے لئے حسبِ ذیل اصلاحات کا نفاذ:

(الف) کم سے کم منصفانہ معاوضے اور اوقاتِ کار کی قانونی حد بندی،

(ب) جائز اور معقول وجوہ کے بغیر اجیر کی برخاستگی کا ممنوع ہونا،

(ج) مضرِ صحت حالات میں اجیروں کو رکھنے اور ان سے کام لینے کی ممانعت،

(د) بیماری اور مشینی حادثات کی صورت میں اجیروں کے علاج کا انتظام،

(ہ) ناقابلِ کار ہو جانے کی صورت میں، نیز بڑھاپے کی صورت میں پنشن کا انتظام،

(و) اجیروں کے بچوں کی تعلیم کا انتظام،

(ز) ۱۲ سال سے کم عمر کے بچوں سے محنت لینے کی ممانعت،

(ح) عورتوں اور مردوں سے یک جا کام لینے کی ممانعت،

(ط) اجیروں اور مستاجروں کی مشترکہ پنچایتوں کا قیام، تاکہ شکایات کا باہمی گفت و شنید سے ازالہ ہو سکے،

(ی) جو معاملات پنچایت میں طے نہ ہو سکیں ان کے تصفیہ کی ذمہ داری حکومت اپنے اوپر لے اور کسی صنعتی ادارے میں ہڑتال یا در بندی کی نوبت نہ آنے دے۔

ارتی اصلاحات

(۱) احتکار اور ناجائز نفع اندوزی کا سختی کے ساتھ استیصال۔

(۲) خرید و فروخت کی اُن تمام شکلوں کو از روئے قانون بند کرنا جو شرعاً ممنوع ہیں۔

(۳) ایسی تمام چیزوں کی صنعت اور تجارت کو بند کرنا جو شریعت کی رو سے ناجائز ہیں۔

(۴) تجارت کو فروغ دینے کی ایسی تمام تدبیروں کو روکنا جو فریب، جھوٹ، اور فحش کی تعریف میں آتی ہوں۔

(۵) جہاں تک صوبائی حکومت کے اختیار میں ہے جائز کاروبار کے فروغ کے لیے تمام ممکن سہولتیں بہم نا اور اُن اسباب کو رفع کرنا جن کی وجہ سے تجارت پیشہ لوگوں کے لئے اپنے کاروبار کو جائز طریقوں ترقی دینا مشکل ہوتا ہے۔

م معاشی اصلاحات

(۱) زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ کی تحصیل کا انتظام۔ اس انتظام میں یہ گنجائش بھی ہے کہ

صدقاتِ نافلہ اور اپنی عام خیرات بھی اگر حکومت کو دینا چاہیں تو دے سکیں۔

(۲) اسلامی اوقاف کی اصلاح و تنظیم، اور ایسے اوقاف کو سرکاری انتظام میں لے لینا جو نااہل ہاتھوں
، یا واقفین کے منشا کے خلاف استعمال کیے جا رہے ہوں، یا جن کی شرائطِ وقف اس کی گنجائش
ا کہ حکومت ان کی تولیت خود اپنے ہاتھ میں لے سکے۔

(۳) مذکورۂ بالا مدات سے جو آمدنیاں حاصل ہوں اُن سے شرعی قواعد کے تحت حسبِ ذیل امور کا انتظام کرنا۔

(الف) معذور اور اپاہج لوگوں کی پرورش، اور ایسے بوڑھے لوگوں کی پنشن جو اور کوئی سہارا نہ رکھتے ہوں۔

(ب) یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت۔

(ج) بے روزگار لوگوں کی اعانت، جب تک کہ وہ کوئی روزگار حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوں۔

(د) ایسے قابلِ کار لوگوں کی اعانت جو کچھ سہارا پا کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہوں۔

(ہ) حاجتمند لوگوں کو قرضِ حسن۔

(و) نادار بیماروں کا معالجہ۔

(ز) غریب لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی میں امداد۔

(ح) غریب طلبہ کے لیے وظائف۔

(ط) مساجد اور معاہدِ دینیہ کی اصلاحِ حال۔

(ی) علمی اور دینی خدمات انجام دینے والوں کی مستقل یا وقتی اعانت۔

(ک) علمی اور دینی اداروں کی امداد۔

(۴) حتی الامکان اصلاحی تدابیر سے اور حسبِ ضرورت قانونی ذرائع سے تعیشات اور اسراف و تبذیر
[illegible]عام۔

ت عامہ | (۱) کم تنخواہ پانے والے ملازمین اور عام غریب طبقوں کے لئے کم کرایہ کے صحت بخش مکانات کی تعمیر۔

(۲) دیہی علاقوں میں سڑکوں کا انتظام، یہاں تک کہ ہر گاؤں کا تعلق اپنے قریب کی کسی شاہراہ سے قائم ہو جائے۔

(۳) پنجاب کو بھارت کی بجلی کا محتاج نہ رہنے دینا۔

(۴) پنجاب کو اس مستقل خطرے سے محفوظ کرنا کہ بھارت کسی وقت اپنی نہروں کا پانی بند کر کے اس کی خوش حالی کا خاتمہ کر دے۔

(۵) صنعتی ترقی کے لئے مزید برقی طاقت کی فراہمی۔

قومی صحت

(۱) کسی باشندے کو محض اس بنا پر علاج سے محروم نہ رہنے دیا جائے کہ وہ معالج کی فیس اور دوا کی قیمت ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس غرض کے لیے حسب ذیل تدابیر عمل میں لائی جائیں:

(الف) ڈاکٹروں اور طبیبوں کی فیسوں پر کنٹرول۔

(ب) دواؤں کی قیمتوں پر کنٹرول۔

(ج) سرکاری شفاخانوں اور دایہ گھروں کی تدریجی توسیع۔

(د) علاج کی سہولتوں کو عام کرنے کے لیے ایلوپیتھی کی طرح یونانی طب اور ہومیوپیتھی کے شفاخانے بھی سرکاری طور پر قائم کرنا (اس غرض کے لئے ضروری ہوگا کہ ان دونوں طریقہائے علاج کو وہی سرکاری سرپرستی حاصل ہو جو اب تک صرف ایلوپیتھی کو حاصل رہی ہے)

(۲) دق، وبائی امراض، اور جنسی امراض کی روک تھام پر خصوصی توجہ۔

(۳) غذا اور دواؤں میں آمیزش کو پوری سختی کے ساتھ بند کرنا۔

(۴) شہروں اور دیہات میں حفظانِ صحت کا اطمینان بخش انتظام۔

(۵) حفظانِ صحت، تیمارداری، وباؤں کی مدافعت، غذائیات، اور فوری طبی امداد (FIRST AID) کے متعلق ضروری معلومات کو مدارس کے نصاب اور تعلیم بالغان کے نصاب میں شامل کرنا، نیز ان معلومات کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے اور عوام میں صفائی کی حس پیدا کرنے کے لئے دوسری ممکن تدابیر اختیار کرنا۔

معاشرے کی اصلاح و تعمیر

(۱) قانون اور انتظام کی تمام طاقتوں اور حکومت کے تمام ذرائع و وسائل سے کام لے کر معاشرے کو ہر قسم کے فواحش اور بداخلاقیوں سے پاک کرنا۔

(۲) اُن تمام اسباب کی روک تھام کرنا جو معاشرے میں اخلاقی مفاسد کی تحریک اور اشاعت کے موجب بنتے ہیں۔

(۳) نظامِ معاشرت کی ان خرابیوں کو دور کرنے کی طرف خاص توجہ کرنا جن کی وجہ سے لوگوں کی اخلاقی و معاشی
نقصان پہنچتا ہے، یا خاندان کے استحکام پر زد پڑتی ہے، یا نکاح میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں یا حقوق و فرائض
توازن میں خرابی واقع ہوتی ہے جو اسلام نے عورتوں اور مردوں کے درمیان قائم کیا ہے۔

(۴) جس حد تک حکومت کے وسائل سے ممکن ہے اخلاقِ عامہ کی اصلاح اور عوام کی ذہنی تربیت
ایسے انتظامات کرنا جن سے لوگوں میں سچی خدا پرستی اور خدا ترسی پیدا ہو، اپنی اخلاقی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا
پیدا ہو، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون اور برائی کے کاموں میں عدم تعاون کی اسپرٹ پیدا ہو، قانون
احترام کا جذبہ اور اجتماعی مفاد کا درد پیدا ہو، اور عوام الناس اس قابل ہو سکیں کہ برائیوں کے انسداد
ن کی ترویج اور اجتماعی فرائض کی ادائیگی کا دار و مدار محض قانونی جبر پر نہ رہے بلکہ لوگوں کی اپنی اخلاقی
کاموں کے لیے کافی ہو۔

(۵) عوام کو تنظیم اور تعاون کی تربیت دینے کے لئے امداد باہمی کے طریقوں اور پنچایتی نظام کی ترویج۔

(۶) مساجد کو تہذیبِ ملت کے مراکز بنانے کے لیے ائمہ و خطبا کی تنظیم، ان کے لئے تربیت گاہوں کا قیام
عزت طریقے سے معاوضے دلوانے کا انتظام، مساجد کے موجودہ نظامِ تولیت کی اصلاح، مساجد میں قرآن
کے درس کا اجرا اور دارالمطالعوں کا قیام۔ (اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر ملحوظ رہنی چاہیے کہ مسجدیں
کے بت کی پرستش گاہوں میں تبدیل نہ ہونے پائیں۔ حکومت مسجدوں کی خادم ہو نہ کہ ان کی حاکم
کے منبروں کی اجارہ دار)

(۷) شہری دفاع کے لیے عوام کو وسیع پیمانے پر تیار کیا جائے اور اس کے لئے حسبِ ذیل تدبیریں
بت کے ساتھ اختیار کی جائیں:

(الف) لوگوں میں جہاد فی سبیل اللہ کی روح پھونکی جائے اور قوم پرستی یا وطن پرستی کے بجائے اس
ملک کی حفاظت کے لیے کٹ مرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے جس کے برحق ہونے پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔

(ب) سرکاری ملازمین اور زیرِ تعلیم طلبہ کو دفاع کی تربیت دینے کا خاص اہتمام۔

(ج) عوام کو ایک مقررہ منصوبہ کے مطابق دفاعی تربیت دینے کا وسیع انتظام تاکہ چند سال کے اندر صوبے کا ہر فرد اسلحہ کے استعمال اور دفاعی تدابیر سے واقف ہو جائے (اس سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ حکومت اپنے شہریوں کو بے اعتمادی کی نگاہ سے دیکھنا چھوڑ دے اور ان پر یہ بھروسہ کرے کہ وہ خود اپنے ملک کے دشمن نہیں ہیں)

(د) اسلحہ کے لائسنس عطا کرنے کے معاملے میں ان بیجا پابندیوں کا خاتمہ جو انگریزی حکومت نے اس ملک کے لوگوں کو نہتا اور بزدل بنانے کے لئے عائد کر رکھی تھیں۔

(ہ) اے، آر، پی اور فرسٹ ایڈ کے تربیتی مراکز میں توسیع۔

(و) عورتوں کو اسلامی پردہ کے حدود میں رہتے ہوئے دفاعی تربیت دینے کا انتظام۔

مالیات

(۱) صوبے کے خزانے کو بتدریج ایسی آمدنیوں سے پاک کیا جائے جو اسلامی شریعت کی رو سے حرام ہیں، یا اسلام کی معاشی پالیسی کے خلاف ہیں۔

(۲) رفاہ عام کے کاموں سے اور ان تجارتی کاموں سے جو سرکاری انتظام میں چلائے جا رہے ہوں، بے جا نفع اندوزی نہ کی جائے۔

(۳) جہاں تک صوبے کی حکومت کے بس میں ہے وہ اپنے حدود و اختیار کے اندر سود کو بند کر دے اور ہمسایہ صوبوں اور مرکزی حکومت پر بھی دباؤ ڈالے کہ وہ اس پالیسی میں پنجاب کے ساتھ تعاون کریں۔ تاہم اگر مرکز اور ہمسایہ صوبوں کا تعاون حاصل نہ ہو تو کچھ نقصان اٹھا کر بھی اس برحق پالیسی کا آغاز کرنے میں تامل نہ کیا جائے۔

(۴) ٹیکس عائد کرنے اور وصول کرنے کے طریقوں میں ایسی اصلاحات کی جائیں کہ ٹیکسوں کا بوجھ انصاف کے ساتھ ہر طبقے پر اس کی استطاعت کے مطابق پڑے اور ٹیکسوں سے بچنے کے لئے معاشرے میں جھوٹ، خیانت، اور جعل و فریب کی بیماریاں نہ پھیلیں۔

(۵) اس منشور میں جو اصلاحی پروگرام تجویز کیا جا رہا ہے اس کے مالی بار کو سہارنے کے لئے حسب ذیل تدابیر پر اعتماد کیا جائے۔

ت) نظم ونسق اور معاشرے کی اخلاقی اصلاح جس سے رشوت، خیانت، غبن، نافرض شناسی اور
ے محاصل سے اجتناب کی بیماریاں دور ہوں۔ اس اصلاح سے لازمًا حکومت کی آمدنی بڑھے گی
مصارف کم ہوں گے۔

) حکومت کے مصارف میں اسراف کی تمام موجودہ صورتوں کا انسداد اور آئندہ کے لیے
ی روک تھام۔

) اصلاح و تعمیر اور ترقی کے اس پروگرام کی اہمیت پبلک کے ذہن نشین کرنا اور اجتماعی مفاد کے
نہ پبلک کی دلچسپی اور ہمدردی کو ابھارنا، نیز کارکنانِ حکومت کی دیانت و امانت کا اعتماد عوام
دلوں میں قائم کرنا۔ اس طریقے سے حکومت کو رضاکارانہ مالی امداد عطیوں اور قرضِ حسن کی شکل
ملنا بآسانی ممکن ہے۔

بدرجۂ آخر مزید ٹیکس عائد کرنا، جسے پبلک ایسی صورت میں بخوشی قبول کر سکتی ہے جب کہ اسے
اصلاحی پروگرام کی افادیت کا بھی یقین ہو اور اس امر کا اطمینان بھی حاصل ہو کہ جو کچھ لوگوں سے لیا
ے گا وہ ایمانداری کے ساتھ اُنھی کے مفاد پر خرچ ہوگا۔

اس مسئلے کی بیشتر پیچیدگیاں مرکزی پالیسی سے تعلق رکھتی ہیں۔ صوبائی حکومت کے دائرۂ اختیار
میں رہتے ہوئے جو کچھ کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیے وہ حسبِ ذیل ہے:

مہاجرین کے مسائل کو حل کرنے میں خود مہاجرین کے معتمد علیہ نمائندوں کے مشورے سے فائدہ
ے۔

جہاں تک ممکن ہو الاٹ منٹ منصفانہ بھی ہوں اور مستقل بھی تاکہ جو شخص جہاں بٹھایا جائے وہاں
یکام کرے۔

جو خاندان منتشر ہو گئے ہیں ان کو یک جا ہونے میں پوری ممکن سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

کرایوں اور ملبے کا بوجھ قابلِ برداشت منصفانہ حد تک گھٹا لا جائے۔

بقایوں کے بقایا وصول کرنے کے لیے مہاجرین کو تنگ نہ کیا جائے۔

(۶) کسی مہاجر کو الاٹ کی ہوئی جگہ سے اس وقت تک بے دخل نہ کیا جائے جب تک کہ ایسا کرنا بالکل ہی ناگزیر نہ ہو، اور ناگزیر ہونے کی صورت میں بے دخلی کا عمل اس وقت تک ہرگز نہ ہو جب تک اسے دوسری جگہ مہیا نہ کر دی جائے۔

(۷) مقامی لوگوں کے ناجائز قبضے سے متروکہ جائدادیں نکالی جائیں اور انھیں انصاف کے ساتھ محروم مہاجرین میں تقسیم کیا جائے۔

(۸) مہاجرین کی زائد آبادی کے لیے مکانات کی تعمیر کا انتظام کیا جائے۔

(۹) جو مہاجرین اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں مگر سہارے کے محتاج ہیں ان کی اعانت کی جائے۔

غیر مسلم اقلیتیں

(۱) اقلیتیں اپنے معاشرے کی اصلاح کے لیے جس قسم کے قوانین منظور کرنا چاہیں ـــــ بشرطیکہ وہ دوسروں کے حقوق پر اثر انداز نہ ہوں ـــــ انھیں پاس کرانے میں ان کی مدد کی جائے۔

(۲) ان کو اپنے مذہبی و تہذیبی معاملات میں حکومت کے وسائل سے جس جائز امداد کی ضرورت ہو وہ کشادہ دلی کے ساتھ دی جائے۔

(۳) ان کے مذہبی و معاشرتی معاملات میں کوئی بے جا مداخلت نہ ہونے دی جائے۔

(۴) انھیں اکثریت کے طرزِ عمل یا حکومت کے نظم و نسق سے جو بھی معقول شکایات ہوں انھیں رفع کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ؂

ـــــ + ـــــ
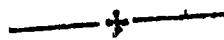
اسلامی مملکت کے بنیادی اصول

جن کو پاکستان کے ہر مکتب خیال اور تمام اسلامی فرقوں کے مشاہیر علماء نے متفقہ طور پر مرتب کیا ہے

[شاید تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمانوں کے تمام بڑے بڑے فرقوں کے اکابر علماء
بالاتفاق وہ اصول مرتب کیے ہیں جن پر قرآن و سنت کے منشا کے مطابق ایک اسلامی ریاست
عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے۔ اس سے پہلے اشخاص اور افراد متفرق طور پر تو بارہا ان مسائل کے متعلق
تحقیقات بیان کرتے رہے ہیں، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ایک مجلس میں بیٹھ کر مختلف عقائد
مسالک کے نمائندہ علماء نے خالص علمی بحث و تحقیق کے بعد اسلامی مملکت کے تصور اور اس کے
بنیادی اصولوں کے متعلق اس قدر واضح اور مستند بیان تیار کیا ہو۔ یہ ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس
اب تک کی اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی اور توقع کی جاسکتی ہے کہ انشاء اللہ ہماری آئندہ تاریخ
تشکیل میں اس کا حصہ نہایت اہم ہوگا۔ اب کسی کے لیے یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ مسلمان جیسی کچھ
حکومت بنا بیٹھیں وہ "اسلامی حکومت" ہے۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام ایک دین کی
حیثیت سے ریاست اور سیاست کے لیے اپنے کچھ مخصوص اصول رکھتا ہی نہیں ہے۔ اب کسی
یہ موقع باقی نہیں رہا ہے کہ اپنے خود ساختہ بنیادی اصولوں اور دستوری خاکوں پر "اسلامی"
کر جعلی نوٹوں کی طرح انہیں بازار میں چلا سکے۔ اب یہ دعویٰ کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ
فرقوں کے مذہبی نزاعات ایک اسلامی حکومت کے قیام میں مانع ہیں۔ اب اس جاہلانہ
مفروضے کو پلنے کا بھی امکان نہیں رہا ہے کہ دور [illegible]

اسلام کے اصول سیاست موزوں نہیں ہیں۔ اب یہ جھوٹ بھی نہیں چل سکتا کہ ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ علماء پاکستان کے مستند اور متفق علیہ بیان نے ان تمام غلط فہمیوں کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ یہ بیان ایک ایسا چارٹر ہے جو خدا کے فضل سے صرف پاکستان ہی کی حکومت کا سنگِ بنیاد ثابت نہ ہوگا بلکہ دوسرے مسلمان ملکوں کے لئے بھی مشعلِ راہ بنے گا۔ جن مسلمان ملکوں میں اس وقت تک لادینی ریاستوں کی نقل اتاری جا رہی ہے، وہ سب انشاء اللہ اس چارٹر سے ہدایت پائیں گے۔

ایک مدت دراز سے اسلامی دستورِ مملکت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلام کا کوئی دستورِ مملکت ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کے اصول کیا ہیں اور اس کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے اور کیا اصول اور عملی تفصیلات میں کوئی چیز بھی ایسی ہے جس پر مختلف اسلامی فرقوں کے علما متفق ہو سکیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق عام طور پر ایک ذہنی پریشانی پائی جاتی ہے اور اس پریشانی میں ان مختلف دستوری تجویزوں نے اور بھی اضافہ کر دیا ہے جو مختلف حلقوں کی طرف سے اسلام کے نام پر وقتاً فوقتاً پیش کی گئیں۔ اس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ تمام اسلامی فرقوں کے چیدہ اور معتمد علیہ علماء کی ایک مجلس منعقد کی جائے اور وہ بالاتفاق صرف اسلامی دستور کے بنیادی اصول ہی بیان کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان اصولوں کے مطابق ایک ایسا دستوری خاکہ بھی مرتب کر دے جو تمام اسلامی فرقوں کے لئے قابل قبول ہو۔

اس غرض کے لئے ایک اجتماع بتاریخ ۱۲-۱۳-۱۴ اور ۱۵-ربیع الثانی سنہ ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۱-۲۲-۲۳ اور ۲۴-جنوری سنہ ۱۹۵۱ء بصدارت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کراچی میں منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں اسلامی دستور کے جو بنیادی اصول بالاتفاق طے ہوئے ہیں انہیں فائدہ عام کے لئے شائع کیا جا رہا ہے۔

مجلس دستور ساز پاکستان کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے بنیادی حقوق اور بنیادی اصولوں کے متعلق جو سفارشات پیش کی ہیں ان کے بارے میں اس اجتماع کی یہ متفقہ رائے ہے کہ یہ سفارشات اسلامی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

اس اجتماع کی خواہش تھی کہ اس موقع پر اسلامی اصولوں کے مطابق ایک تفصیلی خاکہ بھی مرتب کر دیا جائے
س غرض کے لئے مجلس دستور ساز پاکستان کے صدر سے درخواست کی گئی کہ وہ تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ
بشات کا ایک نسخہ اس اجتماع کو مہیا کر دیں تاکہ اگر وہ اسلامی اصولوں کے مطابق درست ہو تو اس
کردی جائے یا اگر اس میں کچھ کمی ہو تو اسے پورا کر دیا جائے اور نئے سرے سے ایک چیز مرتب کرنے
ت صرف نہ کرنی پڑے۔ لیکن صاحبِ موصوف نے بعض وجوہ سے اس درخواست کو قبول نہ فرمایا۔
جتماع مردست ملتوی کیا جاتا ہے اور تمام اسلامی فکر رکھنے والے اصحاب اور اداروں سے درخواست
ہے کہ ان متفقہ اصولوں کی روشنی میں دستورِ اسلامی کے متعلق اپنی اپنی تجاویز ۱۵۔ مارچ ۱۹۵۱ء تک حضرت
احتشام الحق صاحب تھانوی جیکب لائنز کراچی کے پاس بھیج دیں۔ اس کے بعد جلدی ہی یہ اجتماع
منعقد کیا جائے گا اور تمام تجاویز پر غور کر کے ایک تفصیلی خاکہ مرتب کر دیا جائے گا انشاء اللہ العزیز۔

اسلامی مملکت کے بنیادی اصول

اسلامی مملکت کے دستور میں حسبِ ذیل اصول کی تصریح لازمی ہے:۔

۱۔ ـــــــ اصل حاکم، تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔

۲۔ ـــــــ ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا، نہ کوئی
ایسا حکم دیا جا سکے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

تشریحی نوٹ۔ اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب و سنت کے خلاف ہوں تو
اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل
کر دیئے جائیں گے۔

۳۔ ـــــــ مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی
ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

۴۔ ـــــــ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم

کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائرِ اسلام کے احیاء و اعلاء اور مسلّمہ اسلامی فرقوں کے لئے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

۵ ـــــــ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے کی کوشش کرے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیتِ جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی و لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کرکے ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

۶ ـــــــ مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہوگی جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعیٔ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

۷ ـــــــ باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعتِ اسلامیہ نے ان کو عطا کئے ہیں۔ یعنی حدودِ قانون کے اندر تحفظ جان و مال و آبرو، آزادیٔ مذہب و مسلک، آزادیٔ عبادت، آزادیٔ ذات، آزادیٔ اظہارِ رائے، آزادیٔ نقل و حرکت، آزادیٔ اجتماع، آزادیٔ اکتسابِ رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

۸ ـــــــ مذکورۂ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سند جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمیٔ موقع صفائی و فیصلۂ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

۹ ـــــــ مسلّمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کرسکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انہی کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

۱۰ ـــــــ غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدود قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج

ابع کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

۱۱۔۔۔۔۔۔ غیر مسلم باشندگانِ مملکت سے حدودِ شرعیہ کے اندر جو معاہدات کئے گئے ہوں ان
بندی لازمی ہوگی۔ اور جن حقوقِ شہری کا ذکر دفعہ نمبر ۷ میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک
باشندگانِ ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

۱۲۔۔۔۔۔۔ رئیسِ مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدیّن، صلاحیت اور اصابتِ
پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

۱۳۔۔۔۔۔۔ رئیسِ مملکت ہی نظمِ مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی
ی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

۱۴۔۔۔۔۔۔ رئیسِ مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ ارکانِ حکومت
ب نمائندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

۱۵۔۔۔۔۔۔ رئیسِ مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلاً یا جزاً معطل کرکے شوریٰ کے
مت کرنے لگے۔

۱۶۔۔۔۔۔۔ جو جماعت رئیسِ مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرتِ آرا سے اسے
ل کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

۱۷۔۔۔۔۔۔ رئیسِ مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ
الاتر نہ ہوگا۔

۱۸۔۔۔۔۔۔ ارکان و عمالِ حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا
نوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

۱۹۔۔۔۔۔۔ محکمۂ عدلیہ، محکمۂ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام
ی میں ہیئتِ انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

۲۰۔۔۔۔۔۔ ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکتِ اسلامی کے اساسی

اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہو۔

۲۱۔۔۔۔۔۔ ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی، یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی جنھیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا۔ مگر انھیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

۲۲۔۔۔۔۔۔ دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

اسمائے گرامی حضرات شرکائے مجلس

۱۔ (علامہ) سید سلیمان ندوی (صدر مجلس ہذا)

۲۔ (مولانا) سید ابوالاعلیٰ مودودی (امیر جماعت اسلامی پاکستان)

۳۔ (مولانا) شمس الحق افغانی (وزیر معارف۔ ریاست قلات)

۴۔ (مولانا) محمد بدر عالم (استاذ الحدیث۔ دارالعلوم الاسلامیہ۔ اشرف آباد۔ ٹنڈو اللہ یار۔ سندھ)

۵۔ (مولانا) احتشام الحق تھانوی (مہتمم دارالعلوم الاسلامیہ اشرف آباد۔ سندھ)

۶۔ (مولانا) محمد عبدالحامد قادری بدایونی (صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان۔ سندھ)

۷۔ (مفتی) محمد شفیع (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان)

۸۔ (مولانا) محمد ادریس (شیخ الجامعہ۔ جامعہ عباسیہ بہاولپور)

۹۔ (مولانا) خیر محمد (مہتمم مدرسہ خیر المدارس۔ ملتان شہر)

۱۰۔ (مولانا مفتی) محمد حسن (مہتمم مدرسہ اشرفیہ۔ نیلا گنبد۔ لاہور)

۱۱۔ (پیر صاحب) محمد امین الحسنات (مانکی شریف۔ سرحد)

۱۲۔ (مولانا) محمد یوسف بنوری (شیخ التفسیر دارالعلوم الاسلامیہ، اشرف آباد۔ سندھ)

۱۳۔ (حاجی) خادم الاسلام محمد امین خلیفہ حاجی ترنگ زئی (المجاہد آباد۔ پشاور صوبہ سرحد)

۱۴۔(قاضی) عبدالصمد سربازی (قاضی قلات۔ بلوچستان)

۱۵۔(مولانا) اطہر علی (صدر عامل جمعیۃ العلماء اسلام مشرقی پاکستان)

۱۶۔(مولانا) ابوجعفر محمد صالح (امیر جمعیت حزب اللہ مشرقی پاکستان)

۱۷۔(مولانا) راغب احسن (نائب صدر جمعیۃ العلماء اسلام مشرقی پاکستان)

۱۸۔(مولانا) محمد حبیب الرحمٰن (نائب صدر جمعیۃ المدرسین، سرسینہ شریف۔ مشرقی پاکستان)

۱۹۔(مولانا) محمد علی جالندھری (مجلس احرار اسلام پاکستان)

۲۰۔(مولانا) داؤد غزنوی (صدر جمعیۃ اہلحدیث۔ مغربی پاکستان)

۲۱۔(مفتی) جعفر حسین مجتہد (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان)

۲۲۔(مفتی حافظ) کفایت حسین مجتہد (ادارۂ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان، لاہور)

۲۳۔(مولانا) محمد اسمٰعیل (ناظم جمعیت اہل حدیث پاکستان، گوجرانوالہ)

۲۴۔(مولانا) حبیب اللہ (جامعہ دینیہ دار الہدیٰ، ٹھیڑی، خیرپور میرس)

۲۵۔(مولانا) احمد علی (امیر انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ، لاہور)

۲۶۔(مولانا) محمد صادق (مہتمم مدرسہ مظہر العلوم۔ کھڈہ۔ کراچی)

۲۷۔(پروفیسر) عبدالخالق (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان)

۲۸۔(مولانا) شمس الحق فرید پوری (صدر مہتمم مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ)

۲۹۔(مفتی) محمد صاحبداد عفی عنہ (سندھ مدرستہ الاسلام۔ کراچی)

۳۰۔(مولانا) محمد ظفر احمد انصاری (سکرٹری بورڈ آف تعلیمات اسلام مجلس دستور ساز پاکستان)

۳۱۔(پیر صاحب) محمد ہاشم مجددی (ٹنڈو سائیں داد۔ سندھ)

حق اور باطل

نعیم صدیقی

(۲)

دوسرا سوال

دوسرا سوال جو اسلام کے نظامِ صالح کے قلیل مدت تک چلنے کے بارے میں اٹھایا جاتا ہے اور جس کے اندر دراصل یہ استدلال چھپا ہوتا ہے کہ جب ایک نظام اپنے آپ کو زیادہ دیر تک زندہ رکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا تو آخر اس کے لئے بیش بہا قربانیاں کیوں دی جائیں اور اس کے بجائے کیوں نہ کسی دوسرے نظام کو اختیار کر لیا جائے ——— اپنے جواب میں متعدد ضروری تصریحات چاہتا ہے۔ ہم ان تصریحات کو نمبروار درج کرتے ہیں :-

اول :-

اگر کسی اصول یا نظام کو قبول کرنے اور اسے عملاً برپا کرنے کی جدوجہد میں شریک ہونے کے لئے شرطِ اول یہ ہوتی کہ اس کا ماضی میں دیر تک چلنا ثابت کر دیا جائے تو شاید نہ دنیا جمہوریت کو کوئی کارکن ملتا اور نہ دنیا اشتراکیت کو۔ ان دونوں نظاموں میں سے کسی ایک کو بھی ماضی کی تاریخ میں قدم جمانے کا موقع نہیں ملا، لیکن ان کے علمبرداروں نے اپنے لئے صرف یہ بات کافی سمجھی کہ ان کا عقلی اطمینان ہو جائے۔ جب ان کے دلوں نے یہ گواہی دی کہ یہ اصول و نظام برحق ہے اور افادیت اسی میں ہے تو پھر اصول و نظام کے لئے بازی لگا دی۔ وہ احمق ہوتے، اگر عقلی اطمینان کے بعد اور دل کے ٹھک جانے کے بعد پھر یہ سوچنے بیٹھ جاتے کہ جب پہلے ہزاروں انسانی نسلیں گزر گئیں اور کسی کو اس اصول و نظام کو قائم کرنے کی ہمت نہ ہوئی تو آج ہم یہ حرکت کس امید پر کرنے لگے ہیں؟

ان دونوں رائج الوقت نظاموں کے بخلاف اسلامی نظام کے علمبرداروں کے لئے تو عملی تحریک کا

ان موجود ہے۔ وہ اپنے لئے عقلی اطمینان کے پورے وجوہ بھی اسلام میں پاتے ہیں، اور پھر وہ تاریخ سے یہ ثبوت
پاتے ہیں کہ یہ نظام پہلے بھی قائم رہا ہے اور اپنی معیاری شکل میں تیس سال تک ماضی قریب میں چل چکا ہے،
ب کہ وسائلِ تمدن موجودہ دور سے بہت کم تھے۔

تعجب ہے کہ جن نظاموں کا کوئی ماضی نہ تھا انھیں جب کارکن مل گئے تو وہ نہ صرف قائم ہوئے بلکہ
اری دنیا پر ان کے اثرات پھیل گئے، لیکن جس نظام کا ایک مضبوط ماضی موجود ہے اس کے کارکن تذبذب میں
مبتلا رہیں۔

دوم :-

یہ سمجھنا کہ اسلام دنیا میں صرف ایک ، بار برپا ہوا اور وہ بھی تیس سال کے لئے، قرآن اور تاریخ سے ناواقفیت
، دلیل ہے۔ سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے اپنی ذریت کے اندر اسلامی نظام کو قائم کیا، پھر یوسف علیہ السلام
، ذریعے یہ مصر میں قائم ہوا اور دیر تک اس کے اثرات قائم رہے، پھر سلیمان علیہ السلام نے اسے برپا کیا اور
ا مدت تک اسے بڑی وسعتوں کے ساتھ چلایا ـــــــ اور نہ معلوم تاریخ کے مختلف ادوار میں اور کون کون
انبیاء و صلحا کس کس خطے میں ایسے گزرے ہوں گے جنھوں نے اسی نظام کو بار بار برپا کیا ہوگا (قرآن میں صرف
، اقوام کے انبیاء اور ان ملکوں کی دینی تاریخ کا تذکرہ ہے جس سے عرب براہِ راست متعارف تھے) پھر آخری نبی
صلعم کے ذریعے یہی نظامِ حق اپنی معیاری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اس پر نہ معلوم لوگ کیسے کہہ دیتے ہیں کہ
لامی نظام دنیا میں صرف تیس سال چل کے ختم ہوگیا۔ اسلامی نظام تو بار بار اپنے آپ کو دہراتا چلا آرہا ہے!

بخلاف اس کے کوئی غیر اسلامی نظام ایسا نہیں جو مٹ مٹ کر پھر قائم ہوا ہو۔

سوم :-

صرف تیس سال" کا دہ مفہوم بھی غلط ہے جو معترض حضرات لیتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ
لی عنہ کی شہادت کے ساتھ اسلامی نظام بھی بالکل شہید ہوگیا اور اس کی پوری عمارت پیوندِ زمین ہوگئی۔ حالانکہ
یں، اصل صورتِ حالات جو کچھ تھی وہ یہ تھی کہ پورے اسلامی نظام میں سے ایک "اصولِ انتخاب" ساقط کر دیا
گیا باقی سب کچھ جوں کا توں رہا۔ قانون وہی تھا، اقامتِ عبادات کا نظم وہی تھا، جہاد فی سبیل اللہ کا

...رہے، معاشرتی نظم وہی رہا، عوامی اخلاق کی حالت ویسی ہی تھی، نظام تعلیم اسی طرح تھا۔ بلاشبہ میدان
...کو جب ہم سامنے رکھتے ہیں تو اصولاً ہم یہی رائے قائم کرتے ہیں کہ نظام بدل گیا، لیکن یہ تبدیلی کلی نہ تھی بلکہ
...نے اس قلعے میں گھسنے کا ایک چور دروازہ بنا لیا تھا۔ یہ تبدیلی بہت ہی تدریجی طریق سے واقع ہوئی۔ ایک
...رت میں سے آہستہ آہستہ ایک ایک اینٹ بدلی جاتی رہی اور بہت دیر کے بعد جا کر اس عمارت کا بیشتر
...متغیر ہوا۔

اصل میں سارا بگاڑ شاہی محل اور دربارِ خلافت کے اندر بپا ہوا لیکن عوامی زندگی بہ حیثیت مجموعی اسی
...ح نقشے پر استوار رہی جیسے دورِ سعادت میں جما دیا گیا تھا۔ یہ حالت سات آٹھ سو سال تک جاری رہی۔
...ل آخری دو چار صدیاں ایسی تھیں جب کہ عوام میں اخلاقی انحطاط پھیلا، معیشت و معاشرت میں مفاسد
... اور سوسائٹی اسلامی بنیادوں سے اکھڑنے لگی، اور انھی صدیوں میں امت کا سفینہ زوال کی موجوں کا
...ر ہوا۔ جب تک نظامِ حق کی اصل قدریں زندگی میں غالب رہیں مسلمان ترقی کرتے گئے، اگرچہ ان کے سلاطین
...بگڑتے چلے جا رہے تھے، لیکن جب نظامِ حق کی قدریں کمزور پڑ گئیں تو پھر زوال غالب آ گیا۔

یہ اسی تیس سال کے معیاری دور کا کرشمہ تھا کہ اس کی پیدا کردہ اخلاقی قوت ملتِ اسلامیہ کو کئی صدیوں تک
...کی راہ پر دوڑاتی چلی گئی اور تاریخ میں سے ان کو ایک لمبا دورِ اقبال عطا کیا گیا۔ اس تیس سال کی پیدا کردہ
...ت جب گھٹنے لگی اور اس کی کمی کو پورا کرنے کا کوئی اہتمام نہ کیا گیا تو مسلمانوں کے تمدن کی گاڑی پہلے سست
...ر ہوئی، پھر دھیمی ہوتے ہوتے بالکل رک گئی۔

اس ہزار سال کے دور کو لوگ جب "صرف تیس سال" کے الفاظ میں سمیٹ کر سامنے لاتے ہیں تو
...ف آدمی کو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

چہارم :-

اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس کے علمبرداروں نے نبی صلعم کی قیادت میں جب اسے بہ حیثیت نظام کے
...کر دیا، تو چاہے وہ بقول معترضین صرف تیس سال چلا ہو ـــــ بہرحال اپنی پوری معیاری شان کے
...چلا۔ نبی صلعم اور آپ کے صحابہ اور مسلمان عوام سب کے سب اس بات پر پوری طرح مطمئن تھے کہ جو کام

[illegible] سے کما حقہٗ انجام دے دیا اور اس کو نہ کوئی معذرت کرنی پڑی، نہ کوئی حسرت لے کر وہ رخصت ہوئے۔ [illegible] جیسی زندگی مطلوب تھی، اسے عملاً سو فی صدی معیار پر قائم کر کے دکھا دیا۔

لیکن آج جن نظاموں سے مرعوب ہو کر لوگ "صرف تیس سال" کا سوال اٹھاتے ہیں، انہوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ یہ جمہوریت اور یہ اشتراکیت تو اپنے معیارِ مطلوب کے مطابق اب تک زمین کے اوپر ایک لمحے کے لئے بھی قائم نہیں ہو سکیں۔

جمہوریت کے تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ معیاری جمہوریت ابھی تک کتابی اصولوں میں تو پائی جاتی ہے سطحِ ارض پر نافذ نہیں ہو سکی ہے۔ برنارڈ شا کے الفاظ میں ابھی بمشکل یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت کے لئے تیار کرنے کا وقت آیا ہے (POCKET HISTORY OF THE WORLD) ہینڈرک وان لون اپنی تاریخِ عالم کے آخر میں کیا خوب کہتا ہے کہ "لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ ابھی ہم درجنوں غلط پگڈنڈیوں کو اختیار کریں گے، تب کہیں جا کر شاید [illegible] سمتِ سفر پا سکیں۔"

مارکسزم کے متعلق بھی یہ بالکل واضح ہے۔ اس کے مومنین خود کہتے ہیں کہ ابھی ہم ایک عبوری دور (TRANSITIONAL PERIOD) میں سے گزر رہے ہیں۔ معیاری حالت جو ان کے پیشِ نظر ہے اس میں پہنچنے کے بعد ایک تو ریاست کا وجود ختم ہو جائے گا جسے آج ایک ناگزیر برائی (NECESSARY EVIL) کی حیثیت سے اختیار کیا گیا ہے، اور دوسری تبدیلی یہ آئے گی کہ ہر شخص صرف اپنی قوت و صلاحیت کے مطابق کام کرے گا اور اپنی ضروریات کے مطابق بدلہ پائے گا۔ اس معیاری حالت اور آج کی حالت کے درمیان نہ معلوم کتنی صدیوں کا وقفہ حائل ہے۔ اصل سرخ جنت مستقبل کے بہت ہی بعید گوشوں میں مستور ہے۔

پس جن نظاموں سے آج ہمیں سابقہ ہے، ان میں سے کوئی بھی اپنی معیاری شکل میں ابھی ایک منٹ کے لئے بھی برپا نہیں ہوا بلکہ ان کے علمبردار ابھی ادھ کچرے نظام لئے چل رہے ہیں۔ بخلاف اُن کے اسلام اگر اپنے کارکنوں کو ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے لئے بلاتا ہے تو انہیں ماضی میں اپنے پیش کردہ نظام کو تیس سال تک معیاری شکل میں چلتا ہوا دکھاتا ہے۔ کونسا دوسرا نظام ایسا ہے جو تیس سال نہ سہی، صرف ایک ہی سال کے لئے اپنے آپ کو سو فی صدی عملاً تاریخِ انسانی میں دکھا دے۔

پانچم ۱

دُنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی نظام ایسا نہیں ہے جو ایک مرتبہ مٹ جائے تو اس کے احیاء کا جذبہ قائم رہے، یا اس میں اصولی تبدیلیاں پیدا کر دی جائیں تو ان تبدیلیوں کے خلاف جدوجہد کر کے بنیادی اصولوں کو دوبارہ تازہ کرنے کی فکر کی جائے۔

جن ملکوں میں پاپائیت تھی، وہ جب مٹ گئی تو کوئی نہ تھا جو اس کے احیاء کا خواہشمند ہو۔ جاگیردارانہ نظام جہاں جہاں شاہ ہاں پھر اس کی تجدید کرنے کے لئے کبھی کوئی تحریک نہ اٹھی۔ سرمایہ داری مٹتی ہے تو کوئی اس کے تنِ مردہ میں دوبارہ جان ڈالنے کے لئے کوشش نہیں کرتا، بلکہ غیر اسلامی نظاموں کے علمبردار اپنے ماضی کو کراہیت سے دیکھتے ہیں اور اپنی سابق کارگزاریوں کے لئے معذرتیں پیش کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے اسلامی نظام کے علمبرداروں کے لئے ان کا ماضی قابلِ فخر اور زندگی بخش رہا ہے اور وہ اسی ماضی کے احیاء کو مستقبل کی فلاح و بہبود کے لئے ہمیشہ پسند کرتے رہے ہیں۔ دورِ حق "تیس سال" تک محدود سہی لیکن بہرحال وہ ایسا مقدس دور ہے کہ اس میں کسی کو کوئی شرمناک چیز نہیں ملتی، اس دور کے کسی واقعہ پر معذرت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، اور ہم اس دور کے واقعات کو نہ تو "سبق آموز غلطیاں" قرار دیتے ہیں، نہ ان غلطیوں سے نکل نکلنے کا نام ترقی رکھتے ہیں۔

جمہوری ممالک میں نظام زندگی متغیر ہے، لیکن لوگ اسے ترقی قرار دیتے ہیں اور پچھلے طریقوں کو نادانی کے تجربات سمجھتے ہیں۔ "حاضر" کو بدلنے کی سعی تو ہوتی ہے لیکن "سابق" کے احیاء کے لئے جدوجہد کرنے کی رجعت پسندانہ حرکت کوئی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح خود کمیونزم کے نظام میں اس سے بہت بڑی تبدیلیاں واقع ہوتی چلی آ رہی ہیں جیسی تبدیلی اسلامی نظام میں امیر معاویہ کے دور میں واقع ہوئی تھی۔ بلا تشبیہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ لینن اور ٹراٹسکی کا اختلاف اُس اختلاف سے کم زوردار نہ تھا جو اسلامی تاریخ میں امیر معاویہ کے طرزِ عمل سے امام حسین کو ہوا تھا جس طرح ہمارے ہاں تاریخ کی رو امام حسین کو شہید کرتی ہوئی آگے نکل گئی، اسی طرح روس میں اشتراکی تاریخ کی موجوں نے ٹراٹسکی کو اٹھا کے ایک خزف ریزے کی طرح پرے پھینک دیا۔ وہاں بھی نظام میں اصولی تغیر آیا تھا، اور یہاں بھی آیا، لیکن دونوں طرف ایک جیسے واقعات کے نتائج

جو مؤثر ثابت ہوا اس کو غلط کہتے ہیں لیکن روسی تاریخ نے جو ... ہیں۔ واقعہ کربلا کے ظہور پر ہماری تاریخ نے جو مؤثر تھا ہم اس کو غلط کہتے ہیں لیکن روسی تاریخ نے جو
... تھا اس تاریخ کے بنانے والے اُس کو ترقی کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ ورنہ اگر اصل واقعات کو دیکھا جائے
... لین جس نظام کو قائم کرنے چلا تھا اسے قائم کرتے ہوئے اسے متعدد اصولوں کو بدلنا پڑا، اور پھر اسٹالین
... اسے اور مسخ کر دیا۔ لینن نے کولکس کی بغاوت کا سامنا کرتے ہوئے ایک نئی زرعی پالیسی اختیار کی، پھر
... نیشنلزم سے نیشنلزم کی طرف ساری پالیسی کو پسپا ہونا پڑا، پھر مذہب دشمنی میں نرمی پیدا کرنی پڑی، پھر انفرادی
... کے بارے میں ابتدائی اصولوں میں خاصی تحریف کی گئی، پھر مغربی امپیریلزم کے جواب میں امپیریلزم کے کٹر
... ن جن کے اٹھنے والوں کو خود امپیریلزم کا علم اٹھانا پڑا۔ یہ ساری "بدعات" واقع ہوئیں لیکن یہ ترقی کی شاہراہ
... لئے سنگِ میل قرار پائیں۔

بخلاف اس کے اسلام کے معیاری نظام میں اس طرح کی جو تبدیلیاں کی گئیں، ان کے خلاف مسلمانوں میں
... ت نمودار ہوتی رہی، علماء ان کے خلاف ذہنوں کو تیار کرتے رہے، اُن پر بندگانِ حق نے احتجاج کرنے کا حق
... ہا، اور جہاں کسی اصلاح پسند کو موقع ملا، اس نے اصل معیاری نظام کے اصولوں کو از سرِ نو برپا کرنے کی
... و جہد کی۔ ایسی جدوجہد کی بہت سی مثالیں علمی و فکری تاریخ میں بھی موجود ہیں اور سیاسی تاریخ میں بھی۔
... اری نظام کے احیاء کی کامیاب ترین مثال حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں ملتی ہے، لیکن آپ کے علاوہ
... نسے ایسے اکابر کے کارنامے بھی ناقابلِ فراموش ہیں جو اگر کُل کے کُل نظام کا احیاء نہ کر سکے تو کم سے کم
... کے جن اجزا کی تجدید کرنا ان کے بس میں تھا، ان کو انھوں نے دوبارہ قائم کیا۔ تجدید و احیاء کی یہ اسپرٹ ملتِ
... میہ میں بدستور کام کر رہی ہے اور اسی اسپرٹ کے زندہ ہونے کی وجہ سے ہم نظامِ اسلامی کی قدروں سے وابستہ
... اداروں کو زندگی میں عملاً کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں۔

ششم:-

ایک پاکباز سوسائٹی، ایک صالح نظامِ حکومت اور ایک بااخلاق تہذیب و معاشرت اگرچہ چند روز کے
... لئے صفحۂ ہستی پر جلوہ افروز ہو تو وہ اپنے مٹ جانے سے پہلے انسانی تاریخ پر گہرا اثر ڈال جاتی ہے۔ کیا
... [illegible] کہ آج اگر پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو ——— اور بالفرض وہ تیس ہی سال

[illegible] ہو جاتا ہے ــــ تو بس وہ ایک حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گی اور تاریخِ انسانی اور [illegible] کے قومی، ذہنی و اخلاق پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے گا؟ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو پھر آپ تمدنِ انسانی کے نوامیس سے قطع نظر کر کے سوچتے ہیں۔ دن چاہے کتنا ہی چھوٹا ہو جائے، اور چھوٹے سے چھوٹے دن کو آفتاب کے سامنے کتنے ہی لکہ ہائے ابر چھائے رہیں، لیکن سورج کے طلوع کے چند فطری اثرات جمادات، نباتات اور حیوانات پر لازماً پڑتے ہیں، یہاں تک کہ بعد میں لمبی رات کی تاریکی اور ٹھنڈک بھی اگر آ کے مسلط ہوتی ہے تو بھی وہ دنیا سے سورج کے طبعی اثرات کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ بالکل اسی طرح نظامِ حق کا ظہور چاہے کتنے ہی قلیل وقت کے لئے ہو، اور بعض وجوہ سے چاہے وہ ناقص ہی کیوں نہ رہ جائے، پھر بھی اس کے اثرات انسانی زندگی پر پڑتے ہیں ــــ اور ان اثرات کو بعد میں تسلطِ باطل بھی پوری طرح ملیامیٹ نہیں کر سکتا۔

آپ نیکی اور حق کے اجتماعی نظام کو الگ رکھ کر حق اور نیکی کے سپاہیوں کے انفرادی کارناموں پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ فرزندانِ انسانیت کے اچھے کارنامے ہی وہ نور ہیں جن سے ہمارا ایوانِ تاریخ روشن ہے۔ انھی کارناموں کے چراغ جلا کر ہم عظیم الشان مہموں کو سر کرنے کے لئے نکلتے ہیں، انھی کارناموں سے ہمارے ادبیات کی رگوں میں گرم گرم جذبات کا خون رواں دواں ہے، انھی کارناموں سے ہمارے افکار غذا حاصل کرتے ہیں، انھی سے ہماری انقلابی تحریکیں سرگرمی اخذ کرتی ہیں اور انھی سے ہم آج بھی خیر کا سبق لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے زرّیں کارناموں کو سامنے رکھئے اور سوچئے کہ کیا ان بہی خواہانِ انسانیت کی خدماتِ حق نسیاً منسیا ہو گئی ہیں اور تاریخ پر ان کا کوئی نقش باقی نہیں ہے؟ ــــ ایسا نہیں ہے۔ حق اور نیکی کی راہ میں جینا تو جینا ہے، اس راہ میں مرنا عالمِ انسانی کے لئے ہزار در ہزار زندگیاں پیشکش کرتا ہے۔ جس پاکیزہ مقصد کے لئے ایک مرتبہ کوئی انسانی جان بھینٹ چڑھتی ہے، اس کی قیمت پہلے سے بڑھ جاتی ہے، اور اس کے فداکاری دکھلانے والے عشاق پہلے سے زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ میدان میں آنے لگتے ہیں۔ ایک وقت میں نیکی کے لئے قربانی کا جو بیج بویا جاتا ہے، وہ پھر بار بار پھوٹتا رہتا ہے۔ ہر انسانی ایثار جو حق کے لئے خاص ہو، ایک ایسا قُقنس ہوتا ہے جو بار بار اپنی راکھ سے پیدا ہوتا رہتا ہے اور اپنے نغمۂ آتشیں سے فضا کو گرم کرتا رہتا ہے۔

جب انفرادی کارناموں کا اثر اتنا دور رس ہو تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نظامِ حق کے ظہور کا اثر کہاں تک پہنچا
چنانچہ عرب میں جو اسلامی نظامِ تہذیب و سیاست برپا ہوا تھا، اس نے اپنے حلقۂ اثر میں آنے والوں پر بعض
فکری و ثقافتی اثرات ڈالے ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ آج تک کسی نہ کسی درجے میں برقرار ہیں۔ دوسری طرف اس نے
مخالفین تک کے تہذیب و تمدن کا رخ بدل کے رکھ دیا۔ جن لوگوں کو علم و تحقیق سے کچھ بھی دلچسپی ہے وہ جانتے
مغرب میں نشأۃ ثانیہ (RENAISSANCE.) کا ظہور جس نے فکری آزادی کے دور کا یورپ میں افتتاح
براہِ راست اسلام کے اثرات کا ردِ عمل تھا۔ اسی طرح مغربی اقوام کو فکری اور طبعی علوم کے خزانوں کی ساری
ں انہی عربوں سے ہاتھ آئیں جو اسلام کے علمبردار تھے۔ پھر مغرب کی سیاسی فکر کے ارتقا پر اور اس کے تاریخی
ظر پر اگر آپ گہری نگاہ ڈالیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ موجودہ جمہوری نظامِ سیاست بھی ملتِ
یہ کی مخصوص فکر کا ایک بالواسطہ نتیجہ ہے۔ افلاطون کی نظری جمہوریت درحقیقت مغربی جمہوریت کو ظہور
نے کی محرک نہیں ہوئی بلکہ جمہوریت کی عملی روح یورپ نے عربوں سے لی اور اسے مادہ پرستی کے قالب
ر برسرِ عمل کیا۔ یہ اخوت اور مساوات اور عدل وغیرہ کے جو تصورات موجودہ دور میں ابھر رہے ہیں، یہ
اسلام ہی کے فکری عطیات کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ اسی طرح مغربی فلسفہ جو بدقسمتی سے خدا پرستی
ئے الحاد کی راہ پر چل نکلا اس کے اندر اسلامی فلسفے کے بے شمار اثرات گندھے ہوئے ہوئے ہیں، اور
افکار سے ترکیب پا کر وہ اتنے مسخ ہو گئے ہیں کہ ان کو پہچاننے میں دقت ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس قانون
الاقوامی مسائل میں جدید دنیا نے اسلام سے بہت کچھ مستعار لیا ہے۔ یہی حال ادبیات کا ہے۔
اگر اسلامی نظام تیس سال کے لئے برپا نہ ہوا ہوتا تو پھر اس کے یہ سارے نتائج کہاں سے آتے؟ —
یا کا نقشہ دوسرا ہوتا۔ فلسفہ، سیاست، قانون، بین الاقوامیات اور مختلف علوم و ادبیات کا طرزِ نشوونما
دہ ہوتا۔

پس محض "تیس سال" کہہ کر نظامِ حق کی قدر و قیمت گرا کر دکھانے کی جو کوشش کی جاتی ہے، وہ نہایت
کوشش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظامِ حق اگر ایک دن کے لئے بھی برپا ہو سکے ——— اور پورا نہیں،
ا ہی کا برپا ہو سکے تو بھی آئندہ چند صدیوں کے لئے دنیا کے علم پر، دنیا کی سیاست پر، دنیا کے معاملات

جنہیں کے قانون پر ایسے مفید اثرات چھوڑ جائے گا کہ ان اثرات کے پیشِ نظر اسے ایک دن کے لئے برپا کرنے میں اگر ہزاروں جانیں صرف ہو جائیں تو بھی سودا مہنگا نہیں۔ انسانیت کے لئے بجائے خود یہ چیز بہت بڑے درجہ احسان ہے کہ اس کے سامنے زندگی کا ایک معیاری نقشہ عملاً پیش کر دیا جائے اور اگر یہ نقشہ زیادہ دیر کے لئے قائم نہ رکھا جا سکے تو اس کی ایک جھلک دکھا دینا بھی انتہائی خیر کا وسیلہ ہو سکتا ہے۔ آج آپ دیکھتے ہیں کہ ادب میں خیالی نقشے (UTOPIA) پیش کر کر کے انسان کو فکری و اخلاقی ارتقا کے لئے مصنوعی طور پر تحریک دلائی جاتی ہے، لیکن اگر خیالی نقشوں کو پیش کرنے کے بجائے ایسا ہو کہ ایک واقعی منظر ساری دنیا کو دکھایا جا سکے تو وہ ارتقا کی تحریک دلانے میں کتنا مؤثر ہو سکتا ہے۔

وہ نظامِ حق جس کی تحقیر کرنے کے لئے بعض اصحاب کہتے ہیں کہ "صرف تیس سال چلا تھا"، کبھی انہوں نے ٹھنڈے دل سے اس کی نوعیت اور اس کے معیار پر بھی غور کیا ہے؟ اس نظام نے ہر لحاظ سے جو حیرت انگیز معجزے دکھائے ہیں، کیا کبھی اس کا مذاق اڑانے والوں نے ان معجزوں کی لامثالیت کا بھی اندازہ کیا؟

یہ ایسا نظام تھا:۔

جو ایک غیر خونی انقلاب کے ذریعے برپا ہوا۔ پورے عرب میں اس کے قیام کے لئے چند ہزار سے زیادہ جانیں صرف نہیں ہوئیں۔

جو سی، آئی، ڈی قانونی تحکم، تشدد اور سازش کاریوں کے بغیر چلا ہے۔

جس نے بے شمار انسانوں کی زندگیوں کا پورا نقشہ یکسر پلٹ کے دکھا دیا، ان کو جاہل سے عالم بلکہ معلم، ان کو بے اخلاق سے با اخلاق بلکہ نگرانِ اخلاق، ان کو فتنہ انگیزوں سے امن پسند بلکہ نگہبانِ امن، اور ان کو بے نظم سے منظم بلکہ ماہرینِ تنظیم بنا دیا۔

جس کے تحت جرائم کا اوسط اتنا کم رہا ہے کہ آج کی مہذب کہلانے والی اقوام میں سے کوئی اپنے جرائم کی تعداد اتنی گھٹا نہیں سکی۔

جس کی عدالتوں میں گنتی کے مقدمات پیش ہوئے۔

جس کے حکمرانوں کا معیارِ زندگی ہر لحاظ سے عوام کے برابر رہا۔

جس کے علمبرداروں نے قلتِ تعداد اور بے سروسامانی میں بھی بڑی سے بڑی طاقتوں سے ٹکر لے کر ان کا
زور توڑ کر رکھ دیا۔

جس کی فوجوں نے میدانِ جنگ میں شریفانہ اخلاق کا مظاہرہ کیا اور اپنے دشمنوں پر بھی احسانات کئے۔

جس نے عوام کی فلاح و بہبود کا پورا پورا حق ادا کیا۔

جس نے اپنے اصولوں کے بارے میں کبھی سودا بازی (COMPROMISE) کی روش اختیار نہیں کی۔

جس نے جماعت کی فکری وحدت کو ایسی مستحکم بنیادوں پر اٹھایا کہ نہ کوئی عصبیت اسے توڑ سکی نہ سیاسی
تفرقہ نمودار ہوا۔

جس کے خلاف نیچے سے کوئی ردِ عمل (RE-ACTIONARY) انقلابی تحریک نہیں بپا ہوئی۔

جس میں روزمرہ کی زندگی اعلیٰ انسانی اخلاق کے مظاہر سے لبریز تھی، اور گھٹیا اخلاق کے نمونے ناپید تھے۔

یہ معیاری نظام جس کی کوئی مثال کسی غیر اسلامی فکر کے علمبرداروں کی طرف سے آج تک سامنے نہیں آسکی
سال تک چلا تو آخر اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔ نوعِ انسانی کے سامنے زندگی کا ایک معیاری نمونہ اتنی
رکھا گیا کہ وہ اسے ہر پہلو سے خوب اچھی طرح دیکھ لے، اور پھر اس کی نقل اتارنے کے لئے جدوجہد
رہے۔ بجائے اس کے کہ کوئی خیالی نقشہ (UTOPIA) ہمارے سامنے ہو، آج ماضی ایک "امرِ واقعہ" کو ہمارے
لئے کھڑا ہے اور ہم ایک روشن مستقبل کی تعمیر اسے سامنے رکھ کے کر سکتے ہیں۔

بالفرض اگر دوبارہ یہی صورت پیش آئے کہ اس طرح کا صالح نظام صرف تیس ہی سال کے لئے رونما ہو
سے فائدہ یہ ہوگا کہ انسانیت کی فلاح کی منزل آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں تازہ ہو جائے گی۔ ایک لمبی رات
اگر ایک چھوٹا دن بھی دنیا کو نصیب ہو جائے تو آفتابِ حق کے طلوع کی برکات دن گزر جانے کے
برابر محسوس کی جا سکیں گی۔

نقطۂ نظر ان تصریحات کو ایک طرف رکھ کر خوب سوچئے کہ کسی اصول و نظام کے قبول یا رد کرنے کے
بارے میں ایک سلیم الطبع آدمی کا طرزِ فکر کیا ہونا چاہیئے!

آپ منافی کے اصول کو ہر لحاظ سے پرکھ کر حق پاتے ہیں، لیکن فرض کیجئے کہ آپ ایک ایسے ماحول میں

ہیں جو متعفن گندہ ماحول ہے۔ آپ کی سوسائٹی کا ہر شخص گندگی پھیلانے میں سرگرم ہے اور سوسائٹی ایک نظامِ غلاظت چلا رہی ہے۔ فرض کیجئے آپ اپنے ماحول کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں اور اس سے آپ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ماحول پر آج سے پچاس سال پہلے صرف ایک ہفتہ ایسا آیا تھا جبکہ یہاں ہر طرف صفائی ستھرائی تھی، ہوا میں تعفن نہ تھا، کریہہ مناظر نہ تھے، بیماریاں نہ تھیں، بلکہ پاکیزگی کا دور دورہ تھا، لیکن یہ حالت تھوڑے دنوں رہ کر ختم ہو گئی اور پھر کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ یا آپ کو تاریخ میں ایک دن بھی ایسا نہیں ملتا۔ اب آپ کا رویہ کیا ہوگا؟

کیا محض اس وجہ سے کہ سابق تاریخ میں صفائی کا دور بڑا مختصر سا گزرا تھا، یا سرے سے کوئی دور ایسا آیا ہی نہ تھا، اور چونکہ آج تمام لوگ غلاظت پسند ہیں اور بظاہر پائیداری نظامِ غلاظت ہی میں محسوس ہوتی ہے، آپ اپنے بارے میں یہ فیصلہ کریں گے کہ آپ کو بھی غلاظت پسند اور نظامِ غلاظت کا سچا خادم بن جانا چاہیئے؟ ——— نہیں اگر آپ کے اندر خودی زندہ ہوگی تو آپ یوں سوچیں گے کہ غلاظت بہرحال انسانیت کے لئے غلط اور مضر ہے اور صفائی کا اصول و نظام اس کے لئے برحق اور مفید ہے، اس لئے میرا فرض یہ ہے کہ نظامِ غلاظت کے خلاف لڑنے اور اصولِ صفائی کو عملاً قائم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دوں۔ آپ اصول پسندوں کی طرح سوچیں گے کہ اصولِ صفائی کے تحت گزرنے والا ایک ہی دن اگر پوری زندگی کی جدوجہد کے معاوضے میں حاصل ہو تو بھی یہ غلاظت کے نظام کے تحت سو سال جینے سے زیادہ قیمتی ہوگا۔ بلکہ آپ یہ عزم لے کے اٹھیں گے کہ صفائی کا نظام قائم کرنے کے لئے غلاظت سے لڑتے ہوئے اگر ساری زندگی ختم ہو جائے ——— اور عملاً اس مہم میں ایک منٹ کے لئے بھی کامیابی حاصل نہ ہو تو بھی با اصول آدمی کا طرزِ عمل یہی ہو سکتا ہے۔ اور جو لوگ اس ایمان اور اس طرزِ فکر کے ساتھ اٹھتے ہیں، بازی انھی کے ہاتھ رہتی ہے۔

بالکل اسی طرح اسلام کے اصول اور نظام کو معقول طریق سے جانچئے، اس کے برحق ہونے پر غور کیجئے، اس کے افادی نتائج کا اندازہ کیجئے، پھر اگر آپ کو یہ یقین ہو جائے کہ یہی اصول و نظام حق ہے، یہی مطابقِ فطرت ہے، یہی مفیدِ انسانیت ہے تو اس کے بعد آپ کا طرزِ عمل اس کے سوا کچھ اور رہنا ہی نہ چاہیئے کہ آپ اپنی پوری زندگی اس اصول و نظام کو برپا کرنے کے لئے صرف کر دیں۔ اگر آپ کی کوششوں سے اسلام دوبارہ تیس ہی سال چلے گا تو بھی اس تیس سال کے عرصے میں وہ خیر و برکت کے اتنے تحائف دنیا کو دے کر رخصت ہوگا کہ

ں میں بگاڑ کے دوبارہ آنے میں ایک لمبی مدت صرف ہوگی۔

یہ جو ضرب المثل ہے کہ لومڑی کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی زیادہ اچھی ہوتی ہے اس کو
ر آپ یوں بدل لیں تو اچھا ہو کہ نظام حق کے تحت ایک دن جینا، نظام باطل کے تحت ہزار سال جینے سے
یادہ بہتر ہے۔ بلکہ آپ اس سے بھی آگے بڑھیں اور یہ نظریہ سامنے رکھیں کہ غیر اسلامی نظام کے تحت امن چین
ے پڑے رہنے سے وہ موت اچھی جو اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد میں نصیب ہو!

مسئلہ ملکیتِ زمین

- زمین کی شخصی ملکیت از روئے قرآن
- زمین کی شخصی ملکیت از روئے حدیث
- مزارعت کا مسئلہ
- اصلاح کے حدود اور طریقے

سید ابو الاعلیٰ مودودی

قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ
مکتبہ جماعت اسلامی
اچھرہ، لاہور (پاکستان)

انفرادی ملکیت اسلام میں

نعیم صدیقی

(۳)

اس مضمون کی پہلی قسط کے شائع ہونے کے بعد ایک مقامی روزنامے میں کسی "عالم دین" نے میرے دلائل سے تعرض کیا اور خلافتِ راشدہ کے دور سے دو ایک نظیریں صاحب موصوف نے ایسی پیش فرمائی ہیں جن سے بظاہر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حکومت تقسیم اراضی اور زرعی املاک کو سلب کرنے کے غیر محدود اختیارات رکھتی تھی اور اس کا عمل قومی ملکیت کے اصول پر مبنی تھا۔ حالانکہ یہ نظیریں یا تو حکومت کے عطایا (جو اراضی موات اور اراضی خالصہ ہی سے دیئے جاتے ہیں) سے تعلق رکھتی ہیں، یا پھر چشمہ زاروں، جنگلات اور چراگاہوں سے، اور ان کے بارے میں شریعتِ اسلامیہ میں بہت ہی واضح قسم کے مخصوص قوانین موجود ہیں جن کو عام زمینوں پر پھیلانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں تحقیق کر کے ضروری مواد بہم پہنچایا اور ایک نئی بحث مرتب بھی کر لی۔ لیکن چونکہ مضمون کی آخری قسط کی کتابت بھی اس دوران میں مکمل ہو چکی تھی، لہذا اس بحث کو شامل نہ کیا جا سکا۔ اب انشاء اللہ جب یہ مضمون کتابی صورت میں شائع ہوگا تو یہ بحث بھی اس میں بڑھا دی جائے گی۔

املاک میں خلافت راشدہ کے بعض خاص تصرفات

"قومی ملکیت" کو اسلام ثابت کرنے کے لئے خلافتِ راشدہ سے چند ایسے خاص نوعیت کے "نظائر" تحریر و تقریر میں بیان کئے جاتے ہیں جن کی اصل حیثیت کو

نہ بیان کرنے والے سمجھتے ہیں، نہ ان کے سامنے سر دھننے والے! وہ خود بھی مغالطے میں مبتلا رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی غلط فہمیوں میں مبتلا کرتے ہیں۔

ان خاص نظائر میں سے چند اہم ترین مثالیں یہ ہیں:۔

اوّل: عیاض بن غنم (عاملِ مصر) کے متعلق حضرت عمرؓ کو شکایت پہنچی کہ وہ لباسِ فاخرہ پہنتے ہیں اور دروازے پر دربان رکھتے ہیں، چنانچہ ان کو پکڑ بلوایا گیا اور سخت تنبیہ کی گئی تاآنکہ وہ معافی مانگ کر منصب پر بحال کئے گئے۔

دوم: حضرت ابو موسیٰ اشعری کے متعلق شکایات موصول ہوئیں کہ ان کی ایک لونڈی کو وہ غذا ملتی ہے جو عام مسلمانوں کو نصیب نہیں، تو ثبوتِ الزام پر لونڈی ان سے الگ کرا دی گئی۔

سوم: کوفہ میں سعد بن ابی وقاص نے اپنے لئے ایک عالی شان محل بنوایا جس کے آگے ڈیوڑھی تھی چنانچہ تحقیقات کے بعد محمد بن مسلم کو حکومت نے مامور کیا کہ وہ اس ڈیوڑھی کو آگ لگا دیں۔

چہارم: حضرت خالد بن ولید نے رومیوں کو فتح کر کے بہت سا مالِ غنیمت پایا تو اس میں سے اشعث بن قیس (شاعر) کو دس ہزار روپیہ انعام دیا۔ حضرت عمرؓ نے معاملے کی تحقیق کے بعد خالدؓ کے ذاتی مال میں سے یہ روپیہ ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دیا۔

ان واقعات کو تاریخ کے اوراق میں پاکر مارکسیت کے علمبرداروں کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور فرطِ مسرت میں وہ ان کی خاص نوعیت کا جائزہ بھی نہیں لے پاتے بلکہ فوراً زبان و قلم سے یہ طوفان اٹھا دیتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ میں انفرادی ملک کو قومی مفاد پر قربان کرنے کا طریقہ عام طور پر رائج رہا ہے۔

یہ سب کچھ سطحی معلومات کا کرشمہ ہے!

یہ سارے واقعاتی نظائر دراصل اسلامی حکومت کے افسروں اور ملازموں سے متعلق ہیں۔ ان افسروں اور ملازموں کے معاملات کو اسلامی حکومت کے "ضابطۂ خدماتِ عامہ" (PUBLIC SERVICE CODE) اور قواعدِ ملازمت (SERVICE CONDUCT RULES) کے تحت دیکھا جاتا تھا۔ ان ضوابط و قواعد کی رو سے اسلامی حکومت کے افسروں اور ملازمین کی پوری زندگی (سرکاری اور نجی) پر نگرانی قائم رکھی جاتی تھی اور ان کا محاسبہ کیا جاتا تھا

[illegible] سے متعلقہ ہدایات ان کو پورا کرتے ہیں یا نہیں؟

ان ضوابط و قواعد کی رو سے خلافتِ راشدہ کا ہر سرکاری کارکن اس بات کا پابند تھا کہ وہ سادہ زندگی بسر کرے گا، شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے مظاہرے سے پرہیز رکھے گا، عام لوگوں سے ربط رکھے گا اور ان کو شکایات و مطالبات پیش کرنے کے لئے پوری سہولتیں دے گا، نیز نہ ریاست کے اموال کو بے جا طور پر صرف کرے گا اور نہ ذاتی اموال سے سوسائٹی میں ایسے نمونے قائم کرے گا جن سے پوری پبلک میں مفاسد پھیل سکتے ہوں۔

مندرجہ بالا واقعات میں سے ہر ایک ایسا تھا کہ اس قسم کی حدود و شرائط میں سے کوئی نہ کوئی ٹوٹتی تھی، جسی کو قائم کرنے کے لئے متعلقہ کارکنوں کے خلاف ضابطے کی کارروائی کی گئی۔

یہ واقعات اگر عام شہریوں کے متعلق ہوتے اور کسی عدالتی قانون اور عدالتی کارروائی یا کم سے کم انتظامیہ (EXECUTIVE) کی طرف سے ان کی املاک میں تصرفات کئے گئے ہوتے تو پھر معاملہ قابلِ غور تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ حکومت کے افسران اور ملازمین پر جو خاص پابندیاں عائد تھیں (اور دُنیا کی ہر حکومت اپنے کارکنوں پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے) ان سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ شہریوں کے عام بنیادی حقوق تک میں قطع و برید کی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے الٹے سیدھے استدلال کر کے جو لوگ اپنی اسلامیت کا رعب گانٹھنا چاہتے ہیں، حقیقتِ حال پر نگاہ ڈالتے ہی ان کی جہالت کا سارا راز فاش ہو جاتا ہے۔

ایسے ہی کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز (جن کی حکومت خلافتِ راشدہ ہی کا ضمیمہ قرار پاتی ہے) شاہی خاندان کے افراد اور دوسرے درباریوں اور امراء سے بھی آخر جاگیریں سلب کی ہی تھیں، حالانکہ وہ ان کی ملک بنا دی گئی تھیں، تو پھر اسی طرح آج کوئی حاکمِ عادل اٹھے اور وہ لوگوں کے املاک کو ان کے قبضے سے لے لے تو ایسا کرنا ناجائز کیوں ہونے لگا؟

یہاں پھر ایک نظیر کی نوعیت سمجھے بغیر فتویٰ دیا جا رہا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دراصل جو اصلاحی مہم شروع کی تھی وہ اموالِ مغصوبہ کی واپسی کی مہم تھی۔ آپ ایک طرف بیت المال کو وہ املاک (زمینیں، ساز و سامان، نقدی، جواہرات وغیرہ) واپس دلوائیں جو ناجائز سند کے لئے، ناجائز مقداروں میں ناجائز طریقوں سے دی اور دلوائی گئی تھیں، اور دوسری طرف عام شہریوں

(مسلمانوں اور ذمیوں دونوں) کو ان کی املاک (زمینیں، سامان و سامان وغیرہ) ان لوگوں کے قبضے سے نکال کر واپس کرائیں جن کو سابق حکومت نے جبراً سلب کر کے بہم پہنچائی تھیں۔

یہ دو مختلف قسم کے اموال تھے۔ ایک حکومت کے املاک جو ناجائز طور پر کسی کے شخصی قبضے میں دیئے گئے تھے اور دوسرے شہریوں کے املاک جو حکومت نے دوسرے شہریوں کو جبراً دلوا دیئے تھے۔ یہ سب کے سب بیت المال میں داخل کر کے قومی ملکیت نہیں بنا دیئے گئے تھے، بلکہ جو جس چیز کا حقدار تھا وہ اسی کو دلوائی گئی تھی۔ پھر یہ ساری اصلاحی مہم باضابطہ آئینی کارروائی کر کے سرانجام دی گئی تھی اور ایک ایک معاملے پر الگ الگ غور کیا گیا تھا۔

اس نظریئے سے تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر ایک حکومت نے پبلک خزانے کے املاک کو ناجائز طور پر افراد کے حوالے کر دیا ہو، یا بعض افراد سے چھین کر کوئی مال بعض افراد کو بلا کسی قانونی حق کے دلوا دیا ہو تو بعد کی صالح حکومت کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر معاملے کی تحقیق کر کے حقداروں کو ان کا حق پہنچا دے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلا کہ افراد سے جو کچھ چاہو چھین کر اسے قومی ملکیت کے باڑے میں داخل کر دو!

یہ ہیں وہ نظائر جن سے عام طور پر ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن اس کی حقیقت پر ذرا سا غور کرتے ہی اس استدلال کی غلطی کھل جاتی ہے جس پر قومی ملکیت کے "اسلامی" فلسفے کا دارومدار ہے!

سرمایہ داری اور اسلام کے نظام ملکیت میں فرق

جب ہر طرف سے قومی ملکیت کے مسلم مبلغوں کو دلائل گھیر کر یہاں لے آتے ہیں کہ اسلام میں انفرادی ملکیت کا حق شہریوں کے بنیادی حقوق میں داخل ہے اور یہاں نہ قومی ملکیت کے اصول کی ضرورت ہے، نہ اس کی جگہ ہے، تو پھر طنز پر بات ختم کر دی جاتی ہے کہ اگر بات یہی ہے تو اسلام اور سرمایہ داری میں فرق کیا رہا!

یہ درست ہے کہ انفرادی ملکیت کا اصول اسلام میں بھی پایا جاتا ہے اور سرمایہ داری میں بھی، لیکن کیا اتنی سی بات سے دونوں ایک ہو جائیں گے؟ اگر ایسا ہے تو کمیونزم بھی "اصولی ریاست" کا داعی ہے اور اسلام بھی! پھر کیا اسلام اور کمیونزم ایک ہو جائیں گے؟ بکری کا بھی معدہ ہوتا ہے اور اونٹ کا بھی معدہ ہوتا ہے

[illegible] سمجھا جائے گا ؟ ہرن کے بھی سینگ ہوتے ہیں اور بیل گائے کے بھی، تو کیا اتنی سی بات دونوں کو ایک [illegible]
ادے گی ؟ کچھ سوچئے کہ آپ حضرات کی منطق کی چولیں کہیں سے ڈھیلی تو نہیں ہیں !

آئیے، اب آپ کی خدمت میں تجزیہ کر کے واضح کیا جاتا ہے کہ اسلام کے نظامِ ملکیت اور سرمایہ دارانہ نظامِ ملکیت کو کونسی چیزیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں۔

(۱) املاک کے حصول، تقسیم، اور ان کے استعمال کے بارے میں اسلام کے چند بنیادی اصول (FUNDAMENTALS) اور چند قانونی حدود (LIMITATION) کتاب وسنت کی رو سے ہر ملک اور زمانے کے لئے واجب القبول ہیں اور ان کو بدلنے یا برطرف کرنے کا حق دستور و قانون کے لحاظ سے کسی کو حاصل نہیں ہے یہ بنیادی اصول و حدود دراصل ان بے شمار مفاسد کا دروازہ بند کرنے کے لئے ہیں جنہیں اگر کھلا چھوڑا جائے تو پھر انفرادی ملکیت کا نظام انسانیت کے لئے عذاب بن جاتا ہے۔

مثلاً سود اور سٹے اور قمار کی حرمت، معصیت کو کمائی کا ذریعہ بنانے یا معصیت کے راستوں میں خرچ کرنے کی حرمت۔ یا صدقاتِ واجبہ کی ادائی اور ایک خاص نظم سے وراثت کی تقسیم وغیرہ کا لازم ہونا ! ——— وغیرہ۔

بخلاف اس کے سرمایہ دارانہ نظام میں آمد و صرف اور تبادلہ و تقسیم کے لئے کوئی اٹل اصول و قواعد نہیں ہیں کہ ہر حال میں ان کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا بہاؤ کسی ایک متعین رودگاہ میں نہیں ہوتا بلکہ وہ افراط و تفریط کے مظاہرے کرتا ہوا بڑھتا ہے۔ اس کے خداوند آج ایک حد کو قائم کرتے ہیں تو کل اسے خود ہی توڑنے کا فیصلہ کر دیتے ہیں، اور کل جسے توڑا تھا اسے آج پھر بحال کرنے کا اہتمام کرتے نظر آتے ہیں۔

(۲) اسلام کے سارے ضابطۂ ملکیت میں اس سرے سے اس سرے تک افراد اور معاشرہ کے اخلاقی ارتقا کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اور اصول و حدود محض معاشی فائدوں اور نقصانوں کا جائزہ لے کر نہیں مقرر کئے گئے، بلکہ اس سے زیادہ انسانیت کے اخلاقی نفع و نقصان کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

مثلاً سود بعض معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے میں خاصا مفید معلوم ہوتا ہے، اور اس کے بعض [illegible]

مگر پیشِ نظر سرمایہ دارانہ نظام نے سے قبول کیا ہے اور اس کو اصول بنا کر اس پر بینکنگ کا لمبا چوڑا نظام تعمیر کر ڈالا ہے جسے دیکھ کر آج مسلمان علماء کی آنکھیں بھی مرعوب ہو جاتی ہیں لیکن اسلام نے سود کے معاشی مفاد کے ساتھ اس کے معاشی نقصانات کو بھی دیکھا ہے، اور ان سے بھی بڑھ کر اس کے اخلاقی مفاسد کا لحاظ کیا ہے۔ اسی طرح شراب کی حرمت معاشی لحاظ سے نہیں، اخلاقی نقطۂ نظر سے عائد کی گئی ہے، حالانکہ معاشی لحاظ سے شراب بنا کر غیر ملکوں کے ہاتھ بیچنا بہت نفع دے سکتا ہے۔

اسلام کے اس مزاج کے پیشِ نظر ایک صحیح اسلامی حکومت اپنی مختلف حیثیتوں کے ساتھ معاشیات میں اپنی قانون سازی اور اپنی پالیسی بنانے کی سرگرمیوں میں مجبور ہے کہ صرف معاشی فائدے ہی کو نہ دیکھے، اس سے زیادہ اہمیت کے ساتھ عوام کے اخلاقی صلاح و فساد کا لحاظ کرے۔ اگر ایک طریقے سے مالی فائدہ ہو لیکن اخلاقی نقصان بھی ساتھ آتا ہو تو وہ اسے چھوڑ دے گی اور دوسرے طریقے سے اگر وہ دیکھے گی کہ یک مالی فائدہ ہاتھ سے جاتا ہے لیکن ملت کو عظیم الشان اخلاقی فوائد حاصل ہوتے ہیں تو وہ اخلاقی فوائد کی زیادہ مائل ہو گی۔

ایسے نظام میں جس میں انفرادیت ملکیت ایسی قانونی اور انتظامی تدابیر کے ساتھ قائم کی گئی ہو جو اس کے اخلاقی روح کو بیدار رکھیں اور معاشرت میں اسے مفاسد پیدا کرنے کا موقع نہ دیں، سرمایہ داری سے بالکل نئی نوعیت کا ہو گا۔

سرمایہ دارانہ ریاست میں تو انفرادی ملکیت کے نظام کو ایسے قانون اور ایسی پالیسی کے ذریعے قائم رکھا ہے جس میں انسانیت کی اخلاقی فلاح کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ قابلِ لحاظ صرف مفاد، مالی ترقی، ذرائع پیداوار کی افزائش وغیرہ قسم کے مقاصد ہوتے ہیں۔ اخلاق صرف وہی قبول کیا ہے اور اسی حد تک جس کا یہ مقاصد تقاضا کریں، ورنہ تعمیرِ اخلاق کی بجائے خود کوئی مقصدی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

اب جب "انفرادی ملکیت" کو ایک غیر اخلاقی فضا مل جاتی ہے تو وہ خوب پاؤں پھیلاتی ہے اسے کوئی سنجیدگی کسی طرح بڑھنے سے نہیں روکتا، اسے کسی

پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اصل مفسدانہ مادہ پرستانہ فضا کی وجہ سے ہوتا ہے نہ کہ انفرادی ملکیت کی وجہ سے ——
لہٰذا اسلام میں اس طرح کی فضا قابلِ برداشت نہیں ہے۔ اس فضا کو بھی اگر انفرادی ملکیت کے ساتھ اسلام میں
اٹھا لیا جائے تو پھر وہ بھی یقیناً سرمایہ داری بن جائے گا۔

سرمایہ دارانہ نظام ایسی خدا پرستانہ ذہنیت اور خدمت پسند سیرت انسانوں کے اندر تعمیر کرنے کی بھاری ذمے داری اپنے سر نہیں لیتا جو ان کو جانور اور درندے بننے سے بچائے۔ اس قسم کا کوئی پروگرام اس کے پاس نہیں ہے، بلکہ اپنی اس کوتاہی پر شرمندہ ہونے کے بجائے اس نے ارتقا کا وہ فلسفہ قبول کیا ہے جو طاقت کو حق قرار دے کر اور اخلاق کا محور فائدے کو مقرر کر کے انتہائی فاسد ذہنیتیں اور سیرتیں بہم پہنچا رہا ہے۔

دوسری طرف اسلام حکومت پر واجب ٹھیراتا ہے کہ وہ خدا کی بندگی اور آخرت کی جواب دہی کے عقائد گہرے سے گہرا نقش عوام میں بٹھائے، ان کو اخلاق پرور عبادات کا پابند بنائے، ان میں بھلائیوں میں تعاون اور برائیوں کی مدافعت کا جذبہ ابھارے، ان میں اخوت اور مساوات کی حس بیدار کرے، ان میں اہلِ صالح جماعتی نظم کو ترقی پذیر بنائے، ان میں باہمی تعاون کی روح پھونکے، ان میں پوری نوعِ انسانی کو حق کی تعلیم دینے، مفاسد سے بچانے، اور مظالم سے نجات دلانے کو ایک اعلیٰ نصب العین بنا کر ساری قوتیں اس پر صرف کرنے کا جذبہ ابھارے۔

اس طرح سے تیار کی ہوئی سوسائٹی میں انفرادی ملکیت جب پرورش پاتی ہے تو وہ بالکل دوسری ہی قسم کے برگ و بار لاتی ہے۔ پھر اس میں پھل پھول تو لگتے ہیں کانٹے نہیں نکلتے۔

(۳) سرمایہ دارانہ نظام میں انفرادی ملکیت کے تحت مادہ پرستانہ ذہنیتیں جب طبقاتی کشمکش کی بنا ڈالتی ہیں تو ریاست اس کشمکش میں بڑی حد تک غیر جانبدار رہتی ہے اور اسے روکنے یا صحیح راستے پر ڈالنے اور کسی نتیجہ خیز
پہنچانے کے لئے کوئی پارٹ ادا نہیں کرتی۔ ظالم و مظلوم میں تعاون پیدا کرنے کی کوئی تدابیر اس کے پاس نہیں ہوتیں۔ وہ اگر اس کشمکش میں مداخلت کرتی بھی ہے تو سرمایہ دار طبقہ کے سیاسی تسلط کی وجہ سے ہمیشہ اپنا وزن ظالم عناصر کے پلڑے میں ڈالتی ہے، اور مظلوموں کا کوئی حق وہ اسی وقت مانتی ہے جب اسے یہ محسوس ہو جائے کہ اس کے سوا چارۂ کار کوئی اور ہے ہی نہیں۔

بخلاف اس کے اسلام کے نظام میں اول تو انفرادی ملکیت طبقاتی کشمکش برپا کرنے کے لئے کبھی سازگار
نہیں پا سکتی، اور اگر ایسا ہو جائے تو حکومت کی پوری کوشش یہ ہوگی کہ وہ کشمکش کر تعاون سے بدلے اس
کہ جہاں غیر جانبدار تماشائی بن کر بیٹھے رہنا ایسی حالت میں ممکن نہیں ہو سکتا، یہ بھی ناقابل تصور ہے کہ وہ
ظالم طبقے کے پلڑے میں ڈالے۔ جیسا کہ خلفائے راشدین نے اپنے خطبات خلافت میں اسلامی ریاست
کی توضیح کرتے ہوئے اعلانات کئے تھے اور ان پر عمل کر کے دکھایا تھا۔

(۴) سرمایہ دارانہ نظام میں انفرادی ملکیت کے کھل کھیلنے کی وجہ سے جب مسابقت میں کمزور افراد ہار کر
تے ہیں تو حکومت کی ذمہ داری ان کو اٹھا کر سنبھال کر، ہمت بندھا کر ذرائع مہیا کر کے پھر سے دوڑ لگانے
بنانے کے بارے میں اصولاً کچھ نہیں ہوتی۔ کوئی اگر بے روزگاری میں گھر گیا ہے، کوئی محنت کا معاوضہ
تا ہے، کسی سے ... [illegible] بیوی علاج سے محروم ہے، کسی کا بچہ تعلیم حاصل کرنے کے
ہیں ہے تو حکومت اس قسم کے حالات پر اس وقت تک متوجہ نہیں ہوتی جب تک وہ یہ نہ محسوس
کہ ان حالات سے اس کی آمدنی میں فرق آ رہا ہے، یا اس کے لئے لا اینڈ آرڈر کو بحال رکھنا مشکل ہو چلا
بین الاقوامی طور پر اس کی رسوائی ہو رہی ہے! اصولاً وہ ان حالات کے بارے میں کوئی ذمہ داری نہیں رکھتی۔
بخلاف اس کے اسلامی حکومت اپنے شہریوں کے بنیادی حقوق ہی میں اس بات کی ضمانت دیتی ہے
ان کو کسی حال میں بے سہارا نہ رہنے دے گی۔ وہ اگر بے روزگاری یا فاقہ کشی میں مبتلا ہوں گے تو چاہے
منظم احتجاج نہ کر سکیں اور کوئی جلوس نکال کر شور و غوغا نہ مچا سکیں، اور چاہے وہ نہایت ہی قلیل
ہوں اور ان کی کوئی آواز نہ ہو، تو بھی وہ ان کی بنیادی ضروریات بہم پہنچانے اور ان کو اپنے پاؤں
کرنے کے لئے انتظام کرے گی۔

اس مقصد کے لئے اس کا ایک انتظام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ گرتوں کو سہارا دینے کی عام اسپرٹ شہریوں
پیدا کرتی اور اسے نشوونما دیتی، اور ... کے لئے ان کی تنظیموں، اداروں اور اوقات کی سرپرستی کرتی
دوسری طرف وہ خود اپنے بیت المال اور خود اپنے سرکاری اداروں کی مشینری کو بھی اس مقصد
کا استعمال کرتی ہے۔

ہا نظام سرمایہ داری میں نہیں ہوتا۔

مثلاً آج ـــــ نظام سرمایہ داری کی مادہ پرستانہ ذہنیت کے ساتھ ـــــ جب ایک سرمایہ دار

پیداآوری کے لئے ایک مشین خریدتا ہے تو اس سے بالکل بے پروا ہوتا ہے کہ خود اس کے اپنے ہاں کے کتنے

دور بے کار ہو جائیں گے یا شہر اور ملک کے دوسرے کتنے مزدوروں پر اثر پڑے گا۔ لیکن ایک صحیح اسلامی نظام

یا اسلامی معاشرہ میں صاحب سرمایہ لوگ اس ناپاک ذہنیت کے مالک نہ ہوں گے کہ دوسرے ہزار لاکھ آدمی

اہ ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں، ہمیں تو اپنے فائدے سے غرض ہے۔ پھر سر پر ایک حکومت اس طرز کی ذہنیت

ساتھ نگراں ہوگی جس کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے (بیان طبری کا ہے) کرائے کے گھوڑوں کا ایک بڑا اصطبل

قائم کرنے والے ایک کاروباری کو اس شرط پر اس کی اجازت دی تھی کہ ان گھوڑوں کے لئے چارہ مدینہ کی

حدود سے باہر سے آئے گا تاکہ یہاں کے مویشیوں کے لئے چارے کی قیمتیں نہ بڑھنے پائیں۔ وہ حکومت

مشینی دور کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے ہر تبدیلی پر نظر رکھے گی کہ یہ کہاں کہاں اثر ڈالتی ہے اور کتنے آدمیوں کو اپنی

لپیٹ میں لیتی ہے۔ پھر وہ ان کو بے روزگاری ـــــ اور مشین کے مقابلے ـــــ کے خطرے سے بچانے

کے لئے کوآپریٹو سسٹم کے تحت ایسی اسکیمیں اختیار کرے گی جن میں اس کے تربیت دیئے ہوئے اہل

سرمایہ رضاکارانہ طور پر تعاون کے لئے تیار رہوں گے۔ وہ سرمایہ و محنت کو ایک بڑے اور پاکیزہ نصب العین

کے لئے اس طرح جمع کرتی جائے گی جس طرح جہاد فی سبیل اللہ کے لئے بھاری اسلحہ والے دستے اور ہلکے

اسلحہ والے دستے اور ہوا باز اور سفر مینا سب کے سب ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

میرے ایک دوست خوب کہتے ہیں کہ اگر مشینی انقلاب نبی صلعم یا خلافت راشدہ کے دور میں عرب سے

نمودار ہوا ہوتا تو آج دنیا کے نظام ہائے حیات کی شکل ہی دوسری ہوتی!

(۵) سرمایہ دارانہ نظام میں انفرادی ملکیت کی نشوونما جس قانون اور حکومتی انتظام کے تحت ہوتی ہے

اس کی باگ ڈور ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہتی ہے جو سرمایہ دار طبقے کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اس نظام

میں "انتخابات" کسی اخلاقی معیار پر نہیں ہوتے بلکہ ان پر "روپے کا زور" پورا پورا تسلط رکھتا ہے لیکن اسلام

میں صالحیت و تقویٰ کے معیار قرار پانے اور "امیدواری" کے ممنوع ہونے کی وجہ سے بالکل دوسری

...کے لوگ آگے آتے ہیں جو کسی ایک طبقے کے نہیں بلکہ جدوجہد میں ... کے پوری قوت کے [illegible]
...کے مخلص نمائندے ہوتے ہیں۔ اِن کے ہاتھوں جو قانون و نظم وجود پاتا ہے وہ انفرادی ملکیت کو
...نہج پر پروان نہیں چڑھاتا جس نہج پر سرمایہ دارانہ نظام میں اس کی نشوونما ہوتی ہے۔

یہ پانچ بنیادی اختلافات ہیں جن کی وجہ سے اسلام اور سرمایہ داری میں انفرادی ملکیت کے اصولی... ہونے کے باوجود مشرق و مغرب کا تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے مارکسی پروپیگنڈے کا یہ ... جب اسلام انفرادی ملکیت کا داعی ہے تو اس میں اور سرمایہ داری میں فرق کیا۔ رہا محض مغالطہ ...ہے، اور کچھ نہیں!

یہ چیز دگر ہے، وہ چیز دگر!

...ور غلط فہمی

اسلام کے نظریۂ ملکیت پر جب کوئی ٹھوس بحث کی جاتی ہے تو بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ انفرادی ملکیت کے اسلامی اصول کو موجودہ بگڑے ہوئے معاشرہ کے احوال میں ہم نظامِ حاضر کا تحفظ کرنے کے لئے سارا استدلال کر رہے ہیں۔ بسا اوقات جان بوجھ کر ایسا سمجھا ...یا جاتا ہے۔

ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انفرادی ملکیت کے موجودہ سسٹم کو بجائے اس کے کہ قومی ملکیت ...ی نظام میں ڈھالا جائے، بہ حیثیت مسلم ہمارا فرض یہ ہے کہ اسے اسلامی معاشرہ کے مخصوص سانچے ...اور جہاں ملکیت کا اسلامی ضابطہ اختیار کریں وہاں پورا نظامِ معیشت بھی اسلام کا ... اور مزاج کے مطابق اسلام کا سیاسی و معاشرتی نظام بھی اختیار کریں۔ ورنہ اصولِ ملکیت اسلام کا ...سے معیشت، معاشرت اور سیاست کے کسی ایسے نظام میں جڑ جائے جو خود غیر اسلامی ہو ...م سرمایہ دارانہ بنے گا نہ کہ اسلامی۔ نہ ہم دعوت اس کی نہیں دے رہے۔
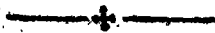
رسائل و مسائل

سوال :-

آپ نے میرے مضمون "قرآن میں چوری کی سزا" پر جو اظہارِ خیال فرمایا ہے اس کے لئے شکریہ ! اب میں قسم کا ایک اور مضمون "قرآن میں زنا کی سزا" کے عنوان سے بھیج رہا ہوں۔ میری درخواست ہے کہ آپ اس پر بھی اظہارِ خیال فرمائیں۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو جناب کی دونوں تنقیدوں کا یکجا جواب دوں گا۔

یہاں سرسری طور پر اس قدر گزارش کرنا ضروری ہے کہ آپ نے میری اس تشریح کے بارے میں نکتہ چینی نہیں فرمائی کہ قرآن نے جو سزا بیان کی ہے وہ زیادہ سے زیادہ سزا ہے، اور کم سے کم سزا جج کی قوتِ تمیزی پر منحصر ہے۔ اور نہ اس بارے میں کچھ فرمایا کہ دنیا میں کسی جرم کی سزا مجرم کو آخرت کی سزا سے محفوظ رکھتی ہے۔

نوٹ :- مستفسر کے محولہ بالا مضمون کے چند ضروری اقتباسات

درجِ ذیل ہیں، تاکہ ان کی روشنی میں جواب کو دیکھا جاسکے (ادارہ)

ہم اپنے سابقہ مضمون (قرآن میں چوری کی سزا) میں بتلا چکے ہیں کہ سارقۃ سے مراد سرقہ کے تمام مددگار لوگ ہیں، خواہ وہ مؤنث ہوں یا مذکر اور خود عورت اگر چور ہے تو وہ لفظِ سارق میں بھی داخل ہے اور سارقہ بھی ہے۔ یہاں بھی (آیت الزانیۃ والزانی میں) وہی کیفیت ہے۔ زانیہ میں فعلِ زنا کے تمام مددگار لوگ شامل ہیں، خواہ وہ دلال ہوں، دلالہ ہوں یا پیغام رساں ہوں، یا زانیوں کے لئے آسانیاں فراہم کرنے والے، یا زنا کے مشغول ہوں، وغیرہ وغیرہ" ——— "چور کی سزا کو بیان کرتے ہوئے "سارقہ" کو سارق کے بعد لایا گیا تھا۔ آخر کوئی وجہ ہونی چاہیئے کہ یہاں زانیہ کو زانی سے پہلے لایا گیا۔ ہمیں جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ چوری کے جرم میں بڑا مجرم چور ہوتا ہے اور باقی اس کے مددگار رہتے ہیں، مگر زنا کی صورت میں زنا کے مددگار (یعنی زانیہ) زانی سے مقدم ہیں کیونکہ ان کی امداد اور رضامندی کے بغیر فعلِ زنا

واقع ہی نہیں ہو سکتا، اس واسطے سے پہلے لایا گیا"۔۔۔ "قرآن نے زنا کی دو سزائیں بیان کی ہیں، ایک یہ کہ زانیوں کو ۱۰۰ کوڑے مارے جائیں اور دوسری یہ کہ ان کا مقاطعہ (بوجہ آیت الزانی لاینکح ...... الخ ۲۴ ص) کر دیا جائے یعنی ان کو مومنین کی جماعت سے علیحدہ کر کے یہ اجازت نہ دی جائے کہ وہ توبہ کئے بغیر مومنین کے اندر نکاح کریں"۔۔۔ "قرآن میں دیگر احکام کی رو سے مومن کا مشرکہ کے ساتھ نکاح جائز نہیں اور یہاں اس کے خلاف ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مشرک اور مشرکہ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، یعنی مشرکہ وہ عورت ہے جو اپنے خاوند کے ساتھ کسی دوسرے کو حظ اٹھانے میں شریک کرے اور مشرک وہ مرد ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر عورت کو حظ حاصل کرنے میں شریک کرے"۔۔۔ "پس زانیہ اور مشرکہ کے معنی میں فرق ہے۔ مشرکہ شوہر دار زانیہ ہے، اور زانیہ وہ مرد یا عورت ہے جو فعل زنا میں کسی دوسرے کی مدد کرے، اپنے آپ کا مفعول بنانے سے یا کسی دوسری طرح۔ اسی طرح زانی اور مشرک میں فرق ہے۔ زانی عام ہے، خواہ اس کی بیوی ہو یا نہ ہو اور مشرک وہ زانی ہے جس کی بیوی ہو"۔۔۔ "جو عالم صاحبان ہمارے اس قول کو نہیں مانتے وہ زانی کے لئے صرف ایک ہی سزا تجویز کریں گے، یعنی سنو کوڑے، دوسری سزا مقاطعہ ان کے لئے کوئی سزا نہ ہو گی"۔۔۔ "ظاہر ہے کہ یہ سنو کوڑے انتہائی سزا ہے۔ ہم نے اپنے مضمون (قرآن میں چور کی سزا) کے اندر لکھا تھا کہ چور کی سزا ہاتھ کاٹنا انتہائی سزا ہے، کم سے کم سزا جج کی قوت تمیزی پر منحصر ہے"۔۔۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسلام کی تعزیرات کی کتاب یعنی قرآن مجید اس قاعدے کے خلاف سب مجرموں کے لیے ایک ہی سزا تجویز کرے اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے، حالانکہ ہر ایک مجرم کے حالات مختلف ہوتے ہیں جن پر جرم کی شدت اور خفت کا دارومدار ہوتا ہے"۔۔۔ "یہی وجہ ہے کہ خلفائے اربعہ اور خود رسول نے زنا کی انتہائی حالتوں میں سنو کوڑوں کی سزا کو ناکافی خیال کر کے مجرمین کو رجم کی سزا دی، یعنی فتوائے موت صادر کیا"۔۔۔ "ہمارے

سنو کوڑے کی سزا کا زیادہ سے زیادہ ہونا بھی مسلم نہ رہا۔ اگر قرآن نے زیادہ سے زیادہ سزا بیان کر دی تھی تو رجم اس سے پیچھے تو رہ سکتا تھا لیکن آگے بڑھنے کا مجاز نہ تھا۔ (ن-ص)

[illegible] کم از کم اتنا تو معلوم ہے کہ قرآن میں رجم کا کوئی ذکر نہیں اور جب حالت یہ ہے تو اسے کیوں ایک منسوخ التلاوۃ اور قائم الحکم آیت کی بنا پر زیر بحث لایا جاوے"۔۔۔۔ "البتہ عقل اس امر سے بغاوت کرتی ہے کہ بیٹی یا بھتیجی کے ساتھ زنا کرنے والے کو زندہ رہنے دیا جائے۔ اس لئے اگر بعض مخصوص حالتوں میں زانی کے خلاف موت کا فتویٰ صادر کیا جاوے تو اس میں کوئی ہرج معلوم نہیں ہوتا۔ مگر وہ صرف فتوائے موت ہو، فتوائے رجم نہ ہو۔ کیونکہ رجم آج کل کے تمدن کے خلاف ہے اور کوئی انسانی طبیعت رجم کو گوارا نہیں کر سکتی"۔۔۔۔ "اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ زنا اور چوری کے جرموں کی سزا میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ چور کو توبہ کرنے کا موقع سزا سے قبل دیا گیا ہے اور زانی کو سزا کے بعد دیا۔ (آیت الا الذین تابوا من بعد ذالک ۔۔۔۔ الخ) یہاں ذالک کا اشارہ سزا کی طرف ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زانی کسی صورت میں حد سے بری نہیں ہو سکتا مگر چور توبہ کر کے حد سے بری ہو سکتا ہے بشرطیکہ قاضی قبول کر لے (ماخوذ از پیغام صلح ۲۲۔ نومبر ۱۹۵۰ء)

جواب:-

عنایت نامہ مع مضمون "قرآن میں زنا کی سزا" پہنچا۔ آپ کے پہلے مضمون اور اس دوسرے مضمون کو بغور پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں (اور میرے اس اظہارِ رائے پر آپ برا نہ مانیں) کہ آپ آیاتِ قرآن کی تاویل و تفسیر اور احکام شرعیہ کی تشریح میں وہ احتیاط ملحوظ نہیں رکھتے جو ایک خدا ترس آدمی کو ملحوظ رکھنی چاہیے۔ اگر آپ میری نصیحت مانیں تو میں دو باتیں بطورِ اصول کے آپ کو بتاؤں۔ ایک یہ کہ آپ بطورِ خود اپنے نظریات قائم کر کے قرآن و سنت سے ان کے حق میں دلائل ڈھونڈھنے کا طریقہ چھوڑ دیں اور اس کے بجائے قرآن و سنت سے جو تعلیم ملے اس کے مطابق نظریات قائم کیا کریں۔ دوسرے یہ کہ قرآن و سنت سے کسی مسئلے کا استنباط کرتے وقت سلف کے مجتہدین و مفسرین و محدثین کی تشریحات کو سرے سے نظر انداز نہ کر دیا کریں۔ آپ کو اختیار ہے کہ ان میں سے ایک کی رائے کو چھوڑ کر دوسرے کی رائے قبول کر لیں، لیکن ان میں سے کسی ایک کا آپ کے ساتھ رہنا اس سے بہتر ہے کہ آپ ان سب سے الگ اپنا مستقل مذہب بنائیں۔ تفرد صرف اس صورت میں جائز ہو سکتا ہے جبکہ آپ قرآن و سنت کے گہرے مطالعے سے اعلیٰ درجہ کی محققانہ بصیرت بہم پہنچا چکے ہوں (جس کی علامات آپ کی تحریروں میں مجھے

آتیں) اور جس مسئلے میں بھی آپ اپنی منفرد رائے ظاہر کریں اس میں آپ کے دلائل نہایت مضبوط ہوں ان
ں کو اگر آپ ملحوظ رکھیں گے تو مجھے امید ہے کہ اُس طرح کی غلطیوں سے محفوظ رہیں گے جو میں نے آپ
ضامین میں پائی ہیں۔
میرے لئے آپ کے مضامین پر مفصل تنقید کرنا تو مشکل ہے۔ البتہ جو نمایاں غلطیاں بیک نظر دیکھ سکا ہوں
بیان کئے دیتا ہوں۔
(۱) آپ کا یہ قول ایک حد تک صحیح ہے کہ قرآن میں چوری اور زنا کی جو سزا بیان کی گئی ہے وہ انتہائی سزا
سے کم سزا جج کے اختیارِ تمیزی پر موقوف ہے۔ لیکن اس سے بڑی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اگر اس بات
یح نہ کر دی جائے کہ جب زنا کے لئے وہ شہادت بہم پہنچ جائے جو شرعاً ضروری ہے، اور جب شرعی قواعد
بق چوری کا جرم ثابت ہو جائے تو پھر چوری اور زنا کی وہی حد جاری کرنی پڑے گی جو قرآن میں مقرر کر دی
ہے۔ اس صورت میں حد سے کم سزا دینے کا جج کو اختیار نہیں۔ البتہ کمتر درجہ کی چوریاں کمتر درجہ کی سزاؤں
ل ہوں گی، اور ثبوتِ زنا کے بغیر اگر کمتر درجہ کے فواحش شہادت یا قرائن سے ثابت ہوں گے تو ان پر
جہ کی سزائیں دی جا سکیں گی۔
(۲) آپ نے اپنے اس مضمون میں بھی اپنی سابق غلطی کا اعادہ کیا ہے کہ الزانیہ کے معنی "فعلِ زنا کے مدد گار"
ان کئے ہیں اور اس سے مراد "دلال، دلالہ، بیغام رساں اور زانی و زانیہ کے لئے آسانیاں بہم پہنچانے والے"
۔ قرآن صریح طور پر اس معنی سے اِبا کرتا ہے۔ جس آیت میں زانی و زانیہ کی سزا بیان کی گئی ہے اس میں
سے پہلے الزانیہ کا ذکر ہے اور پھر دونوں کے لئے ایک ہی سزا مقرر کی گئی ہے کہ فاجلدوا کل واحد
مائۃ جلدۃ (دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو) لیکن آپ نے اس پر بھی اپنی رائے کو قرآن
ت بدلنے کے بجائے قرآن کے حکم کو اپنی رائے کے مطابق بدلنے کی کوشش فرمائی۔ یہ بڑی بے جا جسارت
سے پرہیز واجب تھا۔
(۳) مشرک اور مشرکہ کے جو معنی آپ نے بیان کیے ہیں یعنی مشرکہ وہ عورت ہے جو اپنے خاوند کے ساتھ
ے کو خدا ملانے میں شریک کرے اور مشرک وہ مرد ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر عورت کو حصہ

[illegible] ہے، بالکل ہی ایک آزادانہ معنی آفرینی ہے جس کے لئے نہ قرآن میں کوئی بنیاد پائی جاتی ہے، نہ اصطلاح میں، اور نہ کوئی قرینہ ہی ایسا موجود ہے جس کی بنا پر ایسے دوراز قیاس و گمان معنی لیے جا سکیں۔ آیت الزانی لاینکح الا زانیۃ او مشرکۃ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ میں لاینکح سے مراد لایلیق بہ ان ینکح ہے یعنی زانی ایک ایسا بدکار ہے کہ وہ کسی عفیفہ مومنہ سے نکاح کرنے کے لائق نہیں ہے، اس کے لیے اگر موزوں ہو سکتی ہے تو ایک بدکار یا مشرکہ عورت ہی ہو سکتی ہے، اور زانیہ ایک ایسی فاسقہ و فاجرہ ہے کہ وہ کسی صاحب عصمت مومن کے لیے موزوں نہیں ہے، وہ اگر نکاح کے لائق ہے تو ایک بدکار یا مشرک مرد کے لئے ہو سکتی ہے۔ اس سے مقصود فعل زنا کی قباحت و شناعت واضح کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ صالح اہل ایمان کو معروف بالزنا مردوں اور عورتوں سے مناکحت کے تعلقات نہ قائم کرنے چاہئیں۔

(۴) یہ ایک عجیب بات میں نے دیکھی کہ آپ خود تسلیم فرما رہے ہیں کہ خلفائے اربعہ اور رسول اللہ صلعم نے زنا کی انتہائی حالتوں میں (؟ زانی محصن کی آپ تصریح نہیں کرتے) مجرمین کو رجم کی سزا دی ہے، مگر پھر بھی آپ یہ کہنے میں تامل نہیں کرتے کہ "رجم آج کل کے تمدن کے خلاف ہے اور کوئی انسانی طبیعت رجم کو گوارا نہیں کر سکتی"۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے ان الفاظ پر آپ خود اگر کبھی غور کریں گے تو آپ کو ندامت محسوس ہوگی۔ کیا کوئی "انسانی طبیعت" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ پاکیزہ اور رحیم و شفیق ہو سکتی ہے؟ اور کیا ہم مسلمانوں کے لئے آج کل کا تمدن (ایٹم بم والا تمدن!) کوئی معیار حق ہے؟

یہ چند معروضات میں صرف اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ آپ نے خود مجھ کو اپنے مضامین پر تنقید کی دعوت دی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ جب اتنا بڑا دل رکھتے ہیں کہ تنقید کی خود دعوت دیتے ہیں تو آپ ضرور میری ان باتوں کو ٹھنڈے دل سے پڑھیں گے اور اگر حق معلوم ہوں گی تو قبول کریں گے۔ (ا-م)

سود اور زمین کے کرائے میں فرق

سوال:

روپے کے سود اور زمین کے کرائے میں کیا فرق ہے؟ خاص کر اس صورت میں جبکہ دونوں

سرمائے کے عناصر ترکیبی (UNITS OF CAPITAL) ہیں۔ مثال کے طور پر ایک سو روپیہ پانچ روپے سالانہ کی شرح سود پر لگایا جائے یا ایک بیگھ زمین پانچ روپے سالانہ لگان پر، آخر ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ دونوں حالتوں میں یہ معاملہ مشتبہ ہے کہ فریق ثانی کو نفع ہوگا یا نقصان، سرمایہ کار (LENDER) کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ صاحبِ زر یا صاحبِ زمین نفع و نقصان سے بالکل بے نیاز رہتا ہے۔

جواب:

زمین کے کرائے کی جو شکل میرے نزدیک جائز ہے اس کی تشریح میں مسئلۂ ملکیتِ زمین میں کر چکا ہوں۔ اسے نگاہ میں رکھ کر سوچئے کہ اس میں اور سود میں کیا فرق ہے۔ کرایہ جن چیزوں کا لیا جاتا ہے وہ ایسی چیزیں ہیں جو کرایہ دار کے استعمال سے کچھ نہ کچھ ٹوٹتی پھوٹتی یا خراب ہوتی ہیں اور جن کا اپنی اصلی حالت میں مالک کو واپس ملنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کلیہ کا اطلاق جس طرح فرنیچر، مکان، موٹر وغیرہ پر ہوتا ہے اسی طرح زمین پر بھی ہوتا ہے خواہ اسے لے کر کوئی شخص بستر لگائے، کوئی اسٹال لگائے، یا کسی اور طریقے سے استعمال کرے۔ لیکن روپیہ تو محض ایک قوتِ خرید کا نام ہے، اسے اگر کوئی شخص مستعار لے تو اس کے ٹوٹنے پھوٹنے یا گھسنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اسے قرض لینے والا جوں کا توں لوٹا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص غلہ قرض لے تو جتنا غلہ لیا ہے اتنا ہی وہ واپس دے سکتا ہے۔ غلہ کی مقدار جو دراصل قرض لی گئی ہے، کوئی گھسنے یا خراب ہونے والی چیز نہیں ہے۔ (ا۔م)

کیا زکوٰۃ کے نصاب اور شرح کو بدلا جا سکتا ہے؟

سوال:

زکوٰۃ کے متعلق ایک صاحب نے فرمایا کہ شرح میں حالات اور زمانے کی مناسبت سے تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ حضور اکرمؐ نے اپنے زمانے کے لحاظ سے ۲½٪ شرح مناسب تصور فرمائی تھی، اب اگر اسلامی ریاست چاہے تو حالات کی مناسبت سے اسے گھٹا یا بڑھا سکتی ہے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ قرآن پاک میں زکوٰۃ کا جابجا تذکرہ آتا ہے لیکن شرح کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا، اگر کوئی خاص شرح

لازمی ہوتی تو اسے ضرور بیان کیا جاتا۔ اس کے برعکس میرا دعویٰ یہ تھا کہ حضور ؐ کے احکام ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے ہیں اور ہم ان میں تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ رہی صاحب موصوف کی دلیل تو وہ کل یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نمازیں اتنی نہ ہوں بلکہ اتنی ہوں، اور یوں نہ پڑھی جائیں یوں پڑھی جائیں، جیسا کہ ان کے نزدیک حالات اور زمانے کا اقتضا ہو۔ پھر تو رسولِ خدا کے احکام احکام نہ ہوئے کھیل ہو گئے۔ دوسری چیز جو میں نے کہی تھی وہ یہ تھی کہ اگر اسلامی ریاست کو زیادہ ضروریات درپیش ہوں تو وہ حدیث ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ کی رو سے مزید رقوم وصول کر سکتی ہے۔ خود یہی حدیث زکوٰۃ کی شرح کے مستقل ہونے پر اشارۃً دلالت بھی کرتی ہے۔ اگر زکوٰۃ کی شرح بدلی جاسکتی تو اس حدیث کی ضرورت ہی کیا تھی۔ لیکن وہ صاحب اپنے موقف کی صداقت پر مصر ہیں۔ براہِ کرم آپ ہی اس معاملے میں وضاحت فرما دیجئے۔

جواب:

زکوٰۃ کے معاملے میں آپ نے جو استدلال کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ شارع کے مقرر کردہ حدود اور مقادیر میں رد و بدل کرنے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ یہ دروازہ اگر کھل جائے تو پھر ایک زکوٰۃ ہی کے نصاب اور شرح پر زد نہیں پڑتی بلکہ نماز، روزہ، حج، نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ کے بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں ترمیم و تنسیخ شروع ہو جائے گی اور یہ سلسلہ کہیں جا کر ختم نہ ہو سکے گا۔ نیز یہ کہ اس دروازے کے کھلنے سے وہ توازن و اعتدال ختم ہو جائے گا جو شارع نے فرد اور جماعت کے درمیان انصاف کے لیئے قائم کر دیا ہے۔ اس کے بعد پھر افراد اور جماعت کے درمیان کھینچ تان شروع ہو جائے گی۔ افراد چاہیں گے کہ نصاب اور شرح میں تبدیلی ان کے مفاد کے مطابق ہو اور جماعت چاہے گی کہ اس کے مفاد کے مطابق۔ الیکشن میں یہ چیز ایک ISSUE بن جائے گی۔ نصاب گھٹا کر اور شرح بڑھا کر اگر کوئی قانون بنایا گیا تو جن افراد کے مفاد پر اس کی زد پڑے گی وہ اسے خوش دلی کے ساتھ نہ دیں گے، جو عبادت کی اصل روح ہے، بلکہ ٹیکس کی طرح چٹی سمجھ کر دیں گے اور (EVASION) اور (AVOIDANCE) دونوں ہی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ یہ بات جو اب ہے کہ خدا اور رسول سمجھ کر ہر شخص سر جھکا دیتا ہے اور عبادت کے جذبے سے بخوشی رقم نکالتا ہے، اس صورت میں کبھی باقی نہیں رہ سکتی کہ پارلیمنٹ کی اکثریت اپنے حسبِ منشا کوئی نصاب اور کوئی شرح لوگوں پر مسلط کرتی رہے۔ (ا،م)

مکانوں کے کرایوں میں بلیک مارکیٹنگ

سوال:

جس مکان میں میں رہتا ہوں، وہ مجھ سے پہلے ایک کرایہ دار نے پینتالیس روپے ماہانہ کرایے پر مالکِ مکان سے اس شرط پر لیا تھا کہ دو ماہ کے نوٹس پر خالی کر دیں گے۔ ان کرایہ دار سے یہ مکان اسی شرط پر میرے بھائی نے لیا اور میں بھی ان کے ساتھ رہنے لگا۔ دو ماہ کے بعد میرے کہنے پر مالکِ مکان میرے نام سے رسید کاٹنے لگے۔ آٹھ ماہ تک برابر ہم پینتالیس روپے ماہانہ ادا کرتے رہے اور اس دوران میں کرایے کی زیادتی ہمارے لئے سخت موجبِ تکلیف رہی اور کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ رینٹ کنٹرولر کے یہاں درخواست دے کر کرایہ کم کرایا جائے، مگر اس صورت پر دلی اطمینان نہیں ہو سکا۔ ستمبر میں مالکِ مکان کو سفیدی وغیرہ کرانے کے لئے کہا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ تو کرایہ دار کے فرائض میں سے ہے۔ آس پاس کے لوگوں نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے اپنا سکوت توڑتے ہوئے یہ کہا کہ دو ماہ بعد جواب دوں گا (شاید مکان خالی کرانے کی دھمکی اس جواب میں مضمر تھی) اس پر کسی قدر تیز گفتگو ہوئی جس کے نتیجے میں میں نے رینٹ کنٹرولر کے یہاں کرایہ تشخیص کرنے کی درخواست دے دی۔ وہاں سے سولہ روپے گیارہ آنے ماہوار کے حساب سے کرایہ مقرر کر دیا گیا۔ مگر میرا ضمیر اس پر اب بھی مطمئن نہیں ہے۔

جن صاحب کے ذریعے یہ مکان حاصل ہوا تھا ان کے اور ان کے عزیزوں کے کہنے سننے سے میں نے یہ صورت منظور کر لی کہ بتیس روپے ماہوار میں اس شرط پر دوں گا کہ میں مکان میں جب تک چاہوں رہوں، لیکن اگر کبھی مالکِ مکان نے مکان خالی کرایا تو پھر شروع سے کرایہ سولہ روپے گیارہ آنے ماہوار کے حساب سے محسوب ہوگا اور زائد وصول شدہ رقم مالکِ مکان کو واپس کرنی ہوگی۔ مالکِ مکان فی الحال اس شرط پر راضی نہیں ہے لیکن ظاہر بات ہے کہ ان کو راضی ہونا پڑے گا۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے میرے لئے کونسی صورت صحیح ہوگی؟

میں پینتالیس روپے ماہوار دیتا رہوں یا سولہ روپے گیارہ آنے ادا کیا کروں؟ نیز کیا میرے لئے ضروری ہے کہ جب مالک مکان مکان کے خالی کرنے کا مطالبہ کرے تو فوراً خالی کر دوں یا اس امر کا تحقیق کیا جانا چاہئے کہ اسے مکان کی خود ضرورت نہیں ہے بلکہ محض کرایہ بڑھانے کے لئے دوسرے کرایہ دار کو دینا مطلوب ہے، میرے لئے جائز ہے کہ میں مطالبہ کی تعمیل سے انکار کر دوں؟ ـــــ واضح رہے کہ مکانوں کی غیر معمولی قلت کی بنا پر پینتالیس کے بجائے پچاس روپیہ دینے والے کرائے دار بھی مل سکتے ہیں۔

مجھے صاف اور دو ٹوک جواب دیا جائے۔ جواب میں یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ میں مالکِ مکان کو نصیحت کروں یا اس کا ظلم اس پر واضح کروں، کیونکہ یہ چیز بیکار ہوگی۔

جہاں تک مجھ سے ہو سکا، حقیقتِ واقعہ جیسی کچھ ہے، میں نے صاف صاف عرض کر دی ہے۔

جواب:

موجودہ حالات میں بڑے شہروں کے مالکانِ مکان مکانات کی قلت سے، اور لوگوں کی خصوصاً مہاجرین کی حاجتمندی سے انتہائی ناجائز فائدے اٹھانے پر تُل گئے ہیں۔ ان کے ساتھ اگر کوئی شخص معاہدہ کرتا بھی ہے تو برضا و رغبت نہیں کرتا بلکہ اُسی طرح کی مجبوری سے کرتا ہے جیسی سود پر قرض لینے والے حاجتمند کو لاحق ہوتی ہے۔ ایسے معاہدا کی کوئی اخلاقی قدر و قیمت نہیں ہے، اور درحقیقت یہ معاہدے اس وجہ سے ہو رہے ہیں کہ حکومت کی طرف سے قائم کرنے اور لوگوں کی ضروریات منصفانہ شرائط پر بہم پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اب اگر حکومت نے منصفانہ مقرر کرنے کا کوئی انتظام کیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اور دوسرے لوگ اس سے فائدہ نہ اٹھائیں جس کا کرایہ ازروئے انصاف سولہ روپیہ ہے، اگر ایک مالک مکان اس کا کرایہ پینتالیس پچاس روپے وصول کرتا یقیناً وہ لٹیرا ہے۔ وہ آخر کونسا اخلاقی حق رکھتا ہے کہ آپ پر اس کا احترام کرنا واجب ہو؟ کل جو شخص غذا کی کمی کی وجہ سے بلیک مارکیٹنگ کرنے پر اتر آئے اور اپنا دس روپے من خریدا ہوا غلہ اسّی روپے من کے حساب سے بیچے تو کیا اس کے بھی حقوقِ ملکیت کا احترام کیا جائے گا؟ اگر ہم حکومت کی مدد سے ایسے لوگوں کو مناسب اپنا مال بیچنے پر مجبور کر سکتے ہیں تو کیوں نہ کریں؟ (ا۔م)

امام مہدی، مجددیت اور کشف و الہام

سوال :

کتاب "تجدید و احیائے دین" جس قدر بلند پایہ ہے اس کا اندازہ تو "کارِ تجدید کی نوعیت" کے عنوان سے تحریر شدہ مضمون اور مختلف مجددینِ امت کے کارناموں کی تفصیل سے ایک صاحبِ بصیرت بخوبی کر سکتا ہے۔ تاہم چند پہلو تشریح کے محتاج ہیں اور وہ درج ذیل ہیں :-

(۱) امام غزالی کے تذکرے کے آخر میں تین کمزوریاں جو آپ نے بیان کی ہیں (صفحہ ۴۰) یعنی (ا) علم حدیث میں امام کا کمزور ہونا (ب) عقلیات کا غلبہ، اور (ج) تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہونا۔ کیا ان کا ثبوت امام کی مشہور کتب احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت وغیرہ سے ملتا ہے؟ اور کیا وہ تصوف جس کا بیان انھوں نے ان کتابوں میں کیا ہے ایک مستحسن چیز نہیں ہے؟ نیز کیا مجدد وقت کو تمام ہم عصروں کے مقابلہ میں علم صحیح زیادہ نہیں دیا جاتا؟ اگر نہیں تو زمانے بھر میں اُس کو ایک امتیازِ خاص کیوں حاصل ہوتا ہے؟

(۲) مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانی کے وقت سے شاہ (ولی اللہ) صاحب اور ان کے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور ان کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی" (ص ۱۲۳)

اس کے متعلق سچ یہ باور کرنا مشکل ہے کہ حضرت مجدد اور شاہ صاحب اتنے ناقص البصیرت تھے کہ تصوف کی بیماری کا پورا اندازہ نہ لگا سکے۔ یہ حضرات علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی (بطریق کشف و الہام) سے بھی بہرہ ور رہ چکے تھے۔ پھر ان حضرات نے مجدد ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے جس کا ذکر مولانا آزاد نے اپنے تذکرے میں کیا ہے۔ خود حضرت مجدد نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ بعد نبوت سے ہزار سال بعد جو مجدد آیا ہے وہ آپ کی ذاتِ گرامی ہے۔

ان باتوں کے پیشِ نظر قدرتی طور پر حسبِ ذیل سوال پیدا ہوتے ہیں :-

(ا) کیا ان مختلف حضرات کا اعلانِ مجددیت حکم خداوندی کے تحت نہ تھا، نیز کشف والہامات جن کا ذکر ان کی تصانیف میں ملتا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ آخر وہ مجدد امرِ شرعی سے ہوئے یا امرِ تکوینی سے؟

(ب) کیا لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ مجدد لازماً اپنے دور کا وہ ممتاز انسان ہوتا ہے جو شریعت کے علوم کا (مع اسرارِ دین) سب سے بڑا عالم ہو اور اقرب الی اللہ ہو؟ اگر ایسا نہیں ہے تو دوسروں کو چھوڑ کر اس کارِ اہم کے لئے اسے کیوں مامور کیا جاتا ہے؟

(ج) المبشرات کی حقیقت کیا ہے؟

(د) کیا یہ حدیث صحیح نہیں کہ صدی کے سرے پر ایک مجدد آئے گا، اور کیا اسے مجددیت کا شعور ہونا ضروری نہیں؟

(۳) سب سے زیادہ جو چیز مجھے کھٹکی ہے وہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آپ کی وہ تحریر ہے جو ص ۳۵ سے شروع ہو کر ص ۵۲ تک ان الفاظ میں موجود ہے: "مگر واقعہ یہ ہے . . . بی بی کی صحنک اور اس قسم کی نیازوں کا سلسلہ خود اس خاندان کی خواتین میں جاری تھا" اس پر مولانا منظور نعمانی کے اختلافی نوٹ کا حوالہ دے کر آپ نے لکھ دیا ہے کہ "ممکن ہے کہ یہ بیانات یا ان میں سے اکثر غلط ہوں" لیکن اس حصے کو کتاب سے خارج نہیں کیا۔ اب میں گزارش کرتا ہوں کہ جب یہ چیزیں جو شاہ صاحب کے خاندان کی طرف منسوب ہیں حتمی اور یقینی نہیں تو کیوں نہ آپ اس حصے کو کتاب سے خارج کر دیں!

(۴) الامام المہدی کے متعلق آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ وہ عام علماء کے بیان سے بہت مختلف ہوگا حالانکہ علماء سے یہ سنا ہے کہ امام کا نام اور نسبت تک علاوہ دیگر علامات کے احادیث میں مذکور ہے۔ وہ خاص ماحول میں اور خاص علامات کے ساتھ نمودار ہوں گے، لوگ ان کو پہچان لیں گے اور زبردستی بیعت کر کے حاکم بنائیں گے اور اسی دوران میں آسمان سے آواز آئے گی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ الامام المہدی ہیں۔ لیکن آپ فرماتے ہیں کہ "نبی کے سوا کسی کا یہ منصب نہیں ہے کہ دعوے سے

کام کا آغاز کر سے اور نہ یہ کسی کو کھینچ تان کر یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کسی خدمت پر مامور ہوا ہے۔ مہدویت دعوی کرنے کی چیز نہیں، کر کے دکھا جانے کی چیز ہے۔ اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور اپنے ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں (ص)

میرا سوال یہ ہے کہ مذکورۂ بالا علامات جو کہ اکثر اہل علم (مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب بہشتی زیور ملاحظہ ہو) نے بیان کیے ہیں کیا احادیث صحیحہ پر مبنی نہیں ہیں؟ اگر ہیں تو آپ کے بیان کی پشت پر کونسے دلائل موجود ہیں۔

جواب:

آپ کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ چند امور کی توضیح کر دوں جن کو سمجھ لینے سے آپ کی بہت سی الجھنیں خود بخود صاف ہو جائیں گی۔ اول یہ کہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم تعین کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ فلاں شخص مجدد تھا اور فلاں شخص نہ تھا۔ یہ تو ایک شخص کے کام کو دیکھ کر بعد کے لوگ یا خود اس کے ہم عصر لوگ یہ رائے قائم کرتے رہے ہیں کہ وہ مجدد تھا یا نہ تھا۔ اس میں اختلافات بھی بہت کچھ رہے ہیں، پچھلے زمانے کے متعدد لوگوں کے متعلق بہت سے اہل علم کی یہ رائے ہے کہ وہ مجدد تھے مگر بعض نے ان کو مجدد نہیں مانا ہے۔ کوئی خاص علامت کسی کے ساتھ بھی لگی ہوئی نہیں ہے جس سے اس کے مرتبے کا تعین ہو سکے۔

دوم یہ کہ تجدید کسی دینی منصب کا نام نہیں ہے جس پر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے باضابطہ شرعی مامور ہوتا ہو اور اس کو مجدد ماننے یا نہ ماننے سے کسی شخص کے عقیدۂ دینی پر کوئی اچھا یا برا اثر پڑتا ہو۔ یہ تو ایک لقب ہے جو کسی آدمی کو اس کے کارنامے کے لحاظ سے دیا جاتا ہے۔ ہمارے علم میں جس شخص نے بھی دین کو از سر نو تازہ کرنے کی کوئی خدمت انجام دی ہو ہم اسے مجدد کہہ سکتے ہیں۔ اور دوسرے شخص کی رائے میں اگر اس کا کارنامہ اس مرتبے کا نہ ہو تو وہ اسے اس لقب کا مستحق ٹھیرانے سے انکار کر سکتا ہے۔ نادان لوگوں نے اس معاملے کو خواہ مخواہ اہم بنا دیا ہے۔ نبی صلعم نے جو خبر دی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو مٹنے نہیں دے گا بلکہ ہر صدی کے سر پر ایسے شخص یا اشخاص کو اٹھاتا رہے گا جو اس کے دھندلے ہوتے ہوئے آثار کو پھر سے تازہ کر دیا کریں گے۔ حدیث میں "من" کا لفظ عربیت کے لحاظ سے اس بات کا متقاضی نہیں ہے کہ

[illegible]
نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ مجدد کو اپنے مجدد ہونے کا شعور بھی ہونا چاہیئے، یا یہ کہ لوگوں کے لئے مجدد کا پہچاننا بھی ضروری ہے۔

سوم، کسی شخص کے مجدد ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ہر لحاظ سے مردِ کامل ہے اور اس کا کام نقائص سے پاک ہے۔ اس کو مجدد قرار دینے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ اس کا مجموعی کارنامہ تجدیدی خدمت کی شہادت دیتا ہو۔ لیکن ہم سخت غلطی کریں گے اگر کسی کو مجدد قرار دینے کے بعد اس کو بے خطا سمجھ لیں گے تو اس کی ہر بات پر ایمان لے آئیں گے۔ نبی کی طرح مجدد معصوم نہیں ہوتا۔

چہارم، مجددین امت کے کام پر میں نے جو تبصرہ کیا ہے وہ بہرحال میری اپنی رائے ہے۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ میری جس رائے سے چاہے اختلاف کرے۔ میں نے جن دلائل کی بنا پر کوئی رائے قائم کی ہے ان پر آپ کا اطمینان ہو تو اچھا ہے۔ نہ اطمینان ہو تو مضائقہ نہیں۔ البتہ میں یہ ضرور چاہوں گا کہ آپ کسی رائے کو رد یا قبول کرنے کا انحصار دلیل اور تحقیق پر رکھیں، اکابر پرستی کے جذبے سے متأثر نہ ہوں۔

پنجم، پچھلے زمانے کے بعض بزرگوں نے بلاشبہ اپنے متعلق کشف والہام کے طریقے سے یہ خبر دی ہے کہ وہ اپنے دور کے مجدد ہیں، لیکن انھوں نے اس معنی میں کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ ان کو مجدد تسلیم کرنا لوگوں کے لئے ضروری ہے اور جو ان کو نہ مانے وہ گمراہ ہے۔ دعویٰ کر کے اس کو ماننے کی دعوت دینا اور اسے منوانے کی کوشش کرنا سرے سے کسی مجدد کا منصب ہی نہیں ہے۔ جو شخص یہ حرکت کرتا ہے وہ خود اپنے اس فعل ہی سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ فی الواقع مجدد نہیں ہے۔

ششم، کشف والہام وحی کی طرح کوئی یقینی چیز نہیں ہے۔ اس میں وہ کیفیت نہیں ہوتی کہ صاحب کشف کو آفتابِ روشن کی طرح یہ معلوم ہو کہ یہ کشف یا یہ الہام خدا کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اس میں غلط فہمیوں کا کم و بیش امکان ہوتا ہے۔ اسی لیے اہلِ علم اس بات کے قائل ہیں کہ کشف والہام کے ذریعے سے کوئی حکمِ شرعی ثابت نہیں ہوتا، نہ اس ذریعۂ علم سے حاصل کی ہوئی کوئی چیز حجت ہے، نہ خود صاحبِ کشف کے لئے یہ جائز ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر پیش کئے بغیر کسی کشفی والہامی چیز کی پیروی کرے۔

امام المہدی کے بارے میں جو کچھ میں نے تجدید و احیائے دین میں لکھا ہے اس کی مزید توضیح مختلف مواقع پر ترجمان القرآن کے متعدد نمبروں میں کر چکا ہوں۔ براہِ کرم ان سب توضیحات کو آپ پڑھ لیں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان روایات کے بارے میں میری کیا تحقیق ہے جن کی بنا پر علماء نے امام موعود کے اتنی تفصیلات مرتب کر دی ہیں۔ میں ان تمام اکابر علماء کا دل سے احترام کرتا ہوں مگر کسی عالم کی ہر بات کو ماننے کی عادت مجھے کبھی نہیں رہی۔ (ا۔م)

نماز کا مسنون طریقہ

سوال:

میں پہلے نماز ادا کرنے کی سعادت سے محروم تھا، لیکن الحمدللہ کہ اب نماز ادا کرتا ہوں۔ مجھ کو اس بارے میں بڑی پریشانی در پیش ہے۔ میں جس بستی میں تعلیم پا رہا ہوں وہاں کے لوگ دیوبندی حنفی ہیں اور میرے گاؤں کے لوگ اہلحدیث ہیں۔ اب اگر میں نماز اہلِ حدیث کے طریقے پر ادا کرتا ہوں تو بستی کے لوگ مجھے وہابی کہہ کر پریشان کرتے ہیں اور جب حنفی طریقے پر پڑھتا ہوں تو گاؤں کے لوگ مقلد ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ چونکہ مجھے آپ پر اعتماد ہے، لہٰذا اس معاملے میں آپ سے رہنمائی چاہتا ہوں۔

سوال یہ ہے کہ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو نماز ایک ہی طریقے پر پڑھی ہوگی، پھر مختلف فرقوں کے مختلف طریقوں کا اسلام میں کیا مقام ہے؟ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کونسا فرقہ آنحضور صلعم کے طریق پر نماز ادا کرتا ہے اور میں کس کے مسلک پر رہوں۔ یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ خود آپ کس طریق پر نماز ادا کرتے ہیں۔

علاوہ بریں دیہات میں نمازِ جمعہ ادا کرنا چاہیے یا نہیں؟

جواب:

[illegible] علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور ہر ایک نے معتبر روایات [illegible] اسی بنا پر ان میں سے کسی گروہ کے

کسی عالم نے یہ نہیں کہا کہ ان کے طریقے کے سوا جو شخص کسی دوسرے طریقے پر نماز پڑھتا ہے اس کی نماز نہیں ہوتی۔ یہ صرف بے علم لوگوں کا ہی کام ہے کہ وہ کسی شخص کو اپنے طریقے کے سوا دوسرے طریقے پر نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر اسے ملامت کرتے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں ان سب طریقوں سے نماز پڑھی ہے۔ اختلاف اگر ہے تو صرف اس امر میں کہ آپ عموماً کس طریقے پر عمل فرماتے تھے۔ جس گروہ کے نزدیک جو طریقہ آپ کا معمول بہ طریقہ ثابت ہوا ہے اس نے وہی طریقہ اختیار کر لیا ہے۔

میں خود حنفی طریقے پر نماز پڑھتا ہوں، مگر اہل حدیث، شافعی، مالکی، حنبلی سب کی نماز کو درست سمجھتا ہوں اور سب کے پیچھے پڑھ لیا کرتا ہوں۔

دیہات میں نمازِ جمعہ کا مسئلہ بہت اختلافی ہے۔ حنفی اس کو جائز نہیں سمجھتے۔ اہل حدیث جائز سمجھتے ہیں۔ اور دوسرے فقہا کے مسالک بھی اس معاملے میں مختلف ہیں۔ آپ کے سوال کا مختصر جواب دوں تو غلط فہمی کا موجب ہوگا۔ مفصل جواب کا موقع نہیں۔ میں اس سے پہلے ترجمان القرآن میں اس مسئلہ پر بہت تفصیل سے لکھ چکا ہوں اور وہ سب مضامین اب میری کتاب تفہیمات حصہ دوم میں شائع ہونے والے ہیں۔

(ا۔م)
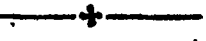
کمیشن اور نیلام

سوال:

حسبِ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے:

(۱) بعض ایجنٹ مال سپلائی کرتے وقت دکاندار سے کہتے ہیں کہ اگر مال فروخت کر کے ہمیں رقم دو گے تو ۲۰ فی صدی کمیشن ہم آپ کو دیں گے، اور اگر نقد قیمت مال کی ابھی دو گے تو ۲۵ فی صدی کمیشن ملے گا۔ کیا اس طرز پر کمیشن کا لین دین جائز ہے؟

(۲) سامان نیلام کرنے کے لئے کیا یہ جائز ہے کہ جب کوئی شخص بولی نہ چڑھائے اور وہ دیکھے کہ

[illegible] نقصان ہوگا تو وہ خود بولی دے کر مال کو اپنے قبضے میں [illegible]

وقت میں نیلام ہوگا۔ نیز کیا وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اپنے آدمی مقرر کر دے کہ وہ قیمت بڑھانے کے لئے بولی بولتے رہیں، یہاں تک کہ اس کے حسبِ منشا مال کی قیمت وصول ہو سکے۔

جواب:

(۱) نقد خریداری کی صورت میں زیادہ اور ادھار کی صورت میں کم کمیشن دینا میرے علم میں ناجائز نہیں ہے۔ ایجنٹ (یا مالک) دوکانداروں کو مال فراہم کرتے وقت جو کمیشن دیتا ہے وہ دراصل اپنے منافع میں سے ایک حصہ اُس کو ادا کرتا ہے۔ اس حصے کو سودے کی نوعیت کے لحاظ سے کم و بیش کرنے کا اسے حق ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کوئی چیز سود سے مشابہ ہے۔ البتہ اگر ادھار کی مدت کے لحاظ سے کمیشن کی کمی کے درجے قائم کیے جائیں تو اس میں سود سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) نیلام کرنے والے کے لئے یہ تو درست ہے کہ اگر کسی مال پر اتنی بولی نہیں آتی جس پر اپنا مال بیچنے کے لئے صاحبِ مال راضی ہو، تو وہ فروخت نہ کرے۔ لیکن اس کے لئے دھوکے اور فریب سے کام لینا مناسب نہیں ہے۔ اسے کھلے بندوں یہ بات ظاہر کر دینی چاہیے کہ دوسرے لوگوں کا جو مال وہ نیلام کے ذریعے سے فروخت کر رہا ہے یا خود اپنا خریدا ہوا جو مال وہ اس طریقے سے نکال رہا ہے، اس پر اگر کم سے کم مطلوبہ قیمت کی حد تک بولی نہ آئی تو وہ اس چیز کو فروخت نہ کرے گا۔ خریداروں میں اپنے آدمی بٹھا کر ان سے بولی دلوانا یا خود خریدار بن کر بولی دینا فریب کاری ہے۔ (ا۔م)

ایک نوجوان کے چند اہم سوالات

سوال:

(۱) ہمیں یہ کیونکر معلوم ہو کہ ہماری عبادت خامیوں سے پاک ہے یا نہیں اور اسے قبولیت کا درجہ حاصل ہو رہا ہے یا نہیں؟ —— قرآن و حدیث کے بعض ارشادات جن کا مفہوم یہ ہے کہ

بہت سے لوگوں کو روزے میں بھوک پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بہت سے لوگ اپنی نمازوں سے رکوع و سجود کے علاوہ کچھ نہیں پاتے، یا یہ کہ جو کوئی اچھے عابد کہے جانے پر خوش ہو تو نہ صرف اس کی عبادت ضائع ہو گئی بلکہ وہ شرک ہو گیا، اور اسی طرح سے دیگر تنبیہات جن میں عبادت کے لئے بعد چھپانے اور سزا دینے کی خبر دی گئی ہے دل کو نا امید و مایوس کرتی ہیں۔

اگر کوئی شخص اپنی عبادت کو معلوم شدہ نقائص سے پاک کرنے کی کوشش کرے اور اپنی دانست میں کر بھی لے پھر بھی ممکن ہے کہ اس کی عبادت میں کوئی ایسا نقص رہ جائے جس کا اسے علم نہ ہو سکے اور یہی نقص اس کی عبادت کو لاحاصل بنا دے ——— اسلام کا مزاج اس قدر نازک ہے کہ اپنی بشریت کے ہوتے ہوئے اس کے مقتضیات کو پورا کرنا ناممکن سا نظر آتا ہے۔

(۲) توجہ اور حضورِ قلب کی کمی کیا نماز کو بیکار بنا دیتی ہے؟ نماز کو اس خامی سے کیونکر پاک کیا جائے؟

نماز میں عربی زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے نہایت بے حضوریٔ قلب پیدا ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیئے کیونکہ ہم سوچتے ایک زبان میں ہیں اور نماز دوسری زبان میں پڑھتے ہیں اگر آیات کے مطالب سمجھ بھی لئے جائیں تب بھی ذہن اپنی زبان میں سوچنے سے باز نہیں رہتا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف اُن اعمال کے صلہ کا وعدہ کیا گیا ہے جن کا تمام مقصد اور تمام محرک صرف اس کی خوشنودی و رضا کا حصول ہو۔ مثلاً اگر کسی کی غربت و بے کسی پر رحم کھا کر ہم اس کی مدد کریں اور مدد کرنے میں اس کو ممنون کرنے یا اس سے آئندہ کوئی کام نکالنے یا کچھ لینے کا خیال نہ ہو بلکہ صرف اللہ کا واسطہ منظور ہو تو کیا یہ بھی شرک ہے؟ کیونکہ اس کے ساتھ سلوک کرنے کا ابتدائی محرک ہماری رقتِ قلب ہے جس طرح آپ کے نزدیک خدمتِ ملت میں اگر کہیں قومیت کا رنگ پیدا ہو جائے تو عبادت نہیں رہتی۔

(۴) "پردہ" پڑھنے سے کافی تشفی ہوئی لیکن اکثر مسائل ایسے ہیں جن کے بارے میں الجھاؤ رفع نہیں ہوتا۔

ایک ایسا شخص جسے اس کے موجودہ حالات اور معاشی وسائل نکاح کرنے کی اجازت نہ دیں وہ آج کل کے زمانے میں کیونکر اپنی زندگی پاکبازی سے بسر کرے؟

میں نے اس کا جواب جس کسی سے بات کی، نفی میں پایا۔ ایک طرف موجودہ ماحول کی تہہ نگیاں اور دوسری طرف چشم و گوش کی بھی حفاظت کا مطالبہ ناممکن العمل معلوم ہوتا ہے، کہاں آنکھیں میچئے اور کہاں کانوں میں انگلیاں دیجئے اور پھر یہ کہ ...... خیالات کی آمد کو کیونکر روکئے۔ اول تو ہم اپنے خیالات کی آمد و رفت پر کوئی اختیار نہیں رکھتے اور اگر اس کی کوشش بھی کی جائے تو ایک ذہنی انتشار کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا جو اور خراب کن ہے۔

سیلف کنٹرول (SELF-CONTROL) جن سازگار حالات میں قابلِ عمل ہو صرف انھیں حالات میں کارگر اور مفید ہو سکتا ہے لیکن ایسے ماحول میں جہاں ہر طرف ہر انگیختگی کے فوج در فوج سامان ہوں اپنے آپ سے لڑنا اپنی شخصیت کے لئے ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ ایک صاحب جو میڈیکل سائنس میں اس سال ڈاکٹریٹ کی سند لے رہے ہیں کہتے ہیں کہ اس صورت میں نکاح جو کہ حاصل نہیں ہے، اس کے علاوہ، نیچرل طریق پر تسکینِ خاطر حاصل کرنا ہی صرف اس ذہنی انتشار اور تذلیلِ نفس سے نجات دے سکتا ہے۔ نفسیات کے ماہرین بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔

کیا آپ بتائیں گے کہ بحالتِ مجبوری مذکورہ بالا رائے پر عمل پیرا ہو جانا کس حد تک گناہ ہے اور اگر یہ سراسر گناہ ہے تو پھر ان حالات میں صحیح راستہ کیا ہوگا جو معقول اور قابلِ عمل ہو؟

امید ہے کہ آپ ان مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے نفسیاتِ انسانی کے حقائق کی پوری رعایت فرمائیں گے۔

جواب:

(۱) اسلام کا مزاج بلاشبہ بہت نازک ہے، مگر اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی استطاعت سے زیادہ مکلف نہیں فرماتا۔ قرآن و حدیث میں جن چیزوں کے متعلق ذکر کیا گیا ہے کہ وہ عبادات کو باطل یا بے وزن کر دینے والی ہیں ان کے ذکر سے دراصل عبادات کو مشکل بنانا مطلوب نہیں ہے، بلکہ انسان کو ان خرابیوں پر متنبہ کرنا

مقصود یہ ہے کہ انسان اپنی عبادات کو ان سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے اور عبادات میں وہ روح
کی طرف متوجہ ہو جو مقصود بالذات ہے۔ عبادات کی اصل روح تعلق باللہ، اخلاص للہ اور تقویٰ و احسان ہے۔
اس روح کو پیدا کرنے کی کوشش کیجئے، اور ریا سے، فسق سے، دانستہ نافرمانی سے بچئے۔ ان ساری چیزوں کا
محاسبہ کرنے کے لئے آپ کا اپنا نفس موجود ہے۔ وہ خود ہی آپ کو بتا سکے گا کہ آپ کی نمازیں، آپ کے روزے
ہیں، آپ کی زکوٰۃ اور حج میں کس قدر اللہ کی رضا جوئی اور اس کی اطاعت کا جذبہ موجود ہے، اور ان عبادتوں کو
آپ نے فسق و معصیت اور ریا سے کس حد تک پاک رکھا ہے۔ یہ محاسبہ اگر آپ خود کرتے رہیں تو ان شاء اللہ آپ
کی عبادتیں بتدریج خالص ہوتی جائیں گی اور جتنی جتنی وہ خالص ہوں گی آپ کا نفس مطمئن ہوتا جائے گا۔ ابتداءً
جو نقائص محسوس ہوں ان کا نتیجہ یہ نہ ہونا چاہئے کہ آپ مایوس ہو کر عبادت چھوڑ دیں، بلکہ یہ ہونا چاہئے کہ آپ
اخلاص کی پیہم کوشش کرتے جائیں۔ خبردار رہئے کہ عبادت میں نقص کا احساس پیدا ہونے سے جو مایوسی کا جذبہ ابھرتا
ہے اسے دراصل شیطان ابھارتا ہے اور اس لئے ابھارتا ہے کہ آپ عبادت سے باز آ جائیں۔ یہ شیطان کا وہ پوشیدہ
حربہ ہے جس سے وہ طالبینِ خیر کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ان سب کوششوں کے باوجود یہ معلوم کرنا
بہرحال کسی انسان کے امکان میں نہیں ہے کہ اس کی عبادات کو قبولیت کا درجہ حاصل ہو رہا ہے یا نہیں۔ اس کو
جاننا اور اس کا فیصلہ کرنا صرف اس ہستی کا کام ہے جس کی عبادت آپ کر رہے ہیں اور جو تمہاری آپ کی عبادتوں
کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ ہر وقت اس کے غضب سے ڈرتے رہئے اور اس کے فضل کے امیدوار
رہئے۔ مومن کا مقام بین الخوف والرجاء ہے۔ خوف اس کو مجبور کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ بہتر نیکی بجا لانے کی
کوشش کرے اور یہ توقع اس کی ڈھارس بندھاتی ہے کہ اس کا رب کسی کا اجر ضائع کرنے والا نہیں ہے۔

(۲) توجہ اور حضورِ قلب کی کمی نماز میں نقص ضرور پیدا کرتی ہے، لیکن فرق ہے اُس بے توجہی میں جو نادانستہ
ہو اور اس میں جو دانستہ ہو۔ نادانستہ پر مواخذہ نہیں ہے بشرطیکہ انسان کو دورانِ نماز میں جب کبھی اپنی بے توجہی کا احساس
ہو جائے اسی وقت وہ خدا کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش کرے اور اس معاملے میں غفلت سے کام نہ لے۔ رہی
دانستہ بے توجہی، بے دلی کے ساتھ نماز پڑھنا، یا نماز میں قصداً دوسری باتیں سوچنا، یا نماز کو بیگار کر دینے والی چیز
عربی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر جو بے حضوری کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اُس کی تلافی جس حد تک ممکن

[illegible] اذکار کا مفہوم ذہن نشین کرنے سے کم ہے۔ اس کے بعد [illegible] آپ عند اللہ [illegible]

کیونکہ آپ حکم خدا اور رسول کی تعمیل کر رہے ہیں۔ اس بے حضوری پر آپ سے اگر مواخذہ ہو سکتا تھا تو اس [illegible]

میں جب کہ خدا اور رسول نے آپ کو اپنی زبان میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہوتی اور پھر آپ عربی میں نماز پڑھتے۔

(۳) آپ کا تیسرا سوال واضح نہیں ہے۔ اگر کسی کی غربت دیکھ کر کسی پر رحم کھا کر آپ صرف اللہ واسطے اس کی مدد کریں تو یہ فعل ظاہر ہے کہ خالص رضائے الٰہی کے حصول کے لئے ہوگا، اس کے مشرک ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اور اس سے میرے قول کی نفی کیسے لازم آتی ہے؟ اس کی ابتدائی محرک آپ کی رقت ہی سہی، مگر رقتِ قلب کی تحریک پر جو کام آپ نے کیا وہ تو اللہ کا پسندیدہ کام ہی کیا اور اس غرض کے لئے کیا کہ اللہ اسے پسند فرمائے۔ اسی طرح اگر آپ اپنی قوم کی کوئی خدمت اس طریقے سے کریں جو اللہ کا پسندیدہ طریقہ ہو، اور اس غرض کے لئے کریں کہ اللہ اس خدمت سے خوش ہو تو یہ عین عبادت ہے۔ میں جس چیز کا مخالف ہوں وہ تو یہ ہے کہ قوم کی خاطر وہ کام کیے جائیں جو اللہ کو پسند نہیں ہیں اور ایسے طریقے سے کیے جائیں جو اللہ کی بتائی ہوئی راہ کے خلاف ہیں۔

(۴) آپ کا یہ سوال ان اہم مسائل میں سے ہے جن کی بنا پر ہم موجودہ ناپاک ماحول کے خلاف اجتماعی جدوجہد کی ضرورت پر برسوں سے زور دے رہے ہیں۔ بلاشبہ آج کل کے ماحول نے افراد کے لئے پاکباز رہنے کو سخت مشکل بنا دیا ہے۔ لیکن اس کا حل یہ نہیں ہے کہ اس ماحول کی خرابی کو حیلہ بنا کر افراد اپنے لئے اخلاقی بے قیدی کے جواز کی راہ نکالنے لگیں۔ بلکہ اس کا صحیح حل یہ ہے کہ اس ماحول کی ناپاکی کا جتنا زیادہ شدید احساس آپ کے اندر پیدا ہو اسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ آپ اسے بدلنے کی جدوجہد میں حصہ لیں۔ رہیں وہ مشکلات جو اس کے دوران میں ایک نوجوان کو اس ناپاک ماحول کے اندر پیش آتی ہیں، تو ان کا علاج یہ ہے کہ جن ہیجان انگیز چیزوں سے آپ بچ سکتے ہوں ان سے بچیے، مثلاً سینما، فحش تصویریں، فحش لٹریچر، [illegible] سوسائٹی میں بے پردہ عورتوں [illegible] دانستہ گھورنا، یا ان کی صحبت میں بیٹھنا۔ اس کے بعد جو اضطراری محرکات باقی رہ جاتے ہیں وہ اتنے زیادہ اشتعال انگیز نہیں رہتے کہ آپ ان کی وجہ سے بندشِ تقویٰ کو توڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ آپ کے ڈاکٹر دوست اور جن ماہرینِ نفسیات کا آپ ذکر کر رہے ہیں، دراصل اس بات سے ناواقف ہیں کہ زنا انسانی [illegible] کے لئے کس قدر شدید مفسد و مخرب چیز ہے۔ اگر وہ اس چیز کی برائیوں سے واقف ہوں [illegible]

یہ مشورہ نہ دیں کہ وہ محض اپنے نفس کی تسکین کے لئے سوسائٹی کے خلاف اتنے سخت جرم کا ارتکاب کر گزرے۔ کیا یہ لوگ کسی شخص کو یہ مشورہ دینے کی جرأت کریں گے کہ جب کسی کے خلاف اس کا جذبۂ انتقام ناقابلِ برداشت ہو جائے تو وہ اسے قتل کر دے، اور جب کسی چیز کے حاصل کرنے کی خواہش اسے بہت ستائے تو وہ چوری کر ڈالے؟ اگر ایسے مشورے دینا وہ ناجائز سمجھتے ہیں تو جذبۂ شہوت کی تسکین کے لئے وہ زنا کا مشورہ دینے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔ حالانکہ زنا کسی طرح بھی قتل اور چوری سے کم جرم نہیں ہے۔ آپ اس جرم کی شدت کو سمجھنے کے لئے ایک مرتبہ پھر میری کتاب پردہ کے وہ حصے پڑھئے جن میں میں نے زنا کے اجتماعی نقصانات بحث کی ہے۔ (ا۔م)

—+—

۱۹۴۷ء کے فساد اور اموالِ متروکہ کا حکم وغیرہ

سوال:

(۱) موجودہ پاکستان دارالحرب ہے یا دارالامن (دارالاسلام)؟

(۲) ۱۹۴۷ء میں جو ہندو مسلم فساد پاکستان میں ہوا اس میں ہندوؤں کے اموال مسلمانوں پر حلال تھے یا حرام؟ اور ان کے قتل کا اس صورت میں مواخذہ قیامت میں ہوگا یا نہ جب کہ انھوں نے کوئی پیش دستی نہ کی ہو؟

(۳) ہندوؤں کے اموالِ متروکہ جو اب موجود ہیں وہ کس کی ملکیت شمار ہوں گے، نیز ان اموال کا کوئی حصہ ایک مسلمان اپنے تصرف میں لائے تو اس کے لئے از روئے شریعت کیا حکم ہے؟

(۴) اگر حکومتِ پاکستان کا کوئی سرکاری ملازم اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں بغیر اجازت افسران کچھ وقت مسجد کی مرمت میں صرف کرے تو کیا یہ جائز ہے؟

جواب:

ان سوالات کے جواب میں فتویٰ دینا تو کسی مفتی کا کام ہے۔ آپ پاکستان کے صاحب فتویٰ علماء کرام

[illegible]

(۱) پاکستان شرعی اصطلاح کے مطابق اب دارالاسلام ہے۔

(۲) ۱۹۴۷ء کے فسادات کی حیثیت کسی ایک جگہ کے مقامی فساد کی سی نہ تھی کہ ہر جگہ کے فساد کا الگ الگ حکم ہو بلکہ انھوں نے ایک قومی جنگ کی حیثیت اختیار کر لی تھی یعنی غیر منقسم ہندوستان میں بہ حیثیت مجموعی مسلم قوم اور ہندو سکھ قوم کے درمیان اجتماعی دشمنی پیدا ہوگئی تھی اور اس نے بڑھتے بڑھتے جنگ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس حالت میں ظلم و زیادتی دونوں طرف سے ہوئی اور بھلے برے کی تمیز کے بغیر ہر فریق نے بدتر سے بدتر مظالم کا ارتکاب کیا۔ ہمارے نزدیک اس معاملے میں فریقین قصور وار ہیں اور ظلم جس نے بھی کیا ہے برا کیا ہے۔

(۳) ہندوؤں اور مسلمانوں کے اموالِ متروکہ جو اس وقت ہندوستان و پاکستان میں موجود ہیں، سردست کسی کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ دونوں حکومتوں کے پاس اس وقت تک کے لئے امانت ہیں جب تک کہ فریقین میں ان اموال کے متعلق کوئی معاہدہ نہ ہو جائے۔ اس دوران میں کسی فرد کے لئے حلال نہیں ہے کہ ان اموالِ متروکہ میں بطور خود کسی قسم کا تصرف کرے۔

(۴) حکومت کے ملازم کو اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں سرکاری فرائض کے ماسوا دوسرے کام نہ کرنے چاہئیں، بجز ان کاموں کے جن کی سرکاری طور پر اجازت ہو، یا ان فرائض کے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کئے گئے ہوں۔ (ا۔م)

مقامِ صبر

سوال:

مجھے مولانا صاحب ناظم مدرسہ عربیہ سے جماعت اسلامی کے موضوع پر تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ انھوں نے آپ پر مہدی ہونے کا الزام لگایا اور اپنی ملاقات کا تذکرہ فرمایا۔ حاضرین کے دلوں پر کئی قسم کے توہمات غالب کئے۔ کیا جناب نے ظہور مہدی علیہ السلام کی علامات اپنی ذات سے

حسب ... کے اصرار پر تحریری انکار یا اقرار سے پہلو تہی فرمائی ؟ مہربانی فرما کر بذریعہ ...

میرے استفسار کا جواب باصواب عطا فرمائیں۔

جواب:

مولانا اور ان کے گروہ کے علماء نے میرے خلاف جو پروپگنڈا شروع کیا ہے اس سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ مگر میرے لئے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہے۔ بارہا اس طرح کے لوگوں نے طرح طرح کے جھوٹ میرے خلاف پھیلانے کی کوشش کی ہے اور میں نے ہمیشہ ان کے مقابلے میں صبر سے کام لیا ہے۔ میرا اب تک کا تجربہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی جھوٹ کو فروغ نہیں دیتا۔

مولانا صاحب موصوف اور ان کے ساتھیوں نے یہاں آکر مجھ سے جو باتیں کیں اور پھر واپس جاکر جو باتیں شائع کیں، ان دونوں کے فرق پر جب غور کرتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے دل خدا کے خوف اور آخرت کی جوابدہی کے احساس سے بالکل خالی ہو چکے ہیں اور انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا ہے، آگے کوئی نہیں جہاں اپنے اقوال و اعمال کا انھیں حساب دینا ہوگا۔

میرا ہمیشہ یہ قاعدہ رہا ہے اور میں آئندہ بھی اسی پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ جن لوگوں کو میں صداقت و دیانت سے بے پروا اور خدا کے خوف سے خالی پاتا ہوں ان کی باتوں کا کبھی جواب نہیں دیتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے نمٹنا میرے بس میں نہیں ہے، خدا ہی ان سے بدلہ لے سکتا ہے۔ اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ ان کے جھوٹ کی تردید کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ ان کا پردہ انشاء اللہ دنیا ہی میں فاش ہوگا۔ اس لئے آپ مجھ سے یہ توقع نہ رکھیں کہ میں ان کے جواب میں کوئی بیان کسی اخبار کو بھیجوں گا۔

میری کتاب تجدید و احیائے دین جس کی بعض عبارتوں کو غلط معنی پہنا کر وہ مجھے مدعی مہدویت قرار دے رہے ہیں آج کوئی نئی تصنیف نہیں ہے، آج سے دس سال پہلے شائع ہوئی تھی، اس وقت سے اب تک برابر شائع ہو رہی ہے، اور اب بھی ہر جگہ آپ کو مل سکتی ہے۔ آپ اس کو خود دیکھیں، دو چار سطروں یا چند فقروں کو نہیں پوری کتاب کو پڑھیں۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ میں نے اس میں اپنی مہدویت یا مجددیت کا دعویٰ کیا ہے یا دعوے کرنے والوں کی تردید کی ہے!

(ا۔م)

ایک گمنام خط کا جواب

سوال :

میں نے ایک دوشیزہ کو لالچ دیا کہ میں اُس سے شادی کر دوں گا۔ پھر اس کے ساتھ خلافِ اخلاق تعلقات رکھے۔ میں نہایت دیانتداری سے اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس لڑکی کے خاندان کی عام عورتیں زانیہ اور بدکار ہیں۔ یہاں تک کہ اُس کی ماں بھی۔ اب مجھے خوف ہے کہ اگر میں اس لڑکی سے شادی کر لوں تو وہ بھی بدچلن ثابت نہ ہو۔ ترجمان القرآن کی اشاعت میں مطلع کیجئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

جواب :

یہ ایک گمنام خط ہے جو ہمیں حال میں وصول ہوا ہے۔ عموماً گمنام خطوط جواب کے مستحق نہیں ہوا کرتے۔ لیکن اس کا جواب اس لئے دیا جا رہا ہے کہ ہماری بدقسمت سوسائٹی میں اس وقت بہت سے ایسے نوجوان موجود ہیں جن کے اندر سائل کی سی ذہنیت پائی جاتی ہے، جو خود بدکار ہیں مگر شادی کے لئے کوئی ایسی لڑکی چاہتے ہیں جو عفیفہ ہو، اور جن کی خواہش یہ ہے کہ جس ظرف کو انھوں نے خود گندا کیا ہے اسے دوسروں کے لئے چھوڑ کر اپنے لئے کوئی ایسا ظرف تلاش کریں جسے کسی نے گندہ نہ کیا ہو۔

جناب سائل سے گزارش ہے کہ جس لڑکی کو آپ نے خود شادی سے پہلے خراب کیا ہے اس کے لئے آپ سے زیادہ موزوں کون ہو سکتا ہے، اور وہ آپ سے زیادہ اور کس کے لئے موزوں ہو سکتی ہے؟ آپ کو اپنے لئے نیک چلن لڑکی کیوں درکار ہے جب کہ آپ خود بدچلن ہیں؟ جب اس لڑکی نے شادی سے پہلے اپنے جسم کو آپ کے حوالے کیا تھا کیا اُسی وقت آپ کو یہ معلوم نہ ہو گیا تھا کہ وہ بدچلن ہے؟ پھر آپ کو اب یہ اندیشہ کیوں لاحق ہوا کہ آگے چل کر وہ کہیں بدچلن ثابت نہ ہو؟ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے ملوث ہونا تو نیک چلنی ہے اور صرف دوسروں سے ملوث ہونے کا نام ہے؟ پھر اس کے خاندان کی عورتوں پر آپ کا اعتراض بھی عجیب ہے۔ وہ خواتین کرام جیسی کچھ بھی ہیں، اسی لئے ہیں کہ آپ جیسے معزز اصحاب سے ان کو سابقہ پیش آتا رہا ہے۔

[illegible] پہلے ان مردوں کے نام [illegible]

ظاہر فرماتے ہیں بہرا نہ لیجیے۔ آپ دانستہ یا نادانستہ ٹھیک اُس خاندان میں پہنچ گئے ہیں جس کے لیے آپ موزوں تر ہیں اور جو آپ کے لیے موزوں تر ہے۔ کسی دوسرے پاکیزہ خاندان کو خراب کرنے کے بجائے آپ اسی خاندان میں ٹھیر جائیں جس کو آپ جیسے لوگ پہلے خراب کر چکے ہیں اور جسے خراب کرنے میں آپ کا حصہ بھی شامل ہے۔

آخر میں محترم سائل کو قرآن کی دو آیتیں بھی سنا لینی چاہئیں۔ پہلی آیت یہ ہے:

الزانی لاینکح الا زانیۃ او مشرکۃ، والزانیۃ لاینکحہا الا زان او مشرک وحرم ذالک علی المومنین (النور-۱)	زانی مرد نکاح نہیں کیا کرتا مگر ایک زانیہ یا مشرکہ عورت سے۔ اور زانیہ عورت سے نکاح نہیں کیا کرتا مگر ایک زانی اور مشرک۔ اور ایسا کرنا مومنین پر حرام ہے۔

اس آیت میں "نکاح نہیں کیا کرتا" سے مطلب یہ ہے کہ زانی مرد اس لائق نہیں ہے کہ اس کا نکاح زانیہ یا مشرکہ کے سوا کسی اور سے ہو۔ اور زانیہ عورت کے لئے اگر کوئی شخص موزوں ہے تو زانی یا مشرک مرد، نہ کہ کوئی مومن صالح۔ دوسری آیت یہ ہے:

الخبیثٰت للخبیثین والخبیثون للخبیثٰت والطیبٰت للطیبین والطیبون للطیبٰت۔	بدکار عورتیں بدکار مردوں کے لئے ہیں اور بدکار مرد بدکار عورتوں کے لئے۔ اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے۔

مکتوبِ جرمنی

(ذیل میں ایک خط اور ایک طویل مراسلہ درج کیا جا رہا ہے جو حال میں ہم کو جرمنی سے وصول ہوا ہے۔ صاحبِ مکتوب کی اپنی خواہش بھی یہ ہے کہ ان کے اس مراسلے کو شائع کیا جائے، اور ہم خود بھی یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اسے ان سب لوگوں تک پہنچا دیا جائے جو اشاعتِ دین سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس مراسلے میں بڑی خوبی کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ دو لڑائیوں میں شکست کھانے کے بعد اس وقت جرمن قوم کس حالت میں ہے اور اس کے اسلام سے متاثر ہونے کے امکانات کس حد تک روشن ہیں۔ جماعت اسلامی دل سے چاہتی ہے کہ عبدالرحمٰن روسلر صاحب اور ان کی حزبِ اسلامی کو اسلام سے متعلق مفید لٹریچر فراہم کر کے دے لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک ہمارے لٹریچر کے انگریزی تراجم کا خاطرخواہ انتظام نہیں ہو سکا ہے۔ اگر کچھ خدا کے بندے اس خدمت کے لئے آگے بڑھیں اور انگریزی تراجم کی اشاعت میں ہماری قلمی اور مالی اعانت کریں تو انشاء اللہ نہ صرف جرمن قوم تک، بلکہ دنیا کی دوسری قوم تک بھی دینِ حق کا پیغام پہنچانے کے لئے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے)

جنابِ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی السلام علیکم

برادرِ اسلام! میں انتہائی مسرت اور گہرے جذبۂ احترام کے ساتھ آپ کی تازہ ارسال کردہ اسلامی کتابوں کی وصولی کی اطلاع آپ کو دیتا ہوں۔ یہ کتابیں صرف میرے لئے ہی نہیں بلکہ یہاں ہم سب کے لئے غایت درجہ دلچسپ، مفید اور قابلِ قدر ہیں۔ میں اپنی جماعت کی طرف سے آپ کی اس عنایت کا انتہائی مخلصانہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ فی الواقع جرمنی میں اشاعتِ اسلام سے دلچسپی رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کے خیالات و افکار یہاں کے لوگوں تک پہنچیں۔ چنانچہ میں اس خط کے ساتھ آپ کی رہنمائی کے لئے اس ملک کے حالات کی ایک روداد بھیج رہا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ ہمیں اپنے مقاصد کے لئے یہاں کس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔

میں آپ سے یہ درخواست کرنے کی بھی جرأت کرتا ہوں کہ آپ اپنے ذاتی ارشادات سے بھی ہمیں نوازیں کیونکہ ہمارے کام میں آپ کی شخصی اور مخلصانہ دلچسپی ہمارے لئے ممنونیت کا باعث ہوگی۔ اسی طرح یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ میں بھی باہمی روابط کو بڑھانے کے لئے ہر سعی کرنے کے لئے تیار ہوں، بلکہ فی الحقیقت آپ مجھے یہاں اپنا نمائندہ شمار کر سکتے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ اسلام سے متعلق آپ کی تجاویز اور معلومات کو بڑے وسیع اور با اثر حلقوں کے اندر بجنسہ پوری دیانت اور غیر جانبداری کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔ اور یہ سب کچھ اس اسلامی اخوت کی بنا پر ہوگا جس کے لئے ہم اخلاص کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

میں آپ کی طرف سے جلد جواب آنے کی توقع رکھتا ہوں اور بخلوص، تشکر اور احترام کے جذبات پیش کرتا ہوں۔

المخلص فی الاسلام

عبدالرحمٰن روسلر

[جس روداد کا اوپر کے خط میں حوالہ دیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہے]

حزبِ اسلامی ہمبرگ

۱۹۴۵ء میں جرمنی کی شکست کے فوراً بعد مسٹر عمر شوبرٹ (OMAR SCHU BERT) مسٹر عبدالرحمٰن روسلر (RÖSELER) اور دوسرے مسلمان رفقا کی مدوجہد کے نتیجے میں ہمبرگ کی 'حزبِ اسلامی' کی دوبارہ تنظیم ہوئی۔ ۳۱ جنوری ۱۹۵۰ء کو اسے حکومت نے سرکاری طور پر تسلیم کر لیا اور اس تحریک نے باقاعدہ طور پر اپنے نصب العین کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔ کام کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سب سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ 'حزبِ اسلامی' کا مسلمانوں کے کسی خاص فرقے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کے سامنے اسلام کا کوئی محدود تصور ہے، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا 'حزبِ اسلامی' کا دنیا کے ہر مسلمان سے اور ہر اس شخص سے جو اسلام سے دلچسپی رکھتا ہو، یکساں تعلق ہے۔ ہماری مخلصانہ اسلامی محبت و اخوت عالمگیر، عمومی، دائمی، مستحکم، سچی اور بے لوث ہے ہم اپنے اللہ کے اطاعت گزار ہیں اور اس کی حمد و ستائش کے ساتھ ہم اس کی پوری کائنات اور مخلوق کے ساتھ یکساں محبت رکھتے ہیں، متعدد اسلامی اداروں سے ہمارے

[illegible]

اللہ کی اصلی اور صاف ستھری صورت میں ایک بار قاری دینی دسترخوان پر پہنچ دیتے ہیں جہاں سے ہر شخص اُن

ستفادہ کر سکتا ہے اور بذاتِ خود اسلام کی عظمت کا مشاہدہ کر کے اس حقیقت کو پہچان سکتا ہے کہ اس کے بعد

ت میں ایک ہی خالص، غیر فانی اور حیات بخش روح موجود ہے ——— وہی روح جو ہر ایک مومن صادق

ل میں زمان و مکان کی قید سے بے نیاز ہو کر جاری و ساری ہے۔

۱۔ مسٹر عمر ہوبرٹ ۶۔ فروری ۱۹۰۵ء کو برلن میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۔ فروری ۱۹۳۰ء کو عقلی دلائل سے مطمئن ہو کر
ہ باسلام ہوئے۔ آپ کو 'حزب اسلامی' کا صدر منتخب کیا گیا کیونکہ آپ نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور
اسلامی کے امورِ داخلی و خارجی کو نہایت عمدہ طریقے سے منظم کیا تھا۔ آپ نے انتہائی خطرات کے مواقع پر
ان جوکھوں میں ڈال کر تعلق باللہ کا ثبوت بہم پہنچایا۔ آپ کا وسیع حلقۂ احباب پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ حکمت
ور اسلامی تاریخ سے آپ کو خاص شغف ہے۔ کئی مقالوں کے مصنف ہیں اور چیدہ حاضرین کے مجمعوں میں
ہانے بارہا اسلامی موضوعات پر تقریریں کی ہیں۔ آپ کی زندگی کلیۃً خدمتِ دین کے لئے وقف ہے۔

۲۔ مسٹر فرانز ایرک عبدالرحمن روسلر (MR. FRANZ ERICH ABDURRAHMAN RÖSELER) ۵۔ اپریل ۱۹۲۱ء
برگ میں پیدا ہوئے۔ جون ۱۹۴۲ء میں باقاعدہ طور پر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ چودہ سال کی عمر میں انھوں نے
ہم خواب دیکھا جس میں انھیں اشارہ ہوا کہ وہ اسلام کے مشن کے حامل ہیں۔ آخرکار انھوں نے اس مقصد کے لئے
پ کو بالکل فارغ اور یکسو کر لیا۔ دین کی خاطر یہ کئی مرتبہ جان پر کھیل چکے ہیں۔ اپنے اوصاف اور صلاحیتو
اپر ان کو حزبِ اسلامی کا نائب صدر اور باقاعدہ نمائندہ تجویز کیا گیا۔ ان کی خاص ذمہ داری یہ ہے کہ وہ [illegible]
کے نگران ہیں۔ اُن کے بارے میں کچھ معلومات میر لائق علی صاحب آپ کو دے چکے ہیں جس کے لئے ہم
ممنون ہیں۔ روسلر صاحب ایک مانے ہوئے عالمِ دین اور خطیب ہیں۔ جرمنی کی انجمن مصنفین کے رکن ہیں۔
ہ دینی مقالے اور فیئل پوسٹ، برلن اور اسلامک ریویو، انگلینڈ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ نیچرل ایسوسی
امریکہ کے بھی رکن ہیں اور اصولِ دین کو علوم سائنس پر منطبق کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ تمام غیر ملکی
[illegible] انچارج [illegible]۔ حزبِ اسلامی کے دار [illegible] جتنے استقبالات، دعوتیں [illegible]

پہلے [illegible] کے سپرد ہے۔ یہ ہماتحانہ ٹریمزبیوٹل (TREMSBUTTEL) کے قصر میں قائم کیا گیا
جو شمالی جرمنی کے خوبصورت ترین اور خوش منظر ترین قصروں میں سے ایک ہے اور اپنے قدیم ارتقاء کی
وجہ سے خاص طور پر مشہور ہے۔ بارگٹے ہائڈ (BARGTEHEIDE) میں اُن کا ایک عمدہ مکان اور باغ ہے۔

مسٹر عمر شوبرٹ اور مسٹر عبدالرحمٰن ردسلر کی سالہا سال کی دیرینہ رفاقت ہے۔ وہ ہمیشہ مل کر کام کرتے رہے ہیں۔ اُن کے برلن مسجد سے دوستانہ روابط تھے۔ جب 'حزبِ اسلامی' کی تنظیم مستحکم ہوگئی تو برلن مسجد روابط اور گہرے ہو گئے اور برلن مسجد کے تعاون سے اس امر پر اتفاق ہو گیا کہ عمر شوبرٹ ہیمبرگ کے ناظم رہیں اور عبدالرحمٰن ردسلر برلن مسجد کی جمعیتِ مسلمین اور یونیورسل اسلامک یونین (اسکندریہ) کی مقامی شاخ کے ڈائرکٹر رہیں اور انجمن احمدیہ اشاعت اسلام لاہور کے لٹریچر کی اشاعت کے ذمے دار ہوں۔ اس کام کی مزید توسیع کی توقع ہے۔ اسلام کے لئے ہماری متحدہ مساعی کو اس تعاون سے بے حد فائدہ پہنچا۔ برلن مسجد خاص حالات کی وجہ سے اپنے کام کو صرف برلن کے تنہا شہر میں ہی مرتکز کر سکی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم مغربی جرمنی میں پُر خلوص سرگرمی اور امکانی حد تک بہترین ذرائع کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ باہمی امداد سے اس کام کو اور زیادہ تقویت پہنچ رہی ہے۔

جرمنی کی موجودہ ذہنی کیفیت

ماضی قریب اور ماضی بعید کے ہنگامہ خیز واقعات نے یہاں ذہنوں پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں جو ابھی تک پورے طور پر محو نہیں ہو سکے ہیں۔ ان واقعات میں سے اہم ترین گزشتہ دو عالمگیر لڑائیاں ہیں جن میں سے دوسری ابھی ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی ہے۔ اس کے بعد بدحالی، اخلاقی بے راہروی، عدم تحمل، چاپلوسی، بہتان تراشی، بے انصافی، ظلم و ستم، خودکشی، قتل و غارت، چوری، بے ضمیری، سوئے ظن، خودغرضی، اور خدا و خلق سے بیزاری کا دور دورہ ہو گیا۔ اجتماعی نظربندی کے کیمپ وجود میں آئے جہاں لاکھوں مرد، عورتیں اور بچے قتل کر دیے گئے یا اپاہج اور بیکار بنا دیے گئے۔ بیماری اور موت چاروں طرف منہ کھولے کھڑی تھی۔ لاکھوں پناہ گزین اپنی املاک کھو دینے کے بعد بمباریوں سے جلی بھنی ہوئی آبادیوں میں زندگی اور موت

[illegible]

ہو گیا اور گیس اتنا تی جرائم کو جنم دیا۔ نوجوان نسل جو باطل مگر دلفریب نظریات کی شدت سے معتقد تھی

جرمنی کے انکشاف کے بعد ایک ذہنی صدمے سے دوچار ہوئی۔ مگر ان تلخ شواہد کے باوجود بعض ابھی تک

[illegible]بی کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

[illegible]بی جرمنی کی ریاست [illegible]یام تک کے حالات

جب جنگ ختم ہوئی تو جرمنی عملاً مغربی اور مشرقی دو باہم مخالف خطوں میں بٹ چکا تھا۔ اس تقسیم کو اب قطعی تصور کیا جا سکتا ہے۔ مغربی جرمنی [illegible] گنجان آباد تھا۔ اب یہاں مشرقی جرمنی کے پناہ گزینوں کی درآمد کا بھی تانتا بندھ گیا۔ اشیاء کے کنٹرول، [illegible] اور چور بازاری کا وہی عالم تھا۔ زرِ کاغذی کی گردش میں مسلسل اضافہ اور قیمت میں مسلسل تخفیف ہوتی [illegible]۔ بے شمار لوگ بے روزگار ہو گئے۔ لولے، لنگڑے، بیمار، بھکاری، مصیبت زدہ بچے اور بوڑھے [illegible] کی تعداد میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ نہ ان کا گھر بار تھا، نہ اعزہ و اقربا تھے، نہ رہنے کی کوئی [illegible] اور نہ کرنے کو کوئی کام تھا۔ ان کے پاس اپنے کوئی ذرائع نہ تھے اور دوسروں کی مدد کو وہ تامل اور [illegible]کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ بڑے بڑے شہروں کے تاریک کھنڈرات میں بھٹکتے ہوئے اب تک ایک [illegible] غیر متعین اور بھیانک مستقبل کے منتظر ہیں۔ یہ ہمارا تشویشناک ترین قومی مسئلہ ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں [illegible] دیا گیا ہے۔ باشندوں کو غیر نازی بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے ردِ عمل میں نئی پارٹیاں وجود [illegible] آئی ہیں جو باہم گرم پیکار رہیں۔

اس کے بعد سکے کی قیمت میں کمی (DEVALOATION) واقع ہوئی اور مارکٹ کچھ سہارا پاکر آباد ہو گئی۔ [illegible] چیز باسانی دستیاب ہونے لگی۔ زندگی کے ظاہری آثار نمودار ہونے لگے۔ لیکن طبیعتیں جو مصائب کی [illegible] ہو چکی تھیں وہ ان تغیرات کو بآسانی نہ اپنا سکیں۔ غالباً اسی وجہ سے تفریح اور دل لگی کے عجیب و غریب [illegible] اوقات بڑے کردہ طریقے ایجاد ہوئے۔ چنانچہ اب بھی ان جگہوں پر لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے جہاں [illegible] "مغروبات" پیش کئے جاتے ہیں۔ اس میں بڑی حد تک ان نوا مغزوں کا ہاتھ ہے جن کا انتہائی زور [illegible] ہے کہ دیرینہ روایات کو ملیامیٹ کر دیا جائے۔ لیکن یہ ایک عارضی صورت حال ہے [illegible]

[illegible] مقاصد اور نصب العین کی تلاش کے آثار نظر آنے لگے ہیں، اسی تلاش [illegible]
بھی مضبوطی سے مطابقت کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تلاشِ حق کے لئے یہ گرمجوشی اور ولولہ اگرچہ ابھی ایک
اور غیر معین صورت میں ہے تاہم اس کی قوت اور اس کے خلوص کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ اس وقت
جرمن ریاست کی تعمیرِ نو کا مرحلہ درپیش ہے اور ایک نوخیز قوم کے دوبارہ احیاء کا آغاز ہو رہا ہے، اس
اس وقت نئی اقدار کے قبول کئے جانے کا زیادہ امکان ہے۔ جرمنوں کی یہ آمادگی اور یہ میلان اتنا نمایاں
ہے کہ دنیا کی تمام قومیں اس سے استفادے کا اہتمام کر رہی ہیں۔ چنانچہ یورپ والوں کا یورپ ہاؤس، امریکہ والوں کا امریکہ
اور انگریزوں کا برج (BRIDGE) موجود ہے جہاں پر یہ لوگ اپنے تہذیبی تصورات کو نوعمر اور مشتاق حاضر
سامعین پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان اداروں کے ساتھ دار المطالعے اور لائبریریاں موجود ہیں، جہاں گا [illegible]
تقریروں، مباحثوں، فلمی تصویروں اور نمائشوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ان اداروں میں سے اکثر کو تقو
نوجوانوں ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ فطرت کا قاعدہ ہے کہ غنچے روشنی کی سمت پھوٹی اگتے اور کھ
اس میں بھی شک نہیں کہ پرانی اقدار چونکہ مغلوب ہو چکی ہیں اور بہر حالت میں صحیح ثابت نہیں ہوئیں، اس
جوان نسل شکی مزاج ہو گئی ہے اور نئی اقدار جو مختلف گوشوں سے اُن کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں اُن
بارے میں بڑی چھان بین کی جاتی ہے۔

موجودہ ذہنیت دنیا کے تازہ ترین واقعات نے ہر شخص کے ذہنی جوہر کو، جیسا کچھ بھی وہ اس
بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ ذہنی فضا میں سے اس وقت سب سے نمایاں خصوصیت "خوف" ہے ——
اس کا خوف کہ کہیں نئی جنگ نہ چھڑ جائے، کہیں تہذیبی، سیاسی اور معاشی حالات پہلے سے بدتر یا بد
نہ ہو جائیں، کہیں تازہ مقاصد تک رسائی میں پھر ناکامی نہ ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی خدا کا وجود ہی نہ
ایسا نہ ہو کہ ہر چیز ایک اندھے بہرے ارادے کے رحم و کرم پر ہو۔ ایسے ہی جذبات کی بنا پر خودکشی کے وا
آئے دن رونما ہو رہے ہیں۔ دورانِ خون کی زیادتی، حرکتِ قلب کا یکایک بند ہو جانا، اعصابی تکالیف
اور اسی قسم کے دوسرے امراض نہایت کثرت سے پھیل رہے ہیں۔ اس کی اصل وجہ وہی "خوف" اور "ہول"
جو مختلف صورتوں میں دلوں پر طاری ہے۔ بہت سے لوگ تند مزاج، قنوطی یا بے حس ہو جاتے ہیں۔

[illegible] اختیار کر لئے گئے ہیں بعض اپنے نظریے [illegible]
پیشہ ورانہ کاموں میں شدتِ انہماک سے حصہ لیتے ہیں اور تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ایک ہیجان انگیز مشغلے کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرتے رہتے ہیں کہ کہیں زندگی کی کسی ایسی تلخ حقیقت سے دوچار نہ ہونا پڑے جس کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو بے بس پائیں۔ اُن کا یہ رویہ بعض مرتبہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور ان کے ذہنی نشو و نما کو بہت صدمہ پہنچتا ہے اور اس میں ترقی کے بجائے تنزل شروع ہو جاتا ہے اگرچہ لوگ حق کی روشنی کے لئے بے تاب ہیں لیکن ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جو الہامی اقدار کا علم رکھتے ہیں۔

جرمنی کے کلیساؤں کی موجودہ حالت

کلیسا اپنے ریوڑ کی منتشر اور سرکش بھیڑوں کو باقاعدہ کے اندر رکھنے کے لئے پورا زور صرف کر رہے ہیں۔ سوائے چند مستثنیات کے لوگ چرچ میں کسی ذہنی اور عقلی وابستگی کی وجہ سے نہیں بلکہ روایاتی بندھنوں کی وجہ سے آتے ہیں۔ باضابطہ عیسائی کہلانے والوں میں سے بھی بہت کم ایسے ہوں گے جو وجودِ باری اور مذہب کے بارے میں اپنے عقائد کو کسی کے سامنے دلائل سے صحیح ثابت کر سکیں۔ میں نے یہ کبھی بھی نہیں سنا کہ کسی پادری نے لوگوں کے سامنے ایسے دلائل کی وضاحت کی ہو۔ بائبل کے اقتباسات کو وہ روایتی انداز میں بار بار پڑھتے رہتے ہیں لیکن اپنی تبلیغ کا آغاز ہمیشہ اس غلط مفروضے سے کرتے ہیں کہ ان کے سامعین خدا پر پختگی یقین رکھتے ہیں اور بائبل کو خدا کا واحد کلام سمجھتے ہیں۔ میں اس طرح کے وعظوں میں خود حاضر ہوا ہوں۔ اُن کا انداز استدلالی نہیں بلکہ تحکمانہ ہوتا ہے اور سننے والوں کا ذہن کبھی اس سے مطمئن نہیں ہوتا۔ ایک تازہ چرچ کانفرنس میں اربابِ کلیسا نے بلا تامل یہ تسلیم کیا ہے کہ باقاعدہ عیسائیوں اور کلیسا میں حاضری دینے والوں میں سے صرف چند فی صد ایسے ہیں جنہیں صحیح معنوں میں مسیحی شمار کیا جا سکتا ہے۔ پادری اس صورتِ حال کی تبدیلی اور عیسائیت کے احیاء کے لئے کوشاں ہیں۔ شمالی جرمنی میں (EVANGELICAL CHURCH) کسی حد تک اظہارِ رائے کی آزادی دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے پیرو کھلم کھلا "کلیسائیت" سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ "ہمیں اس کا یقین نہیں کہ پادری جن نظریات کی ہم کو تبلیغ کرتے ہیں آیا وہ خود بھی ان پر ایمان رکھتے ہیں یا نہیں؟" نوجوان خصوصاً مسیحی تصورات کے بارے میں شک میں [illegible]

یہاں [illegible] زیادہ افسوسناک چیز یہ ہے کہ جب روایاتی عقیدہ پر سے اعتقاد متزلزل ہو جاتا ہے اور
کوئی نیا عقیدہ اس کی جگہ نہیں لیتا تو ایک خطرناک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں یا تو آدمی متروک
روایات پر ایمان رکھنے کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے جو ریاکاری اور نفاق پر مبنی ہوتا ہے یا وہ دیانتداری سے اُن روایات
کو جھٹلا دیتا ہے اور اس حالت میں نہ اسے کوئی نئی روشنی نصیب ہوتی ہے اور نہ وہ پُرانی تاریکیوں کو قبول
کر سکتا ہے۔ جنوب مغربی جرمنی کا رومن کیتھولک چرچ اپنے پیروؤں پر نسبتۃً زیادہ اثر رکھتا ہے حالانکہ اُس
کے معتقدات دلائل و حقائق سے بعید تر ہیں۔ یورپ اور اُس کے نائبین عظیم جلسہ بازیوں، ہنگامہ پرستیوں
اور صرف آرائیوں سے اپنے گلوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حال ہی میں مقدس سال کا اہم ترین
فرمان اس واقعہ کے بارے میں جاری کیا گیا ہے کہ مریم ——— مادرِ خدا ——— اپنے جسد و روح کے ساتھ
بنفسِ نفیس خدا کے ہاں تشریف لے گئی ہیں۔ جب اس کے متعلق فلمی مناظر یہاں ہمبرگ میں دکھائے جا رہے
تھے تو لوگ ان کا علانیہ مذاق اڑا رہے تھے۔ بہرحال ان فلموں میں ہزاروں آدمیوں کے مجمعے یورپ کے محل کے
سامنے فرمان کے منتظر سمٰعاً و طاعۃً کھڑے دکھائے جاتے ہیں۔ کیتھولک چرچ کی نسبت پر EVANGELICAL
CHURCH کی نسبت مضبوط تر اسناد و روایات ہیں اور اُس کے بہت سے پیرو اُن سے نسلی اور موروثی وابستگی
رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں کے سامنے یکساں قسم کی مشکلات ہیں۔ بس اتنا ہے کہ بہت سے لوگ
اپنے خالق سے رابطہ قائم کرنے کا واحد وسیلہ کلیساؤں کو سمجھتے ہیں اس لئے وہ اسے تھوڑی بہت تسکین کا ہی
ذریعہ سمجھ کر اس سے پیوستہ ہیں ورنہ کلیسا ذہنی طمانیت اور تربیتِ اخلاق کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس کے
پیروؤں میں اضافے کا انحصار فقط توالد و تناسل پر ہے۔ میں نے کبھی نہیں سنا کہ مشنریوں نے صحیح معنوں میں
یہاں کوئی کام کیا ہو۔ اپنے نام لیواؤں، اور اُن میں سے خصوصاً نوجوانوں کو سمیٹ کر رکھنے کے لئے کلیسا خاص
طور پر موسیقی کلب، سیر و سیاحت، تفریحی دوروں اور پارٹیوں کا انتظام کرتے ہیں۔ اب 'مذہبی فلموں' کو بھی آزمایا
جا رہا ہے۔ ان فلموں کی بنا کسی تازہ ایمانی کیفیت پر نہیں ہوتی بلکہ پرانے مذہبی افسانوں پر ہوتی ہے۔ ان سے
قطعاً یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ ایمان اور ایمان کی کوئی متعین صورت انسان کے لئے ضروری ہے۔ نوجوان خدا کے
وجود کے لئے دلائل و شواہد چاہتے ہیں۔ وہ ذاتی تحقیق اور اطمینان کے واسطے سے ایمان کی دولت حاصل کرنا

[illegible]

خدا کے نام پر تحزّب، فرقہ بندی اور عدم رواداری سے متنفر ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مذہب اور سائنس،
خالق اور مخلوق میں کامل رفاقت ہو۔ وہ تمام انسانوں سے محبت اور تعاون علی البر کا رویہ رکھنا چاہتے ہیں
چونکہ کلیسا ان کے سامنے یہ نصب العین نہیں رکھتے اور اس کے ساتھ اس کے بھی مدعی ہیں کہ صرف انھی کے
پاس ان مسائل کا صحیح جواب ہے، اس لئے طالبینِ حق چرچ اور اس کے خدا دونوں سے دور بھاگتے ہیں ہر انسان
جس کے اندر اپنے خدا کی خالص طلب موجود ہوتی ہے۔

خلاصۂ بحث

جرمنوں کی اکثریت میں خصوصاً ان کی نوجوان نسل میں اگرچہ اس وقت تمام سلبی اور منفی عوامل
کارفرما ہیں، تاہم ان کے اندر ایک نئے نصب العین کی شدید طلب اور جستجو موجود ہے ——
ایک ایسا نصب العین جو انھیں طمانیت، مسرت اور مقدس فرائض کی انجام دہی میں محو کر دے۔ وہ خالق کائنات
تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک صحت مند اور متوازن زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے باطنی اور روحانی قویٰ
کے فطری نشو و نما کے خواہش مند ہیں۔ وہ حقائق کا سبق آموز مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پیش قدمی کے لئے
ہموار اور پختہ زمین کی تلاش میں ہیں۔ اپنوں میں سے یا اغیار میں سے جو کوئی بھی انھیں اپنے کسی مخلصانہ قول
و فعل کے ذریعے سے خیر سگالی یا اعانت کی پیشکش کرے اُسے وہ خوش دلی سے قبول کرتے ہیں۔ اس کے
ساتھ ساتھ وہ محتاط بھی ہیں اور قدرتی طور پر سائنس کی طرف زیادہ متوجہ ہیں، کیونکہ اس کی معلومات اُن
کے نزدیک حقائق ہیں۔ علومِ طبیعی سے اُن کو غایت درجہ شغف ہے۔ یونیورسٹیاں، ہائی اسکول اور جلقہائے
مطالعہ طلبہ سے بھرپور رہتے ہیں۔ بہت سے طلبہ اور طالبات کو انتہائی ناسازگار حالات میں تعلیم کے
لئے فیس کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ یہ سب علم برائے علم کے قائل نہیں ہیں بلکہ اکثر اس طرح اپنی
روحانی تشنگی کے بجھانے کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ سائنس کے قوانین میں انھیں اللہ کی مشیت کار
فرما ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ انھیں اس سے تسکین نصیب ہوتی ہے کہ وہ ایسے راستے پر گامزن ہیں جو بالآخر
خدا تک پہنچتا ہے۔

اسلام اور جرمنی

اسلام کے بارے میں معلومات

لوگوں کو اسلام کے بارے میں بہت ہی کم معلومات ہیں۔ اس صورت حال کے ذمہ دار بعض خود غرض عناصر ہیں۔ اسلام کے بارے میں لوگوں کے بڑے غلط اور گمراہ کن تصورات ہیں جو غلط معلومات، متعصبانہ تحریروں، تقریروں اور بیجا روایتی قیود کا نتیجہ ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اسلام کو سرے سے ایک الہامی دین ہی نہیں سمجھتے کیونکہ کلیسا مسلمانوں کو اب تک "بے دین" HEATHENS کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اشاعتِ اسلام کی تازہ کوششیں

۱۹۴۵ء کے بعد جب مسلمانوں نے اپنا کام دوبارہ شروع کیا اور اسلام کے نظریۂ حیات اور اصولِ سائنس میں کامل تطابق ثابت کرنے کی کوشش کی تو لوگ حیرت زدہ ہوگئے۔ مسلمانوں کی کامیابی نے پوپ کو بھی چونکا دیا اور اس نے ۱۹۵۰ء کو اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ وہ اسلام کی اشاعت کو روکنے کے لئے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں لیکن اسلام کی اشاعت نہ رک سکی بلکہ تیزی سے بڑھتی چلی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم اپنی قوم کی ذہنیت، اس کی الجھنوں، اس کی امنگوں، اور اس کے خدشات کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے پیچیدہ اسباب و نتائج کا تجزیہ اسلامی نقطۂ نظر سے صرف ایسے ہی افراد کر سکتے تھے جو ان حالات کا شخصی طور پر سالہا سال تک مشاہدہ کرتے رہے ہوں۔ یہ صرف ہمیں ہی معلوم ہو سکتا تھا کہ کس طرح اپنے لوگوں کی روح کی گہرائیوں میں اتر کر ان کی وہ خدمت انجام دی جا سکتی ہے جو ہمارے پروردگار نے ہمارے سپرد کی ہے اور کس طرح انھیں ایک فطری ارتقا کی [illegible] ڈالا جا سکتا ہے۔ اب ہماری بنیاد مستحکم اور سرکاری حیثیت سے تسلیم شدہ ہے۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک متعدد مخلص اور ذی اثر احباب ہیں۔ یہاں بہت سے لوگ ہیں جو باقاعدہ مسلمان نہیں ہوئے ہیں، بلکہ کلیسا کے اندر عیسائی ہی اور رہتے ہیں، لیکن وہ کسی وقت کے منتظر ہیں کہ پورے طور پر کھل کر میدان میں آ جائیں۔ ان کے خیال میں خالق و مخلوق [illegible] ہم ہی انھیں [illegible] اور سچی جستجو، اسلامی اور سائنٹفک معلومات دے کر ان کے دل و دماغ کی تسکین کا سامان پیدا کر سکتے ہیں۔ جو لوگ پہلے شک اور تردد میں مبتلا تھے۔

ہمیں حقائق سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ ان کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی دلچسپیاں بڑھتی اور ربط
باہمی زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد محبت، اعتماد، افہام و تفہیم اور آخر کار عملی تعاون کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔

ہمارا کام

ہم اب وسیع پیمانے پر پورے جرمنی کے لئے ایک "مرکزِ اسلامی" کی تشکیل کر رہے ہیں۔ اس کا
آغاز نہایت کامیابی کے ساتھ ہو چکا ہے۔ ہم اسلام کے بارے میں معلومات چاہنے والے
فرد، جماعت یا تحریک کے سامنے اسلام سے متعلق پوری معلومات بلاکم و کاست پیش کر رہے ہیں،
یہاں جو جرمنی یا باہر سے ہمارے پاس آتا ہے ہم اُسے ہر طرح کی امداد اور مشورہ بہم پہنچاتے ہیں۔ اسی
اپنے ملکی اور غیر ملکی مسلمانوں اور اسلام سے دلچسپی رکھنے والے بھائیوں کے لئے ہم تحصیل علم اور
نس کے مطالعے کا انتظام کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں جرمنی بھر میں دورے، خطابات اور طلبہ و اساتذہ
مذاکرات بھی ہوتے ہیں۔ لٹریچر اور اخلاقی فلموں کا بھی انتظام کر لیا گیا ہے۔ ہمارے ایک مہربان فلم ساز
متعدد فلمیں سائنس اور علوم اجتماعی سے متعلق تیار کر کے دی ہیں۔ ان میں قوانینِ طبعی کو کرشمہ ہائے
ت کے رنگ میں دکھا کر وجودِ باری کے اثبات کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ یہاں اور باہر کے بعض
دل حضرات اس کام میں پورا تعاون کر رہے ہیں۔ غرض ہمارے پیشِ نظر تمام دنیا کے مسلمانوں اور
م سے دلچسپی رکھنے والوں کی فلاح و بہبود ہے۔ عالمِ اسلام کے وقار اور قدر و منزلت میں اضافے کے
جد و جہد کرنا ہمارا خصوصی اور خوشگوار فریضہ ہے۔ ہم بے غرضی، دیانت اور خلوص کے ساتھ صحیح اسلامی
رو تصورات کی اشاعت اور وکالت کر رہے ہیں۔ ہم اسلامی دنیا کے ہر فرد کی خدمت کے لئے تیار ہیں
ہم اسلام کی ذہنی اور علمی امامت دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں، وہ امامت جس کا ہر سچا مسلمان علمبردار
خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہو۔

ایسے کام کی اہمیت

یہ ایک نہایت ہی اہم کام ہے جو یہاں کے اور متعدد مسلمان ملکوں کے ادارے
کی مدد سے کیا جا رہا ہے۔ اس سے ان لوگوں کے اندر اسلام سے دلچسپی اور
ت پیدا ہو رہی ہے جو اب تک گمراہ کن معلومات کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں سے رو گرداں تھے۔ ہمارے
کی اہمیت کا احساس یہاں دن بدن بڑھ رہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسی سچی اخوت کی بنا پر اقوامِ عالم

…سے قریب تر لائی جا سکتی ہیں۔ ہم آپ سے اور دیگر اسلامی ممالک کے افراد اور اداروں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس کام کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہماری طرف تعاون و اعانت کا ہاتھ بڑھائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس کام کی افادیت سے انکار نہ ہوگا۔ اسی میں اللہ کی رضا اور انسان کی فلاح کا راز مضمر ہے۔ میری استدعا آپ سے یہ ہے کہ آپ اپنی شخصیت کے وزن اور اثر کو اس کام کی تقویت کے لئے استعمال کریں جو اسلام کے لئے اس خطۂ زمین میں ہو رہا ہے۔ آپ کے لئے اور آپ کے اسلام پسند ہم وطنوں کے لئے بھی اس کام کی اتنی ہی قدر و قیمت ہے جتنی کہ ہمارے لئے ہے۔ آپ اپنے ملک کے باشندوں کو ہمارے کام سے مطلع کریں اور اُن کو توجہ دلائیں کہ وہ ہم سے ربط قائم کریں اور اپنی تجاویز اور مشورے ارسال فرمائیں۔ اگر وہ محض دعائے خیر اور خیر خواہانہ جذبات ہی سے ہمیں سرفراز کریں تو بھی ہماری نگاہ میں اس کی بڑی وقعت ہوگی۔ دوسری طرف ہم بھی آپ کی ہر طرح خدمت کے لئے تیار رہیں۔ آپ کی طرف سے اسلام سے متعلق، آپ کی ذات، جماعت یا آپ کے ملک کے متعلق ہر طرح کی معلومات کا خیر مقدم کیا جائے گا کیونکہ جانبین کے باہمی ربط و ضبط ہی کے ذریعے سے سچی رفاقت کی بنیاد استوار ہوگی۔ یہاں کے لوگ ان امور میں بہت دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اگر آپ اپنے رفقاء کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں تو اس سے ہمیں بہت خوشی ہوگی۔

آپ کی ہمدردی کی ضرورت و اہمیت

اگر آپ اور آپ کے احباب اپنے ذاتی خطوط میں چند کلمات سے ہی ہمیں خطاب فرمائیں تو ہم اس کی تہِ دل سے قدر کریں گے۔ ہمارے ہمدردوں کے اضافے سے ہمارے یہاں کے کام کے وقار اور تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب یہاں کے لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ باہر کے مسلمان بھائی دل و جان سے ہمارے کام میں دلچسپی لے رہے ہیں اور یہ ہیں کہ بے تاب دلوں کو اسلام کی روحانی غذا نصیب ہو تو یہاں اسلام کے ظہور اور غلبے کے امکانات زیادہ ہونے لگتے ہیں۔ پھر ہماری یہاں کی کامیابی کا پرتو آپ کے وہاں کے کام پر بھی ان شاء اللہ ضرور پڑے گا اور اس کا فائدہ پوری اسلامی دُنیا کو پہنچے گا۔ غرض میں آپ کی دعاؤں کا محتاج ہوں اور معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کون لوگ ہماری اس بے لوث خدمت سے دلچسپی اور محبت رکھتے ہیں۔ میں اسلام کی راہ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے رشتۂ الفت قائم کرنا چاہتا ہوں اور میری یہ الفت اتنی وسیع ہوگی جتنی وسیع خود کائنات…

ئنات اور رفادِ مطلق کے لئے کامل سمع و طاعت کا رویہ رکھتے ہوئے ہی ہم اپنی شخصیتوں کی تکمیل کر سکتے ہیں۔
اگر آپ کے اور ہمارے درمیان یہ جذبۂ رفاقت قائم رہے بلکہ آخری ممکنہ حد تک نشوونما پاتا رہے تو
سے آپ کی عنایت شمار کروں گا۔ اگر آپ مجھے اپنے ساتھ رابطہ رکھنے اور اپنے کام کے رفتار کی وقتاً فوقتاً
بھیجنے کی اجازت دیں، تو یہ امر میرے لئے موجب مسرت ہوگا۔ ہم اپنے کام میں اپنی زندگی اور اس کے
کو پوری خوشی اور نفس کی آمادگی کے ساتھ لگا رہے ہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ خود اللہ کا فضل و کرم ہمارے
حال ہے اور سمع و طاعت کا جذبہ جب تک ہمارے اندر کام کرتا رہے گا ہمارے لئے کامیابی ہی کامیابی
للہ نے چاہا تو یہ جذبہ مرتے دم تک کارفرما رہے گا۔

عبدالرحمان روسلر

FRANZ ERICH ABDURRAHMAN RÖSELER TREMSBUTTLERWEST

BARGTEHEIDE I. HOLST. BRITISH ZONE (GERMANY.)

صفحہ ۱۳۶) تنقید کرنے میں جو آزادی برتی، اُسی آزادیٔ تنقید کو اپنی جماعت میں بھی برقرار رکھا تاکہ جماعت کے اندر جہاں جو خرابی بھی
ہو اس کی بروقت نشاندہی ہو جائے اور اسے دور کرنے کی کوشش کی جا سکے۔ جماعت کے ہر شخص کو محض تنقید کا حق ہی حاصل
بلکہ یہ اس کا فرض ہے کہ کسی خرابی کو محسوس کر کے خاموش نہ رہ جائے۔ یہ بات ہر رکن جماعت کے اجتماعی فرائض میں داخل
ہ ساتھی ارکان کی ذات میں، یا ان کے جماعتی کردار میں، یا اپنی جماعت کے نظم میں، یا جماعت کے لیڈروں میں اگر وہ کوئی
ہے تو اسے بلا تکلف بیان کرے اور اصلاح کی دعوت دے۔ اسی طرح جن لوگوں پر تنقید کی جائے ان کو بھی اس بات کا عادی
ہے کہ وہ نہ صرف تنقید کو برداشت کریں، بلکہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں اور جس نقص کی نشاندہی کی گئی ہے وہ
موجود ہو تو اسے دور کرنے کی طرف توجہ کریں ورنہ تنقید کرنے والے کی غلط فہمی رفع کر دیں۔ اس معاملے میں تنقید کے جائز
طریقے نہ معلوم ہونے کی وجہ سے بسا اوقات غلطیاں بھی ہوتی ہیں، اور ان کا کچھ نہ کچھ نقصان بھی ہمیں اٹھانا پڑا ہے، لیکن اس کے
نے کبھی جماعت میں روحِ تنقید کو خوابیدہ ہونے نہ دیا، اور اسی کا یہ فائدہ ہے کہ جماعت کا ہر فرد پوری جماعت کا
نگہبان ...

مطبوعات

(افسوس ہے کہ اس مرتبہ کتابوں کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بجائے محض ایک سرسری نگاہ ڈال کر ریویو درج کیے جا رہے ہیں۔ ادھر تو کتابوں کا ایک ڈھیر پڑا ہے اور ادھر مصروفیات کا ایک ہجوم ہے۔ اندریں حال ریویو کا حق ادا نہ ہو سکے گا، لیکن پھر بھی جو رائے عرض کی جا رہی ہے، احتیاط کے ساتھ عرض کی جا رہی ہے، اور بہرحال میں کوتاہیوں سے بچانے والا خود اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ ادارہ)

"الفرقان" حج نمبر

بہ ادارت: جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی۔

مقامِ اشاعت: دفتر الفرقان گوئن روڈ، لکھنؤ۔

قیمت: عہ (قیمت عام نمبر فی کاپی ۸ر) چندہ سالانہ صہ۔

الفرقان ایک مقصدی دینی جریدہ ہے اور اس سے پہلے بعض بیش بہا خاص نمبر پیش کر چکا ہے۔ ان خاص میں سے ایک حج نمبر بھی تھا جس کی مقبولیت وائی دیستانے ادارے کو مجبور کیا ہے کہ وہ حج نمبر کو مزید بہتر بنا کر شائع کرے۔

اس خاص نمبر کا آغاز "نگاہِ اولیں" کے عنوان سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بیش قیمت مقالے سے ہوا۔ مولانا حسین احمد مدنی کا ایک خط "سفرِ عشق" کے نام سے سامنے آیا ہے جو مولانا موصوف نے آج سے پانچ سال پہلے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام اپنے سفرِ حج کے موقع پر لکھا تھا۔ اس خط میں عبودیت کے جذبے کا نمایاں ہے۔ اس کے بعد مولانا محمد اویس ندوی اور مولانا مناظر حسن گیلانی کے سفرنامہ ہائے حج درج ہیں۔ معلومات بھی ہیں اور ہدایات بھی۔

پھر زائرینِ حج کے نام مولانا منظور صاحب نعمانی، مدیر الفرقان نے ایک خاص پیغام درج فرمایا ہے جسے بتانے کی کوشش کی ہے کہ آپ حج کس طرح کریں۔ پیغام محبت بھرا ہے، طرزِ تخاطب میں اخوت کی روح ہے، اور عام ضروریاتِ سفرِ حج کے بارے میں مشورے دینے کے علاوہ مولانا نے ضروریاتِ دینی و رشد

...سے میں پوری پوری رہنمائی فرمائی ہے۔ کاش کہ مولانا کا یہ پیام ایک اور پہلو بھی نمایاں طور پر ساتھ لئے ہوئے ہوتا
اگرچہ اس سے بالکل صرفِ نظر بھی نہیں کیا گیا ہے) کہ حج سے لوٹ کیا ساتھ لے کر لوٹو، حج کے بعد تم کو اپنی زندگی کو
مقاصد میں لگانی ہے، جو سرمایہ عبودیت کما کے لا رہے ہو اسے آخر کس "کاروبار" میں لگانا ہے، جس ماحول
کو پیچھے جاتے ہوئے پیچھے چھوڑ گئے تھے اس کی طرف لوٹتے ہوئے اس کے بدلنے کے لئے کیا عزائم لے کر لوٹنا ہے
آخر میں ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی دکن نے اپنے مخصوص رنگ میں "اسرارِ حج" کے عنوان
سے اپنے خاص تاثرات بیان فرمائے ہیں۔
علاوہ بریں چند نظمیں بھی شامل ہیں۔
مجموعی طور پر اس نمبر کا مقصد یہ ہے کہ حج کا شوق پھیلے، اسے صحت کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام ہو اور اس کا
خارجی ڈھانچہ ہی مطابقِ شریعت نہ ہو بلکہ اس کے اندر مطلوبہ روح بھی موجود ہو۔

القول المختار فی ما ورد فی النبی المختار

مؤلفہ: جناب عنایت اللہ صاحب اثری وزیرآبادی (مدرس دارالحدیث گجرات پنجاب)

ملنے کا پتہ: جناب مؤلف سے طلب کیجئے۔

قیمت: ایک روپیہ فی جلد

یہ کتاب فنِ تاویل و مناظرہ میں ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ آیات و احادیث کی تفسیر و شرح میں نادانی یا
غلط فہمی کی وجہ سے ایسی جتنی باتیں شامل ہو گئی ہیں جن کی آڑ لے کر نبی صلعم یا آپ کے صحابہ اور آپ کی ازواجِ مطہرات
کے متعلق مخالفین فضول گوئی کرتے ہیں ان کو صاف کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے قرآن و حدیث کے بہت سے
اہم مقامات کی تمام ممکن تاویلوں کو سامنے لا کر ان میں واضح اور بہترین تاویل کو اہم وجوہ کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے
کتاب کے طرزِ تحریر میں فنِ تاویل و مناظرہ کی قدیم روایات کو محفوظ رکھا گیا ہے، بلکہ کتاب کی
تبویب اور اس کی طباعت وغیرہ میں بھی!

بیان المختار فی تاویل	مولفہ: جناب عنایت اللہ صاحب اثری وزیر آبادی (مدرس دار الحدیث، گجرات، پنجاب)
انبیاء الرسل الاخیار	ملنے کا پتہ: جناب مولف سے طلب کیجئے۔

قیمت: فی جلد دو روپے۔

یہ کتاب بھی فن تاویل و مناظرہ ہی سے تعلق رکھتی ہے، اور اس میں جملہ انبیاء و مرسلین کے بارے میں ان غلط فہمیوں کو صاف کیا گیا ہے جو کتاب اللہ کی تفسیر و تشریح میں غلط باتوں کے شامل ہو جانے سے پیدا ہوئی ہیں۔

PAKISTAN THE	مرتبہ: جناب ایم، اے، مجید صدیقی ایم، اے۔
ISLAMICE STATE	شائع کردہ: اسلامک پبلیکیشنز، ۲۴، نابھہ روڈ، پرانی انارکلی، لاہور۔

قیمت: فی جلد پانچ روپے آٹھ آنے۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ "عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد" ("خدا شرے برانگیزد کہ خیرے ما دراں باشد") بڑی وسیع صداقت اپنے اندر رکھتا ہے حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ہر شر خیر کو نمود دینے کا ذریعہ بن جاتا ہے آج سے پہلے اسلامیات پر جتنا بھی علمی و تحقیقی لٹریچر پیدا ہوا ہے اس کا ۹۰ فی صدی حصہ ایسا ہے جو مخالفِ اسلام قوتوں کی تحریک سے وجود میں آیا ہے۔ ہمارے بے شمار قدیم سیاسی کتابیں ایسی ہیں کہ اگر خوارج، روافض، اہلِ بدعت، خلقِ قرآن کے موجد اور دوسرے گمراہ فرقے اپنے خیالات نہ پھیلاتے تو ان کے لکھے جانے کی کوئی وجہ نہ ہوتی اور آج ہم ان سے محروم ہوتے۔ بالکل اسی اصول پر ہمارے حکمران طبقہ کی "دستوری سفارشات" کا شر بہت بڑے پیمانے پر دنیائے علم میں خیر کی افزائش کا ذریعہ بن گیا ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت کے متعلق متعدد کتابیں، رسائل اور دستوری خاکے محض ان سفارشات کی تحریک سے وجود میں آ رہے ہیں۔ پیشِ نظر مجموعۂ مقالات بھی انھیں چیزوں میں شامل ہے۔

اس مجموعے کا پہلا مقالہ خود مرتب کا ہے جس میں جدید نظامِ ریاست اور اسلامی ریاست پر قلم اٹھایا گیا ہے اور اس کے بعد ایک دستوری خاکہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ دوسرا بیش قیمت مقالہ ڈاکٹر ایم عزیز احمد (پنجاب یونیورسٹی) کے قلم سے "اسلامی نظریۂ سیاست کا مزاج" کے عنوان سے ہے۔ "اسلام کا نظریۂ سیاسی" کے عنوان سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا مشہور مقالہ درج ہے۔ "اسلام میں انتخابِ خلیفہ" کے

موضوع پر ڈاکٹر محمد یوسف صاحب کا مضمون پیش کیا گیا ہے۔ ان مقالات کے ساتھ قراردادِ مقاصد اور اس کے محرک جناب لیاقت علی خاں صاحب کی تحریکی تقریر بھی جمع کر دی گئی ہے تاکہ اسلامی اصولِ سیاست کی روشنی میں اس فاصلے کو ناپا جا سکے جو قراردادِ مقاصد اور دستوری سفارشات کے درمیان رکھا گیا ہے۔

تتمہ کے طور پر "مسلم معاشرہ کی اصلاح" کے موضوع پر پرنس سعید حلیم پاشا کا مضمون شریک مجموعہ ہے۔

الطریقۃ السہلہ

مؤلفہ: ایس، اے، رشید صاحب عربک لکچرار جامعہ عباسیہ بہاولپور۔

ملنے کا پتہ: مؤلف کے علاوہ قومی کتب خانہ چوک بازار بہاولپور سے مل سکتی ہے۔

قیمت: مکمل نصاب دو روپے۔

عربی زبان کی تعلیم کو آسان بنانے کے لئے اچھی قسم کی نصابیات کا خلا پُر کرنے کے لئے برابر کوششیں ہو رہی ہیں اور ان کوششوں کے متعدد اچھے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ الطریقۃ السہلۃ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مؤلف نے عربی کا کافی ذخیرۂ الفاظ بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ اس کورس میں قواعد کی تفہیم بہت ہی سادہ طریق پر کی ہے۔ یہ ہم ضرور عرض کریں گے کہ قواعدِ صرف و نحو کے ذریعے زبان سکھانے کا فرسودہ طریق اختیار کرنے کے بجائے اگر تعلیم زبان کے ذریعے قواعد صرف و نحو سکھانے کا طریق اختیار کیا جاتا تو تعلیم زبان کے اصولوں کے لحاظ سے صحیح تر ہوتا۔ آخر کیوں نہ ایسا ہو کہ عربی کی تعلیم روزمرہ کی ضرورت کے جملوں، کہانیوں، مکالموں اور نظموں کے ذریعے دی جائے اور قواعد کی تعلیم کو اس میں سمو دیا جائے۔ بحالاتِ موجودہ یہ کورس طلبہ کی نفسیات کے لحاظ سے کبھی بھی دلچسپ نہ ہوگا۔ اور جو نصاب دلچسپ نہ ہو وہ سہل بھی نہیں ہو سکتا۔ علاوہ بریں کتابت و طباعت کا معیار بھی تعلیمی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے۔

عربی زبان کے اساتذہ اور بطور خود عربی زبان کا مطالعہ کرنے والے اصحاب اس نصاب کو آزمائیں اور مولف کو مفید مشورے بہم پہنچائیں۔
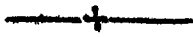
سلسلۂ مبادیات

مؤلفہ: جناب خواجہ علی کاکوروی ایم اے، بی ٹی۔
شائع کردہ: ادارۃ القرآن (مرکز تحریکِ ایمانی) محمد علی لین لکھنؤ۔

قیمت: مکمل سلسلہ ۱۲؍

یہ سلسلہ جیبی سائز کے چھوٹے چھوٹے آٹھ پمفلٹوں پر مشتمل ہے۔ ان پمفلٹوں کے عنوانات یہ ہیں (۱) انسانیت کے قیام و استحکام کا دارومدار مذہب پر ہے (۲) اسلام سے بہتر کوئی مذہب نہیں (۳) دین فطرت کا فطری نظام ایمان (۴) اسلام سائنس اور نفسیات کی روشنی میں (۵) قرآن کی روشنی میں ذاتِ باری تعالیٰ کا تصور و تعلق (۶) دین فطرت ہمارے لئے ناقابلِ عمل کیوں بن گیا (۷) رسول اللہ کا مرتبہ اور منصب (۸) قرآن کی روشنی میں قرآن کی اہمیت۔
یہ رسائل دین کی بنیادی دعوت پر مشتمل ہیں اور سرسری مطالعہ کی بنا پر ہماری رائے یہ ہے کہ مرکزی فکر غیر متوازن نہیں ہے۔

مردِ مومن

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب
شائع کردہ: کتاب منزل لاہور

قیمت: مجلد مع رنگین گرد پوش دو روپے چار آنے۔

یہ کتاب پہلے "قرآن اور سیرت سازی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے اب اس کا دوسرا ایڈیشن "مردِ مومن" کے نام سے کتاب منزل نے پیش کیا ہے۔ ترجمان القرآن میں اس کے پہلے ایڈیشن پر ریویو ہو چکا ہے۔ لہٰذا کسی تفصیلی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر میر ولی الدین ممتاز علمی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کے انداز بیان میں فلسفہ تصوف اور ادبیت تینوں عناصر گندھے ہوئے ہیں۔ آپ عربی الفاظ خصوصاً مصادر بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں جن کی وجہ سے زبان کہیں کہیں ثقیل ہو جاتی ہے۔ پیشِ نظر کتاب میں آپ نے واضح فرمایا ہے کہ قرآن کس طرح انسانی سیرت کو بناتا ہے۔ کتاب کے تین باب، قرآن اور علاجِ خوف، قرآن اور علاجِ حزن، اور قرآن اور علاجِ غضب خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہیں۔ تازہ ایڈیشن بلحاظ دیدہ زیبی پہلے ایڈیشن سے فائق تر ہے۔

پاکستانی عورت دوراہے پر

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی دوران نظربندی کی تازہ تصنیف

(دیباچہ از مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی)

جس میں اس منظم تحریک کو بے نقاب کیا گیا ہے:۔۔۔۔

۔۔ جو آج کل مسلمان عورت کو مغربیت کے سانچے میں ڈھالنے کیلئے جاری ہے،

۔۔ جو مذہب ملا سے نہیں، بلکہ دین خدا سے برسر پیکار ہے،

۔۔ جس کے طریق کار میں بغاوت کے ساتھ منافقت بھی شامل ہے،

۔۔ جس سے نہ ہماری دنیا بننے کا امکان ہے، نہ عاقبت سنورنے کی توقع،

جلد عمدہ، گرد پوش دیدہ زیب، ضخامت ۲۶۴ صفحات، قیمت ۲ روپے ۱۲ آنے

پردہ

اس کتاب کا مطالعہ ہر اس مسلمان کیلئے ناگزیر ہے جو اسلام اور مغرب کے معاشرتی نظریات و عملیات کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہے اور اسلام کے اصول تمدن پر ذہناً مطمئن ہونا چاہے۔ مرد و زن کے آزادانہ میل جول سے یورپ میں جو فواحش کی کثرت، خاندانی نظام کی بربادی اور کلی قومی ہلاکت نمودار ہوئی ہے اسکی تفصیل روداد کتاب میں پیش کی گئی ہے ضخامت ۲۴۲ صفحات قیمت ۲ روپے آٹھ آنے

حقوق الزوجین

مرد اور عورت کے قانونی اور معاشرتی حقوق جو اسلام کے عطا کردہ ہیں، اُنکی تفصیل اِس کتاب میں موجود ہے ضخامت ۱۲۴ صفحات قیمت ‎-/۸/۱

اسلام اور ضبط ولادت

اِس رسالے کا موضوع ضبط تولید کی تحریک کی علمی اور عملی خامیوں کا اِبطال ہے۔ ضخامت ۰۰ صفحات قیمت ایک روپیہ

فہرست مضامین

جمادی الاولیٰ، جمادی الآخرہ، رجب ۱۳۷۰ھ مطابق مارچ، اپریل، مئی ۱۹۵۱ء | عدد ۵، ۶، ۱

...ی نے مرکنٹائل پریس ریلوے روڈ سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

تحریک اسلامی کے دوسرے مرحلے میں جماعت کی تنظیم اور تربیت جس طرز پر کی گئی اسے ہم پچھلی اشاعت میں بہت اختصار کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ ابھی یہ مرحلہ کچھ اور دراز ہوتا اور ہمیں اپنے نظم کو پختہ اور اپنے کارکنوں کی تربیت کو مکمل کرنے کا پورا موقع مل جاتا، لیکن اگست ۱۹۴۷ء میں تشکیل جماعت کے ٹھیک چھ سال بعد، وہ قیامت نظیر انقلاب رونما ہو گیا جس کی آمد کے آثار دیکھ کر ہی ہمیں پہلے مرحلے کی تکمیل کا انتظار کئے بغیر اگست ۱۹۴۷ء میں دوسرے مرحلے کی طرف قدم اٹھا دینا پڑا تھا۔ اس قیامت صغریٰ نے ہمارے کام اور نظام پر دو حیثیتوں سے زبردست اثر ڈالا۔

اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ملک کی سیاسی تقسیم نے جماعت اسلامی کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پاکستان اور ہندوستان، دونوں کے حالات اور مسائل اچانک ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہو گئے کہ دونوں ملکوں میں ایک نظم، ایک پالیسی اور ایک رہنمائی کے تحت کام کرنا بالکل ناممکن ہو گیا۔ اگرچہ ان حالات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہمیں تقسیم سے پہلے بھی تھا، چنانچہ اپریل ۱۹۴۷ء کی تقریر مدراس میں اس طرف اشارہ بھی کر دیا گیا تھا کہ تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں ایک نظام جماعت قائم نہ رہ سکے گا، لیکن جب تقسیم فی الواقع رونما ہوئی تو ہمیں اپنے اندیشوں سے بھی کہیں زیادہ سخت حالات سے سابقہ پیش آیا، اور خبر رسانی کے ذرائع بحال ہوتے ہی پہلی فرصت میں ہم کو مسلم لیگ کی طرح یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ دونوں ملکوں کے نظام جماعت قطعی طور پر ایک دوسرے سے الگ کر دیے جائیں۔ یہ فیصلہ فروری ۱۹۴۸ء میں ہوا اور اس کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کی ہر چیز، بجز عقیدے اور مقصد کے، جماعت اسلامی ہندوستان سے الگ ہو کر رہ گئی۔[1]

---

[1] اس جگہ یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ دونوں جماعتوں کی علیحدگی کے وقت جو ارکان جماعت پاکستان میں مقیم تھے یا ہجرت کر کے آ چکے تھے ان کی تعداد ۳۸۵، اور جو ارکان ہندوستان میں رہ گئے تھے ان کی تعداد ۲۴۰ تھی۔ اُس وقت سے پاکستان کے ارکان کی تعداد بڑھتے بڑھتے اب ۴۴۰۵ تک پہنچ چکی ہے۔

مرا اثر اس سیاسی انقلاب کا یہ ہوا کہ جماعت اسلامی پاکستان کو یک لخت توسیع اور عملی اقدام
ں داخل ہو جانا پڑا حالانکہ نظم اور تربیت دونوں کے لحاظ سے ابھی ہمیں اپنی تکمیل کے لئے بہت
اقی تھا۔

فوری پیش قدمی کا فیصلہ جن وجوہ سے کیا گیا انہیں اُسی زمانہ میں جماعت کے اُن اجتماعات میں
یا گیا تھا جو مارچ و اپریل ۱۹۴۸ء میں ہوئے تھے۔ مختصراً وہ وجوہ یہ تھے۔ ۱۹۴۷ء کا سیاسی انقلاب
ہ میں محض ایک مصنوعی انقلاب تھا یعنی وہ کسی ذہنی، اخلاقی اور اجتماعی انقلاب کے نتیجے میں
ہوا تھا، بلکہ زیادہ تر خارجی حالات کے تغیر اور دباؤ کے اثر سے واقع ہو گیا تھا۔ اُس کی پشت پر
یری قوت کی نشان دہی کی جا سکتی ہے تو وہ حد سے حد بس یہ ہے کہ ایک طرف انگریزی درسگاہوں
کی تعلیم و تربیت سے مسلمانوں میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی تیار ہو چکی تھی جو ایک آزاد
کے انتظام کا بار، برا یا بھلا کسی نہ کسی طرح اٹھا سکتے تھے۔ اور دوسری طرف مسلمانوں میں اپنی ایک
ت قائم کرنے کی خواہش پوری طرح اُبھر آئی تھی جس نے خواص سے گزر کر عوام تک کو متحرک کر
لیکن ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک حقیقی اور پختہ اور نتیجہ خیز سیاسی انقلاب پیدا کرنے کے لئے
ہو سکتی تھیں۔ ان کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ مسلمانوں کے سامنے اُس نظامِ زندگی کا ایک واضح تصور
جس پر انہیں آزادی کے بعد اپنی حیاتِ قومی کا قصر تعمیر کرنا تھا، اور اُس تصور کے بارے میں ذہنی
سے وہ فی الجملہ یکسو ہوتے، کسی انتشارِ فکر اور پراگندگیٔ خیال اور اختلافِ مقاصد میں مبتلا نہ ہوتے۔
ری تھا کہ مسلمان اخلاقی حیثیت سے اس حد تک صالح اور بالغ ہو چکے ہوتے کہ آزاد ہو جانے کے
رمتِ خود اختیاری کی ذمہ داریاں بآسانی اٹھا سکتے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ مسلمانوں میں صبر، ضبط، نظم،
محنت، تعاون، مواساۃ، امانت، فرض شناسی، احساسِ ذمہ داری، حدود کی نگہداشت، اور
اخوت کے وہ اوصاف موجود ہوتے جو ایک کامیاب اجتماعی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔
ن چیزوں کی کمی ہم اُسی وقت محسوس کر رہے تھے جب مسلمانوں میں اپنی مستقل حکومت کی خواہش اُبھی

نمایاں نظر رہی تھی۔ ہم نے اس کمی کی طرف اُن لیڈروں کو توجہ دلائی جن کے ہاتھ میں مسلمانوں کی قیادت کی باگ ڈور
رہے تھے، مگر انہوں نے اسے صدائے بے ہنگام سمجھا۔ ہم نے خود اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی، مگر ہمیں
اُلٹا دشمن سمجھا گیا اور مسلمانوں کو ہم سے بدگمان کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی۔ اِس حد پر بھی معاملہ رکا نہ رہا
بلکہ دس سال تک مسلمانوں کی قومی تحریک اس انداز سے چلائی گئی کہ مسلمانوں کا ذہن پہلے سے زیادہ پراگندہ
اور ان کے اخلاق پہلے سے زیادہ خراب، اور ان کے اجتماعی اوصاف پہلے سے بھی زیادہ گئے گزرے ہو گئے۔
مختلف خیالات، عقائد، نظریات، اغراض اور مقاصد رکھنے والے عناصر کو جمع کر لیا گیا جو اسلام کا نعرہ
بلند کرنے کے ساتھ ہی بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہے کہ مسلمانوں کا رہا سہا اسلامی تصور بھی دھندلا
ہو گیا اور عین پاکستان بننے کے وقت بھی وہ کچھ نہ جانتے تھے کہ وہ کونسا اسلام ہو گا جس پر یہ نئی ریاست
تعمیر کی جائے گی۔ ہم نے اس پراگندہ خیالی پر بار بار ٹوکا، مگر جواب میں اُلٹا اس بات پر فخر کیا گیا کہ ہم نے قوم
کے سارے مختلف عناصر کو جمع کر کے رکھ دیا ہے۔ حالانکہ یہ عناصر ایک منفی جنگ کے لئے تو اکٹھے ہو سکتے
تھے، مگر ایک ایجابی تعمیر کا مرحلہ آتے ہی ان کا منتشر اور متصادم ہو جانا بادی النظر ہی میں یقینی تھا۔ ایسا ہی
معاملہ اخلاقی اور اجتماعی حالت کا بھی تھا۔ قومی تحریک جس انداز پر چلائی جا رہی تھی اس نے مسلمانوں کو اپنی
جگہ پر بھی نہ ٹھیرنے دیا کجا کہ انہیں کچھ اُوپر اٹھایا جاتا۔ بدترین سیرت و اخلاق کے لوگ صحافت و قیادت پر
قابض ہو گئے۔ ہر میدان میں غیر مسلموں سے مسابقت شروع ہو گئی۔ ہر بُرائی کا جواب کارِ ثواب سمجھ کر بُرائی
سے دیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ دونوں قومیں ایک دوسری کی ضد میں گرتے گرتے اسفل السافلین تک پہنچ گئیں۔

یہ سارے حالات ہمارے سامنے گزر رہے تھے اور ان کے نتائج کو ہم خوب جانتے تھے۔ اس لئے جس روز
تقسیم ملک کا اعلان ہوا اسی وقت ہم نے سمجھ لیا کہ جیسی بری یا بھلی تعمیری سعی بھی آج تک ہم کر سکے ہیں اب
اسی پر اکتفا کرنا ہو گا اور اس قوم کو سنبھالنے کی فوراً کوشش کرنی پڑے گی جو کسی واضح نصب العین کے
بغیر اور کسی اخلاقی طاقت اور اجتماعی صلاح کے بغیر یکلخت با اختیار ہو گئی ہے۔ اس فوری اقدام کی ضرورت کا
احساس ان حالات کو دیکھ کر اور بھی زیادہ شدید ہو گیا جو عین تقسیم کے وقت اور اس کے معاً بعد پیش آئے۔

ندوستان کے بعض حصوں سے مسلمانوں کا خروج جس شان سے ہوا، پاکستان سے غیر مسلموں کی نکاسی جس طرح
مل میں آئی، غیر مسلموں کی چھوڑی ہوئی دولت کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا، اور مسلمان مہاجرین پاکستان میں پہنچ
الات سے دوچار ہوئے، یہ سب کچھ ایک ایسا آئینہ تھا جس میں پوری قوم کی، اس کے عوام اور خواص کی
س کے لیڈروں اور پیشواؤں کی، اس کے حکام اور عمال کی، اس کے اہل دین اور اہل دنیا کی، غرض سب ہی
اخلاقی اور اجتماعی تصویر بالکل برہنہ نظر آگئی۔ پھر اختیارات ہاتھ میں لیتے ہی ہماری قوم کے قائدوں نے
ب قائد ہی نہیں حاکم بھی تھے، ملک کے آئندہ نظام کے متعلق جیسی الجھی الجھی متضاد باتیں کرنی شروع کیں
قوم جس طرح ابتدائی چند مہینوں میں ٹھنڈے دل سے ان کو سنتی رہی، اسے دیکھ کر صاف معلوم ہو گیا
ا وقت ایک بے شعور قوم کی باگیں ایک بے فکر گروہ کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ وقت خاموش بیٹھ کر تعمیری
یں لگے رہنے کا نہیں ہے۔ اب اگر ایک لمحہ بھی ضائع کیا گیا تو بعید نہیں کہ جو لوگ منزل کا تعین کئے
بے سوچے سمجھے چل پڑے تھے وہ یکایک کسی غلط نظریے کو اس نئی مملکت کی بنیاد قرار دے بیٹھیں
ر اس فیصلے کو بدلوانا موجودہ حالت کی بہ نسبت ہزار گنی زیادہ قربانیوں کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔

خوش قسمتی سے اس زمانے میں متعدد آزمائشیں ایسی پیش آگئیں جن سے ہمیں تیسرے مرحلے کی طرف
ھنے سے پہلے یہ اندازہ کرنے کا موقع مل گیا کہ ہماری جماعت اپنی اخلاقی تربیت اور اپنے نظم کے
ے اس وقت فی الواقع کتنی طاقت رکھتی ہے اور آگے کے مراحل میں اس پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے
ن میں سے پہلی آزمائش ان لوگوں کو پیش آئی جو مشرقی پنجاب کے ہنگامۂ قیامت سے گزر کر پاکستان
ہم نے فرداً فرداً ان کے حالات کا تفحص کیا اور یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ صرف ارکان جماعت
جماعت کے ہمدرد اور متاثرین تک ہمت و جرأت اور صبر و استقلال کے ساتھ اپنا فرض انجام
ان میں سے کوئی بھی لیگ کے لیڈروں کی طرح بھاگنے والوں میں سب سے آگے نہ تھا، کسی نے جھوٹ
ا، کسی نے خود غرضی سے کام نہیں لیا۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ خطرے اور مصیبت میں اپنے بھائیوں کے
ہر ایک نے اپنی استطاعت کی حد تک مظلوم مسلمانوں کو بچانے، سنبھالنے اور منظم طریقے سے نکالنے

کی کوشش کی بہت سوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کام کیا۔ اور اکثر و بیشتر اپنے علاقوں سے اس وقت نکلے جب وہ مسلمانوں سے خالی ہو چکے تھے۔

دوسری آزمائش مغربی پاکستان میں پیش آئی جہاں سے غیر مسلم نکل رہے تھے۔ یہاں بھی ہم نے پوری دقتِ نظر کے ساتھ جماعت کے رویہ کا جائزہ لیا، اور یہ معلوم کرکے ہمیں اطمینان ہوا کہ جماعت کے ارکان ہی نہیں ہمدردوں اور متاثرین تک میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے کشت و خون یا لوٹ مار میں کوئی حصہ لیا ہو۔ بعض مقامات پر تو پوری پوری بستیوں میں اگر لوٹ سے بچنے والے کچھ لوگ پائے گئے تو وہ صرف وہی لوگ تھے جنہوں نے جماعتِ اسلامی کا اثر قبول کیا تھا۔ متعدد مقامات پر جماعت کے لوگوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر بھی غیر مسلموں کو پناہ دینے میں تامل نہ کیا۔ اور کوئی ایک اطلاع بھی ہمیں ایسی نہیں ملی کہ جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کا دامن کسی غیر مسلم عورت کی آبروریزی سے آلودہ ہوا ہو، حالانکہ اس کے مواقع کی اُس وقت کمی نہ تھی۔

تیسری آزمائش اُس وقت پیش آئی جب جماعت کے کارکنوں کو پناہ گزینوں کے کیمپوں میں کام کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس آخری آزمائش نے ہمیں پوری طرح مطمئن کر دیا کہ اپنی تمام کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود جماعتِ اسلامی کے پاس اِس وقت مردانِ کار کا ایک ایسا گروہ تیار ہے جس کے اخلاق اور نظم پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ لاہور، کراچی، پشاور، سیالکوٹ، سرگودھا، لائل پور، چنیوٹ اور ملتان میں مجموعی طور پر جماعت کے تقریباً سات سو ارکان اور ہمدردوں نے پناہ گزینوں کی خدمت کا کام کیا۔ ان کارکنوں میں بہت سے وہ لوگ تھے جو خود پناہ گزین کی حیثیت سے آئے تھے اور ابھی کہیں جمنے بھی نہ پائے تھے۔ پھر بھی وہ خدمت کی پکار پر لبیک کہنے سے باز نہ رہے۔ ان لوگوں نے ایثار، جفاکشی، ہمدردی، دیانت، امانت، عفت اور نظم و ضبط کا پورا امتحان دیا، اور نتیجہ میں کم از کم جو چیز ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ ان اوصاف میں نہ حکومت کے عمال ان سے کوئی نسبت رکھتے ہیں اور نہ قومی جماعتوں کے کارکن۔ جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے سات سو آدمیوں میں سے ایک بھی ایسا نہ نکلا جو ناقابلِ اعتماد ثابت ہوا ہو۔ اور جہاں تک نظم کا تعلق ہے دو تین خفیف شکایتوں سے زائد کوئی چیز ہمارے علم میں نہیں آئی۔

یہ تھا وہ سرمایہ جسے لیکر ہم تیسرے مرحلے میں داخل ہوئے۔ اس مرحلے میں ہمارا پہلا قدم یہ تھا کہ براہ راست عوام تک پہنچ کر ان کے سامنے اُس اسلامی ریاست کے تصور کو ایک صاف اور متعین صورت میں پیش کریں جس کے صرف نعرے ہی نعرے انہوں نے اُس وقت تک سُنے تھے اور جس کے فہم کے معاملہ میں ان کے لیڈروں نے ان کے ذہن کو اُلجھانے کے سوا کوئی دوسری خدمت اُس وقت تک انجام نہ دی تھی۔ یہ کام جنوری ۱۹۴۸ء میں شروع کیا گیا اور شاید ہم بلا شائبۂ مبالغہ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ قریبی دَور کی تاریخ میں پہلی مرتبہ شہری اور دیہاتی عوام کو وسیع پیمانے پر اسلامی نظامِ زندگی کے ایک جامع اور واضح تصور سے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی۔ اس کام کے لئے صرف لٹریچر کی اشاعت اور مجلسی ملاقاتوں ہی پر اکتفا نہ کیا گیا، جیسا کہ جماعتِ اسلامی کا سابق طریقِ کار تھا۔ بلکہ جماعت کا ہر وہ رُکن جو ذمہ دارانہ طریقہ سے بول سکتا تھا، تقریر کا مجاز کر دیا گیا اور پاکستان کے گوشے گوشے میں جلسے کر کے عوام کو یہ بتایا گیا کہ آزاد ہو جانے کے بعد اب مسلمان ہونے کی حیثیت سے تمہاری ذمہ داریاں کیا ہیں، اسلام جس کے تم معتقد ہی نہیں عاشق بھی ہو، تمہیں کیا نظامِ زندگی دیتا ہے، اور وہ اسلامی ریاست فی الواقع کس قسم کی ریاست ہے جس کے قیام کی خاطر تم نے اتنی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اس کے ساتھ ملک کے کارفرما اور اہلِ دماغ طبقے کو بھی خطاب کیا گیا اور ان کو نہ صرف علمی حیثیت سے یہ بتایا گیا کہ ایک حقیقی اسلامی ریاست کے خدوخال کیا ہیں، بلکہ عملی حیثیت سے اس کو وجود میں لانے کی تدابیر بھی پیش کی گئیں اور ہر اُس حجت کو قطع کرنے کی کوشش کی گئی جو اس کے خلاف عذر کے طور پر سامنے لائی جا سکتی تھی۔ اس غرض کے لئے ۱۹۴۸ء میں جو چیزیں شائع کی گئیں وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ اسلام کا نظامِ حیات،

۲۔ اسلامی قانون اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر،

۳۔ اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق،

۴۔ آزادی کے اسلامی تقاضے،

۵۔ مطالبۂ نظامِ اسلامی۔

دوسرا قدم جو پہلے قدم کے ساتھ ہی اٹھا دیا گیا ، یہ تھا کہ عوام کے سامنے اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں کا ایک جچا تلا، نکاتی، جامع اور مختصر فارمولا پیش کیا گیا ، اور رائے عام کو اس کے حق میں اس حد تک ہموار اور منظم کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ ایک قومی مطالبے کی حیثیت اختیار کر لے اور ملک کی دستور ساز اسمبلی اسے قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ قدم فوری طور پر اٹھا دینا اس لئے ضروری تھا کہ ملک کے سربراہ کار اُس وقت صریح طور پر ایک غیر دینی (سیکولر) ریاست کے نظریہ کی طرف مائل تھے اور اس کے اعلان سے صرف ایک جھجک ان کو روکے ہوئے تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت ذرا سی غفلت بھی برتی گئی تو یہ موقع پاتے ہی آئینی طور پر ایک غیر اسلامی ریاست کی بنا رکھ دیں گے اور پھر اسے اسلامی ریاست میں تبدیل کرنا اس قدر دشوار ہوگا کہ جو کچھ آج تھوڑی سی قربانیوں سے ہو سکتا ہے وہ ہزاروں آدمیوں کے پھانسی پر لٹکنے سے بھی مشکل ہی ہو سکے گا۔

اس مہم کی ابتدا فروری ۱۹۴۸ء میں کی گئی اور چند مہینوں کے اندر اندر ہمارا مرتب کردہ مطالبہ پاکستان کی پوری مسلم قوم کا متفقہ مطالبہ بن گیا۔ برسر اقتدار گروہ اس مطالبے کا نہ انکار کر سکتا تھا اور نہ اس کڑوی گولی کو حلق سے اتارنے کے لئے تیار تھا۔ کچھ مدت تک وہ عالم حیرت میں اس پھیلتی ہوئی آگ کو دیکھتا رہا، پھر اس نے ویسی ہی ایک چال چلی جیسی بزدل اور پست اخلاق لوگ ہمیشہ سے چلتے آ رہے ہیں۔ وہ چال یہ تھی کہ ایک گھڑی گھڑائی بنی ہوئی سازش سے راقم الحروف پر زبردستی یہ الزام چسپاں کیا گیا کہ وہ "جہاد کشمیر کو حرام" کہتا ہے اور جن لوگوں نے وہاں لڑ کر جان دی ہے ان کی موت کو "حرام موت" قرار دیتا ہے۔ اس الزام کو پوری قوت کے ساتھ اخباروں اور اشتہاروں اور سرکاری مولویوں کے ذریعہ سے پھیلایا گیا۔ نت نئے جھوٹ پوری بے شرمی اور بے باکی کے ساتھ تصنیف کر کر کے میرے اور جماعت اسلامی کے خلاف پھیلائے گئے، اس جھوٹ کو فروغ دینے کے لئے جماعت کے اخبارات کو بند کیا گیا تاکہ کوئی تردیدی بیان پبلک تک نہ پہنچ سکے، اور اس طرح چند مہینے تک فضا کو خوب ہموار کر لینے کے بعد اکتوبر ۱۹۴۸ء میں مجھے اور میرے دو ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا —— اس سازش کی شرمناک داستان پوری تفصیل کے ساتھ جماعت کے شائع کردہ پمفلٹ "مودودی کی نظر بندی کیوں ؟" میں بیان کی جا چکی ہے —— بظاہر یہ بڑی ہی زبردست چال تھی۔ دیکھنے والے سمجھ رہے تھے کہ اس کے (بقیہ بر صفحہ ۱۴)

تفہیم القرآن

ابراہیمؑ

م | رکوع ۶ کی پہلی آیت وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا سے ماخوذ ہے۔ اس
م کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سورہ میں حضرت ابراہیمؑ کی سوانح عمری بیان ہوئی ہے، بلکہ یہ بھی اکثر سورتوں
ہ ناموں کی طرح علامت کے طور پر ہے۔ یعنی وہ سورہ جس میں ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔

مانۂ نزول | عام انداز بیان مکہ کے آخری دور کی سورتوں کا سا ہے۔ سورۂ رعد سے قریب زمانہ ہی کی نازل
دہ معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً رکوع ۳ کی پہلی آیت وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ
تَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (انکار کرنے والوں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا
نہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے) کا صاف اشارہ اس طرف ہے کہ اُس وقت مکہ میں مسلمانوں پر ظلم
م انتہا کو پہنچ چکا تھا اور اہل مکہ پچھلی کافر قوموں کی طرح اپنے ہاں کے اہل ایمان کو خارج البلد کر دینے پر
ل گئے تھے۔ اسی بنا پر ان کو وہ دھمکی سنائی گئی جو اُن کے سے رویّہ پر چلنے والی پچھلی قوموں کو دی گئی تھی کہ
نُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ (ہم ظالموں کو ہلاک کر کے رہیں گے) اور اہل ایمان کو وہی تسلی دی گئی جو ان کے پیش رو دل
دی جاتی رہی ہے کہ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ (ہم ان ظالموں کو ختم کرنے کے بعد تم ہی کو اس سرزمین
ن آباد کریں گے)۔

اسی طرح آخری رکوع کے تیور بھی یہی بتاتے ہیں کہ یہ سورہ مکہ کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہے۔

رکزی مضمون اور مدعا | جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ماننے سے انکار کر رہے تھے اور
پ کی دعوت کو ناکام کرنے کے لئے ہر طرح کی بدتر سے بدتر چالیں چل رہے تھے ان کو فہمائش اور تنبیہ لیکن فہمائش
ہ نسبت اس سورہ میں تنبیہ اور ملامت اور زجر و توبیخ کا انداز زیادہ تیز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تفہیم کا حق اس

کی سنتوں میں تحریک اسلامی کیا جا چکا تھا اور اس کے باوجود کفار قریش کی ہٹ دھرمی، عناد، مزاحمت، شرارت

وجور میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

آ۔ل۔ر۔ اے محمدؐ! یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ، ان کے رب کی توفیق سے اُس خدا کے راستے پر[1] جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود[2] ہے اور زمین اور آسمانوں کی ساری موجودات کا مالک ہے۔

---

[1] یعنی تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لانے کا مطلب شیطانی راستوں سے ہٹا کر خدا کے راستے پر لانا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہر وہ شخص جو خدا کی راہ پر نہیں ہے وہ دراصل جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے، خواہ وہ اپنے آپ کو کتنا ہی روشن خیال سمجھ رہا ہو اور اپنے زعم میں کتنا ہی نور علم سے منور ہو۔ بخلاف اس کے جس نے خدا کا راستہ پا لیا وہ علم کی روشنی میں آگیا چاہے وہ ایک ان پڑھ دیہاتی ہی کیوں نہ ہو۔

پھر یہ جو فرمایا کہ تم ان کو اپنے رب کے اذن یا اس کی توفیق سے خدا کے راستے پر لاؤ، تو اس میں دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی مبلغ، خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، راہ راست پیش کر دینے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کسی کو اس راستے پر لے آنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ اس کا انحصار سراسر اللہ کی توفیق اور اس کے اذن پر ہے۔ اللہ کسی کو توفیق دے تو وہ ہدایت پا سکتا ہے، ورنہ پیغمبر جیسا کامل مبلغ بھی اپنا پورا زور لگا لینے پر اس کو ہدایت نہیں بخش سکتا۔ رہی اللہ کی توفیق، تو اس کا قانون بالکل الگ ہے جسے قرآن میں مختلف مقامات پر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے ہدایت کی توفیق اسی کو ملتی ہے جو خود ہدایت کا طالب ہو، ضد اور ہٹ دھرمی اور تعصب سے پاک ہو، اپنے نفس کا بندہ اور اپنی خواہشات کا غلام نہ ہو، کھلی آنکھوں سے دیکھے، کھلے کانوں سے سنے، صاف دماغ سے سوچے سمجھے اور معقول بات کو بے لاگ طریقے سے مانے۔

[2] "حمید" کا لفظ اگرچہ محمود ہی کا ہم معنی ہے، مگر دونوں لفظوں میں ایک لطیف فرق ہے۔ محمود کسی (باقی صفحہ ۱۶۱ پر)

اور سخت تباہ کن سزا ہے قبولِ حق سے انکار کرنے والوں کے لئے جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے، جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روک رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ راستہ ان کی خواہشات کے مطابق ٹیڑھا ہو جائے۔ یہ لوگ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔

ہم نے اپنا پیغام دینے کے لئے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اُس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔ پھر اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) شخص کو اسی وقت کہیں گے جبکہ اسکی تعریف کی گئی ہو یا کی جاتی ہو۔ مگر حمید آپ سے آپ حمد کا مستحق خواہ کوئی اسکی حمد کرے یا نہ کرے۔ اس لفظ کا پورا مفہوم ستودہ صفات، سزاوارِ حمد اور مستحقِ تعریف جیسے الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا، اسی لئے ہم نے اس کا ترجمہ "اپنی ذات میں آپ محمود" کیا ہے۔

[1] یا بالفاظِ دیگر جنہیں ساری فکر بس دنیا کی ہے، آخرت کی پروا نہیں ہے جو دنیا کے فائدوں اور لذتوں اور آسائشوں کی خاطر آخرت کا نقصان تو مول لے سکتے ہیں، مگر آخرت کی کامیابیوں اور خوشحالیوں کے لئے دنیا کا کوئی نقصان، کوئی تکلیف اور کوئی خطرہ، بلکہ کسی لذت سے محرومی تک برداشت نہیں کر سکتے۔ جنہوں نے دنیا اور آخرت دونوں کا موازنہ کر کے ٹھنڈے دل سے دنیا کو پسند کر لیا ہے اور آخرت کے بارے میں فیصلہ کر چکے ہیں کہ جہاں جہاں اُس کا مفاد دنیا کے مفاد سے ٹکرائے گا وہاں وہ اُسے قربان کرتے چلے جائیں گے۔

[2] یعنی وہ اللہ کی مرضی کے تابع ہو کر نہیں رہنا چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین ان کی مرضی کا تابع ہو کر رہے۔ ان کے ہر خیال، ہر نظریے اور ہر وہم و گمان کو اللہ کا دین اپنے عقائد میں داخل کرے اور کسی ایسے عقیدے کو اپنے نظامِ فکر میں نہ رہنے دے جو ان کی کھوپڑی میں نہ سماتا ہو۔ ان کی ہر رسم، ہر عادت اور ہر خصلت کو جواز دے اور کسی ایسے طریقے کی پیروی کا ان سے مطالبہ نہ کرے جو انہیں پسند نہ ہو۔ وہ ان کا ہاتھ بندھا غلام ہو کر جدھر جدھر یہ اپنے شیطانِ نفس کے اتباع میں مڑیں ادھر وہ بھی مڑ جائے اور کہیں نہ تو وہ انہیں ٹوکے اور نہ کسی مقام پر انہیں اپنے راستہ کی طرف موڑنے کی کوشش کرے۔ وہ اللہ کی بات صرف اسی صورت میں مان سکتے ہیں جبکہ وہ اس طرح کا دین ان کے لئے بھیجے]

[3] اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو نبی جس قوم میں بھیجا اس پر

ہدایت بخشتا ہے، وہ بالا دست اور حکیم ہے۔

ہم اس سے پہلے موسیٰ کو بھی اپنی نشانیوں کے ساتھ اس کام کے لئے بھیج چکے ہیں کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائے۔ اسے محمدؐ! تم ان لوگوں کو تاریخِ الٰہی کے سبق آموز واقعات سنا کر نصیحت کرو،

(بقیہ حاشیہ ۲) اس پراسی قوم کی زبان میں اپنا کلام نازل کیا تاکہ وہ قوم اسے اچھی طرح سمجھے، اور اسے یہ عذر پیش کرنے کا موقع نہ مل سکے کہ آپ کی بھیجی ہوئی تعلیم تو ہماری سمجھ ہی میں نہ آتی تھی پھر ہم اس پر ایمان کیسے لاتے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض معجزہ دکھانے کی خاطر کبھی یہ نہیں کیا کہ رسول تو بھیجے ہندوستان میں اور وہ کلام سنائے چینی یا جاپانی زبان میں۔ اس طرح کے کرشمے دکھانے اور لوگوں کی عجائب پسندی کو آسودہ کرنے کی بہ نسبت اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں تعلیم و تلقین اور تفہیم و تبیین کی اہمیت زیادہ رہی ہے جس کے لئے ضروری تھا کہ ایک قوم کو اسی زبان میں پیغام پہنچایا جائے جسے وہ سمجھتی ہو۔

۳ یعنی باوجود اس کے کہ پیغمبر ساری تبلیغ و تلقین اسی زبان میں کرتا ہے جسے ساری قوم سمجھتی ہے، پھر بھی سب کو ہدایت نصیب نہیں ہو جاتی، کیونکہ کسی کلام کے محض عام فہم ہونے سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ سب سننے والے اسے مان جائیں۔ ہدایت اور ضلالت کا سررشتہ بہرحال اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہی جسے چاہتا ہے اپنے اس کلام کے ذریعہ سے ہدایت عطا کرتا ہے، اور جس کے لئے چاہتا ہے اسی کلام کو الٹی گمراہی کا سبب بنا دیتا ہے۔

۴ یعنی لوگوں کا بطور خود ہدایت پا لینا یا بھٹک جانا تو اس بنا پر ممکن نہیں ہے کہ وہ کاملاً خود مختار نہیں ہیں، بلکہ اللہ کی بالادستی سے مغلوب ہیں، لیکن اللہ اپنی اس بالادستی کو اندھا دھند استعمال نہیں کرتا کہ یونہی بغیر کسی معقول وجہ کے جسے چاہے الل ٹپ ہدایت بخش دے اور جسے چاہے خواہ مخواہ بھٹکا دے۔ وہ بالادست ہونے کے ساتھ حکیم و دانا بھی ہے۔ اس کے ہاں سے جس کو ہدایت ملتی ہے معقول وجوہ سے ملتی ہے، اور جس کو راہِ راست سے محروم کر کے بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے وہ درحقیقت اس سلوک کا مستحق ہوتا ہے۔

۵ "ایام" کا لفظ عربی زبان میں اصطلاحاً یادگار تاریخی واقعات کے لئے بولا جاتا ہے۔ "ایام اللہ" سے مراد تاریخِ انسانی کے وہ اہم ابواب ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے گذشتہ زمانہ کی قوموں اور بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کے اعمال کے لحاظ سے جزا یا سزا دی ہے۔

اِن واقعات میں بڑی نشانیاں ہیں[1] ہر اُس شخص کے لئے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔[2]

یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا "اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ اس نے تم کو فرعون والوں سے چھڑایا جو تم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے، تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ بچا رکھتے تھے۔ اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔ اور یاد رکھو، تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گذار بنو گے[3] تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے"۔ اور موسیٰ نے کہا کہ "اگر تم کفر کرو اور زمین کے سارے رہنے والے

---

[1] یعنی ان تاریخی واقعات میں ایسی نشانیاں موجود ہیں جن سے ایک آدمی توحیدِ خداوندی کے برحق ہونے کا ثبوت بھی پا سکتا ہے اور اس حقیقت کی بھی بے شمار شہادتیں فراہم کر سکتا ہے کہ مکافات کا قانون ایک عالمگیر قانون ہے، اور وہ سراسر حق اور باطل کے علمی و اخلاقی امتیاز پر قائم ہے، اور اس کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ایک دوسرا عالم یعنی عالمِ آخرت ناگزیر ہے۔ نیز ان واقعات میں وہ نشانیاں بھی موجود ہیں جن سے ایک آدمی باطل عقائد و نظریات پر زندگی کی عمارت اٹھانے کے برے نتائج معلوم کر سکتا ہے اور ان سے عبرت حاصل کر سکتا ہے۔

[2] یعنی یہ نشانیاں تو اپنی جگہ موجود ہیں مگر ان سے فائدہ اٹھانا صرف انہی لوگوں کا کام ہے جو اللہ کی آزمائشوں سے صبر اور پامردی کے ساتھ گزرنے والے ہوں اور اللہ کی نعمتوں کو ٹھیک ٹھیک محسوس کر کے ان کا صحیح شکریہ ادا کریں۔ چھچھورے اور کم ظرف اور احسان ناشناس لوگ اگر ان نشانیوں کا ادراک کر بھی لیں تو ان کی یہ اخلاقی کمزوریاں انہیں اس ادراک سے فائدہ اٹھانے نہیں دیتیں۔

[3] یعنی اگر ہماری نعمتوں کا حق پہچان کر ان کا صحیح استعمال کرو گے، اور ہمارے احکام کے مقابلہ میں سرکشی و استکبار نہ برتو گے، اور ہمارا احسان مان کر ہمارے مطیع فرمان بنے رہو گے۔

* یہ مضمون بائیبل کی کتاب استثناء میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اس کتاب میں حضرت موسیٰ اپنی وفات سے چند روز پہلے بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے سارے اہم واقعات یاد دلاتے ہیں، پھر توراۃ کے ان تمام احکام کو دہراتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو بھیجے تھے، پھر ایک طویل خطبہ (باب ۲۸ میں) پہلے

بھی کافر ہو جائیں تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔"

(بقیہ حاشیہ ۹۷) دیتے ہیں جس میں بتاتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنے رب کی فرمانبرداری کی تو کیسے کیسے انعامات سے نوازے جائیں گے اور اگر نافرمانی کی روش اختیار کی تو اس کی کیسی سخت سزا دی جائے گی یہ خطبہ اس کتاب کے ابواب نمبر ۴-۶-۸-۱۰-۱۱ اور ۲۸ تا ۳۰ میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے بعض بعض مقامات کمال درجہ موثر و عبرت انگیز ہیں مثال کے طور پر اس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں جن سے پورے خطبے کا اندازہ ہو سکتا ہے:

"سن اے اسرائیل، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا کے ساتھ محبت رکھ۔ اور یہ باتیں جن کا حکم آج میں تجھے دیتا ہوں تیرے دل پر نقش رہیں۔ اور تو ان کو اپنی اولاد کے ذہن نشین کرنا اور گھر بیٹھے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اٹھتے ان کا ذکر کرنا" (باب ۶۔ آیات ۴-۷)

"پس اے اسرائیل، خداوند تیرا خدا تجھ سے اس کے سوا اور کیا چاہتا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کا خوف مانے اور اس کی سب راہوں پر چلے اور اس سے محبت رکھے اور اپنے سارے دل اور ساری جان سے خداوند اپنے خدا کی بندگی کرے اور خداوند کے جو احکام اور آئین میں تجھ کو آج بتاتا ہوں ان پر عمل کرے تاکہ تیری خیر ہو۔ دیکھ آسمان اور زمین اور جو کچھ زمین میں ہے یہ سب خداوند تیرے خدا ہی کا ہے" (باب ۱۰۔ آیات ۱۲-۱۴)

"اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات کو جانفشانی سے مان کر اس کے ان سب حکموں پر جو آج کے دن میں تجھے دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا دنیا کی سب قوموں سے زیادہ تجھ کو سرفراز کریگا۔ اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات سنے تو یہ سب برکتیں تجھ پر نازل ہونگی اور تجھ کو ملیں گی۔ شہر میں بھی تو مبارک ہوگا اور کھیت میں بھی مبارک .... خداوند تیرے دشمنوں کو جو تجھ پر حملہ کریں تیرے روبرو شکست دلائے گا .... خداوند تیرے انبارخانوں میں اور سب کاموں میں جن میں تو ہاتھ ڈالے برکت کا حکم دیگا .... تجھ کو اپنی پاک قوم بناکر رکھے گا اور

(باقی آگے)

کیا نہیں آئی قوموں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گذر چکی ہیں؟ قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے

حاشیہ صفحہ ۲۱۰) دنیا کی سب قومیں یہ دیکھ کر کہ تو خداوند کے نام سے کہلاتا ہے تجھ سے ڈر جائیں گی۔ تو بہت سی قوموں کو قرض دیگا پر خود قرض نہیں لیگا اور خداوند تجھ کو دم نہیں بلکہ سر ٹھیرائے گا اور تو پست نہیں بلکہ سرفراز ہی رہیگا" (باب ۲۸۔ آیات ۱۔۱۳)

"لیکن اگر تو ایسا نہ کرے کہ خداوند اپنے خدا کی بات سن کر اس کے سب احکام اور آئین پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو یہ سب لعنتیں تجھ پر ہونگی اور تجھ کو لگیں گی شہر میں بھی تو لعنتی ہوگا اور کھیت میں بھی لعنتی ۔ ۔ ۔ ۔ خداوند اُن سب کاموں میں جن کو تو ہاتھ لگائے لعنت اور پھٹکار اور اضطراب کو تجھ پر نازل کریگا ۔ ۔ ۔ وبا تجھ سے لپٹی رہے گی ۔ ۔ ۔ ۔ آسمان جو تیرے سر پر ہے پیتل کا اور زمین جو تیرے نیچے ہے لوہے کی ہو جائے گی ۔ ۔ ۔ خداوند تجھ کو تیرے دشمنوں کے آگے شکست دلائیگا۔ تو ان کے مقابلہ کے لئے تو ایک ہی راستہ سے جائیگا مگر ان کے سامنے سات سات راستوں سے بھاگے گا ۔ ۔ ۔ عورت سے منگنی تو تو کریگا لیکن دوسرا اس سے مباشرت کریگا۔ تو گھر بنائیگا لیکن اُس میں بسنے نہ پائے گا۔ تو تاکستان لگائیگا پر اس کا پھل نہ کھا سکے گا۔ تیرا بیل تیری آنکھوں کے سامنے ذبح کیا جائیگا ۔ ۔ ۔ ۔ بھوکا اور پیاسا اور ننگا اور سب چیزوں کا محتاج ہو کر تو اپنے ان دشمنوں کی خدمت کریگا جن کو خداوند تیرے برخلاف بھیجے گا اور غنیم تیری گردن پر لوہے کا جوا رکھے گا جب تک وہ تیرا ناس نہ کر دے ۔ ۔ ۔ ۔ خداوند تجھ کو زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام قوموں میں پراگندہ کر دیگا" (باب ۲۸۔ آیات ۱۵۔۶۴)

لہ صفحہ سابق) اس جگہ حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کے معاملہ کی طرف یہ مختصر اشارہ کرنے سے مقصود اہل مکہ کو یہ ہے کہ اللہ جب کسی قوم پر احسان کرتا ہے اور جواب میں وہ قوم نمک حرامی اور سرکشی دکھاتی ہے تو پھر ایسی وہ عبرتناک انجام دیکھنا پڑتا ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے بنی اسرائیل دیکھ رہے ہیں۔ اب کیا تم بھی خدا کی نعمت کے احسان کا جواب کفرانِ نعمت سے دیکر یہی انجام دیکھنا چاہتے ہو؟

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جس نعمت کی قدر کرنے کا یہاں قریش سے مطالبہ (باقی ص۲۶۰ پر)

بعد آنے والی وہ بہت سی قومیں جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے؟ ان کے رسول جب ان کے پاس صاف صاف باتیں اور کھلی کھلی نشانیاں لئے ہوئے آئے تو انہوں نے اپنے منہ میں ہاتھ دبا لئے[1] اور کہا کہ "جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی طرف سے ہم سخت خلجان آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں[2]" رسولوں نے کہا "کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے[3]؟ وہ

(بقیہ حاشیہ ص۲۱) فرمایا ہے وہ خصوصیت کے ساتھ اس کی یہ نعمت ہے کہ اس نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے درمیان پیدا کیا اور آپ کے ذریعہ سے ان کے پاس وہ عظیم الشان تعلیم بھیجی جس کے متعلق حضور بار بار قریش سے فرمایا کرتے تھے کہ کلمۃ واحدۃ تعطونیہا تملکون بہا العرب وتدین لکم بہا العجم "میری ایک بات مان لو، عرب اور عجم سب تمہارے تابع ہو جائیں گے"۔

[1] ان الفاظ کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان بہت کچھ اختلاف پیش آیا ہے اور مختلف لوگوں نے مختلف معنی بیان کئے ہیں ہمارے نزدیک ان کا قریب ترین مفہوم وہ ہے جسے ادا کرنے کے لئے ہم اردو میں کہتے ہیں کانوں پر ہاتھ رکھے، یا دانتوں میں انگلی دبائی۔ اس لئے کہ بعد کا فقرہ صاف طور پر انکار اور اچنبھے، دونوں مضامین پر مشتمل ہے اور کچھ اس میں غصے کا انداز بھی ہے۔

[2] یعنی ایسا شک جس کی وجہ سے اطمینان رخصت ہو گیا ہے۔ یہ دعوتِ حق کا خاصہ ہے کہ جب وہ اٹھتی ہے تو اس کی وجہ سے ایک کھلبلی ضرور مچ جاتی ہے اور انکار و مخالفت کرنے والے بھی پورے اطمینان کے ساتھ نہ اس کا انکار کر سکتے ہیں نہ اس کی مخالفت۔ وہ چاہے کتنی ہی شدت کے ساتھ اسے رد کریں اور کتنا ہی زور اس کی مخالفت میں لگائیں، دعوت کی سچائی، اس کی معقول دلیلیں، اس کی کھری کھری اور بے لاگ باتیں، اس کی دل موہ لینے والی زبان، اس کے داعی کی بے داغ سیرت، اس پر ایمان لانے والوں کی زندگیوں کا صریح انقلاب، اور اپنے صدقِ مقال کے عین مطابق ان کے پاکیزہ اعمال، یہ ساری چیزیں مل جل کر کٹے سے کٹے مخالف کے دل میں بھی ایک اضطراب پیدا کر دیتی ہیں۔ داعیانِ حق کو بے چین کرنے والا خود بھی چین سے محروم ہو جاتا ہے۔

[3] رسولوں نے یہ بات اس لئے کہی کہ ہر زمانے کے مشرکین خدا کی ہستی کو مانتے تھے اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ زمین اور آسمانوں کا خالق وہی ہے۔ اسی بنیاد پر رسولوں نے فرمایا کہ آخر تمہیں شک کس چیز میں ہے؟ ہم جس چیز کی طرف تمہیں دعوت دیتے ہیں وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ اللہ فاطر السمٰوٰت والارض تمہاری بندگی کا حقیقی مستحق ہے۔ پھر کیا اللہ کے بارے میں تم کو شک ہے؟

بلا رہا ہے تاکہ تمہارے قصور معاف کرے اور تم کو ایک مدت مقرر تک مہلت دے[۱]۔" انہوں نے جواب
تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں[۲]۔ تم ہمیں ان ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے ہو جن کی بندگی
دادا سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند[۳]۔" رسولوں نے کہا[۴] "واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر
جیسے انسان۔ لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے[۵]۔ اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں
تمہیں کوئی سند لا دیں۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے آ سکتی ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہئے۔

---

[۱] مدت مقرر سے مراد افراد کی موت کا وقت بھی ہو سکتا ہے اور قیامت بھی۔ جہاں تک قوموں کا تعلق ہے ان
بننے اور گرنے کے لئے اللہ کے ہاں مدت کا تعین ان کے اوصاف کی شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے ایک
قوم اگر اپنے اندر بگاڑ پیدا کر لے تو اس کی مہلت عمل گھٹا دی جاتی ہے اور اسے تباہ کر دیا جاتا ہے۔ اور
بگڑی ہوئی قوم اگر اپنے برے اوصاف کو اچھے اوصاف سے بدل لے تو اس کی مہلت عمل بڑھا دی جاتی
قیامت تک بھی دراز ہو سکتی ہے۔ اسی مضمون کی طرف وہ آیت اشارہ کرتی ہے جو سورۂ رعد رکوع ۲
نہ چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے اوصاف کو نہ بدل دے۔

[۲] ان کا مطلب تھا کہ تم ہر حیثیت سے بالکل ہم جیسے انسان ہی نظر آتے ہو۔ کھاتے ہو، پیتے ہو، سوتے ہو،
بچے رکھتے ہو، بھوک، پیاس، بیماری، دکھ، سردی، گرمی، ہر چیز کے احساس میں اور ہر بشری کمزوری میں
مشابہ ہو۔ تمہارے اندر کوئی غیر معمولی پن ہمیں نظر نہیں آتا جس کی بنا پر ہم یہ مان لیں کہ تم کوئی پہنچے ہوئے
ہو اور خدا تم سے ہم کلام ہوتا ہے اور فرشتے تمہارے پاس آتے ہیں۔

[۳] یعنی کوئی ایسی سند جسے ہم آنکھوں سے دیکھیں اور ہاتھوں سے چھوئیں اور جس سے ہم کو یقین آ جائے کہ
خدا نے تم کو بھیجا ہے اور یہ پیغام جو تم لائے ہو خدا ہی کا پیغام ہے۔

[۴] یعنی بلاشبہ ہم ہیں تو انسان ہی۔ مگر اللہ نے تمہارے درمیان ہم کو ہی علم حق اور بصیرت کاملہ عطا کرنے کے
منتخب کیا ہے۔ اس میں ہمارے بس کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو اللہ کے اختیارات کا معاملہ ہے۔ وہ اپنے
دوں میں سے جس کو جو کچھ چاہے دے۔ ہم نہ یہ کر سکتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس آیا ہے وہ تمہارے پاس بھجوا
اور نہ یہی کر سکتے ہیں کہ جو حقیقتیں ہم پر منکشف ہوئی ہیں ان سے آنکھیں بند کر لیں۔

اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جبکہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے؟ جو اذیتیں تم

لوگ ہمیں دے رہے ہو ان پر ہم صبر کریں گے اور بھروسا کرنے والوں کا بھروسا اللہ ہی پر ہونا چاہیے۔[1] آخر کار

منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ "یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے

نکال دیں گے"۔[2] تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ "ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں

زمین میں آباد کریں گے۔[3] یہ انعام ہے اس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے

ڈرتا ہو"۔ انہوں نے فیصلہ چاہا تھا (تو یوں ان کا فیصلہ ہوا) اور ہر جبار دشمن حق نے منہ کی کھائی۔[4] پھر اس

کے بعد آگے اس کے لئے جہنم ہے۔ وہاں اسے کچ لہو کا سا پانی پینے کو دیا جائیگا جسے وہ زبردستی حلق سے

اتارنے کی کوشش کریگا اور مشکل ہی سے اتار سکے گا۔ موت ہر طرف سے اس پر چھائی رہے گی مگر وہ مرنے

نہ پائے گا اور آگے ایک سخت عذاب اس کی جان کا لاگو رہے گا۔

جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے اپنی گمراہ قوموں کی ملت میں شامل ہوا کرتے تھے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت سے پہلے چونکہ وہ ایک طرح کی خاموش زندگی بسر کرتے تھے، کسی دین کی تبلیغ اور کسی رائج الوقت دین کی تردید نہیں کرتے تھے، اس لئے ان کی قوم یہ سمجھتی تھی کہ وہ ہماری ہی ملت میں ہیں، اور نبوت کا کام شروع کر دینے کے بعد ان پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ ملت آبائی سے نکل گئے ہیں۔ حالانکہ وہ نبوت سے پہلے بھی کبھی مشرکین کی ملت میں شامل نہ ہوئے تھے کہ اس سے خروج کا الزام ان پر لگ سکتا۔

[2] یعنی گھبراؤ نہیں، یہ کہتے ہیں کہ تم اس ملک میں نہیں رہ سکتے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ اب یہ اس سرزمین میں نہ رہنے پائیں گے۔ اب تو جو تمہیں ماننے گا وہی یہاں رہے گا۔

[3] ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں اس تاریخی بیان کے پیرایہ میں دراصل کفار مکہ کو ان باتوں کا جواب دیا جا رہا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے۔ ذکر بظاہر پچھلے انبیاء اور ان کی قوموں کے واقعات کا ہے مگر چسپاں ہو رہا ہے وہ ان حالات پر جو اس سورہ کے زمانہ نزول میں پیش آ رہے تھے۔

کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔ وہ اپنے کیے کا کچھ بھی پھل نہ پا سکیں گے۔ یہی پرلے درجے کی گم گشتگی ہے۔
م دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے آسمان و زمین کی تخلیق کو حق پر قائم کیا ہے؟ وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے

---

۲۵ یعنی جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ نمک حرامی، بے وفائی، خودمختاری اور نافرمانی و سرکشی کی روش اختیار کی، اور اطاعت و بندگی کا وہ طریقہ اختیار کرنے سے انکار کر دیا جس کی دعوت انبیاء علیہم السلام دیتے ہیں، ان کا پورا کارنامۂ حیات، اور زندگی بھر کا سارا سرمایۂ عمل، آخرکار ایسا لاحاصل اور بے معنی ثابت ہوگا جیسے ایک راکھ کا ڈھیر تھا جو اکٹھا ہو ہو کر مدت دراز میں بڑا بھاری ٹیلہ سا بن گیا تھا، مگر صرف ایک ہی دن کی آندھی نے اس کو ایسا اڑایا کہ اس کا ایک ایک ذرہ منتشر ہو کر رہ گیا۔ ان کی نظر فریب تہذیب، ان کا شاندار تمدن، ان کی حیرت انگیز صنعتیں، ان کی زبردست سلطنتیں، ان کی عالیشان یونیورسٹیاں ان کے علوم و فنون اور ادب لطیف و کثیف کے اتھاہ ذخیرے، حتیٰ کہ ان کی عبادتیں اور ان کی ظاہری نیکیاں اور ان کے بڑے بڑے خیراتی اور رفاہی کارنامے بھی، جن پر وہ دنیا میں فخر کرتے ہیں، سب کے سب آخرکار راکھ کا ایک ڈھیر ہی ثابت ہوں گے جسے یوم قیامت کی آندھی بالکل صاف کر دے گی اور عالم آخرت میں اس کا ایک ذرہ بھی ان کے پاس اس لائق نہ رہیگا کہ اسے خدا کی میزان میں رکھ کر کچھ بھی وزن پا سکیں۔

۲۶ یہ دلیل ہے اس دعوے کی جو اوپر کیا گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اس بات کو سن کر تمہیں تعجب کیوں ہوتا ہے؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ یہ زمین و آسمان کا عظیم الشان کارخانہ تخلیق حق پر قائم ہوا ہے نہ کہ باطل پر؟ یہاں جو چیز حقیقت اور واقعیت پر مبنی نہ ہو بلکہ محض ایک بے اصل قیاس و گمان پر جس کی بنا رکھ دی گئی ہو اسے کوئی پائیداری نصیب نہیں ہو سکتی، اس کے لئے قرار و ثبات کا کوئی امکان نہیں ہے، اس کے اعتماد پر کام کرنے والا کبھی اپنے اعتماد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جو شخص پانی پر نقش بنائے اور ریت پر قصر تعمیر کرے وہ اگر یہ امید رکھتا ہے کہ اس کا نقش باقی رہیگا اور اس کا قصر کھڑا رہیگا تو اس کی یہ امید کبھی پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ پانی کی یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ نقش قبول کرے اور ریت کی یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ عمارتوں کے لئے مضبوط بنیاد بن سکے۔ لہٰذا سچائی اور حقیقت کو نظر انداز کر کے جو شخص باطل امیدوں پر اپنے عمل کی بنیاد رکھے اسے ناکام ہونا ہی چاہیئے۔ یہ بات اگر تمہاری سمجھ میں آتی ہے تو پھر یہ سن کر تمہیں [illegible]

اور ایک نئی خلقت تمہاری جگہ لے آتے۔ ایسا کرنا اس پر کچھ بھی دشوار نہیں ہے[1]۔

اور یہ لوگ جب اکٹھے اللہ کے سامنے بے نقاب ہونگے[2] تو اُس وقت اِن میں سے جو دنیا میں کمزور تھے

(بقیہ حاشیہ ۲۶) حیرت کس لئے ہوتی ہے کہ خدا کی اس کائنات میں جو شخص اپنے آپ کو خدا کی بندگی و اطاعت سے آزاد فرض کر کے کام کریگا، یا خدا کے سوا کسی اور کی خدائی مان کر (جس کی فی الواقع خدائی نہیں ہے) زندگی بسر کریگا، اس کا کارنامۂ زندگی ضائع ہو جائیگا جب واقعہ یہ نہیں ہے کہ انسان یہاں خود مختار ہو یا خدا کے سوا کسی اور کا بندہ ہو، تو اس پر اس خلاف واقعہ مفروضے پر اپنے پورے نظام فکر و عمل کی بنیاد رکھنے والا انسان تمہاری رائے میں پانی پر نقش کھینچنے والے احمق کا سا انجام نہ دیکھے گا تو اس کے لئے اور کس انجام کی تم توقع رکھتے ہو؟

[1] دعوے پر دلیل پیش کرنے کے بعد فوراً ہی یہ فقرہ نصیحت کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے اور ساتھ ساتھ اس میں ایک شبہ کا ازالہ بھی ہے جو اوپر کی دو ٹوک بات سن کر آدمی کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک شخص پوچھ سکتا ہے کہ اگر بات وہی ہے جو ان آیتوں میں فرمائی گئی ہے تو یہاں ہر باطل پرست اور غلط کار آدمی فنا کیوں نہیں ہو جاتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نادان! کیا تو سمجھتا ہے کہ اُسے فنا کر دینا اللہ کے لئے کچھ دشوار ہے؟ یا اللہ سے اس کا کوئی رشتہ ہے کہ اُس کی شرارتوں کے باوجود اللہ نے محض اقربا پروری کی بنا پر اسے مجبوراً چھوٹ دے رکھی ہو؟ اگر یہ بات نہیں ہے، اور تو خود جانتا ہے کہ نہیں ہے، تو پھر تجھے سمجھنا چاہیئے کہ ایک باطل پرست اور غلط کار قوم ہر وقت اس خطرے میں مبتلا ہے کہ اسے ہٹا دیا جائے اور کسی دوسری قوم کو اس کی جگہ کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس خطرے کے عملاً رونما ہونے میں اگر دیر لگ رہی ہے تو اس غلط فہمی کے نشے میں مست نہ ہو جاؤ کہ خطرہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ مہلت کے ایک ایک لمحہ کو غنیمت جانو اور اپنے باطل نظام فکر و عمل کی ناپائیداری محسوس کر کے اسے جلدی سے جلدی پائیدار بنیادوں پر قائم کر لو۔

[2] بَرَزُوا کے معنی محض نکل کر سامنے آنے اور پیش ہونے ہی کے نہیں ہیں بلکہ اس میں ظاہر ہونے اور کھل جانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اسی لئے ہم نے اس کا ترجمہ "بے نقاب ہو کر سامنے آجانا" کیا ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے تو بندے ہر وقت اپنے رب کے سامنے بے نقاب ہیں۔ مگر آخرت کی پیشی کے دن جب وہ سب کے سب اللہ کی عدالت میں حاضر ہونگے تو انہیں خود بھی معلوم ہوگا کہ ہم احکم الحاکمین اور مالک یوم الدین کے سامنے بالکل بے نقاب ہیں، ہمارا کوئی کام بلکہ کوئی خیال اور دل کے گوشوں میں چھپا ہوا کوئی ارادہ تک اس سے مخفی نہیں ہے۔

اُن لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کہیں گے" دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے، اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لئے بھی کچھ کر سکتے ہو؟" وہ جواب دیں گے "اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں بھی دکھا دیتے۔ اب تو یکساں ہے، خواہ ہم جزع فزع کریں یا صبر، بہرحال ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں[1]" ع

اور جب فیصلہ چکا دیا جائیگا تو شیطان کہے گا "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کئے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کئے ان میں سے کوئی بھی میں نے پورا نہ کیا[2]۔ میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تمہیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا[3]

---

[1] یہ تنبیہ ہے اُن سب لوگوں کیلئے جو دنیا میں آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے چلتے ہیں، یا اپنی کمزوری کو حجت بنا کر طاقت ور ظالموں کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ آج جو تمہارے لیڈر اور پیشوا اور افسر اور حاکم بنے ہوئے ہیں، کل ان میں سے کوئی بھی تمہیں خدا کے عذاب سے ذرہ برابر بھی نہ بچا سکے گا۔ لہٰذا آج ہی سوچ لو کہ تم جس کے پیچھے چل رہے ہو یا جس کا حکم مان رہے ہو وہ خود کہاں جا رہا ہے اور تمہیں کہاں پہنچا کر چھوڑے گا۔

[2] یعنی تمہارے تمام گلے شکوے اِس حد تک تو بالکل صحیح ہیں کہ اللہ سچا تھا اور میں جھوٹا تھا۔ اس واقعہ سے مجھے ہرگز انکار نہیں ہے۔ اللہ کے وعدے اور اس کی وعیدیں، تم دیکھ ہی رہے ہو کہ ان میں سے ہر بات جوں کی توں سچی نکلی۔ اور میں خود مانتا ہوں کہ جو بھروسے میں نے تمہیں دلائے، جن فائدوں کے لالچ تمہیں دیئے، جن خوشنما توقعات کے جال میں تمہیں پھانسا، اور سب سے بڑھ کر یہ یقین جو تمہیں دلایا کہ اوّل تو آخرت واخرت کچھ بھی نہیں ہے، سب محض ڈھکوسلا ہے، اور اگر ہوئی بھی تو فلاں حضرت کے تصدق سے تم صاف بچ نکلو گے، بس اُن کی خدمت میں نذر و نیاز کی رشوت پیش کرتے رہو اور پھر جو چاہو کرتے پھرو، نجات کا ذمہ ان کا، یہ ساری باتیں جو میں تم سے کہتا رہا اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے کہلواتا رہا، یہ سب کچھ محض دھوکا تھا۔

[3] یعنی اگر آپ حضرات یہ ثابت کر سکتے ہوں کہ آپ خود راہِ راست پر چلنا چاہتے تھے اور میں نے زبردستی آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو غلط راستے پر کھینچ لیا، تو ضرور اسے پیش فرمائیے، جو چور کی سزا سو میری۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ

بیٹھے ملامت کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا[ٹ] میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ ایسے ظالموں کے لئے تو دردناک سزا یقینی ہے۔ٹ

بقیہ حاشیہ ۲۱، خود مانیں گے کہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ دعوت حق کے مقابلہ میں اپنی دعوت باطل آپ کے سامنے پیش کی، سچائی کے مقابلہ میں جھوٹ کی طرف آپ کو بلایا، نیکی کے مقابلہ میں بدی کی طرف آپ کو پکارا۔ ماننے اور نہ ماننے کے جملہ اختیارات آپ ہی حضرات کو حاصل تھے۔ میرے پاس آپ کو مجبور کرنے کی کوئی طاقت نہ تھی۔ اب اپنی اس دعوت کا ذمہ دار تو بلاشبہ میں خود ہوں اور اس کی سزا بھی پا رہا ہوں۔ مگر آپ نے جو اس پر لبیک کہا اس کی ذمہ داری آپ مجھ پر کہاں ڈالنے چلے ہیں۔ اپنے غلط انتخاب اور اپنے اختیار کے غلط استعمال کی ذمہ داری تو آپ کو خود ہی اٹھانی چاہیئے۔

ٹ یہاں شرک اعتقادی کے ماسوا شرک کی ایک دوسری مستقل نوع، یعنی شرک عملی کے وجود کا ایک ثبوت ملتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ شیطان کو اعتقادی حیثیت سے تو کوئی بھی نہ خدائی میں شریک ٹھیراتا ہے اور نہ اسکی پرستش کرتا ہے۔ سب اس پر لعنت ہی بھیجتے ہیں۔ البتہ اس کی اطاعت اور غلامی اور اس کے طریقے کی اندھی یا آنکھوں دیکھے پیروی ضرور کی جا رہی ہے، اور اسی کو یہاں شرک کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب جواب میں فرمائیں کہ یہ تو شیطان کا قول ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے لیکن ہم عرض کریں گے کہ اول تو اس کے قول کی اللہ تعالیٰ خود تردید فرما دیتا اگر وہ غلط ہوتا۔ دوسرے شرک عملی کا صرف یہی ایک ثبوت قرآن میں نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد ثبوت پچھلی صورتوں میں گزر چکے ہیں اور آگے آ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ الزام کہ وہ اپنے احبار اور رہبان کو اربابٌ من دون اللہ بنائے ہوئے ہیں (آل عمران۔ رکوع ۷)، جاہلیت کی رسمیں ایجاد کرنے والوں کے متعلق یہ کہنا کہ ان کے پیروؤں نے انہیں خدا کا شریک بنا رکھا ہے (الانعام۔ رکوع ۱۶)، خواہش نفس کی بندگی کرنے والوں کے متعلق یہ فرمانا کہ انہوں نے اپنی خواہش نفس کو خدا بنا لیا ہے (الفرقان۔ رکوع ۴)، نافرمان بندوں کے متعلق یہ ارشاد کہ وہ شیطان کی عبادت کرتے رہے ہیں (یٰسٓ۔ رکوع ۴) اور انسانی ساختہ قوانین پر چلنے والوں کو ان الفاظ میں ملامت کہ اذن خداوندی کے بغیر جن لوگوں نے تمہارے لئے شریعت بنائی وہ تمہارے "شریک" ہیں (الشوریٰ۔ رکوع ۳)، کیا یہ سب اسی شرک عملی کی نظیریں نہیں ہیں جس کا (باقی ۲۹۹)

بخلاف اس کے جو لوگ دنیا میں ایمان لاتے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں وہ ایسے باغوں میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی۔ وہاں وہ اپنے رب کے اذن سے ہمیشہ رہیں گے اور وہاں ان کا استقبال سلامتی کی مبارکباد سے ہوگا[1]۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمۂ طیبہ[2] کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے

(بقیہ حاشیہ ص۲۷۱) یہاں ذکر ہو رہا ہے؟ ان نظیروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شرک کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ کوئی شخص عقیدۃً کسی غیر اللہ کو خدائی میں شریک ٹھیرائے۔ اُس کی ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ وہ خدائی سند کے بغیر، یا احکامِ خداوندی کے علی الرغم، اس کی پیروی اور اطاعت کرتا چلا جائے۔ ایسا پیرو اور مطیع اگر اپنے پیشوا اور مطاع پر لعنت بھیجتے ہوئے بھی عملاً یہ روش اختیار کر رہا ہو تو قرآن کی رو سے وہ اس کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے ہے، چاہے شرعاً اس کا حکم بالکل وہی نہ ہو جو اعتقادی مشرکین کا ہے۔

[1] تحیّہ کے لغوی معنی ہیں دعائے درازیٔ عمر۔ مگر اصطلاحاً عربی زبان میں یہ لفظ اُس کلمۂ خیر مقدم یا کلمۂ استقبال کے لئے بولا جاتا ہے جو دو آدمی آمنا سامنا ہونے پر سب سے پہلے ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا ہم معنی لفظ یا تو "سلام" ہے، یا پھر علیک سلیک۔ لیکن پہلا لفظ استعمال کرنے سے ترجمہ ٹھیک نہیں ہوتا، اور دوسرا لفظ مبتذل ہے، اس لئے ہم نے اس کا ترجمہ "استقبال" کیا ہے۔

تَحِيَّتُهُمْ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کے درمیان آپس میں ایک دوسرے کے استقبال کا طریقہ یہ ہو، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کا اس طرح استقبال ہوگا۔ نیز سَلَامٌ میں دعائے سلامتی کا مفہوم بھی ہے اور سلامتی کی مبارکباد کا بھی۔ ہم نے موقع کی مناسبت کا لحاظ کرتے ہوئے وہ مفہوم اختیار کیا ہے جو ترجمہ میں ہے۔

[2] کلمہ طیبہ کے لفظی معنی تو "پاکیزہ بات" کے ہیں، مگر اس سے مراد ہے قولِ حق اور عقیدۂ صالحہ جو سراسر حقیقت اور راستی پر مبنی ہو۔ یہ قول اور عقیدہ قرآن مجید کی رو سے لازماً وہی ہو سکتا ہے جس میں توحید کا اقرار، انبیاء اور کتب آسمانی کا اقرار، اور آخرت کا اقرار ہو، کیونکہ قرآن انہی امور کو بنیادی صداقتوں کی حیثیت سے پیش کرتا

فضا میں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں، ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے[1]۔ یہ مثالیں اللہ اس لئے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں۔ اور کلمۂ خبیثہ[2] کی مثال ایک بد ذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے۔ اس کے لئے کوئی استحکام نہیں ہے[3]۔ ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قولِ ثابت

---

[1] دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ زمین سے لیکر آسمان تک چونکہ سارا نظامِ کائنات اُسی حقیقت پر مبنی ہے جس کا اقرار ایک مومن اپنے کلمۂ طیبہ میں کرتا ہے۔ اس لئے کسی گوشے میں بھی قانونِ فطرت اس سے نہیں ٹکراتا، کسی شے کی بھی اصل اور جبلت اس سے ابا نہیں کرتی، کہیں کوئی حقیقت اور صداقت اس سے متصادم نہیں ہوتی۔ اسی لئے زمین اور اس کا پورا نظام اس سے تعاون کرتا ہے، اور آسمان اور اس کا پورا عالم اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔

[2] یعنی وہ ایسا بار آور اور نتیجہ خیز کلمہ ہے کہ جو شخص یا قوم اسے بنیاد بنا کر اپنی زندگی کا نظام اس پر تعمیر کرے اس کو ہر آن اُس کے مفید نتائج حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ وہ فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامت، مزاج میں اعتدال، سیرت میں مضبوطی، اخلاق میں پاکیزگی، روح میں لطافت، جسم میں طہارت و نظافت، برتاؤ میں خوشگواری، معاملات میں راست بازی، کلام میں صداقت شعاری، قول و قرار میں پختگی، معاشرت میں حسنِ سلوک، تہذیب میں فضیلت، تمدن میں توازن، معیشت میں عدل و مواساۃ، سیاست میں دیانت، جنگ میں شرافت، صلح میں خلوص اور عہد و پیمان میں وثوق پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا پارس ہے جس کی تاثیر اگر کوئی ٹھیک ٹھیک قبول کرے تو کندن بن جائے۔

[3] یہ لفظ کلمۂ طیبہ کی ضد ہے جس کا اطلاق اگرچہ ہر خلافِ حقیقت اور مبنی بر غلط قول پر ہو سکتا ہے، مگر یہاں اس سے مراد ہر وہ باطل عقیدہ ہے جس کو انسان اپنے نظامِ زندگی کی بنیاد بنائے، عام اس سے کہ وہ دہریت ہو، الحاد و زندقہ ہو، شرک و بت پرستی ہو، یا کوئی اور ایسا تخیل جو انبیاء کے واسطے سے نہ آیا ہو۔

[4] دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ عقیدۂ باطل چونکہ حقیقت کے خلاف ہے اس لئے قانونِ فطرت کہیں بھی اس سے موافقت نہیں کرتا۔ کائنات کا ہر ذرہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔ (باقی ص ۲۴۳)

کی دنیا و پہنچیا اور آخرت، دونوں میں ثبات عطا کرتا تھا ، اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے ، اللہ کو اختیار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) زمین و آسمان کی ہر شے اس کی تردید کرتی ہے ۔ زمین میں اس کا بیج بسنے کی کوشش کی جاتے تو ہر وقت وہ اسے اگلنے کے لئے تیار رہتی ہے آسمان کی طرف اس کی شاخیں بڑھنا چاہیں تو وہ انہیں نیچے دھکیلتا ہے ۔ انسان کو اگر امتحان کی خاطر انتخاب کی آزادی اور عمل کی مہلت نہ دی گئی ہوتی تو یہ بدذات درخت کہیں لگنے ہی نہ پاتا ۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کو اپنے رجحان کے مطابق کام کرنے کا موقع عطا کیا ہے ، اس لئے جو نادان لوگ قانونِ فطرت سے لڑ بھڑ کر یہ درخت لگانے کی کوشش کرتے ہیں ، ان کے زور مارنے سے زمین اسے تھوڑی بہت جگہ دے دیتی ہے ، ہوا اور پانی سے کچھ نہ کچھ غذا بھی اسے مل جاتی ہے ، اور فضا بھی اس کی شاخوں کو پھیلنے کے لئے بادلِ ناخواستہ کچھ موقع دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے ۔ لیکن جب تک یہ درخت قائم رہتا ہے کڑوے کسیلے ، زہریلے پھل دیتا رہتا ہے ، اور حالات کے بدلتے ہی حوادث کا ایک جھٹکا اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے ۔

کلمۂ طیبہ اور کلماتِ خبیثہ کے اس فرق کو ہر وہ شخص بآسانی محسوس کر سکتا ہے جو دنیا کی مذہبی ، اخلاقی ، فکری اور تمدنی تاریخ کا مطالعہ کرے ۔ وہ دیکھے گا کہ آغازِ تاریخ سے آج تک کلمۂ طیبہ تو ایک ہی رہا ہے مگر کلماتِ خبیثہ بے شمار پیدا ہو چکے ہیں ۔ کلمۂ طیبہ کبھی جڑ سے نہ اکھاڑا جا سکا ، مگر کلماتِ خبیثہ کی فہرست ہزاروں مردہ کلمات کے ناموں سے بھری پڑی ہے ، حتیٰ کہ ان میں سے بہتوں کا یہ حال ہے کہ آج تاریخ کے صفحات سے ہو کہیں ان کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا ۔ اپنے زمانے میں جن کلمات کا بڑا زور و شور رہا ہے آج ان کا ذکر کیا جائے تو لوگ حیران رہ جائیں کہ کبھی انسان ایسی ایسی حماقتوں کا بھی قائل رہ چکا ہے ۔ پھر کلمۂ طیبہ کو جب جہاں جس شخص یا قوم نے بھی صحیح معنوں میں اپنایا اس کی خوشبو سے اس کا ماحول معطر ہو گیا اور اس کی برکتوں سے صرف اسی نے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اس کے گردوپیش کی دنیا بھی ان سے مالا مال ہو گئی ۔ مگر کسی کلمۂ خبیثہ نے جہاں جس انفرادی یا اجتماعی زندگی میں بھی جڑ پکڑی اس کی سڑاند سے سارا ماحول متعفن ہو گیا اور اس کے کانٹوں کی چبھن سے نہ اس کا ماننے والا امن میں رہا ، نہ کوئی ایسا شخص جس کو اس سے سابقہ پیش آیا ۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ یہاں تمثیل کے پیرایہ میں اسی مضمون کو سمجھایا گیا ہے جو

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

ٹ و ٹ کا حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں

ہے جو چاہے کرے ۲۷

تم نے دیکھا اُن لوگوں کو جنہوں نے اللہ کی نعمت پائی اور اسے کفرانِ نعمت سے بدل ڈالا اور اپنے ساتھ

(بقیہ حاشیہ ۲۹ ، اوپر رکوع ۳ میں یوں بیان ہوا تھا کہ " اپنے رب سے کفر کرنے والوں کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو " اور یہی مضمون اس سے پہلے سورۂ رعد رکوع ۲ میں ایک دوسرے انداز سے سیلاب اور پگھلائی ہوئی دھاتوں کی تمثیل میں بیان ہو چکا ہے ۔

(حاشیہ ۳۵ صفحہ سابق) یعنی دنیا میں ان کو اس کلمہ کی وجہ سے ایک پائدار نقطۂ نظر، ایک مستحکم نظامِ فکر، اور ایک جامع نظریہ ملتا ہے جو ہر عقدے کو حل کرنے اور ہر گتھی کو سلجھانے کے لئے شاہ کلید کا حکم رکھتا ہے ۔ سیرت کا مضبوطی اور اخلاق کی اُستواری نصیب ہوتی ہے جسے زمانہ کی گردشیں متزلزل نہیں کر سکتیں ۔ زندگی کے ایسے ٹھوس اصول ملتے ہیں جو ایک طرف ان کے قلب کو سکون اور دماغ کو اطمینان بخشتے ہیں اور دوسری طرف انہیں سعی و عمل کی راہوں میں بھٹکنے، ٹھوکریں کھانے، اور تلوّن کا شکار ہونے سے بچاتے ہیں ۔ پھر جب وہ موت کی سرحد کو پار کر کے عالمِ آخرت کے حدود میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں کسی قسم کی حیرانی اور سراسیمگی و پریشانی ان کو لاحق نہیں ہوتی کیونکہ وہاں سب کچھ ان کی توقعات کے عین مطابق ہوتا ہے ۔ وہ اُس عالم میں اس طرح داخل ہوتے ہیں کہ گویا اس کی راہ و رسم سے پہلے ہی واقف تھے ۔ وہاں کوئی مرحلہ ایسا پیش نہیں آتا جس کی انہیں پہلے خبر نہ دے دی گئی ہو اور جس کے لئے انہوں نے قبل از وقت تیاری نہ کر رکھی ہو ۔ اس لئے وہاں ہر منزل سے وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ گزرتے ہیں ۔ ان کا حال وہاں اُس کافر سے بالکل مختلف ہوتا ہے جسے مرتے ہی اپنی توقعات کے سراسر خلاف ایک دوسری ہی صورتِ حال سے اچانک سابقہ پیش آتا ہے ۔

(حاشیہ ۳۶ صفحہ سابق)

یعنی جو ظالم کلمۂ طیبہ کو چھوڑ کر کسی کلمۂ خبیثہ کی پیروی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ذہن کو پراگندہ اور ان کی مساعی کو پریشان کر دیتا ہے ۔ وہ کسی پہلو سے بھی فکر و عمل کی صحیح راہ نہیں پا سکتے ۔ اُن کا کوئی تیر بھی نشانے پر نہیں بیٹھتا ۔

اپنی قوم کو بھی ہلاکت کے گھر میں جھونک دیا — یعنی جہنم، جس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بدترین جائے قرار ہے —— اور اللہ کے کچھ ہمسر تجویز کر لئے تاکہ وہ انہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں۔ ان سے کہو، اچھا، مزے کر لو، آخر کار تمہیں پلٹ کر جانا دوزخ ہی میں ہے۔

اے نبی! میرے جو بندے ایمان لائے ہیں ان سے کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اُس میں سے کھلے اور چھپے (راہِ خیر میں) خرچ کریں[1] قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوست نوازی ہو سکے گی۔[2]

اللہ وہی تو ہے[3] جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ سے تمہاری رزق رسانی کے لئے طرح طرح کے پھل پیدا کئے۔ جس نے کشتی کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ سمندر میں اُس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمہارے لئے مسخر کیا۔ جس نے سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کیا۔[4] جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم

---

[1] مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کی روش کفار کی روش سے مختلف ہونی چاہئے۔ وہ تو کافرِ نعمت ہیں۔ انہیں شکر گزار بندہ بننا چاہئے اور اس شکر گزاری کی عملی صورت یہ ہے کہ نماز قائم کریں اور خدا کی راہ میں اپنے مال خرچ کریں۔

[2] یعنی نہ تو وہاں کچھ دے دلا کر ہی نجات خریدی جا سکے گی اور نہ کسی کی دوستی کام آئے گی کہ وہ تمہیں خدا کی پکڑ سے بچا لے۔

[3] یعنی وہ اللہ جس کی نعمت کا کفران کیا جا رہا ہے، جس کی بندگی و اطاعت سے منہ موڑا جا رہا ہے، جس کے ساتھ زبردستی کے شریک ٹھیرائے جا رہے ہیں وہ وہی تو ہے جس کے یہ اور یہ احسانات ہیں۔

[4] "تمہارے لئے مسخر کیا" کو لوگ غلطی سے "تمہارے تابع کر دیا" کے معنی میں لے لیتے ہیں، اور پھر اس مضمون کی آیات سے عجیب عجیب معنی پیدا کرنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ بعض لوگ تو یہاں تک سمجھ بیٹھے کہ ان آیات کی رُو سے تسخیرِ سماوات و ارض انسان کا منتہائے مقصود ہے۔ حالانکہ انسان کے لئے ان چیزوں کو مسخر کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے قوانین کا پابند بنا رکھا ہے جن کی بدولت وہ انسان کے لئے نافع ہو گئی ہیں۔ کشتی اگر فطرت کے چند مخصوص قوانین کی پابند نہ ہوتی تو انسان کبھی بحری سفر نہ کر سکتا۔ دریا اگر مخصوص قوانین میں جکڑے ہوئے نہ ہوتے تو کبھی ان سے نہریں نہ نکالی جا سکتیں۔ سورج اور چاند اور ستارے اگر ضابطوں میں کسے ہوئے نہ ہوتے تو یہاں زندگی ہی ممکن نہ ہوتی، کجا کہ ایک چلتا پھرتا انسانی تمدن وجود میں آسکتا

نے مانگا[1]۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کر نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔[2]

یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے دعا کی تھی[3] کہ "پروردگار! اس شہر[4] کو امن کا شہر بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ پروردگار! ان بتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈالا ہے[5] (ممکن ہے کہ میری اولاد کو بھی یہ گمراہ کر دیں، لہٰذا ان میں سے) جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو یقیناً تو درگزر کرنے والا مہربان ہے[6]۔ پروردگار! میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد

---

[1] یعنی تمہاری فطرت کی ہر مانگ پوری کی، تمہاری زندگی کے لئے جو جو کچھ مطلوب تھا مہیا کیا، تمہارے بقا اور ارتقاء کے لئے جن جن وسائل کی ضرورت تھی سب فراہم کر دیے۔

[2] عام احسانات کا ذکر کرنے کے بعد اب اُن خاص احسانات کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے قریش پر کئے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ تمہارے باپ ابراہیم نے یہاں لا کر کن تمناؤں کے ساتھ تمہیں بسایا تھا اور کی دعاؤں کے جواب میں کیسے کیسے احسانات ہم نے تم پر کئے، اور اب تم اپنے باپ کی تمناؤں اور اپنے رب کے احسانات کا جواب کن گمراہیوں اور بداعمالیوں سے دے رہے ہو۔

[3] یعنی مکہ

[4] یعنی خدا سے پھیر کر اپنا گرویدہ کیا ہے۔ یہ مجازی کلام ہے۔ بت چونکہ بہتوں کی گمراہی کے سبب بنے ہیں اس لئے گمراہ کرنے کے فعل کو ان کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

[5] یہ حضرت ابراہیم کی کمال درجہ نرم دلی اور نوع انسانی کے حال پر انکی انتہائی شفقت ہے کہ وہ کسی حال میں انسان کو خدا کے عذاب میں گرفتار ہوتے نہیں دیکھ سکتے بلکہ آخر وقت تک عفو و درگزر کی التجا کرتے رہتے ہیں۔ رزق کے معاملہ میں تو انہوں نے یہاں تک کہہ دینے میں دریغ نہ فرمایا کہ وَارْزُقْ اَھْلَہٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْھُمْ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ۔ رکوع ۱۵) لیکن جہاں آخرت کی پکڑ کا سوال آیا وہاں ان کی زبان سے یہ نکلا کہ جو میرے طریقے کے خلاف چلے اسے سزا دے ڈالیو، بلکہ کہا تو یہ کہا کہ ان کے معاملہ میں کیا عرض کروں، تو غفور رحیم ہے۔ اور یہ کچھ اپنی ہی اولاد کے ساتھ اُس سراپا رحم و شفقت انسان کا مخصوص رویہ نہیں ہے، (باقی

نے ایک بےآب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار! یہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں، لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور ہر طرح کی پیداوار سے ان کو رزق پہنچا،[1] شاید کہ یہ شکر گزار بنیں۔ پروردگار! تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں"[2] ——— اور[3] واقعی اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمانوں میں ——— "شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحٰق جیسے بیٹے دیے، حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا سنتا ہے۔ اے میرے پروردگار! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں)۔ پروردگار! میری دعا قبول کر۔ پروردگار! مجھے اور میرے والدین کو[4] اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو جبکہ حساب قائم ہوگا"۔ع

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸) بلکہ جب فرشتے قوم لوط جیسی بدکار قوم کو تباہ کرنے جا رہے تھے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ بڑی محبت کے انداز میں فرماتا ہے کہ "ابراہیم ہم سے جھگڑنے لگا"۔ (ھود۔ رکوع ۷) یہی حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ان کے روبرو عیسائیوں کی گمراہی ثابت کر دیتا ہے تو وہ عرض کرتے ہیں کہ "اگر حضور ان کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ بالادست اور حکیم ہیں"۔ (المائدہ۔ رکوع ۱۶)

[1] یہ اسی دعا کی برکت ہے کہ پہلے سارا عرب مکہ کی طرف حج اور عمرے کیلئے کھنچ کر آتا تھا، اور اب دنیا بھر کے لوگ کھنچ کھنچ کر وہاں جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی اسی دعا کی برکت ہے کہ ہر زمانے میں ہر طرح کے پھل، غلّے، اور دوسرے سامان رزق وہاں پہنچتے رہتے ہیں اور آج بھی پہنچ رہے ہیں، حالانکہ اس وادیٔ غیر ذی زرع میں جانوروں کے لئے چارہ تک پیدا نہیں ہوتا۔

[2] یعنی خدایا جو کچھ میں زبان سے کہہ رہا ہوں وہ بھی تو سن رہا ہے اور جو جذبات میرے دل میں چھپے ہوئے ہیں ان سے بھی تو واقف ہے۔

[3] یہ جملہ معترضہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے قول کی تصدیق میں فرمایا ہے۔

[4] حضرت ابراہیمؑ نے اس دعائے مغفرت میں اپنے باپ کو اس وعدے کی بنا پر شریک کر لیا تھا جو انہوں نے وطن سے نکلتے وقت کیا تھا کہ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي (مریم ۳)۔ مگر بعد میں جب انہیں احساس ہوا کہ وہ تو اللہ کا دشمن تھا تو انہوں نے اس سے صاف تبری فرما دی (التوبہ ۱۴)

اب یہ ظالم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، اللہ کو تم اس سے غافل نہ سمجھو۔ اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے اُس دن کے لئے جب حال یہ ہوگا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں، سر اٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں، نظریں اوپر جمی ہیں[1] اور دل اُڑے جاتے ہیں۔ اے محمدؐ، اُس دن سے تم انہیں ڈراؤ جبکہ عذاب انہیں آ لیگا۔ اُس وقت یہ ظالم کہیں گے کہ "اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت کو لبیک کہیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے۔" (مگر انہیں صاف جواب دے دیا جائیگا کہ) کیا تم وہی لوگ نہیں ہو جو اس سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم پر تو کبھی زوال آنا ہی نہیں ہے؟ حالانکہ تم اُن قوموں کی بستیوں میں رہ بس چکے تھے جنہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا تھا اور دیکھ چکے تھے کہ ہم نے ان سے کیا سلوک کیا اور اُن کی مثالیں دے دے کر ہم تمہیں سمجھا بھی چکے تھے۔ انہوں نے اپنی ساری ہی چالیں چل دیکھیں، مگر اُن کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا اگرچہ ان کی چالیں ایسی غضب کی تھیں کہ پہاڑ ان سے ٹل جائیں۔[2]

پس اے نبی، تم ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ کبھی اپنے رسولوں سے کئے ہوئے وعدوں کے خلاف کرے گا۔[3] اللہ زبردست ہے اور انتقام لینے والا ہے۔ ڈراؤ انہیں اس دن سے جبکہ زمین اور آسمان بدل کر

---

[1] یعنی قیامت کا جو ہولناک نظارہ ان کے سامنے ہوگا اس کو اس طرح ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے ہونگے گویا کہ ان کے دیدے پتھرا گئے ہیں، نہ پلک جھپکے گی، نہ نظر ہٹے گی۔

[2] یعنی تم یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ تمہاری پیش رو قوموں نے قوانینِ الٰہی کی خلاف ورزی کے نتائج سے بچنے اور انبیاء کی دعوت کو ناکام کرنے کے لئے کیسی کیسی زبردست چالیں چلیں، اور یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ اللہ کی ایک ہی چال سے وہ کس طرح مات کھا گئے، مگر پھر بھی تم حق کے خلاف چالبازیاں کرنے سے باز نہ آئے اور یہی سمجھتے رہے کہ تمہاری چالیں ضرور کامیاب ہونگی۔

[3] اس جملے میں کلام کا رُخ بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، مگر دراصل سنانا آپ کے مخالفین کو مقصود ہے۔

کھول کے رکھ دیئے جائیں گے[1] اور سب کے سب اللہ واحد قہار کے سامنے بے نقاب ہو جائیں گے۔ اس روز تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں ہاتھ پاؤں جکڑے ہونگے، تارکول[2] کے لباس پہنے ہوئے ہونگے اور آگ کے شعلے ان کے چہروں پر چھائے جا رہے ہونگے۔ یہ اس لئے ہوگا کہ اللہ ہر متنفس کو اس کے کئے کا بدلا دے، اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لئے، اور یہ بھیجا گیا ہے اس لئے کہ ان کو اس کے ذریعہ سے خبردار کر دیا جائے اور وہ جان لیں کہ حقیقت میں خدا بس ایک ہی ہے اور جو عقل رکھتے ہیں وہ ہوش میں آ جائیں۔

---

[1] اس آیت سے اور قرآن کے دوسرے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں زمین و آسمان بالکل نیست و نابود نہیں ہو جائیں گے بلکہ صرف موجودہ نظام طبیعی کو درہم برہم کر ڈالا جائیگا۔ اس کے بعد نفخ صور اوّل اور نفخ صور ثانی کے درمیان ایک خاص مدت میں، جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، زمین اور آسمانوں کی موجودہ ہیئت بدل دی جائیگی اور ایک دوسرا نظام طبیعت، دوسرے قوانین فطرت کے ساتھ بنا دیا جائیگا۔ وہی عالم آخرت ہوگا۔ اس میں نفخ صور ثانی کے ساتھ ہی تمام وہ انسان جو تخلیق آدم سے لیکر قیامت تک پیدا ہوئے تھے، از سر نو زندہ کئے جائیں گے اور میدان حشر میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے۔ قرآن کے اشارات اور حدیث کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ حشر اسی زمین پر برپا ہوگا، یہیں عدالت قائم ہوگی، یہیں میزان لگائی جائیگی اور قصئہ زمین بر سر زمین ہی چکایا جائیگا۔ نیز یہ بھی قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ ہماری وہ دوسری زندگی جس میں یہ معاملات پیش آئیں گے، محض روحانی نہیں ہوگی بلکہ ٹھیک اسی طرح جسم و روح کے ساتھ ہم زندہ کئے جائیں گے جس طرح آج زندہ ہیں، اور ہر شخص ٹھیک اسی شخصیت کے ساتھ وہاں موجود ہوگا جسے لئے ہوئے وہ دنیا سے رخصت ہوا تھا۔

[2] بعض مترجمین و مفسرین نے قَطِران کے معنی گندھک اور بعض نے پگھلے ہوئے تانبے کے بیان کئے ہیں، مگر درحقیقت عربی میں قَطِران کا لفظ زفت، قیر، رال، اور تارکول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

رفتہ رفتہ اقدامات متعدد ... تبدیلیاں ... مکمل ہو جائیں گے۔ مگر تھوڑی ہی مدت ... ہو گیا کہ ...

کہ بہت جلد یہ سوال ختم ہوتے ہوتے مسلمانوں کی رائے عام پوری طرح اس مطالبہ حق پر متفق ہو گئی جو آغاز سوال میں پیش کیا گیا تھا، اور مارچ ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی کو طوعاً و کرہاً قرار داد مقاصد پاس کرنی پڑی۔

جماعت اسلامی کو یہ دعویٰ نہیں ہے کہ مطالبے کی یہ مہم سراسر اس کی طاقت سے کامیاب ہوئی ہے۔ بلاشبہ ملک کی تمام اسلامی جماعتوں اور تمام دین پسند عناصر کی قوت اس میں شریک تھی، اور اس میں ان لوگوں کا بھی حصہ تھا جو نہ اس وقت جماعت کے دوست تھے نہ آج ہیں۔ مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جماعت اسلامی ہی اس کی اصل محرک تھی اور اگر یہ منظم طاقت اس کی پشت پر نہ ہوتی تو ان منتشر آوازوں سے جو وقتاً فوقتاً اسلامی نظام کے حق میں اٹھتی رہتی تھیں اس مطالبہ کا ایک باقاعدہ مہم کی شکل اختیار کرنا، اور پھر کامیابی کی منزل تک پہنچنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس حقیقت کو وہ لوگ بھی جانتے ہیں جنہوں نے اس مہم کے سلسلہ میں کچھ کام کیا ہے اور وہ برسر اقتدار گروہ بھی جانتا ہے جسے اس کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا ہے۔

جو لوگ سیاسی معاملات کا فہم نہیں رکھتے وہ شاید آج تک بھی یہ اندازہ نہیں کر سکے ہیں کہ یہ کس قدر اہم اور ضروری قدم تھا جو جماعت نے اٹھایا اور کس قدر بروقت اٹھایا۔ آج اس کی اہمیت اور اس کے دوررس نتائج ہم بیان بھی کریں تو وہ ان کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہم اس میں ناکام ہو گئے ہوتے اور یہاں آئینی طور پر لادینی اصولوں کو ریاست کی بنیاد بنانے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا تو ہمارے بھائیوں کو معلوم ہو جاتا کہ یہاں اسلام کے علمبرداروں کا مستقبل کیسا خطرناک ہے۔ اب یہ سراسر اللہ کا فضل ہے کہ کم از کم اس نوزائیدہ ریاست کا دستوری نصب العین تو اسلام کے عین مطابق بن چکا ہے اور آئینی حیثیت سے کفر کے مقابلہ میں اسلام کی پوزیشن مضبوط ہو گئی ہے۔ اس پر مزید فضل یہ ہے کہ رائے عام پوری طرح اس آئینی پوزیشن کی حمایت پر کمربستہ ہے اور اس کو کسی ذریعہ سے بدل ڈالنا کوئی آسان کام نہیں رہا ہے۔

جماعت اسلامی کی فردِ قراردادِ جرم

(از جناب مولانا الحاج حکیم عبدالرشید محمود صاحب گنگوہی)

[ذیل میں ایک بزرگ کا مضمون درج کیا جا رہا ہے جو دراصل رسالہ "فاران" کراچی کو بغرضِ اشاعت بھیجا گیا تھا، مگر مدیر فاران نے ازراہِ عنایت ہمارے پاس بھیج دیا تاکہ ہم جواب سمیت اسے اکٹھا شائع کر دیں۔ ہم ایک مدت سے سن رہے تھے کہ دیوبند و سہارنپور کے مدارسِ علمیہ سے انتساب رکھنے والے متعدد بزرگوں کی مجالس میں جماعت اسلامی کے خلاف اعتراضات، الزامات اور وسوسہ اندازیوں کا سلسلہ چل رہا ہے اور ان کے معتقدین بالعموم مسلمانوں کو اس جماعت سے بدگمان کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، لیکن ابھی تک ہمیں تفصیل کے ساتھ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ آخر ہمارا وہ قصور کیا ہے جس کی یہ سزا دی جا رہی ہے۔ اب ہم مدیر فاران کے شکر گزار ہیں کہ ان کے وسیلے سے یہ فردِ قراردادِ جرم ہمیں مل گئی اور پہلی مرتبہ ہمیں اس بات سے آگاہی نصیب ہوئی کہ ان مقدس بارگاہوں میں ہمیں کن قصوروں کا مجرم ٹھیرایا جاتا ہے۔

ابتداءً یہ تحریر صرف ایک "مستند عالمِ دین اور متدین و متشرع بزرگ" کے نام سے آئی تھی۔ بعد میں جب معلوم ہوا کہ یہ ہمارے پاس بغرضِ جواب پہنچ گئی ہے تو اظہارِ نام کی اجازت دے دی گئی۔

اس تحریر میں جو جزوی غلط بیانیاں یا غلط فہمیاں ہیں ان کا جواب حاشیہ میں بھی دے دیا گیا ہے اور آخر میں ایک جامع اصولی جواب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے قلم سے درج کیا جا رہا ہے۔

اس موقع پر ہم تحدیثاً للنعمہ جماعت اسلامی کی اس خدمت پر اظہارِ فخر کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک مدت دراز کے بعد اس امت کو ہماری بدولت ایک نقطۂ اجتماع میسر آیا ہے۔ اس وقت کمیونسٹ، قادیانی، منکرینِ حدیث، خلاعت پسند ملاحدہ، فرنگیت زدہ اصحاب و خواتین اور دینی خیال کے حضرات تو بھی جماعت اسلامی کے خلاف متحد ہو چکے ہیں، اور ان کے ساتھ اہلِ حدیث

اور دیوبندی بزرگوں کا بھی ایک بڑا حصہ اس محاذ پر متفق ہو کر ایک ملت واحدہ بنا رہا ہے۔ جماعت اسلامی کی دعوت نہ اٹھتی تو شاید اتنے مختلف احزاب کسی معاملے میں یوں مجتمع نہ ہو سکتے۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء]

مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے متعلق میرے تاثرات آپ دریافت فرما رہے ہیں۔ دیانۃً جو میری رائے ہے وہ عرض کرتا ہوں۔ گو مجھ کو اندیشہ ہے کہ پوری بات احتیاط کے ساتھ مع اپنے تمام ضروری گوشوں کے اُسی قدر وزن کے ساتھ جتنی کہ ہے شاید ادا نہ کر سکوں۔ ممکن ہے کہیں افراط ہو جائے اور کہیں تفریط۔ اس لئے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہوئے اور ممکن احتیاط برت کر جو کچھ سمجھا عرض کرتا ہوں:۔

غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کی دعوت و تحریک اور مجموعۂ لٹریچر کچھ منفعتیں بھی اپنے اندر رکھتا ہے اور بعض مضرتیں بھی۔ منفعت اس اعتبار سے کہ ایک ایسا طبقہ دین سے آشنا ہو رہا ہے جس کا دین کی طرف میلان دشوار تھا۔ اور وہ الحاد کی دلدل میں پھنسا تھا۔ کم از کم اور مغربوں کے ساتھ اُن کے متکلمانہ اداروں تعبیرات اور حسنِ ادب و انشا کی یہ خوبی ہے کہ وہ اس طبقے کے ریب و تشکیک یا جحود و انکار کو تصدیق و اثبات کی طرف مائل کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہیں۔ نیز دین کے خلاف اور مذہب سے متصادم آج جو تحریکیں قومیت، وطنیت اور کمیونزم وغیرہ کی راہ سے سامنے آ رہی ہیں اُن کے مقابلے کے لئے پوری طرح مستعد ہے۔ اس خدمت کا وزن اپنی جگہ پر بہت وزنی ہے۔ جو مضرتیں سامنے آ رہی ہیں وہ یہ ہیں۔ جماعت کے حلقے میں غیر شعوری طور پر یہ زعم پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ دین، دین کا درد، اُس کا شعور بس اس جماعت میں محدود اور اس دائرے میں مخصوص ہے۔ بلکہ حضرات صحابہؓ کے بعد سے دین کو بہمہ شعبہ جات اور بجمیع جہات کا فتنہ بس ہم نے سمجھا ہے۔ سوائے اس کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کی

سعیٔ مشکور صرف ہمارا حصہ ہے[لہ] حتیٰ کہ اس سلسلۃ الذہب کی بعض کڑیاں جو حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ سے شروع ہو کر ہندوستان میں خاندان ولی اللّٰہی اور حضرت سید احمد شہیدؒ تک پہنچیں وہ بھی باوجود اپنے تمام محاسن کے اغلاط سے خالی نہیں۔ اس پندار و زعم کا نتیجہ یہ ہے[تلہ] کہ جماعت ایک فرقے کی

لہ اس مبہم الزام کا اگر کوئی ثبوت موجود ہو تو ضرور ارشاد فرمایا جائے۔ اور اگر یہ نتیجہ صرف ان تحریروں سے اخذ کیا گیا ہے جو اقامتِ دین کی سعی سے مسلمانوں کی عام غفلت، اور دین کے معاملے میں قوم کے مختلف طبقوں کی کوتاہیوں پر متنبہ کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ تو اس کو بدگمانی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اور اس بدگمانی سے امت کے اگلوں پچھلوں میں سے کون ایسا شخص بچ سکتا ہے جس نے کبھی اصلاح کی کوشش کی ہے یا اب کرنے اٹھے؟ اگر ارشاد ہو تو زمانہ گذشتہ کے بہت سے بزرگوں کی ایسی تحریروں کے نمونے پیش کئے جائیں جن میں اس "زعم" کا رنگ اس سے بدرجہا زیادہ پایا جاتا ہے جس کی آپ شکایت فرما رہے ہیں۔ بعید نہیں کہ وہ نمونے خود آپ کی نظر سے بھی گزرے ہوں اور آپ کو اس لئے نہ کھٹکے ہوں کہ وہ حضرات آپ کے معاصر نہیں ہیں اور آپ ان سے کوئی "خطرہ" محسوس نہیں فرماتے۔ مگر کیا آپ ان لوگوں کو حق بجانب سمجھتے ہیں جو ان کے معاصر تھے اور جنہوں نے یہی رنگ دیکھ کر ان کے مقابلے میں وہ رویہ اختیار کیا جو آج آپ اور آپ جیسے بہت سے دیندار اپنے ایک خادم دین معاصر کے مقابلے میں اختیار فرما رہے ہیں؟ قریب ترین دور کی مثال حضرت سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی ہے جن پر ابھی ایک صدی سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری ہے۔ ان کے ساتھ ان کے معاصرین کا جو معاملہ رہا ہے اسے ذرا یاد فرمالیں۔

تلہ ممکن ہے آپ کے نزدیک تمام بزرگانِ سلف معصوم اور منزہ عن الخطا ہوں اور شاید ان کو ایسا سمجھنے کے لئے آپ کے پاس کچھ شرعی دلائل بھی موجود ہوں۔ مگر ہم انبیاء کے سوا کسی کا یہ مرتبہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور خود بزرگانِ سلف نے اپنے بزرگانِ سلف کا یہ مرتبہ ماننے سے انکار کیا ہے۔ صحابہؓ کی مختلف آراء کے متعلق امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا احد القولین خطاو والمأثم فیہ موضوع، اور امام مالکؒ نے صاف کہا خطأ و صواب فانظر فی ذالک۔ ہم نے جب کبھی سلف صالحین میں سے کسی کی رائے سے اختلاف کیا ہے یا ان کے کام میں کسی خامی کی نشاندہی کی ہے تو ان کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھ کر، اور ان کے دینی کارناموں کو خراجِ تحسین ادا کر کے کی ہے، اور اس غرض کے لئے کی ہے کہ ہم اپنی حد تک صواب کو پہنچنے اور غلطی سے بچنے کی کوشش کریں۔ اسے اگر آپ بے ادبی یا تعلّی پر محمول فرماتے ہیں تو ہم صرف یہ عرض کرنے پر اکتفا کریں گے کہ ذرا اپنے مدرسوں کی ان تقریروں کو بھی یاد فرمالیں جو درسِ حدیث و فقہ کے سلسلے میں ہوا کرتی ہیں اور جن میں امام بخاریؒ اور امام شافعیؒ جیسے ائمہ کا اس شان سے تخطئہ کیا جاتا ہے کہ شاید ہماری کسی تقریر و تحریر میں اس کے عشرِ عشیر کی نظیر بھی نہ پیش کی جا سکے۔

ست منفیار کر رکھی ہے تحزب اور گروہ بندی کی خصوصیت تفریق ہے۔ اور جماعت کے اندر وہ ظاہر کا امتیاز ہے۔ چنانچہ اس جماعت کے افراد کی زبان پر اکثر آجاتا ہے کہ ہم اصلی اور تحقیقی مسلمان ہیں دوسرے نسلی اور تقلیدی۔ لٹریچر سے جو طبقہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ وہ بقدر تاثر عام علمائے امت سے بدظن ہوتا جا رہا ہے[1]۔ اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے کہ دین کی روح ہم مطلع ہیں جس کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو اجتہاد کا مستحق سمجھنے لگتا ہے۔ چونکہ دنیا کے کسی عالم متقدم یا متأخر پر تو اس کو اعتماد رہتا نہیں۔ اس لئے دین کے بارے میں کسی عالم کی طرف رجوع کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ خود اجتہاد کرتا ہے یا جماعت کے وابستہ اہل علم سے رجوع کرتا ہے اور

---

[1] جی ہاں۔ علمائے امت سے بدظنی تو اب اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ جماعت اسلامی مسلمانوں کی پوری قومی زندگی کی باگ ڈور علمائے دین کے ہاتھ میں دینے پر تل گئی ہے، اور پنجاب کے تازہ انتخابات میں اسی خطا کار جماعت نے (شاید اس ملک کی سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ) یہ کوشش کی کہ ایک درجن سے زیادہ علماء کا ایک پورا جتھا اسمبلی میں بھیجا جائے، اور پاکستان میں سیاسی اقتدار پر علماء کے قابض ہونے کا خطرہ اگر ہے تو اسی قابل ملامت گروہ کی کوششوں سے ہے، ورنہ اگر یہ گروہ میدان میں نہ ہو، یا نہ رہے تو اس خطرے کے رونما ہونے کا نہ امکان تھا نہ آئندہ اس کا اندیشہ ہے۔ یہ سب علماء سے بدظنی ہی کے تو کھلے کھلے ثبوت ہیں!

ہمارے متدین اور متشرع ناقد اگر برا نہ مانیں تو ہم عرض کریں کہ جس طریقے سے علماء کے مختلف طبقوں اور بعض نمایاں بزرگوں نے جماعت اسلامی کی مخالفت فرمائی ہے اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کی طرح اس جماعت میں بھی علماء سے بدظنی بلکہ نفرت پیدا ہو جاتی، لیکن اس جماعت کی ذہنی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ کسی ظالم کا ظلم اسے حق اور انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتا۔ بعض علماء کی زیادتیوں کے باوجود تمام علماء کے خلاف کوئی جذبہ کسی ادنیٰ درجے میں بھی جماعت کے لوگوں میں پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ خود زیادتی کرنے والوں کے خلاف بھی نفرت کے بجائے اگر کوئی جذبہ پیدا ہوا تو وہ افسوس کا تھا۔ پھر یہ جماعت کبھی علم دین کی اہمیت سے غافل نہیں ہوئی اور اس نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ مسلمانوں کے معاملات کی صحیح طریقے سے سربراہ کاری اگر کچھ لوگ کر سکتے ہیں تو وہی جو دین کا علم رکھتے ہوں۔

ماعت کے پورے حلقے میں ایک عالم بھی ایسا نہیں جس کا علم اور تفقہ تفصیلی مسائل میں لائقِ
اعتماد ہو۔ اس لئے اُن کے بڑے بڑے مدعیانِ علم مسائل کے بارے میں فاحش اور مضحکہ خیز
غلطیاں کرتے ہیں[1]۔ صرف یہی نہیں کہ فقہ حنفی کے اعتبار سے وہ غلطی کرتے ہوں۔ بلکہ چونکہ کتاب
سنت اور فقہائے امت کے استنباطات پر ان کی نظر بہت کم ہے۔ انھوں نے دین کے صرف
ایک ہی شعبہ کا اچھا مطالعہ کیا ہے۔ باقی شعبوں میں اُن کا علم بہت ناقص اور خام ہے اس لئے
فاحش غلطیاں پیش آتی ہیں۔ مگر جماعت دین میں انھی کو مرجع سمجھتی اور اعتماد رکھتی ہے۔ میرے
خیال بلکہ مشاہدہ میں جماعت کی اکثریت میں یہ مرض پیدا ہو رہا ہے۔ جو اشراط ساعت میں ارشاد
نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اعجاب کل ذی رأی برأیہ ہے۔ اس اعجاب رائے کا یہ اثر ہے
کہ ہر فرد جماعت مائل با جتہاد اور براہ راست کتاب و سنہ سے اخذ و استنباط کا مدعی ہے۔ خواہ

---

[1] بڑی مہربانی ہوگی اگر دو چار "فاحش" اور "مضحکہ خیز" غلطیوں کی نشان دہی فرما دی جائے۔ اس کے بعد کچھ عرض کیا جا سکے گا۔ البتہ
اصولی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جس نے وسیع پیمانے پر کوئی علمی کام کیا ہو اور اس میں کچھ نہ کچھ غلطیاں
نہ کی ہوں۔ مگر یہ آپ لوگوں کی وسعتِ ظرف ہے کہ اپنے گروہ کے کسی شخص سے غلطی ہو جائے تو پہلے تاویلیں کر کر کے اس کی بات بنانے کی
کوشش کرتے ہیں، اور پھر بھی جب بات نہیں بنتی تو اس کو قلم کی لغزش اور سہو و نسیان وغیرہ نرم الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اپنے گروہ سے
باہر کے کسی شخص کی کوئی غلطی نظر آجائے تو وہ فاحش اور مضحک غلطی سے کم الفاظ کی مستحق نہیں ہوتی، اور معاملہ اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا
بلکہ اس بنیاد پر فیصلہ یہ صادر کیا جاتا ہے کہ وہ شخص علم سے محروم ہے اور اسے مسائلِ دین میں کلام کرنے کا حق نہیں ہے۔
ہم اس بحث کو ناگوار حد تک بڑھانا نہیں چاہتے، ورنہ اس تعصب اور اجارہ دارانہ ذہنیت کی متعدد مثالیں پیش
کرتے۔ تاہم فاضل ناقد سے اور ان کے طرز پر سوچنے والے دوسرے حضرات سے اتنی گزارش ضرور کریں گے کہ
جماعت اسلامی کے جن لوگوں کا ذکر آپ نے "بڑے بڑے مدعیانِ علم" کے الفاظ سے کیا ہے براہ کرم ذرا اُن کے
علمی کام پر ایک نگاہ ڈالیں اور کچھ انصاف کے ساتھ، اگر انصاف کی جنس گراں نہ ہو، آپ کے پاس ہی بتائیں کہ آپ کے
نزدیک ان کے اس پورے ذخیرے میں کام کتنے ہیں اور "فاحش" و "مضحک" غلطیاں کس قدر

اس کا علم اور مبلغ فکر جماعتی لٹریچر کی چند کتب ہی ہوں۔ اور بے باکی کے ساتھ فقہائے امت اور سلفِ صالحین پر تنقید کے لئے پر تولنے کو تیار ہے۔ مگر نہیں جانتا۔ کہ تنقید و اجتہاد کی حدود کیا ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ حدِ تنقید سے نکل کر تنقیص و تحمیق کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے[۵۲]۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کا مورد بنتا ہے کہ آخر زمانے میں لوگ ناجائز چیزوں کا نام بدل کر جائز کر لیں گے۔ تنقیص و تخفیف کے ذہیمے کو تنقید کے عنوان سے بدل کر اسے جواز اختیار کرنا عموماً مشاہد ہے۔ یہ تنقیص تحتِ وعید۔ لَعَنَ آخِرُ هٰذِهِ الامۃ اولھا (اس امت کے آخر زمانے کے لوگ سلف کی تنقیص کریں گے) کی خبر دے رہی ہے۔

ایک اہم ترین عنصر دین کے ایک بڑے شعبہ سلوک و تصوف اور احسان سے متعلق بھی ہے۔ اکابر جماعت چونکہ اس کوچے سے عملاً اور اعتقاداً بالکل فارغ ہیں۔ اس لئے اب اس جماعت کا مزاج یہ بنتا جا رہا ہے کہ اس شعبے کی خیر سے نہ صرف وہ محروم ہیں۔ بلکہ اس خیر کے حاملین صوفیائے کرام اور اربابِ سلوک (جو تنہا اس کفرزار آذرستان میں اشاعتِ اسلام کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آلۂ جارحہ رہے اور جن کے انفاسِ پاک سے آج کروڑوں مسلمان یہاں نظر آ رہے ہیں)

---

[۵۱] یہ صریح تہمت ہے جو تقویٰ کا باس اوڑھ کر لگائی گئی ہے۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ جناب کو کتنے افرادِ جماعت سے ملنے اور ان کے کام اور کلام سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے جس کی بنا پر یہ شہادت ادا کی جا رہی ہے کہ جماعت کا ہر فرد کتاب و سنت سے براہِ راست اخذ و استنباط کا مدعی اور فقہائے امت اور سلف صالحین پر تنقید کے لئے پر تولنے کو تیار ہے؟ دوسروں پر جب آپ لوگ زبان کھولتے ہیں تو یوں حق اور انصاف سے بے نیاز ہو کر صریح بہتان گھڑنے تک سے نہیں چوکتے۔ اور دوسرے اگر کبھی پورا پورا ادب و احترام ملحوظ رکھ کر بھی آپ کے گروہ کے کسی چھوٹے یا بڑے سے اختلافِ رائے کا اظہار کر گزریں تو اس کا ایسا گہرا زخم آپ حضرات کے دلوں پر لگتا ہے کہ دس دس بارہ بارہ برس گزر جانے پر بھی جب ٹٹولیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ہرا ہے۔

[۵۲] براہِ کرم ایک مثال ایسی پیش فرمائیں جس میں فقہائے امت اور سلف صالحین کی "تنقیص" اور "تحمیق" کی گئی ہو۔ اور اگر آپ نہیں کر سکتے تو پھر اتنا دیکھ لیجئے کہ یہ حدودِ تنقید سے جناب کی واقفیت ہی کا جلوہ ہے جو ان سطور میں نظر آ رہا ہے؟

ی یا غیر شعوری طور پر مبغوض ہوتے جا رہے ہیں اور جن قدسی نفوس کو ہم قرآن و سنۃ کا مکمل کھلنے
ملانے والا تصور کرتے تھے آج وہ یوگی، اشراقی، اور سنیاسی کے القاب سے ملقب کئے جا رہے
۔ اور ان کو قطعاً یہ اندازہ نہیں کہ ہم کتنی بڑی خیر سے محروم اور کیسی عظیم جسارت کے مرتکب ہو رہے
مراحتاً وہ لوگ سلوک و احسان کے منکر نہیں۔ مگر حصولِ احسان و تحصیل سلوک کے طُرق متعارفۂ
یا کا وہ اس شدت سے رد کرتے ہیں کہ وہ صرف طرق ہی سے اختلاف کی حد تک نہیں رہتا۔ بلکہ اُن
کو اختیار کرنے والوں کی تنقیص اور بدگمانی تک منجر ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے بعض ذی علم محتاط افراد
ندی سے محفوظ ہوں جن کی تعداد بہ غایت محدود ہوگی۔ ورنہ عامۃً اکثریت اس سے خالی نہیں
رہے کہ جب مولانا مودودی حضرت مجدد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے تمام کمالات
ندین۔ تفقہ اور تورع اور جامعیت کاملہ کے ساتھ ان کی مجددیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ لکھیں کہ
سلمانوں کو طرقِ تصوف کی مہلک اور زہریلی غذا ان حضرات نے دی" تو مولانا نے تو ان حضرات
رفعتِ شان ملحوظ رکھتے ہوئے اسی جملہ پر کتفا کیا۔ مقلدین ضروری نہیں کہ تجزیہ کرکے محتاط ہی
۔ وہ کہہ سکتے اور سمجھ سکتے ہیں۔ کہ اگر یہ حضرات مجدد تھے تو مجدد کا پہلا کام ماحول کی تشخیص ہے۔

ہم پھر دریافت کرتے ہیں کہ جماعت کی اکثریت سے آپ کی واقفیت ہے کتنی جس کی بنا پر آپ دیانۃً کوئی عام
بیان کرنے میں حق بجانب ہوں؟
یہ ادھورا اور ایک حد تک خود ساختہ فقرہ جس عبارت سے اخذ کیا گیا ہے وہ رسالہ تجدید و احیاء دین میں
۲ سے ۵ تک ملاحظہ کر لی جائے۔ اس پوری عبارت کو پڑھ کر ہی ایک انصاف پسند ناظر رائے قائم کر سکتا
وہاں کیا بات کس رنگ میں کہی گئی ہے اور یہاں اس فرد قرار دادِ جرم میں اسے کیا رنگ دے کر پیش
رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کو تجدید و احیاء دین کے مصنف سے اختلاف ہی ہو اور صرف یہ نہیں اگر وہ اختلاف باقی ہے مگر
ئی منصف مزاج اور حق پرست آدمی اس کی پوری عبارت پڑھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اُسی طرح مطعون کئے جانے کے لائق
رح یہاں لائے اور اس کی لپیٹ میں پوری جماعتِ اسلامی کو مطعون کیا گیا ہے؟

یتعین کرنا کہ جاہلیت کس منفذ اور راستے سے قصرِ اسلام میں داخل ہوئی ہے۔ اس تشخیص اور
کے بعد مجدد کا کام یہ ہے کہ اُس منفذ کو فوراً بند اور اُس راہ کو فوراً مسدود کردے جس سے
جاہلیت نے راہ پائی ہے۔ اور مولانا مودودی کے خیال میں جاہلیت خصوصیت سے براہِ تصوف
قصر میں داخل ہوئی ہے۔ تو مجدد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہ کیسے مجدد ہیں جنھوں نے اس راہ
کی تشخیص کیا نہ مسدود کیا۔ صرف صوفیائے جُہّال کی چند مخترعہ رسوم میں اصلاح پر اکتفا کیا حالانکہ
ضرورت تھی قطعی انسداد کی۔ تو ظاہر ہے کہ یہ حضرات اور ان کے اختیار کردہ تمام وسائل تحصیل
سلوک جماعت کی نظر میں کس قدر موجب تخفیف ہوں گے۔ میں سوچا کرتا ہوں کہ سلاسل اربعہ
کے تمام مروجہ طرق جن کی اصل کتاب وسنۃ میں بالدلالت موجود ہے۔ اور سلف سے خلف تک
متقدمین سے متاخرین تک کسی نے ان کو ترک نہیں کیا حتیٰ کہ اُن میں وہ حضرات بھی ہیں جن کو امت
نے من یجدد لھا دینھا کا مصداق اور خدمت تجدید و احیاء کے شرف سے مشرف بھی سمجھا۔ اُن کو
اپنایا اور انھی وسائل سے سلوک و احسان کی بلندیوں تک پہنچے۔ حتیٰ کہ امام غزالیؒ تو المنقذ من
الضلال ص ۳۱ میں یہاں تک لکھتے ہیں کہ وبالجملة فمن لم یرزق منه شیئاً بالذوق فلیس
یدرك من حقیقة النبوة الا الاسم یعنی مختصر یہ کہ جس نے تصوف کا مزہ نہیں چکھا۔ وہ نام کے
سوا نبوت کی حقیقت کو جان نہیں سکتا۔ ممکن ہے اس پر یہ کہا جائے کہ تصوف کا انکار نہیں۔ بلکہ
طرقِ تصوف پر گفتگو ہے۔ تو آگے طرق کے متعلق فرماتے ہیں۔ وبما بان لی بالضرورة من ممارسة
طریقتھم حقیقة النبوة وخاصیتھا یعنی صوفیوں کے طریقے کی مشق سے مجھ کو نبوت کی حقیقت
اور خاصیت بدیہی طور پر معلوم ہو گئی۔ یقیناً ان طرق میں کوئی عمیق منفعت اور عظیم مصلحت موجود ہے۔
اور تجربہ اور فکر غائر سے بھی یہ بات معلوم ہوئی کہ اگرچہ یہ طرق و وسائل احسان کے موقوف علیہ نہیں
نہ ان پر انحصار ہے کہ الطرق الی اللہ بعدد انفاس الخلائق مسلم ہے۔ مگر اس دور بعید عن خیر
القرون میں عامۃ افراد و احاد انھی طرق کے ذریعہ اقصیٰ منازل روحانیت۔ قرب و معیت حق
ربط باللہ خشیۃ اللہ اور استحضار حق کی خصوصی و معیاری کیفیات راسخہ تک پہنچے ہیں۔ اور مجدد

[illegible]

[illegible] سکتا تھا کہ اسلام تو کنت سے از ما ہی تک رہتے جس پر نجات کا مدار ہے اور جن [illegible]

حضرت مجدد سرہندیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نفس کے انکار کے باوجود صرف قلب جنان [illegible]

تصدیق پر کفایت فرما کر نجات دیدیں گے۔ البتہ نفس کا تکسر تذلل۔ کیف وحال اور ذوق

[illegible]دان کا انشراح عادۃً آج انہی طرق میں منحصر ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ بطریق

[illegible]بیت اپنے انجذابِ خصوصی سے کسی کو نوازیں۔ اس لئے رد و انکار کے بجائے اگر کسی شخص کو ان

[illegible] سے مناسبت نہ ہو تو نہ اختیار کرے کہ مامور بہ تو ہیں نہیں۔ ایسے شخص کے لئے صرف عبادات

[illegible] مامورہ ہی پر جن کی ہیئات بھی مطلوب و منصوص ہیں قناعت کافی ہے۔ اس کو نسبت

[illegible]مال انہی عبادات مقصودہ میں حاصل ہو سکتی ہے۔ بلکہ استعمالِ طرق کے بعد جب احسان تک

[illegible]ل پہنچ جاتا ہے۔ تو مشائخ ترکِ طرق کا حکم دے کر صرف منصوصہ عبادات میں مشغولی کا شغل

[illegible]تے ہیں۔ غرض مقصد یہ ہے کہ ان طرق کا رد و انکار اور بغض و کراہت تو ایک تعدی ہے جو ان

[illegible] دو اساطین امت کے رد و انکار اور بغض و تخفیف تک مفضی ہوتی ہے۔ غایت ما فی الباب نہ اختیار

ہے۔ اختیار پر اصرار نہیں اس لئے کہ ان پر مدارِ نجات نہ یہ احسان کے موقوف علیہ محض وسائل

[illegible] درجے میں ہیں جن کو باحتیاط استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نقشبندیہ اور خصوصاً حضرت مجدد سرہندیؒ

تصورِ شیخ تک کو استعمال کرایا جو بیحد خطرناک اور مخدوش طریقہ ہے۔ محض اس لئے کہ جانتے تھے

[illegible] عموماً خوگر پیکر محسوس ہیں۔ صورت محسوس کے بغیر مجرد معنیٰ تک وصول کی صلاحیت ہی نہیں محسوس

[illegible]تی کا ذوق اس قدر مسلط ہے اور تجرید و تفرید معانی سے اس قدر عاری ہیں کہ بغیر اس کے خدا کا

[illegible] ور و تمکن قلوب میں ہوتا ہی نہیں۔ سالہا سال کی اصنام پرستی۔ صورت پسندی اور اِجْعَلْ لَنَا

[illegible] اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ اور لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً۔ کی بد ذوقی نے تنزیہی الوہیت [illegible]

[illegible] مثال بے کیف و لون بے جہت و قیاس خدا کا تصور دشوار تر کر دیا۔ اور وصول [illegible]

[illegible] ہوائی سفر کے بجائے چلنے ہی کے ذریعے اگر قطع مسافت ممکن ہو تو یوں ہی سہی۔ [illegible]

ہے۔ مگر چونکہ مخدوش ہے اس لئے بعض حضرات نے اس سے گریز بھی کیا۔ حاصل یہ ہے کہ یہ طبقہ اس جماعت کے نزدیک اس درجہ منکر اور مبغوض ہو گئے کہ اب یہ بغض و منکریت ذواتِ صالحین تک پہنچ گئی۔ میرے کان نے ایک رکنِ جماعت کی زبان سے بلا واسطہ۔ ایک بڑے زبردست صاحب سلسلۂ چشتی بزرگ (جن کے وصال پر تین سو سال گزرے) کے متعلق اُن لوگوں کو خطاب کر کے کہتے سنا جو ان کے مزار پر حاضر ہو رہے تھے۔ "کہاں جا رہے ہو۔ ایک سنیاسی ہے جو پتھروں میں پڑا ہے"[1] ایک اور صاحب کو جو ایک بڑے دار العلوم کے فاضل بھی ہیں اور جماعت کے رکن بھی۔ حضرت مجدد سرہندیؒ کے مکتوبات پر رکیک تبصرہ کرتے دیکھا۔[2] قریب ہی ایک جماعتی ماہنامہ "زندگی" میں ایک شخص کا جو کم از کم ہمدرد تو یقیناً ہے۔ آدمی خاصہ پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ جس میں وہ لکھتا ہے کہ لٹریچر دیکھنے سے مجھ میں یہ انقلاب رونما ہوا۔ کہ اب میں صحابہؓ کے بعد سے آج تک سوائے مولانا مودودی کے کسی شخص کو کامل الایمان نہیں سمجھتا۔ دین کے اس ضروری تقاضے سے جو مولانا مودودی نے سمجھا ہے۔ تعجب ہے کہ صحابہؓ کے بعد سے اب تک ہر شخص فارغ اور خالی الذہن رہا خصوصاً صوفیا نے تو دین کو ایک پرائیویٹ اصول بنا کر جوگ و سنیاس کی حیثیت دیدی۔ میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے مسلک کو غلط تصور کرتا ہوں۔ بڑے بڑے مشاہیر امت کا کامل الایمان ہونا میری نظر میں مشتبہ ہو گیا ہے...... آگے چل کر لکھا ہے کہ بعض دفعہ مجھ کو خیال ہوتا ہے کہ میں ہی غلطی پر ہوں۔ ایسا بھی کیا اس تیرہ سو سال میں ایک مودودی صاحب نئے نرالے مولوی۔ مجتہد۔ فہم دین رکھنے والے پیدا ہوئے جنھوں نے سلف کی تمام خدمات پر پانی پھیر دیا۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ پھر کہا ہے مبادا جو اس کے اصول تحریک کتاب و سنۃ پر منطبق ہیں اس سے میں دست کش نہیں

---

[1] یہ گفتگو کہاں کس شخص سے ہوئی ہے؟ ذرا اس کی صراحت فرمائی جائے تاکہ تحقیق کی جا سکے۔

[2] ان صاحب کا نام بھی ارشاد ہو اور یہ بھی فرمایا جائے کہ وہ رکیک تبصرہ کیا تھا۔ اس کے بعد ان کا بیان بھی لیا جا سکے گا۔

ولی گڑھ اٹھ

ور فرمایئے کہ یہ سب کچھ کیوں ہے۔ اس لئے کہ مولانا مودودی کا فکری و علمی مزاج و قوام بادجو
خلاص و نیک نیتی کے اسی انداز کا واقع ہوا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ " میں نے دین کو حال یا
کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے براہِ راست کتاب و سنت سے سمجھا ہے۔" یہ عبارت کئی
ہ کی تصانیف میں موجود ہے۔ اس عبارت نے امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آحاد و ائمہ
لمذہبین اور ان کی تمام علمی۔ فقہی مساعی اور خدمات سے امت کو بکسر مستغنی کر دیا ہے۔ ممکن ہے
کا مقصد اس کے مفہوم میں اس قدر عموم و توسع نہ ہو۔ مگر لٹریچر دیکھنے والے نہ صرف غیر
ہ بلکہ اہلِ علم بھی اس عموم کے رجحان سے فارغ نہیں۔ جس کا نتیجہ ہے سلف کی خدمات کی بے
یا کم از کم استغنا۔ اور خود کتاب و سنت سے اخذ و استنباط کا عزم۔ اور اپنے فہم نصوص و تعین
ی کی ترجیح۔ یعنی ہم رجال و ھم رجال کا اعتماد۔ قبل اس جائزہ کے کہ آخذ کا ذخیرۂ علم کو ہضم
ور استنباط و اجتہاد کی حدود و شرائط کیا ہیں۔ حالانکہ جمہور اہلِ حق کا وہ مسلک اور احتیاطی

عبارت جس کا یہاں اقتباس دیا جا رہا ہے ماہ نامہ " زندگی " کے کس پرچے میں شائع ہوئی ہے؟ اگر ماہ و سال
صریح کر دی جاتی تو اصل مضمون نکال کر دیکھا جا سکتا تھا کہ لکھنے والے نے کیا لکھا ہے، ادارۂ زندگی نے اسے
نیت سے شائع کیا ہے، اور جناب اسے کیا رنگ دے رہے ہیں۔
پھر ایک صریح تہمت ہے جو اس قدر بے باکی کے ساتھ لگائی گئی ہے جس عبارت کو آپ سیاق و سباق سے الگ کر کے اپنے ملنے معنی
ہیں اس سے قائل کا اپنا منشا یہ ہے کہ وہ دین کے فہم میں ماضی و حال کے کسی شخص یا گروہ کا اندھا مقلد نہیں ہے بلکہ کتاب و سنت کی کسوٹی
ہو سکتا ہے، اس لئے بڑے بڑے نام لے کر اس کو مرعوب کرنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ جو کچھ منوانا ہو اسے کتاب و سنت کی دلیل سے منوایا جائے اس کا
ہرگز نہیں ہے کہ وہ شخص بزرگانِ سلف کی تمام علمی و فقہی مساعی سے خود مستغنی بنتا ہے اور دوسروں میں یہ استغنا پیدا کرتا ہے۔ یہ الزام
کیسے لگایا جا سکتا ہے جب کہ اس نے سینکڑوں مواقع پر اپنے مضامین اور کتابوں میں مفسرین، محدثین اور ائمہ مجتہدین کی
دیکھتے ہیں ان کے اقوال سے استناد کیا ہے، اور لوگوں کو اُن کی کتابوں سے استفادے کا مشورہ دیا ہے۔

ثانی مجدد اول حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ایک موقعہ پر فرماتے ہیں کہ :-

خذوا من الرای ما یوافق من کان	اپنے سے پہلوں کی رائے کو ترجیح دو اور اختیار کرو
قبلکم فانہم کانوا اوفق بالسنۃ	اس لئے کہ وہ تم سے زیادہ اعلم اور موافق سنۃ تھے۔
واعلم منکم۔	یعنی زیادہ رازدانِ مزاجِ دین تھے۔

مولانا مودودی اجتہاد پر زور دیتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی بعض عبارتیں نقل فرماتے ہیں جن میں حضرت شاہ صاحب روحِ اجتہاد کے مردہ ہونے کی شکایت اور تقلید جامد سے اختلاف کرتے ہیں۔ بلاشبہ شاہ صاحبؒ اس طرف مائل تھے اور فرماتے تھے۔ وجبلتی تابی التقلید وتانف منہ راساً لکن طلب منی التعبد بہ بخلاف نفسی۔

مگر تعجب یہ ہے کہ مولانا اُن عبارتوں کو تو نقل فرما دیتے ہیں جو ترکِ تقلید اور اجتہاد کی ترغیب میں وارد ہیں لیکن وہ تصانیف جو دو سالہ قیام حرمین شریفین کے بعد کی اور پختہ حال و عمر کی ہیں، مثلاً فیوض الحرمین۔ حجۃ اللہ۔ تفہیمات۔ عقد الجید۔ اُن میں جس شدت کے ساتھ ترک و منع اجتہاد اور مذاہبِ اربعہ میں محدود رہنے کی تاکیدات ہیں۔ اُن سے بالکل صرفِ نظر فرما جاتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ فیوض الحرمین ص ۶۴، ۶۵ میں فرماتے ہیں :-

استفدت منہ صلی اللہ علیہ وسلم	میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تین امور کا استفادہ کیا
ثلاثۃ امور خلاف ما کان عندی	اپنے رجحان کے خلاف۔ ان میں سے دوسری یہ تھی
وثانیہا الوصاۃ بالتقلید بہذہ المذاہب	کہ ان مذاہبِ اربعہ (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی)
الاربعۃ لا اخرج منہا۔	سے ہرگز باہر نہ نکلوں۔

تفہیمات ص ۱۱۸ میں فرماتے ہیں کہ باوجود شرائط اجتہاد پائے جانے کے اگر کوئی قضیہ ایسا سامنے آئے کہ علمائے سابقین کا کوئی حکم و فتویٰ اس کے متعلق موجود ہو تو ہرگز اس سے تجاوز نہ کرے۔ عقد الجید ص ۳۸ میں فرماتے ہیں کہ آج مذاہبِ اربعہ سے نکلنا سوادِ اعظم سے نکلنے کے مترادف ہے۔ غرض جا بجا اقوال منع اجتہاد کی عبارات موجود ہیں۔ مگر مولانا نے ان سے قطعی اعتنا نہیں کیا۔

حالانکہ مقتضائے دیانت یہ تھا کہ دونوں قسم کے اقوال و عبارات نقل فرماتے پھر ایک کو ترجیح
[illegible] کو پیش کرتے۔ پھر اس جہت میں عموم و اطلاق اس درجہ برتا کہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ مولانا
کس نوع اجتہاد کو لانا چاہتے ہیں۔ اجتہادِ مطلق۔ اجتہادِ انتساب۔ اجتہاد فی المذاہب
اصحابِ ترجیح میں ہیں کہ اصحابِ تخریج تک ہیں۔ البتہ امیر جماعت ہند مولوی ابو اللیث
صاحب تو صاف لکھتے ہیں کہ "ہم اجتہادِ مطلق کے قائل ہیں۔ ان اقسام کو نہیں جانتے"

اسی طرح فنِ حدیث میں "مسلکِ اعتدال" اُن کا ایک مقالہ ہے جو بعض جہات
سے نہایت فاضلانہ ہے اور غیر معتدل بھی ہے۔ محدثین کرام کی تحقیقِ حدیث اور
تعدیل و تنقید رُواۃ و روایات کے ذیل میں انھوں نے حدیث کے اعتماد کو
بہت حد تک کم اور سلف کے وقار کو بہت حد تک گرا دیا ہے۔ اس لئے کہ
"بلحاظ اسناد اور بلحاظ تفقہ اُن میں جو سُقم ہے اُس کی بنا پر کونسی ایسی چیز ہے
جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو" معیارِ استناد میں بھی احتمالِ نقص اور احوالِ رواۃ بھی
غیر معتبر۔ اس لئے کہ "نفس اُن کے ساتھ لگا ہوا تھا اور نفسانی رجحانات سے وہ مبرا نہ
تھے" اور یہ رجحانات فعلیت کے درجے میں بھی آتے رہتے تھے۔ تفہیمات مصنفہ مولانا
مودودی ص ۱۹ سے دیکھ جائیے۔ خصوصاً فقہاءؒ۔ محدثینؒ۔ اور صحابہؓ کے باہم کلمات
بد زبانی۔ سب و شتم۔ تضلیل و تحمیق اور تکذیب کے تذکار نے تو آزادیٔ افکار کے
اس دورِ ضلال میں ان لوگوں کے دماغوں پر خوب ہی کام کیا جو پہلے سے حق و اہلِ حق کی
حرمتوں اور عظمتوں کو اپنے قلب و دماغ کا بارِ گراں سمجھتے تھے۔ حالانکہ مولانا نے متفقہانہ
احتیاط کے ساتھ متکلمانہ فکر سے اس جزء پر غور نہ فرمایا کہ جب انہی کے قول کے مطابق
اسماء الرجال کے ذخیرے میں کونسی ایسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو تو ان تاریخی روایات
ہی پر کیا وثوق ہے جن میں ایسے ایسے جلیل القدر حضرات عام انسانوں کی طرح لڑتے اور
ایک دوسرے پر سب و شتم کرتے اور طعن و تشنیع دیتے دکھائے گئے ہیں۔ اور کیا امت پر نفرت

...کے اعمال کی مصالح کو اس میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جبکہ اشتراط سماحت بعض

...حضرۃ الامۃ اولیاء کی فضا ہموار ہو رہی ہے۔

...حضرت مجدد سرہندیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کے متعلق کوئی ایسا تذکرہ ایسے انداز میں کہ جس میں
...کا ایہام بے وقعتی ہو یا ان کی جلالتِ شان کے منافی ہو حضرت اقدس جناب رسالتمآب
...اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے فائدے کو کم کرنے والا ہے۔ خبردار احتیاط کرو۔ حضورؐ کا ارشاد کہ
...ب میرے اصحاب کا ذکر آئے۔ خاموش ہو جاؤ۔ الصحابۃ کلھم عدول۔ میرے اصحاب
...میں سب ثقہ ہیں۔ قاضی عیاض شفا میں لکھتے ہیں "جاہل راویوں کی اُن خبروں سے اعراض
...جو صحابہ کی شان میں نقص پیدا کرنے والی ہیں۔ محمد رسول اللہ والذین معہ سے
...کی افضلیت ثابت ہے۔"

اس جذباتی اپیل کی دل سے قدر کرنے کے باوجود سوال یہ ہے کہ آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیا سلف کا وقار
...کرنے کے لئے آپ یہ دعویٰ کرنا چاہتے ہیں کہ نفس ان کے ساتھ لگا ہوا نہ تھا اور وہ نفسانی رجحانات سے مبرا تھے اور یہ جذبات
...فضیلت کے درجے میں نہیں آسکے؟ یا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جرح و تعدیل کا وہ پورا ذخیرہ غلط ہے جس میں یہ شہادتیں
...ہیں کہ بڑے بڑے لوگوں نے بڑے بڑے لوگوں کو مجروح کیا ہے؟ یا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسماء الرجال کے ذخیرے میں
...چیز ایسی نہیں ہے جس میں غلطی کا احتمال ہو؟ جب معاملہ ایک علمی مسئلے سے متعلق ہو تو اس کا فیصلہ جذباتی اپیلوں
...نہیں کیا جا سکتا۔ علم کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم حقیقت کو بالکل بے لاگ طریقے سے سمجھیں اور مانیں،
...خواہ ہمارے لطیف حسیات کے لئے کتنی ہی ناگوار اور ہماری مصلحتوں کے لحاظ سے کتنی ہی ضرر رساں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ روایات
...لحاظ سے فنِ حدیث کے جس قدر ذرائع ہمارے پاس ہیں۔ وہ مفید علمِ یقین نہیں ہیں بلکہ ظنِ غالب ہی تک ہمیں پہنچا سکتے
...ہیں اس لئے مجرد سند کی بناء پر کسی خبرِ واحد کی صحت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے ساتھ درایت سے بھی کام لینا ضروری
...یہی بات ہے جسے "مسلکِ اعتدال" میں دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون پر مصنف کو گالیاں تو آج تک
...دی جا چکی ہیں مگر اس کے دلائل اور مدعا کی غلطی آج تک واضح نہیں کی گئی۔

اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں۔ اگر یہ سوء ظن بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ میں داخل ہو۔ اس لئے کہ ہر سوءِ ظن گناہ نہیں بعض گناہ ہیں جن کے ساتھ قرائن قویہ ظنیہ غالبہ نہ ہوں۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ چونکہ مولانا کا خاص ذوق ہے ایسا کہ بعض دفعہ مناسب حدِ اعتدال اور اپنے مقتدایانہ مجددانہ منصب سے بھی تجاوز اور خروج سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ اور اپنے ہم عصر علماء کے جبہ ودستار کے مضحکہ اور ان کے حواسِ خمسہ کی تعطیل کی خوبی تحمیق سے بھی گریز نہیں فرماتے اور سلفِ صالحین۔ بڑے بڑے ائمہ وقت یا صحابہؓ کے متعلق بھی ایسے الفاظ لکھ جاتے ہیں۔ جو ممکن ہے واقعہ کے تو مطابق ہی کہیں ہوتے ہوں اور اسی تقدیر پر منکر محسوس بھی ہوتے ہیں۔ ورنہ بہتان کہا جاتا۔ مگر کہنے والے کا منصب چونکہ اس سے فروتر ہے۔ اس لئے وہ آں چناں می رود کہ زیبا می روی سے بالکل مختلف ہو جاتے اور ذوق پر سخت گراں بار بن جاتے ہیں۔ آپ ہی خیال فرمائیے حضرات صحابہؓ کے متعلق یہ کہہ جانا کہ گویا وہ اس طرح حدود اللہ سے صریح تجاوز کر رہے ہیں[1]۔ یا امام غزالیؒ کو فن حدیث میں ناقص کہنا اپنے کمال کے

---

[1] اس الزام کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ "حقوق الزوجین" میں ایلاء کے مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے مصنف نے ایک جگہ اس سوال پر بحث کی تھی کہ چار مہینہ کی مدت گزر جانے کے بعد ایلاء کرنے والے کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں اس نے صحابہ کے دو گروہوں کی مختلف آراء نقل کیں اور دونوں میں موازنہ کرکے اس گروہ کی رائے کو ترجیح دی جس نے رجوع کے حق کی نفی کی ہے۔ دوسرے گروہ کی رائے کے متعلق اس نے لکھا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بالفاظ صریح ایلاء کرنے والوں کو صرف چار مہینے کی مہلت دی ہے، اس لئے یہ مدت گزر جانے کے بعد اس کو رجوع کا حق دینا اس مہلت میں اضافہ کرنا ہے اور یہ "اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے صریح تجاوز ہے"۔ یہ کتاب جب شائع ہوئی تو ایک عالم دین نے مصنف کو توجہ دلائی کہ یہ طرزِ بیان نامناسب ہے، اسے بدل دینا بہتر ہے۔ چنانچہ مصنف نے ان کے مشورے کو بلا تامل قبول کر لیا اور حقوق الزوجین کے دوسرے ایڈیشن میں عبارت کو بدل کر یوں کر دیا کہ "یہ اضافہ بظاہر کتاب اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے زائد ہے" (ملاحظہ ہو حقوق الزوجین طبع دوم ص ۲۵) یہ چیز ہے جس پر اتنے بڑے الزام کی بنا رکھی گئی ہے کہ یہ شخص صحابہ کی توہین کرتا ہے اور انہیں حدود اللہ سے تجاوز کا مرتکب ٹھیراتا ہے۔ شاید یہ حضرات اس ایک فقرے کے سوا جس سے رجوع کیا جا چکا ہے کوئی دوسری عبارت اپنے اس الزام کے ثبوت میں پیش نہیں کر سکتے۔

رے کو مستلزم نہیں ہو گیا ہے؟ جو یقیناً ان کا منصب نہیں۔ باہم صحابہؓ یا باہم فقہا اور محدثین کے
بحث و جدال، سباب و طعان کو دہرانا اپنے ذوقِ تنقید کے بیانِ جواز کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ درحقیقت
کی مزاجی افتاد اس احترام کی خوگر ہی نہیں جس کے خوگر دوسرے لوگ ہیں۔ عامۃً ان کی جماعت کے لوگ
ت کی عظمت و احترام کی مزعومہ حد قائم کرکے دوسرے احترام پسندوں کو کہا کرتے ہیں کہ "یہ وہ لوگ ہیں
ن کے سینوں میں اشخاص کے بُت نصب ہیں" جو جاہلیتِ مشرکانہ کا اثر ہے۔ یہ بات ان لوگوں کے
متعلق تو [illegible] مناسب ہے جو بزرگوں کو ترجیح دینے کے عادی ہوں۔ یا جو لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ
الخالق کے منکر ہوں۔ ورنہ جو لوگ سیرِ سلف پر نظر رکھتے ہوں، جنھوں نے صحابہؓ کے احترامِ نبوت حتیٰ کہ
بعض صحابہؓ کا فضلاتِ نبویؐ تک سے معاملۂ حرمت دیکھا ہے۔ پھر تابعین کا صحابہؓ کے مقابلے میں تذلل۔
تلامذہ کا اساتذہ کے مقابلے میں تکسر، منتسبین کا اپنے مشائخ سے تعامل دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ تعظیم
و حرمتِ اکابر افاضہ اور استفاضہ والوں میں کس قدر ضروری سمجھی گئی ہے اور مدارِ نفع اس پر کس قدر
مرتب ہے۔ ہاں حدود ہر چیز کی ہیں جس کی تاکید حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو بھی فرمائی۔
اطراءِ مادح والی حدیث اس کی دلیل ہے۔ حضورؐ نے عام اہلِ وجاہت کے لئے بھی ارشاد فرمایا اقیلوا
ذوی الهیئات عثراتهم الا الحدود۔ یعنی صاحبِ حیثیت لوگوں کی لغزشوں سے چشم پوشی کرو۔ الّا
وہ اغماض جہاں سے حدود اللہ متاثر ہوں۔ جو حق سے متصادم ہوں۔ جہاں نص سے نص کا اضمحلال
لازم آئے یا جس جگہ مراتب امور کی قدریں متغیر ہونے لگیں البتہ قابلِ نکیر ہوگا۔ اس نوع کے اندازے
کے لئے حضرت مجدد سرہندیؒ کا مکتوب نمبر ملاحظہ فرمائیے۔ ایک دفعہ ایک مدراسی عالم[1] جماعت کے
مشہور امیرِ حلقہ مظاہر العلوم سہارنپور تشریف لائے۔ طلبائے دورہ کو بخاری لئے ہوئے دیکھا۔ بے ساختہ
زمزمہ پیرا ہوئے۔ "کب تک یہ بخاری کے بُت لئے بیٹھے رہو گے۔ میدان میں آؤ" حسنِ ظن سے کام لیا جائے

---

[1] غالباً یہ اشارہ مولانا صبغۃ اللہ صاحب بختیاری کی طرف ہے۔ جو بات یہاں ان کی طرف منسوب کی گئی ہے اس کی حقیقت وہی بتا سکتے ہیں۔

یل کی گنجائش ہے۔ کہ علم بہر علم کی روش ترک کرد۔ مگر الفاظ کی درشتنا کی اور عنوان کی بدنمائی اس
مزاجی کی خبر دیتی ہے جس کا ذکر ہے۔ صوفیائے کرام کے تذکرے میں ایک جگہ مولانا کے الفاظ
جو لوگ مشاہدۂ غیب کی تمنا رکھتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک نقب زن کی سی ہے جو اللہ کے
یں جھانکنا چاہتا ہو۔ ظاہر ہے کہ علم دو قسم کا ہے۔ ایک علم باللہ۔ دوسرے علم بالاحکام جیسا کہ
حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہے۔ یہ علم باللہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ علوم استدلالیہ کو کشفیہ کیا جائے۔ اعلم
یہ کو تفصیلیہ۔ جیسا کہ حضرت مجدد سرہندیؒ فرماتے ہیں۔ گویا دوسرے الفاظ میں صدر علیہ کو
و بصائر او رحال و ذوق تک پہنچایا جائے۔ اور استدلال کی محدود عقلی شہر پناہ سے وجدان
کی غیر محدود و بے پناہ سرحد تک منتقل کیا جائے۔ محسوسات کی سرحد ادراک سے ماورا
سنام تک اس طرح پہنچائیں جہاں استدلال و تعقل کی حدیں مضمحل ہو کر افسانہ اذعان میسر ہو
ن و چرا، کیف و لِم اور تنقید و تفلسف سے بلند ہو جس کو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے
اگر الفاظ سے ظاہر کیا جائے۔ تو الفاظ و تعبیر کی تہی دامانی واضح ہو جائے۔ اور لوگ میری تکفیر
حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں۔ لوگ میری شہ رگ قطع کر دیں قطع البلعوم۔ یہ علم اس علم پر اضافہ
نہیں جو کتاب و سنت سے سمجھا گیا۔ اگر اضافہ ہے تو محض ضلال ہے۔ البتہ لِکُلِّ شَیْءٍ ظَھْرٌ وَّبَطْنٌ
طابق لطین علم و رائے علم اور اسرار خفیہ ہیں۔ جو ایک صاحبِ ذوق اپنے جوہر شناسانہ ذوق
سے سمجھ سکتا ہے اور عارفِ محقق اپنے عرفان ہی سے اس پر مطلع اور امارتِ خاصہ ہی سے
شخص کر سکتا ہے۔ اربابِ ظاہر اور اصحاب صحو محض اس کو کیا جانیں۔ اس غیب الغیب کے
و جستجو اور حضور و اضطراب کا طالب امت کا ایک بڑا طبقہ صوفیاء جہاں نہیں صوفیائے حق
رہا جو عقل غیاب نہیں بلکہ عشق حضور و اضطراب والوں کا حصہ ہے جس کے بیان و اظہار پر
بن عربیؒ جیسے مغلوب اور مجدد سرہندی جیسے غالب الحال دونوں قسم کے حضرات مجبور
یہ حرم خداوندی میں نقب زنی نہیں۔ بلکہ احوال و کوائف اور اسرار و مواجید ہیں جس پر منہ
کی ضرورت منزل معرفت کی حاجت۔ ان اسرار پر عوام کے قلوب میں ظاہری معرفت

کے متعلق سخت بدگمانیوں کا محرک ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے ارشاد کے مطابق یہ شائق کے صحیفے صرف لپیٹ کر رکھ دینے کی چیزیں ہیں۔ نہ انکار می کنم و نہ ایں کار می کنم کا تعامل ان کے ساتھ مناسب ہے۔ خلوت کے انفرادی احوال جلوت کی اسٹیج پر افشار و دعوت کے لئے نہیں ہوتے۔ ورنہ بقول حضرت مجدد سرہندیؒ ایسے حضرات کے لیے اسرار کا رد و قبول دونوں خطرناک ہیں۔ مگر مولانا کا ذوق یہ ہے کہ وہ ہر میدان میں شہ سواری اور ہر سمندر کی غواصی کرنا چاہتے ہیں۔ اہل ظاہر کا ایسے موضوع پر کلام کرنا ایسا ہی ہے جیسا صوفیائے جہال کا وحدۃ الوجود پر کلام کر کے وہ معانی بیان کرنا جو ضلال اور شرک قطعی ہیں۔ ضلوا فا ضلوا۔ ایک کنارہ یہ ہے کہ اہل ظاہر اس پر تنقید کریں دوسرا کنارہ یہ ہے کہ جاہل صوفیاء اس کی تعبیر و تصریح کریں۔ نہ وہ محل تنقید نہ یہ مجاز تصریح۔ لپیٹ کر رکھ دو اور سکوت کرو۔ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اُن عارفین ہی کو ان اسرار کے افشا کی کیا ضرورت تھی۔ کیوں نہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی طرح اسرار کو اسرار ہی رکھا گیا واقعہ یہ ہے کہ حضرت شیخ اکبر ابن عربی قدس سرہٗ نے صاف فرمایا کہ ہماری ان کتابوں کو ہر شخص نہ مطالعہ کرے۔ ان کو کیا خبر تھی کہ آئندہ چل کر پریس کی وسعت ان کی کتب کو عام کر دے گی خود حضرت امام غزالیؒ نے اپنی بعض کتب کو عوام کے نہ دیکھنے کی تاکید فرمائی۔ حضرت مجددؒ کے جو خطوط ہیں وہ اُن کے اہل کو لکھے اور خطاب کئے گئے ہیں۔

اس بے جا دخل در معقول کا نتیجہ ظاہر ہے۔ مجھے مولانا کی جماعت کے اکابر کے خیالات شیخ اکبرؒ اور مجدد سرہندیؒ کے بارے میں معلوم ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ مجدد سرہندیؒ شیخ اکبرؒ کے متعلق کس قدر احتیاط کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ایک سرا الجاحدین للتصوف کا ہے دوسرا الجہال من الصوفیہ کا۔ ایاک و ایاھم۔

ایک جگہ حضرت مہدی علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے ان احادیث کا انکار کر جاتے ہیں جو علامات مہدیؑ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ محدثانہ طریق پر ان احادیث کا پایۂ اعتبار کیا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ان احادیث کی علامات کو حافظ ابن حجر مکیؒ اور حضرت...

ہنے معتبر مانا ہے۔ جیساکہ مکتوبات دفتر دوم ص ۶۷، ۶۸ میں اس پر بحث فرمائی ہے۔" اگر ان
کا ذوق مولانا کے نزدیک کسی درجے میں دقیع ہے اور امام غزالی کی طرح وہ بھی اس میں
ہیں ہیں۔

اصل کلام یہ ہے کہ مولانا مودودی باوجود اپنے اخلاص و نیک نیتی اور سچے جذبۂ خدمت
ینے کے نیز سیاسی نظر و فکر اور موضوع ارتفاقات پر اچھی گہری نظر و بصیرت رکھنے کے موضوع
ہیں اپنے اس فکری مزاج و قوام کے اعتبار سے امت مسلمہ کے لئے مفید نہیں۔ ہاں اپنی
تکلمانہ تعبیر و قابلیت کی جہت میں ملاحدہ و زنادقہ کے لئے ان کے لٹریچر کی افادیت کا
ہ انصافی ہے۔ اگر مولانا صرف ایک سیاسی لیڈر ہوتے تو مضائقہ نہ تھا۔ اُن کا ارتفاقی تفکر
ڈانی۔ عبد الکریم مراقشی۔ جمال الدین افغانی سے زیادہ واضح اور مدلل ہے، مگر اُن کی حیثیت
نہ محدثانہ۔ فقیہانہ۔ مفسرانہ بھی ہے۔ اور معتقدین نے اب مجددانہ حیثیت بھی تصور کر لی ہے۔
، اسلامی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مدیر کوثر لاہور نے ان کو اس صدی کا مجدد بتایا ہے۔
اگست ۱۹۴۶ء) آخری مجدد حضرت سید احمد شہید بریلوی قدس سرہٗ کی شہادت ہزارہ کے
سو سال بعد ان کے ظہور اور دعوتِ تجدید و احیا سے ان کے مجدد ماۃ ہونے کا یقین دلایا
سا بات اہم ہو گئی۔ نبی کی دعوت پر لبیک کہنے والا مسلمان اور منکر کافر ہوتا ہے۔ مجدد کی

ب لطیفہ ہے کہ ۸۔ اگست سرے سے کوثر کی کوئی تاریخ اشاعت ہے ہی نہیں۔ ۹۔ اگست البتہ اس کی
عت ہے، مگر ۱۹۴۸ء میں عید الفطر کی وجہ سے اس تاریخ کا پرچہ شائع نہیں ہوا تھا۔ تاہم احتیاطاً ہم نے
ء، ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء کی تمام اشاعتوں کو لفظ بلفظ پڑھ کر دیکھ لیا، مگر کہیں اس مضمون کا نام و نشان تک
مدیر کوثر، جناب ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز سے دریافت کیا کہ دو سال سے قطع نظر، کیا کبھی ان کے قلم
ت کفر" نکلے ہیں جن کا حوالہ ان متشرع و متدین بزرگ نے دیا ہے؟ مگر انھوں نے سن کر کانوں پر ہاتھ رکھے اور صاف
ب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس فردِ قرار دادِ جرم میں یہ صریح الزام کس بنیاد پر درج ہوا ہے۔

دعوت پر لبیک کہنے والا متقی اور گریز کرنے والا فاسق ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ اب ناممکن ہے کہ ان کے تفردات افکار، سیرت اور کردار آپ سے آپ پیرو دل میں سرایت نہ کریں۔ جیسا کہ خود مولانا نے اپنی ایک تحریر مطبوعہ جریدہ محمود میں لکھا ہے جبکہ ایک شخص نے مشرقی کی تحریکِ خاکساریت میں داخلے کی اجازت چاہی اس شرط پر کہ مشرقی کے عقائد و افکار سے کوئی علاقہ نہ رکھے گا۔ تو مولانا نے جواب میں کہا تھا کہ ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو عقل کے افلاس میں مبتلا ہو۔ آپ کسی تحریک میں داخل ہوں اور لیڈر کے خیالات، سیرت اور کردار سے متأثر نہ ہوں۔ یہ ناممکن ہے۔ لیڈر کے خیالات۔ افکار۔ کردار۔ سیرت تحریک کی جان ہوتے ہیں۔ الخ وغیرہ وغیرہ۔ اور مولانا کا اندازِ فکر و تحقیق یہ ہے جو مذکور ہوا۔ جو شخص سلف صالحین اور جمہور امۃ اور اہلِ حق کے مذاق سے کچھ بھی آشنا ہوگا وہ مولانا کے فکر و مذاق کو اُس سے بہت مختلف پائے گا۔ اُن کے لٹریچر کی خاصیت۔ سلف کی غیر شعوری تخفیف و تردید۔ اور اپنی شعوری تصویب و توثیق اور اعجاب رائے کے سوا کچھ نہیں جو نتیجۃً سوادِ اعظم سے نکلنے کے مترادف ہے۔ حیرت ہے کہ کل تک ماضی قریب ہی میں جو لوگ جیسے حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکیؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اکابر دیوبند جو ۱۸۵۷ء کے بعد اپنے تقویٰ۔ توریع، تفقہ خدمتِ دین۔ اماتتِ بدعت اور احیاءِ سنۃ کے اعتبار سے روشنی کے منارے سمجھے جاتے تھے۔ آج وہ غیر متبع سنۃ قرار دیئے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کے امیر جماعت کی یہ تحریریں نے خود دیکھی ہے[1]۔ کل تک جو لوگ جیسے خواجہ معین الدین اجمیری اور

---

[1] امیر جماعت اسلامی پاکستان کی تو کوئی ایسی تحریر پیش نہیں کی جا سکتی جس میں مذکورہ بالا بزرگوں کو "غیر متبع سنت" کہا گیا ہو، یا ان کی شان کے خلاف ہی کوئی بات کہی گئی ہو۔ رہے امیر جماعت اسلامی ہند، تو ان کی بھی کوئی ایسی تحریر ہماری نظر سے نہیں گزری۔ بہر حال جبکہ یہ الزام اُن پر لگایا گیا ہے اس لئے اس کا جواب انہی کے ذمے ہے۔

پہ بختیار کاکیؒ جو تنہا ہندوستان میں شمعِ اسلام روشن کرنے والے اور ہزاروں میل کی مسافت
ہ کے اس کفرزار میں تنویراتِ اسلام پھیلانے والے اور اپنی گرمیٔ رخسار سے محفلِ کفر و ظلمت
پھونک دینے والے تھے۔ آج وہ جوگی اور سنیاسی تصور کئے جا رہے ہیں[1]۔ حالانکہ یہ وہ لوگ
جن کے متعلق کہا جاتا کہ

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ۔   یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ پس ہدایت میں انہی کا اقتدا کیجئے۔

یہ قاعدہ ہے کہ ایک نبی کے بعد دوسرا نبی پہلے کی تائید کرتا ہوا تصویب و توثیق اور تحسین کرتا ہوا آتا
اسی طرح جانشینِ انبیاء مجددین ہیں جو ماقبل مجددین کی تائید، تکریم اور تصویب کرتے ہوئے آتے
۔ مگر فلاسفہ اس سے مختلف ہیں۔ ایک آنے والا فلسفی۔ فلاسفۂ ماقبل کی تردید، تنقیص اور تخفیف
ہوا آئے گا۔ سابق فلسفی کی تحمیق اور اس کے نظریات کی تردید اس کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے
ہوتا ہے کہ مولانا ایک فلسفی ہیں اور فلسفیانہ ذوق کا یہ لازمہ ہے۔ رہے معتقدین جنھوں نے ان کو مجدد دین کا
دیدیا ہے[2]۔ تو اگرچہ یہ ایک خفی چیز ہے۔ امارات واضحہ ہی سے کچھ قیاس ہو سکتا ہے۔ بظاہر تو یہ اطرار مادح
ہوتا ہے جس میں لوگ ہمیشہ مبتلا رہے۔ عیسائیوں نے فرطِ عقیدت سے بندۂ خدا کو خدا بنا دیا۔ شیعوں نے فرطِ محبت
ں کو ولایت سے گزار کر مقامِ نبوت تک پہنچا دیا۔ عامۃً معتقدوں نے اپنے مشائخ کو ارباباً من دون اللہ بنا لیا۔
ی شخص میں غیر معمولی چیز اپنی فکر و پرواز سے زیادہ محسوس کی اور اس کو حسبِ فکر اقصیٰ مقام دے دیا۔

---

[1] کیا اس الزام کے ثبوت میں کوئی ایک فقرہ یا ایک لفظ ہی پیش کیا جا سکتا ہے؟

[2] یہ الزام پوری ہوشیاری کے ساتھ بار بار دہرایا جا رہا ہے، کیونکہ اس کے بغیر عوام کے جذبات بھڑکائے نہیں جا سکتے۔ مگر آج تک کسی نے ایسی
شہادت پیش نہیں کی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ شخص مذکور نے خود مجدد ہونے کا دعویٰ کیا ہو، یا جماعت اسلامی کے لوگوں نے اسے مجدد
۔ رہی یہ بات کہ کوئی یہ "خیال" رکھتا ہے، یا کسی نے ایسا "تصور" کر لیا ہے، یا کسی کو "یہ مقام دیدیا گیا ہے"، تو اس طرح کی باتیں جو
دوسروں کے متعلق کہتے اور لکھتے ہیں وہ شاید خود اپنے آپ کو عالم الغیب اور علیم بذات الصدور سمجھتے ہیں۔

شعر کا پیغمبر اعظم بنایا، کسی کو سیاست کا اوتار کہا، کسی ادیب کو مجموعہ ادب کا خالق کہہ گزرے۔ علامہ۔
امام الائمہ القاب تو روز مرہ کی تقسیم ہے[1]۔ غرض چونکہ اصلی مالک الملک۔ علام و قہار فاعلِ مختار
سنت و جبروت، عظمت و کبریائی سے ذوق آشنا نہیں۔ ساری صفاتِ علیا مخلوق میں تقسیم کرنے

شائیں تو ایک سوال ہم بھی پوچھ لیں۔ ابھی ابھی ایک محترم شخصیت کو "جامع المجددین" کا جو لقب دیا گیا ہے اس کے بارے
فساد ہے؟ دوسروں کے تو قول و فعل نہیں بلکہ خیال پر یہ لتاڑ، اور خیال بھی وہ نہیں جس کا آپ کو علم ہو بلکہ وہ جو آپ اپنے گمان کی بنا پر
رف منسوب کر دیا ہو، لیکن آپ کے گروہ میں علی الاعلان ایک بزرگ کو جامع المجددین کہا گیا اور ان کے کارناموں کا مجموعہ
م سے شائع کیا گیا، اس پر بھی کسی نے کوئی قباحت محسوس نہ فرمائی۔ سوال یہ ہے کہ کیا کچھ مخصوص حقوق آپ لوگوں
نے گزار رکھے ہیں؟ فاضل ناقد جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے ہاں کی شخصیتوں کو بڑے بڑے القاب و خطابات
سے مشتہر کرنے، اور انتہائی مبالغہ آمیز طریقے سے ان کی مدح و ثنا کرنے میں ممتاز رہا ہے۔ آپ اس گروہ کی
ت اٹھا کر دیکھیے۔ ان میں آپ کو جگہ جگہ یہ القاب ملیں گے۔ قطب وقت، راس الفقہاء، قدوۃ الفقہاء والمحدثین،
شائخ، شیخ الکل، شمس العارفین، زبدۃ الفضلاء والمتکلمین، راس اہل البر والتقی، رئیس اصحاب المجد والنہی، تاج
، سراج الامت، شمس سماء التحقیق، مخزن العلوم، مرجع الکمالات۔ وغیرہ۔ دوسری طرف جماعت اسلامی کی
بوعات، رسائل اور اخبارات اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ یہاں ان شاء اللہ کوئی چیز آپ ایسی نہ پائیں گے جس سے یہ محسوس
کہ اپنے گروہ کی بعض خاص شخصیتوں کا نام اچھالنے اور ان کی عظمت قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ اس کے
صریح طور پر آپ یہ دیکھیں گے کہ اس جماعت نے شخصیت پرستی کے ایک ایک منفذ کو بند کرنے کی کوشش
، اور اپنے رہنماؤں کے ساتھ اس کا معاملہ پاکستان و ہندوستان کی تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں سے بالکل
ہے۔ اس پر یہ حال ہے کہ اگر کبھی احیاناً جماعت اسلامی کا کوئی شخص اپنے کسی رہنما کے لئے کوئی کلمۂ مدح و تحسین لکھ بیٹھتا ہے یا زبان سے نکال
دیتا ہے تو ہمارے متشرع و متدین بزرگوں کے لئے اس قدر ناقابل برداشت ثابت ہوتا ہے کہ برسوں وہ اس کے رنج میں تڑپتے رہتے ہیں، اس کے تراشے
سنبھال کر رکھتے ہیں اور ہر ایک کو یہ تحفہ دکھاتے پھرتے ہیں، اور جب موقع ملتا ہے اس شان سے دل کا بخار نکالتے ہیں جس کا ایک ادنیٰ سا
نمونہ ابھی آپ دیکھ رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض تنگ ظرفی ہے یا اس کے ساتھ کچھ اخلاص و تقویٰ کا جذبہ بھی شامل ہے؟

کے لئے بے چین ہیں۔ غور کیجیے تو اس اطرا و مدح میں جذبۂ شرک کی پنہانی کار فرما ہے اور نیز اپنا احساس کمتری
کسی برتر محسوس کے سایۂ عطوفت کا جویاں ہے۔

شاید میں ذرا تجاوز کر گیا۔ استغفر اللہ۔ أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ۔ ہم معترض ہونے والے
کون۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ہمیں بھی اہلِ حق کی تائید و نصرت سے محروم
نہ فرمائیں۔ اور مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ ہونے کے مظلمہ سے بچائیے۔ یا ہماری قلتِ نظر و نقصِ فہم کو اعتذار میں قبول
فرمائے[1]۔ با دردکشاں ہر کہ درافتاد برافتاد، ما تجربہ کردیم دریں دورِ مکافات۔ کے خوف سے بھی
فارغ نہیں ہوں۔ ورنہ تو امت کو اُن کی اجتہادی اغلاط کے ضرر سے بچائیے۔

میں نے سُنا جب وہ جیل سے رہا ہو رہے تھے۔ تو اُن کو مع رفقا کے اُن کے علم و اطلاع میں لا کر
فوٹو بھی لیا گیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو تعجب ہے۔ اس لئے کہ مجھ کو یہ معلوم ہے کہ فوٹو کی حرمت پر ان کی رائے
اہلِ حق سے مختلف نہیں۔ پھر ایسا کس طرح ہوا۔ کیا ان کی طرف سے اس پر نکیر نہیں ہوا[2]؟

اس سب کے باوجود نفسِ تحریک۔ اقامتِ دین و دستورِ اسلامی کی سعی یقیناً مشکور ہے اس کی مخالفت
منشائے حق کی مخالفت ہے جس طرح ممکن ہو۔ تائید و نصرت سے گریز نہ کیا جائے[3]۔

معافی چاہتا ہوں۔ تحریر طویل ہو گئی۔ اور استغفار کرتا ہوں۔ اگر حد سے نکل گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ

---

[1] جزاک اللہ۔ اس تقویٰ کے قربان جائیے۔ سب کچھ فرما چکنے کے بعد اب حضرت کو "شاید ذرا تجاوز کر جانے" کا
احساس ہوا، اور اس احساس نے بھی جناب کو پچھلے ارشادات کی طرف پلٹ کر دیکھنے کے بجائے اگر کسی بات پر ابھارا
تو وہ یہ کہ استغفر اللہ کہنے کے بعد چلتے چلتے ایک چوٹ اور کر جائیں۔

[2] شاید حضرت کو اس موقع پر اپنے گروہ کے اکابر کی وہ تصویریں یاد نہیں رہیں جو بارہا اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔

[3] اس سے بڑھ کر تائید و نصرت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے یہ مضمون لکھا اور آپ کے گروہ کے متعدد
کے بہت سے بزرگ ماشاء اللہ انتہائی خوفِ تقویٰ کے ساتھ اکثر خفیہ و علانیہ اسی طرح کی تائید و نصرت فرماتے
رہتے ہیں۔ جزاکم اللہ عنا جزاءً وفاقاً۔

ہے۔ آپ کی، مولانا اور اُن کے رفقاء کی مغفرت فرمائے اور اغلاط پر متنبہ فرما کر صراطِ سوی پر چلائے
آمین۔ فقط والسلام۔

تتمہ
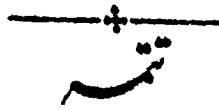
اوپر کا مضمون موصول ہونے کے بعد ایک مدت گزر چکی تھی کہ صاحبِ مضمون کی طرف سے اس کا
یہ تتمہ بھی موصول ہوا جس کو انھوں نے خود "روحِ مضمون" سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے
اپنا نام بھی ظاہر فرمایا اور پورا مضمون اپنے نام سے شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس کے ساتھ
ان کی ہدایت ہے کہ اس تتمہ کو ان کے مضمون کے اس حصے کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے جہاں انھوں نے
مودودی کو ایک فلسفی ثابت کیا ہے اور ایک داعی حق سے اس کی حیثیت مختلف قرار دی ہے۔
یہ تتمہ حسبِ ذیل ہے:۔

ایک خصوصی بات جو گاہ بگاہ موجب خلجان ہوتی ہے۔ یہ بھی ہے جو شاید بعض تفلسف پسند معقول دوستوں کے لئے میرے وہمی یا کم فہم ہونے کی دلیل ہو۔ مگر خدا کرے کہ وہ اللّٰھم اجعل وساوس قلبی خشیتک۔ حدیث میں آیا ہے اِنَّ اللّٰہَ اِذا اَحَبَّ عَبْدًا دعا جبرئیل فقال انی احب فلانا فاحبہٗ فقال فیحبہٗ جبرئیل۔ ثم ینادی فی السماء فیقول ان اللّٰہ یحب فلانا فاحبوہ فیحبہٗ اھل السماء ثم یوضع لہ القبول فی الارض۔

اس حدیث کا منشا رجال کے حق و قبولیت کا معیار بتلانا ہے۔ مقبول عند اللہ کی مقبولیت خواص سے شروع ہو کر عوام تک پہنچتی ہے۔ برعکس مولانا مودودی کو بھی غالباً یہ کھٹک محسوس ہوئی۔ چنانچہ ایک جگہ اشارات میں انھوں نے لکھا ہے[1] "تعجب ہے کہ ہماری دعوت و تحریک پر لبیک کہنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو ہندوستان کے قبرستانوں سے موت کی سند لے کر نکلے ہیں یعنی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فضلا اور گریجویٹ"۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ رہے وہ لوگ جو کم از کم ہماری علم و اطلاع میں اپنے علم و عمل فکر و اخلاص تجرد و تدین رائے اور یمین کے اعتبار سے عظیم القدر ہیں اور حق کا

ا نشانِ عبادات الالٰہ و شتیا کی مصداق ہے وہ اب تک بالکل یکسو اور غیر متوجہ ہیں۔ حالانکہ
ں وہ لوگ بھی ہیں جن کی زندگیاں لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا کی پیہم جدوجہد کی شاہد بھی ہیں۔
سری بات ہے کہ اُن کے طریقِ کار سے کسی کو اختلاف ہو۔

اس سے یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں حق کو رجال سے پہچاننے کے حق میں ہوں۔ اصل یہی ہے کہ حق
رجال کو پہچانا جاتا ہے۔ بشرطیکہ حق شناسی موجود ہو۔ مگر اس جگہ مضمونِ حدیث اول خواص میں
نا ہونا پیشِ نظر ہے جو یہاں مفقود ہے۔ کل تک جو لوگ یا رائے سے کورے تھے۔ یا ہمیں میں
م و فکر سے عاری تھے یا تقویٰ و تورع سے فارغ۔ ختمِ نبوت میں مذبذب تھے۔ یا خاکساریت
مبرداری نیچریت سے مسموم تھے یا الحاد کے شکار۔ وہی متوجہ ہو رہے ہیں۔ اہلِ علم و تقویٰ گویا
اس ہی نہیں۔ یا مدارس عربیہ کے چند نئے نئے فارغ شدہ جو زمانۂ تحصیل میں بھی بخاری بدوش
یونزم بہ کف تھے۔

یا پھر یہ فیصلہ کیجئے کہ یہی لوگ سوسائٹی کا مکھن تھے جو ندائے حرم پر لپک پڑے اور جن کو ہم نے خواص
ادہ ہماری علم و اطلاع اور معرفت کا قصور تھا جس پر نظرِ ثانی ضروری ہے۔ نیز اپنے معیارِ حقانیت کا
یہ بھی ضروری ہوگا۔ ایسا تو نہیں کہ خرد کا نام ہم نے جنوں رکھ دیا ہو اور جنون کا خرد۔ اور کشفِ غبار
ب پر تحت رجل کچھ اور ہی خلافِ توقع سامنے آئے جس کے لئے ہم بالکل تیار نہ ہوں۔ بہرحال یہ
عرض کیا بدرجۂ خطور ہے نہ دلیل۔ اور دل چاہے تو فتور سمجھ لیجئے مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔

—— + ——

جواب

از جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

اس تحریر میں جماعتِ اسلامی پر جو الزامات عائد کئے گئے ہیں ان پر گفتگو کرنے سے پہلے میں
نب تحریر بزرگ اور ان کے انداز پر سوچنے والوں کے اس عجیب و غریب طرزِ فکر پر کچھ عرض کرنا
تا ہوں جس میں یہ حضرات مبتلا ہیں۔

ایک طرف تو یہ حضرات ایک شخص کی نسبت یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس کی تحریریں سلف کی "تنقیص تحمیق" اور اپنی تصویب و توثیق اور اعجاب رائے کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ اور دوسری طرف یہی فرماتے ہیں کہ اس کی دعوت اور اس کے لٹریچر سے "ایک ایسا طبقہ دین سے آشنا ہو رہا ہے جس کا دین کی طرف میلان دشوار تھا"۔ ایک طرف تو ایک شخص کی تحریروں کا نتیجہ ان حضرات کے خیال میں یہ نکل رہا ہے کہ "لوگ سوادِ اعظم سے کٹتے جا رہے ہیں"۔ دوسری طرف اُسی شخص کی تحریروں کی یہ برکت بھی بیان کی جا رہی ہے کہ "وہ اُس طبقے کے ریب و تشکیک یا جمود و انکار کو تصدیق و اثبات کی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہے جو الحاد کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا"۔ ایک طرف تو ایک پوری جماعت کی جماعت کے علم و فضل پر ان کا یہ تبصرہ ہے کہ "ان میں ایک عالم بھی ایسا نہیں ہے جس کا علم و تفقہ تفصیلی مسائل میں لائق اعتماد ہو"۔ دوسری طرف اُسی جماعت کی نسبت یہ ارشاد بھی ہے کہ "دین کے خلاف اور مذہب سے متصادم جو تحریکیں آج چل رہی ہیں اور قومیت وطنیت اور کمیونزم وغیرہ کی راہ سے سامنے آ رہی ہیں ان کے مقابلے کے لئے وہ پوری طرح مستعد ہے"۔ اور ان سب سے عجیب تر بات یہ ہے کہ ایک شخص کو یہ حضرات ایک مفسر، ایک محدث، اور ایک فقیہ کی حیثیت سے تو ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، لیکن اگر وہی شخص ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ان کے سامنے آ رہے تو اس کو اپنا امام بنانے کے لئے بالکل تیار ہیں۔

فکر و نظر کا یہ انتشار ایک طرف تو ان حضرات کی ایک بہت بڑی نفسیاتی کمزوری کا پتہ دے رہا ہے۔ دوسری طرف اس سے اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ اسلام کے متعلق اُن کا تصور اُس تصور سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جو عیسائی اپنے مذہب کے متعلق رکھتے ہیں۔

اُن کی نفسیاتی کمزوری تو یہ ہے کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے ان لوگوں کو جو خلش ہے وہ اس بات کی وجہ سے ہرگز نہیں ہے کہ خدانخواستہ ان کے ہاتھوں اسلام کو کوئی نقصان پہنچ رہا ہے۔ بلکہ ساری خلش اس بات کی وجہ سے ہے کہ مولانا مودودی کی تحریروں اور جماعت کی دعوت سے خود ان کے حلقہائے عقیدت بھی متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر ان حضرات کو

بات کی طرف سے اطمینان ہو جائے کہ ان کے اپنے حلقے جماعت کی افرا اندازیوں سے محفوظ
ہ گئے تو پھر مولانا اور ان کے رفقا جو چاہیں کرتے پھریں، ان شاء اللہ سب خیر و برکت اور خدمت
نت اور دین ہے۔ ورنہ آخر اس کے کیا معنی کہ جو شخص ان کے خیال کے مطابق مسلمانوں میں
نئے فرقے کی بنا ڈال رہا ہے، جو کتاب، سنت اور سلف کے استنباطات پر نظر نہ رکھنے
با وجود خود بھی اجتہاد کا زعم رکھتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے دماغ میں بھی اجتہاد کی ہوائے
سری بھر رہا ہے، جس نے تصوف و احسان سے، اور اس کے اساطین و عمائد کے خلاف لوگوں
اندر نفرت و تحقیر کے جذبات پیدا کئے ہیں، جس نے حدیث کے وقار کو بہت حد تک کم اور
ن کے وقار کو "بہت حد تک گرا دیا ہے،" جو "اپنے تئیں عمر علما کے جمہور و شارکے منکے اور ان کے
خمسہ کی تعطیل و تحمیق سے بھی گریز نہیں کرتا" جو بسا اوقات بڑے بڑے ائمہ وقت بلکہ صحابہ
علق بھی ایسے الفاظ کہہ جاتا ہے جو بعض حالات میں "بہتان" قرار دیئے جا سکتے ہیں ـــــ
اور اس کے ساتھیوں کو اس بات کی چھوٹ دی جا رہی ہے کہ وہ نئے تعلیم یافتہ لوگوں نئی درسگاہوں
بدید تحریکات کے علمبرداروں اور ان کے پیروؤں کے اندر جو چاہیں پوری آزادی کے ساتھ پھیلاتے
ں۔ کیا یہ مسلمان سوادِ اعظم کے اجزا نہیں ہیں اور ان کو سوادِ اعظم کے جسم سے کاٹ کر الگ کر دینے
بی گناہ نہیں ہے؟ کیا اس گروہ کے اندر اجتہاد کی ہوائے خود سری اگر بھر گئی تو اس میں "اعجاب
ی رائے برایہ" کا فتنہ اس امت میں نہیں برپا ہو جائے گا؟ کیا یہ بیچارے تصوف و احسان
یلتوں اور اکابر امت کے ساتھ عقیدتمندیوں کے محتاج نہیں ہیں کہ ان کو ایسے بے دینوں
لے کیا جا رہا ہے جو ان کو نہ صرف علمائے امت ہی سے بلکہ صحابہؓ تک سے بدگمان کر کے
دیں گے؟ کیا یہ گروہ "اقترابات" کی ضرورت سے بالکل مستغنی ہے کہ اس کو صرف "ارتفاقات"
ٹالا جا رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ بھی اگر اسلام کے محتاج ہیں تو اسی اسلام
محتاج ہیں جو اصلی اور صحیح اسلام ہے۔ ورنہ ایک مرتبہ اگر یہ غلط اسلام کے
ستے پر ڈال دیئے گئے اور ان کو کسی غلط قسم کے آدمی یا غلط قسم کی جماعت کے تحت

غلم ہوجانے کا موقع دے دیا گیا تو یہ بھی اسی طرح اس امت کے لئے فتنہ بن سکتے ہیں جس طرح
...نی اور گمراہ فرقہ بن سکتا ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے یہ بزرگ علما ایک طرف تو
مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے اندر اتنے بے شمار خطرے گنتے ہیں لیکن دوسری طرف
اس امت کا سارا ذہین طبقہ انھی کو الاٹ کئے دے رہے ہیں کہ ان کو وہ جس طرح چاہیں
استعمال کریں۔ ایک طرف احتیاط بلکہ تنگ نظری کا یہ عالم ہے کہ ہماری چھوت تک سے مسلمان
پلید ہوجاتا ہے اور دوسری طرف یہ فیاضی ہے کہ سارا ذہین طبقہ ہماری چراگاہ بنا کے چھوڑ دیا گیا ہے
غور کیجئے کہ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات کبھی مسلمانوں
کے معاملات پر اسلام کے نفع و نقصان کے پہلو سے غور کرنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ اپنے گروہ
اور اپنے دھڑے کے نفع و نقصان کو سامنے رکھ کے غور کرتے ہیں۔ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ مودودی
صاحب اور جماعت اسلامی کی دعوت سے ان کے عقیدت کیشوں کی عقیدت مندیاں متزلزل
ہو رہی ہیں اور ان کے دھڑے کے آدمی ٹوٹ رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس دعوت کے اندر ان کو
بہت سے کیڑے نظر آتے ہیں اور یہ ان کو کرید کرید کے اپنے عقیدت مندوں کے سامنے رکھتے ہیں
کہ کہیں بے خبری میں ان میں سے کوئی اس غذا کو نہ چکھ لے۔ باقی رہے دوسرے مسلمان جن کی نسبت
ان حضرات کو یہ یقین ہے کہ اب وہ نئی تعلیم کی بدولت ذہنی اعتبار سے اس قدر متغیر ہو چکے ہیں کہ ان
کی طرف کبھی رخ بھی نہیں کرنے کے، اُن کے خیر و شر سے ان کو کوئی بحث نہیں ہے۔ اُن کو جس کا جی
چاہے جس راہ پر لگائے، جب وہ اِن کے نہیں بنتے تو اُن کو کالا چور لے جائے، اِن کی بیزار سے۔ یہاں
تک کہ مودودی صاحب جیسا آدمی بھی (جس کے کام کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے لئے، ان حضرات
کے نزدیک اتنے خطرے چھپے ہوئے ہیں) اگر وہ ان کو اپنے گرد جمع کر لے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے،
یہ بھی اسلام ہی کی خدمت ہوگی۔
اگر ان حضرات کے سوچنے کا انداز اسلامی ہوتا اور فی الواقع مودودی صاحب اور جماعت اسلامی
کے کام کے اندر یہ حضرات وہی خطرے محسوس کرتے ہوتے جن کا صاحب تحریر نے اتنے ...

لب و لہجہ میں ذکر فرمایا ہے تو یقیناً یہ نہ صرف اپنے مریدوں کو بلکہ تمام مسلمانوں کو، بلکہ تمام انسانوں کو اس فتنے سے بچانے کی کوشش کرتے مگر ان حضرات کے پیش نظر صرف یہ چیز ہے کہ اس دھارے کا رخ اپنی جاگیر کی طرف سے ہٹا کر کسی اور طرف موڑ دیں اور اپنی انصاف پسندی کا مظاہرہ کرنے کے لئے نہایت ثقاہت کے انداز میں مسلمانوں کو یہ بتا دیں کہ ہے تو یہ دھارا بہت خطرناک لیکن اگر اس کا رخ فلاں سمت کی طرف مڑ جائے تو اس میں کچھ پہلو فوائد کے بھی ہیں۔ یہ ہمارے ان بزرگوں کا تورّع ہے۔

اسلام کے متعلق ان حضرات کا جو تصور ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ جس شخص کو یہ ایک مفسر اور فقیہ کی حیثیت سے ایک لمحہ کے لئے بھی قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں اسی شخص کو ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ "اقرابات" کی میزان میں جو شخص ان کے نزدیک پاسنگ کے برابر بھی نہیں ہے اسی شخص کو یہ "ارتفاقات" کی میزان میں پورا من بھر قرار دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ارتفاقات (اجتماعیات) کو اقرابات (وسائل قرب الٰہی) سے الگ کر کے دیکھنے کا یہ انداز ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ سے نہیں سیکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں تو کسی شخص کا ارتفاقات میں بھی درجہ متعین کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا تھا کہ اقرابات میں اس کا درجہ کیا ہے۔ اور اگر اقرابات میں اس کا پلّہ ذرا بھی ہلکا نظر آتا تھا تو اسی کے بقدر اس کا پلّہ ارتفاقات میں بھی ہلکا قرار دے دیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ اسلام نے اس کو پسند نہیں کیا ہے کہ دونوں چیزوں کو الگ الگ کر کے دیکھا جائے۔ اسلام میں دین و دنیا کی تفریق نہیں ہے اور نہ قیصر اور خدا کے الگ الگ دائرے ہیں۔ یہاں جس طرح انفرادی زندگی خدا اور شریعت کے تحت ہے اسی طرح اجتماعی اور سیاسی زندگی بھی خدا اور رسول کے احکام کے تحت ہے۔ اس لئے جس طرح خانقاہوں اور درسگاہوں کا نظام ان لوگوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا جو خدا ناشناس ہوں اسی طرح حکومت کا انتظام بھی ان لوگوں کے سپرد نہیں کیا جا سکتا جو خدا اور اس کی شریعت کو اچھی طرح جاننے والے اور صدق دل سے ماننے والے نہ ہوں۔ لیکن ہمارے ان بزرگوں کا دین چونکہ عیسائیوں کے دین کی طرح اجتماعیات سے بے تعلق ہے اس وجہ سے یہ اس بات پر راضی ہیں کہ مودودی صاحب ان کے

نا وسیاسی لیڈر شوق سے بن جائیں اگرچہ دینی و شرعی نقطۂ نظر سے وہ قطعی گردن زدنی ہیں۔
سے ان بزرگوں کے اسی راہبانہ نقطۂ نظر کا یہ فیض ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی اور سیاسی
صوفی صدی ایسے لیڈروں کے قبضے میں چلی گئی جو نہ صرف خدا کی شریعت سے منحرف ہیں بلکہ
بندوں کو اس کی شریعت سے منحرف کرنے والے بھی ہیں۔ اور انھوں نے سیاسی طاقت
ل کرنے کے بعد مسلمانوں کی پوری زندگی کو جاہلیت کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ صاحب
بزرگ بھی اسی عام نظریہ کے مطابق مودودی صاحب کے لئے یہ حق تو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ
سیاسی لیڈر کی حیثیت سے مسلمانوں پر مسلط ہو جائیں اور بے خدا سیاست شوق سے چلائیں
یہ بات ان کو کھلتی ہے کہ وہ مذہبی اصولوں پر ایک جماعت بنائیں اور اس کے امیر کی حیثیت
سلمانوں کی ساری انفرادی، اجتماعی، اور سیاسی زندگی کو مسلمان بنانے کی جد و جہد جاری
ں۔ اس میں ان کو بے شمار خطرے نظر آتے ہیں۔
یہاں دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ صاحب تحریر بزرگ نے جس فن ارتقاقات
اعیات) میں مودودی صاحب کو از راہِ عنایت ایک اونچا مقام عنایت فرمایا ہے اس کے
ل و فروع قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہیں یا مغربی فلاسفۂ سیاست سے؟ اگر قرآن و
ث ہی سے ماخوذ ہیں تو یہ امر تعجب انگیز ہے کہ ایک شخص کے بارے میں ایک طرف تو یہ تسلیم
جائے کہ قرآن و حدیث میں اتنا درک رکھتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو موجودہ زمانے میں یہ بتانے کا
ہے کہ اسلام ان کی اجتماعی و سیاسی زندگی کے لئے کیا اصول اور کیا ضابطے دیتا ہے اور
جتماعی اور قومی حیثیت میں وہ کس طرح اپنے رب سے ٹھیک ٹھیک جڑ سکتے ہیں لیکن دوسری
، اسی شخص کو اتنا نا اہل سمجھا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو یہ نہیں بتا سکتا کہ ان کے مختلف حالات زندگی
لئے شریعت کے احکام کیا ہیں اور وہ اپنی انفرادی زندگیوں میں کس طرح اپنے رب کی محبت
ل کر سکتے ہیں۔ معلوم نہیں ان میں سے زیادہ مشکل کام پہلا ہے یا دوسرا؟
اور اگر مودودی صاحب کے یہ ارتفاقات مغربی جاہلیت ہی سے ماخوذ ہیں تو پھر صاحب تحریر

زرگ سے بادب گزارش ہے کہ آخر وہ کس بنا پر ایک ایسے شخص کی سیاسی قیادت تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں جو اپنے سیاسی و اجتماعی نظریات میں مغربی فلاسفہ کا مرید ہے؟ کیا ہمارا دین اجتماعی اور سیاسی زندگی سے متعلق ہم کو نہایت تفصیلی ہدایات نہیں دیتا؟ اور کیا وہ ہدایات ہمارے لئے اسی طرح واجب التعمیل نہیں ہیں جس طرح وہ ہدایات واجب التعمیل ہیں جو ہماری انفرادی زندگیوں سے متعلق ہیں؟

بہرحال جماعت اسلامی اور اس کے امیر کو تھوڑا بہت ... جو یہ حضرات دیتے ہیں اس میں بھی ہمارے لئے کوئی پہلو تسلی کا نہیں ہے بلکہ یہ بھی ان حضرات کی ژولیدہ فکری اور ایک بڑی حد تک ان کے احساسِ کمتری کا نتیجہ ہے۔

ان تمہیدی معروضات کے بعد اب آپ ان الزامات پر ایک ایک کر کے غور فرمائیے جو پوری بے باکانہ شانِ احتیاط کے ساتھ اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے ہم پر لگائے گئے ہیں۔

(۱) سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ جماعت ایک فرقہ بنتی جا رہی ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ "جماعت کے حلقے میں یہ زعم پیدا ہو رہا ہے کہ دین، دین کا فہم، دین کا درد، دین کا شعور بس اس جماعت میں محدود اور اسی دائرے میں مخصوص ہے۔"

اس الزام کے متعلق گزارش ہے کہ اول تو صاحب تحریر بزرگ کو یہی پتہ نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی فرقہ کس طرح بنا کرتا ہے۔ محض اتنی سی بات سے کہ کچھ لوگ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ دین کا علم بس ہمارے ہی پاس ہے اور ہم ہی اسلام کی خدمت کر رہے ہیں، وہ ایک فرقہ نہیں بن جاتے۔ اس کو ایک سخت قسم کی بر خود غلطی کہہ لیجیے، غرور بیجا کہہ لیجیے، مگر یہ کہنا بڑی زیادتی ہے کہ انھوں نے اپنا ایک الگ فرقہ بنا لیا ہے۔ اگر اس طرح سے فرقے بن جایا کریں تو پاکستان اور ہندوستان کے جتنے علما اور مشائخ اپنے الگ الگ دائرے بنا کر کام کر رہے ہیں سب کو الگ الگ فرقوں کا بانی قرار دینا پڑے گا۔ کیونکہ ان میں سے ایک شخص بھی شاید ایسا نہ نکلے جو یہ نہ سمجھتا ہو کہ جو کام وہ کر رہا ہے کوئی دوسرا نہیں کر رہا ہے۔ اور اگر اپنی نیک مزاجی کی وجہ سے وہ دوسروں کو

بنا کچھ وزن دے رہا ہے تو کم از کم اس کے معتقدین اور مریدین تو ہرگز اس بات کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ان کے "حضرت" کے سوا کسی اور کو بھی دین کا فہم اور دین کا علم حاصل ہے پھر کیا یہ سب کے سب الگ الگ فرقے ہیں؟ خود صاحبِ تحریر نے بھی اپنے اسی مراسلے میں جگہ جگہ بھی دعوں کی لی ہے۔ خصوصاً تصوف پر بحث کرتے ہوئے تو ان پر انا ولاغیری کا اتنا نشہ چڑھ گیا ہے کہ شیخ ابن عربی کا سکر بھی ان کے سکر کے آگے محو بن کے رہ گیا ہے۔ لیکن محض اتنی بات کی وجہ سے ہم یہ نہیں سمجھتے کہ موصوف بھی کسی خاص فرقے کے بانی بن گئے ہیں بلکہ اس کو محض تنگ ظرفی پر محمول کرتے ہیں جو ایک بیماری ہے اور بہتوں کو لاحق ہو جایا کرتی ہے۔

فرقہ بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اندر کوئی جماعت یا تو عقائد میں کوئی ایسی بات ایجاد کرلے جو کتاب و سنت کے بتائے ہوئے اور سوادِ اعظم کے اختیار کئے ہوئے عقائد سے مختلف ہو یا دین کے جو معروف اور مسلم ماخذ ہیں اُن کے سوا اپنے لئے کوئی اور بھی ماخذ قرار دے لے۔ الحمدللہ صاحب تحریر بزرگ نے بعض دوسرے بزرگوں کی طرح اس قسم کا کوئی الزام جماعت پر نہیں لگایا ہے۔ اس لئے ہماری یہ باادب گزارش ہے کہ جب تک وہ جماعت پر کسی نئے عقیدے یا نئے ماخذِ دین کی ایجاد کا الزام نہیں لگا لیتے اس وقت تک جماعت پر ایک فرقہ ہونے کا الزام لگانے میں بھی وہ توقف فرمائیں۔

ایک فرقہ ہونے کا الزام تو درکنار جماعت اسلامی پر ایک الگ فقہی مذہب ہونے کا الزام بھی نہیں لگایا جاسکتا۔ ایک الگ فقہی مذہب ہونے کے لئے بھی کم از کم پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ جماعت یا اس کے امیر نے اجتہاد کے کچھ ایسے اصول ایجاد کئے ہوں جو مذاہب اربعہ کے اصول اجتہاد سے مختلف ہوں لیکن معلوم ہے کہ ہم نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی ہے۔ صاحب تحریر بزرگ نے ہم پر نااہلیت اور غلط فتوے دینے اور غلط اجتہاد کرنے کے الزامات تو لگائے ہیں لیکن یہ الزام کہیں نہیں لگایا ہے کہ ہم نے ائمۂ اربعہ کے اصولوں سے کچھ ایک اصول اجتہاد کے ایجاد کر لئے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم کو ایک الگ فرقہ قرار دینا تو درکنار وہ ایک الگ فقہی مذہب بھی

ر دینے کا حق نہیں رکھتے۔

باقی رہی یہ بات کہ جماعت کے لوگوں کو یہ زعم ہے کہ "صحابہؓ کے بعد دین کو بس ہم نے سمجھا ہے" یا یہ کہ "ہم اصلی اور تحقیقی مسلمان ہیں دوسرے نسلی اور تقلیدی" تو یہ بات بالکل بہتان ہے۔ جماعت اسلامی اس قسم کی کسی غلط فہمی میں ہرگز مبتلا نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جماعت سے بدگمانی رکھنے والے حضرات پہلے تو خود اپنے دل میں یہ فرض کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی ایسا سمجھتی ہوگی، پھر خود ہی اپنے اس مفروضہ کو واقعہ کی شکل دے لیتے ہیں اور یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ جماعت اسلامی ایسا سمجھتی ہے۔ جماعت اسلامی جو کچھ سمجھتی ہے وہ تو بس اتنا ہے کہ آج پورے دین کو زندگی کے تمام انفرادی، اجتماعی اور سیاسی شعبوں میں قائم کرنے کی عملاً جدوجہد کرنے والی اور اس مقصد کے لئے آگے بڑھ کر لڑنے والی جماعت اُس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی جو کہی جاتی ہے بطور فخر و غرور کے نہیں کہی جاتی، کیونکہ یہ بات کوئی فخر کی بات بہرحال نہیں ہے، بلکہ بطور اظہار حسرت و افسوس کے کہی جاتی ہے کہ دین کی غربت اور حق کی بیکسی کا یہ عالم ہے کہ آج اس سرزمین پر باطل سے باطل مقاصد کے لئے بڑی بڑی پارٹیاں اور جماعتیں موجود ہیں لیکن اسلام ہی ایک ایسا مظلوم ہے جس کو زندگی کے ہر شعبے میں غالب کرنے کا حوصلہ رکھنے والی ایک چھوٹی سی جماعت جماعت اسلامی کے سوا کوئی اور پارٹی موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی کا یہ احساس محض ایک احساس نہیں ہے بلکہ ایک واقعہ ہے جس کا کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمارے یہ بزرگ دین چونکہ اس بات میں اپنی تحقیر محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح بالواسطہ اُن کی دینی خدمات کا انکار کیا جا رہا ہے اس لئے وہ اس کو اس شکل میں تعبیر کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے لوگ اپنے سوا کسی کو دین کا فہم و شعور رکھنے والا سرے سے سمجھتے ہی نہیں۔

جماعت کے طریقِ تنظیم کو بھی محض سطحی نظر سے دیکھ کر یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ وہ ایک نیا فرقہ بن رہی ہے اور سوادِ اعظم سے کٹ رہی ہے کیونکہ ہر مسلمان کو اپنے دائرے میں نہیں لے لیتی بلکہ ... رکن و غیر رکن کا فرق کرتی ہے، اور جماعت کے اندر اور باہر کا امتیاز کرتی ہے۔ لیکن دراصل یہ

ساری باتیں ہمارے نقطۂ نظر کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہیں۔

جماعت اسلامی نے اپنی تنظیم کی بنیاد اس اصول پر رکھی ہے کہ اس کے اندر صرف وہی لوگ شامل ہو سکتے ہیں جو اسلام کو اپنی انفرادی زندگی کا بھی دین مانتے ہوں اور اپنی اجتماعی اور سیاسی زندگی کا بھی۔ نیز وہ اپنی انفرادی زندگی کی حد تک اس پر پوری طرح عمل کرتے ہوں اور اپنی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں اس کو جاری کرنے کے لئے جدوجہد کرنے کا عزم رکھتے ہوں۔ مجرد اس بنا پر کہ ایک شخص مسلمان گھرانے کے اندر پیدا ہوا ہے خواہ اسلام کے ساتھ وہ کوئی عملی و اعتقادی وابستگی نہ رکھتا ہو، کوئی شخص اس جماعت میں داخل نہیں ہو سکتا۔

ظاہر ہے کہ آج مسلمانوں کی قوم ہر قسم کے افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں کتنے ہیں جو اسلام کے ساتھ اس کے سوا کوئی نسبت نہیں رکھتے کہ وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔ نہ وہ اسلام کے کسی حکم پر عمل ہی کرتے ہیں نہ اس کی کسی نہی سے بچتے ہی ہیں۔ کتنے ہیں جو اسلام کو صرف انفرادی زندگی ہی کا دین مانتے ہیں، اپنی اجتماعی زندگی کو شریعت کی پابندیوں سے وہ بالکل آزاد سمجھتے ہیں۔ کتنے ہیں جو اسلام کے اصولوں کے کھلم کھلا منکر ہیں بلکہ اسلام کا مضحکہ اڑانے سے بھی باز نہیں رہتے۔ اب اگر کوئی جماعت اس عزم کے ساتھ اٹھے گی کہ وہ مسلمانوں کے اندر پورے دین کو قائم کرے گی تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں اس طرح کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی کہ مذکورۂ بالا تمام قسم کے مسلمانوں کی ایک فوج بھرتی کر لے۔ لامحالہ اسے یہی کرنا پڑے گا کہ وہ پہلے ان مسلمانوں کو چھانٹے جو اعتقاداً بھی مسلمان ہوں اور عملاً بھی، اور جو اسلام کو انفرادی زندگی کا دین بھی مانتے ہوں اور اجتماعی زندگی کا دین بھی۔ پھر وہ انہی کو دوسرے مسلمانوں کی اصلاح اور ان کو اپنی طرف کھینچنے کا ذریعہ بنائے یہی کام جماعت اسلامی نے کیا ہے لیکن اس پر ہمارے یہ بزرگان دین برہم ہیں کہ جماعت اسلامی اصلی مسلمان صرف اپنے ارکان ہی کو سمجھتی ہے، باقی سارے مسلمانوں کو صرف نسلی مسلمان قرار دیتی ہے اور جماعت کے اندر اور جماعت کے باہر کے مسلمانوں میں امتیاز کرتی ہے۔

جماعت کے اندر اور جماعت کے باہر کے مسلمانوں میں جماعت [illegible]

[illegible] بھی ناداں بھی کا [illegible] ہے [illegible] اسلام [illegible] [illegible] ہے ۔
دراصل صرف اس پہلو سے ہے کہ جماعت کے اندر وہ لوگ ہیں جو اصلاح کے کام میں ہمارے
تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں، اور اس مقصد کے لئے وہ خالص اسلامی اصولوں پر ایک جماعتی
میں منسلک ہو گئے ہیں جس کی بنا پر کوئی ان کو حکم دے سکتا ہے اور وہ اس کا حکم مان سکتے ہیں ۔
رہے جماعت سے باہر کے مسلمان تو وہ ہر قسم کے مسلمانوں پر مشتمل ہیں ۔ ان میں اسلام سے جاہل
بھی ہیں اور اسلام سے باخبر بھی ۔ ان میں صالح بھی ہیں اور فاسق بھی ۔ ان میں اسلام کے دشمن
ہیں اور اسلام کے دوست بھی ۔ اُن میں اسلامی نظام کے چاہنے والے بھی ہیں اور اسلامی نظام
مخالفین بھی ۔ ہم ان کے اندر کے تمام صالحین اور اخیار کو اپنی ہی جماعت کا آدمی سمجھتے ہیں ۔ اگرچہ
بھی ہم سے ملے نہیں ہیں لیکن ہم ان کو وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ کے حکم میں داخل
ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ دیر یا سویر ہم ان سے مل جائیں گے یا وہ ہم سے مل کر رہیں گے ۔
مقصد اور طریقِ کار کی یکسانی کے باوجود یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اور وہ زیادہ دنوں تک الگ الگ
رہتے رہیں ۔ اس وقت ہمارے اور ان کے درمیان جو علیحدگی ہے وہ بیشتر نتیجہ ہے ان کی
جانب سے بعض بدگمانیوں کا اور ہماری جانب سے بعض کوتاہیوں کا ۔ ہم نے اب یہ فیصلہ کر لیا
ہے کہ ہم اپنی کوتاہیاں دور کر کے رہیں گے، وہ اپنی بدگمانیاں دور کریں یا نہ کریں ۔ گو توقع ان کی طرف
سے بھی ہم کو اچھی ہی ہے ۔

(۲) دوسرا الزام جو صاحبِ تحریر بزرگ نے جماعت پر لگایا ہے وہ جہلِ مرکب کا ہے ۔ وہ
فرماتے ہیں کہ "جماعت کا ہر شخص یا تو خود اپنے آپ کو اجتہاد کا مستحق سمجھتا ہے یا جماعت کے وابستہ
افراد سے رجوع کرتا ہے اور جماعت کے پورے حلقے میں ایک عالم بھی ایسا نہیں ہے جس کا علم اور
تفصیلی مسائل میں لائقِ اعتماد ہو ۔ اس لئے ان کے بڑے بڑے مدعیانِ علم مسائل کے بارے
فاحش اور مضحکہ انگیز غلطیاں کرتے ہیں ۔ ..... کتاب و سنت اور فقہائے امت کے استنباطات
پر ان کی نظر بہت کم ہے ۔"

میں صاحبِ تحریر بزرگ اور ان کی طرح کے جماعت سے بے خبر اشخاص کی اطلاع کے لئے اس امر واقعی کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ جماعت کے اندر ہر شخص کا اپنے آپ کو اجتہاد کا مستحق سمجھنا اور اجتہاد کرنا تو الگ رہا جماعت کا ہر شخص اپنے آپ کو تقریر کرنے کا بھی نہ مستحق سمجھتا ہے اور نہ بلا اجازت تقریر کرتا ہی ہے۔ صرف وہی لوگ تقریر کر سکتے ہیں جو اپنی اہلیت کی بنا پر جماعت کے اہلِ حل و عقد کی طرف سے اس کے لئے مجاز قرار دیئے گئے ہوں۔ جو جماعت اپنے ڈسپلن میں اتنی سخت ہو کہ ہر شخص کو تقریر کرنے کی بھی اجازت دینے کی روادار نہ ہو وہ ہر شخص کو اجتہاد کر ڈالنے کی چھوٹ کیسے دے سکتی ہے، درانحالیکہ ایک نااہل کا اجتہاد ایک نااہل کی تقریر سے اس کے لئے اور دوسروں کے لئے کہیں زیادہ فتنہ انگیز ہے۔ اگر اس قسم کے کچھ برخود غلط ارکانِ جماعت کہیں موجود ہوں تو صاحبِ تحریر بزرگ اور ان کے ہم خیالوں سے ہماری گزارش ہے کہ ان کے ناموں اور ان کے اجتہادات کے کچھ نمونوں سے ہمیں ضرور آگاہ فرمائیں تاکہ ہم جماعت کو ان کی فتنہ انگیزیوں سے محفوظ کر سکیں۔

رہے جماعت کے اہلِ علم تو ان کی نسبت جس رائے عالی کا اظہار کیا گیا ہے وہ مدرسی اور خانقاہی حلقوں سے اکثر ہماری نسبت ظاہر کی جاتی رہی ہے اور ہم نے اس کا جواب دینے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس لئے کہ فی الواقع اس کا ہمارے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں آخر جو لوگ ہمیں یہ کہتے ہیں کہ تم عالم فاضل نہیں ہو تو ہم ان کے جواب میں کیا یہ کہیں کہ نہیں تم جھوٹ کہتے ہو، ہم تو بڑے عالم فاضل ہیں اور ہمارے پاس یہ یہ سندیں اور یہ یہ تصدیقیں ہمارے علم و فضل اور تبحر کی شہادت میں موجود ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ تو تو میں میں کچھ اچھی چیز نہیں ہے۔ اس لئے ہم اپنے ان بزرگوں کی لن ترانیوں کے جواب میں ہمیشہ خاموش ہی رہے۔ ہم نے خیال کیا کہ زمانہ خود بہترین جج ہے۔ وہ خود اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ ہم کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ جن لوگوں نے اپنے آپ کو میدان میں اس لئے اتار دیا ہے کہ وہ زمانے سے لڑیں گے اور باطل پر حق کو غالب کر کے رہیں گے یا اس کشمکش میں اپنے آپ کو مٹا دیں گے ان کی قابلیتوں کی شہادت ——

فی الواقع ان کے اندر کوئی قابلیت موجود ہے ـــــ خود زمانہ دے گا۔ ان کے ان دعوں
خانقاہوں کی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس معاملہ کو خدا کے حوالے کر کے کہ وہ
ہم علم و فضل کا منبع ہے، چپ ہی رہے اور اب بھی جہاں تک اس جھگڑے کا تعلق ہے ہم چپ
رہتے۔ لیکن صاحب تحریر بزرگ نے ہماری بہت سی فاحش اور مضحکہ انگیز غلطیوں کا اجمالی حوالہ
دے کر چھوڑ دیا ہے بتایا نہیں ہے کہ وہ غلطیاں کیا ہیں، یقیناً یہ غلطیاں بہتوں کے لئے ٹھوکر
گمراہی کا سبب ہو سکتی ہیں اس لئے ہم صاحب تحریر بزرگ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ
فاحش اور مضحکہ انگیز غلطیوں سے ہمیں ضرور آگاہ فرمائیں تاکہ ہم ان کی اصلاح کر سکیں۔ اور اگر
موصوف کو ہم سے کسی اصلاح کی توقع نہ ہو تو پبلک ہی کو ان غلطیوں کی تفصیل سے آگاہ فرما دیں
لوگ ان سے محفوظ رہ سکیں۔

ایک اور بات کی یہاں تھوڑی سی وضاحت ہو جائے تو اچھا ہے کہ "تفصیلی مسائل" سے ہمارے
بزرگوں کی کیا مراد ہے جس کے علم و تفقہ میں جماعت کا ایک صاحب علم بھی لائق اعتماد نہیں
؟ کیا اس سے مراد اس طرح کے مسائل ہیں کہ اگر کسی کوئیں میں چوہیا مر جائے تو وہ کتنے ڈول پانی
نکالنے سے پاک ہوگا؟ اگر یہی مراد ہے تو میں صاحب تحریر بزرگ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ جماعت
کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو اس "تفقہ" میں آپ حضرات سے اگر آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں ہیں۔
اور اگر اس سے مراد وہ مسائل ہیں جو موجودہ زمانے کی روزمرہ زندگی میں نئی تہذیب کے تصادم
سے پیش آرہے ہیں تو اس طرح کے مسائل سے تعرض کرنے والی اگر کوئی جماعت آج موجود ہے
تو یہی جماعت اسلامی ہی ہے۔ یہ الگ سوال ہے کہ وہ اس کی اہل ہے یا نہیں مگر چونکہ کوئی اور
بہتر جماعت آج اس کام کے لئے آگے نہیں آرہی ہے اس لئے تمدنی، اجتماعی، اور سیاسی
مسائل میں جماعت اسلامی نے اسلام کا نقطۂ نظر واضح کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے
اگر کوئی جماعت ایسی موجود ہے جو ان مسائل میں اپنے علم و تفقہ کو جماعت اسلامی کے علم و تفقہ
سے زیادہ لائق اعتماد سمجھتی ہے تو بسم اللہ وہ آگے بڑھے، جماعت اسلامی اس کے پیچھے چلے گی

[illegible] رہا ہے اس چیز نے کہ انہوں نے [illegible] ذمہ داریاں

محسوس نہیں کیں۔

مولانا مودودی کا علم و مطالعہ مدرسی اور خانقاہی حلقوں میں اکثر زیر بحث رہا ہے اور میں نے

یہ محسوس کیا ہے کہ اس معاملہ میں لوگوں کا غرور علم اکثر اعتراف حق پر غالب آیا ہے۔ میں یہ تو

نہیں جانتا کہ مودودی صاحب نے کہاں پڑھا ہے اور کیا پڑھا ہے، لیکن میں اس بات کو اچھی

طرح جانتا ہوں کہ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں، نہایت قابل آدمی ہیں، اور نہایت وسیع النظر

عالم ہیں۔ ان کا مرتبہ صرف اس پہلو ہی سے اونچا نہیں ہے کہ وہ جدید علوم و افکار پر نہایت وسیع

نگاہ رکھتے ہیں، اور ایک بلند پایہ انشا پرداز ہیں بلکہ ان کی اصلی خوبی یہ ہے کہ وہ کتاب و سنت پر

نہایت گہری اور وسیع نظر رکھتے ہیں۔ قرآن کا انھوں نے ایک اسکالر کی طرح مطالعہ کیا ہے اور

برابر اس پر تدبر کرتے رہتے ہیں۔ صرف بیضاوی اور جلالین "بقدر نصاب" پڑھ کر مفسر نہیں بن بیٹھے

ہیں۔ انھوں نے حدیث کی تمام مستند کتابوں کو حرف حرف نہایت غور و فکر کے ساتھ پڑھا ہے،

صرف ان کے "دورہ" پر اکتفا نہیں فرمایا ہے۔ اسی طرح فقہ، اصول، سیرت اور رجال کی تمام

ضروری کتابیں ان کی نگاہوں سے گزری ہوئی ہیں۔ ان کے مطالعہ کا طریقہ بھی محققانہ ہے۔ میں

۲۰ ماہ ان کے ساتھ جیل میں رہا ہوں اور میں نے نہایت قریب سے ان کو دیکھا ہے کہ وہ کس طرح

کی چیزیں پڑھتے ہیں، کس طرح پڑھتے ہیں اور کس قدر پڑھتے ہیں۔ انھوں نے صرف جیل کے قیام

کے دوران میں عام علوم و فنون کے سوا تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور رجال کی اتنی کتابوں کا مطالعہ

کیا ہے کہ میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو حضرات ان کے مطالعۂ کتاب و سنت پر

باندازِ استخفاف تبصرہ فرماتے ہیں اُن کو شاید مدۃ العمر اتنی کتابیں پڑھنے کی سعادت نہیں حاصل

ہوئی ہوگی۔ میں نے جب کبھی ان کی کوئی پڑھی ہوئی کتاب کسی ضرورت کے لئے اٹھائی تو حدیث

اور فقہ کی موٹی موٹی کتابوں پر بھی دیکھا ہے کہ ان کے تمام اہم یا قابلِ تنقید مقامات پر حاشیہ میں خود

اُن کے قلم سے مفید نوٹ موجود ہیں۔ وہ عربی زبان کو عالمانہ طور پر سمجھتے ہیں اور مطالب حقیقی کی

طرح ہوائی تیر تکے نہیں چلاتے۔ جیل کے دورانِ قیام میں مجھے بعض اوقات عربی کی بعض مشکل غلط چھپی ہوئی عبارتوں کے بارے میں اُن کے مشوروں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے اور میں نے ہر مرتبہ یہ محسوس کیا کہ وہ عبارت کا تجزیہ کرنے اور کلام کی نحوی تالیفات سمجھنے میں مدرسے کے مولویوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ پھر کام کو وہ جس ذمہ داری کے ساتھ کرتے ہیں اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی تقریر بھی اس وقت تک کرنا پسند نہیں کرتے جب تک اس کے لئے اچھی طرح تیاری نہ کریں ——— اگر ایک ایسے شخص پر بھی کتاب و سنت کے علوم کے بارے میں ہم اعتماد نہیں کر سکتے تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ کتاب و سنت کے علم کے بارے میں اس ملک میں کس شخص پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

(۳) صاحبِ تحریر بزرگ نے سب سے زیادہ دردانگیز الفاظ میں جو الزام ہم پر لگایا ہے وہ تصوف کے انکار اور اکابرِ تصوف کی تحقیر کا ہے۔ اس الزام کے پہلے حصے کے متعلق تو یہ گزارش ہے کہ ہم نے تصوف کی مخالفت جس پہلو سے اور جن وجوہ سے کی ہے انھیں مولانا مودودی نے اپنی کتابوں اور مضامین میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور میں نے بھی اپنے رسالہ "حقیقتِ تقویٰ" میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ جو شخص چاہے ان رسائل کی مدد سے ہماری مخالفت کی حقیقت اور اس کے اسباب و وجوہ معلوم کر سکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اکابرِ تصوف کی کسی نوعیت سے کوئی تحقیر کی ہے۔ وہ تمام اکابر صوفیہ جنھوں نے دین کی خدمتیں انجام دی ہیں ہمارے نزدیک بھی اسی طرح محترم ہیں جس طرح صاحبِ تحریر بزرگ کے نزدیک وہ محترم ہیں۔ لیکن اس احترام کے لئے ہم یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ ان کو بالکل معصوم بنا کے چھوڑ دیں اور ان کو وہ درجہ دے دیں جو ہمارے دین میں صرف اللہ کے رسول کو دیا گیا ہے۔ اگر کسی شخص کے احترام کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس پر کسی پہلو سے کوئی تنقید ہی نہ کی جائے [illegible]

سمجھنے اس لئے کہ وہ شاہ ولی اللہ صاحب، مجدد صاحب اور دوسرے بزرگوں سے متفق ہونا یہ محسوس کرتا ہے کہ ہم اُسی کام کو انجام دینا چاہتے ہیں جس کو ان بزرگوں نے انجام دینا چاہا تھا، اور اس کام میں ان بزرگوں کی رہنمائی سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں، لیکن اس فائدہ اٹھانے میں ہم اُس کسوٹی سے بھی کام لے رہے ہیں جو صحیح اور غلط کے پرکھنے کی واحد کسوٹی ہے اور جس پر جانچے بغیر کسی بڑے سے بڑے بزرگِ دین کی بات کو مان لینا بھی ہمارے دین میں ایک صاحب علم کے لئے حرام ہے۔ اس کسوٹی کا نام ہے کتاب اور سنت۔ ہمارے صاحب تحریر بزرگ نے بھی یہ نام بار بار لیا ہے لیکن معلوم نہیں وہ اس کے مصرف سے بھی واقف ہیں یا نہیں؟

تصوف کے متعلق جماعت اسلامی بحیثیت ایک جماعت کے تو کوئی مسلک نہیں رکھتی کیونکہ وہ اس طرح کے مسائل کا فیصلہ کرنے کے لئے نہیں بنی ہے۔ اور مودودی صاحب کا نظریہ اس معاملہ میں بہت نرم ہے، جیسا کہ تجدید واحیاء دین اور رسالۂ دینیات سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ میں مروجہ تصوف کو بدعت سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اس کو اس احسان سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے جو شریعت میں مطلوب اور معتبر ہے۔ احسان کی کوئی اپنی خاص شکل وصورت شریعت سے الگ نہیں ہے۔ اس کی حقیقت تو بس اس قدر ہے کہ آدمی اللہ کی شریعت پر پورے صدقِ دل اور پورے حضورِ قلب کے ساتھ اس کی روح اور حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے عمل کرے۔ دنیا میں انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد لوگوں کا تزکیہ ہے اور وہ اپنے اس اصلی مقصد کو کبھی ناتمام چھوڑ کے نہیں جاتے کہ دوسرے لوگوں کو اس کے اصول وفروع مرتب کرنے پڑیں۔ اگر دوسرے لوگ ایسا کریں تو خلق اور خالق دونوں کے نزدیک ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی ہر بات کے متعلق ثبوت بہم پہنچائیں کہ انھوں نے یہ بات قرآن کی کس آیت سے یا پیغمبر کی کس حدیث سے اخذ کی ہے۔ اس معاملے میں نہ کسی شخص کا مجرد ذوق معتبر ہے اور نہ کسی شخص کا کشف وحال قابلِ لحاظ ہے۔ اور یہ کہنا تو انتہا درجہ کی ضلالت ہے کہ تزکیہ کے یہ رموز کسی خاص شخص یا چند خاص اشخاص ہی کو معلوم ہو سکے، دوسروں پر پیغمبر صلعم نے ان کو [illegible]

ا۔ یہ اسلام میں باطنیت کی بنیاد رکھنا ہے اور دینِ اسلام کی روح اس باطنیت کا قلع قمع کرنا
ی ہے۔ جو لوگ یہ بات کہتے ہیں وہ خدا کے رسول پر سب سے بڑی تہمت لگاتے ہیں اور
ہا فتنوں کے دروازے کھول رہے ہیں۔

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف کی جو مخالفت کی ہے اس کو صاحبِ تحریر بزرگ نے
عن" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ حالانکہ انھوں نے صرف اعراض نہیں کیا ہے بلکہ تصوف
نہایت مدلل مخالفت کی ہے اور صرف اس کی مخالفت ہی نہیں کی ہے بلکہ اس کی جگہ پر
ب و سنت سے اُس احسان کے اصول بھی مرتب کر دیے ہیں جو اسلام میں معتبر ہے۔ پھر
ی مخالفت کی نوعیت بھی ایسی نہیں ہے کہ آدمی اس کو معلوم کرنے کے بعد بغیر اس کے بارے
یکسو ہوئے چین کی نیند سو سکے۔ ہمارے اکابرِ تصوف اور ابن تیمیہ کے نقطۂ نظر کے اختلاف کا
سرسری اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات شیخ ابن عربی کو شیخ اکمل
ۃ ہیں اور تصوف میں سارا مدارِ سخن انھی پر رکھتے ہیں۔ لیکن ابن تیمیہ کے پاس ان کے لئے
سے کم کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ ابن تیمیہ سارے تصوف کو بدعت اور ضلالت قرار دیتے
۔ یوں تو انھوں نے تقریباً اپنی ساری ہی کتابوں اور سارے ہی رسائل میں کسی نہ کسی پہلو سے
ف پر تنقید کی ہے لیکن خاص طور پر ایک شیخ تصوف کی ایک تصنیف کو انھوں نے تنقید کے
انتخاب کیا اور اس پر تنقیدی نوٹ لکھے جن کو بنیاد قرار دے کر ان کے شاگرد علامہ ابن قیم
مدارج السالکین لکھی جو ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کتاب میں صوفیہ کے تصوف پر ابن قیم نے
ی تفصیل کے ساتھ تنقید کر کے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح یہ تصوف قدم قدم پر کتاب و سنت
منحرف ہے۔ میری نگاہ سے آج تک فنی تنقید پر اس سے زیادہ عالمانہ اور اس سے زیادہ
صفانہ کتاب کوئی اور نہیں گزری۔ اس کتاب نے ایک طرف تو بدعی تصوف کے بخیے ادھیڑ دئیے
سری طرف احسان کے تمام مقامات و مدارج کی کتاب و سنت کے نہایت واضح دلائل کے
تفصیل کر دی ہے۔ اس کو پڑھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ تصوف میں کیا خرابیاں پیدا

کن پہلوؤں سے اس نے ہمارے تمام معیارات بدل ڈالے ہیں اور کس طرح اس کو صحیح مان لینے کے بعد یہ لازماً ماننا پڑتا ہے کہ العیاذ باللہ انبیا اور صحابہ تقویٰ اور تزکیہ کے لحاظ سے معیاری لوگ نہیں تھے۔ ابن قیم نے تمام مقامات کی تشریح کر کے یہ دکھایا ہے کہ ان حضرات نے اپنا منتہا کتاب و سنت کے مقرر کئے ہوئے منتہا سے ہر میدان میں آگے مقرر کیا ہے جس کے سبب سے ایک طرف تو کتاب و سنت نگاہوں سے گرتے ہیں اور دوسری طرف امت میں رہبانیت کی بیماری پھیلتی ہے۔ کیونکہ ہر معاملے میں صحیح فطری اور عملی حد وہی ہو سکتی ہے جو شریعت نے مقرر کر دی ہے۔ اگر کوئی شخص اس حد سے آگے بڑھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے گا تو وہ لازماً اپنی فطرت سے جنگ کرے گا اور رہبانیت کے دروازے کھولے گا۔

جن لوگوں نے اتنی وضاحت کے ساتھ اپنا موقف بیان کر دیا ہے اور صرف اپنے ہی لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی یہی راہ کھولی ہے ان کو ہمارے صاحب تحریر بزرگ صرف "اعتراض" کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ میں صاحب تحریر بزرگ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مدارج السالکین پڑھیں۔ اس سے انھیں ایک حد تک اندازہ ہو سکے گا کہ تصوف کے متعلق جو رائے ظاہر کر رہا ہوں وہ محض خیرہ سری اور بد دماغی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ارباب تصوف کا پورا احترام ملحوظ رکھنے کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ تصوف اور احسان دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ ان کو جن لوگوں نے بھی ایک سمجھا انھوں نے غلطی کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے اکثر کی نیتیں نیک ہوں۔

ان واجب الاحترام بزرگوں کی غلطیاں گنانا کوئی خوشگوار کام نہیں ہے لیکن اپنے مدعا کو واضح کرنے کے لیے ایک آدھ مثال کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ میں صاحب تحریر بزرگ ہی کی تحریر سے ایک مثال تصوف کی خوفناک بدعتوں کی پیش کرتا ہوں۔ ہمارے صاحب تحریر بزرگ ارشاد فرماتے ہیں :-

نقشبندیہ اور خصوصاً مجدد سرہندیؒ نے تصور شیخ تک کو استعمال کرایا جو بعید خطرناک

اور محذوش طریقہ ہے۔ محض اس لئے کہ جانتے تھے کہ لوگ عموماً خوگرِ پیکرِ محسوس ہیں۔
صورتِ محسوس کے بغیر مجرد معنی تک وصول کی صلاحیت ہی نہیں۔ محسوس پرستی کا ذوق
اس قدر مسلط ہے اور تجرید و تفرید معانی سے اس قدر عاری ہیں کہ بغیر اس کے
خدا کا تصور و تمکن قلوب میں ہوتا ہی نہیں۔ سالہا سال کی اصنام پرستی، صورت پسندی
اور اجْعَلْ لَنَا إِلٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ اور لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً
کی بدذوقی نے تنزیہی الوہیت، بے شبہ و مثال، بے کیف و لون، بے جہت
و قیاس خدا کا تصور دشوار تر کر دیا، اور وصول ہے ضروری، لہٰذا ہوائی سفر کے بجائے
اگر چھکڑے ہی کے ذریعے قطع مسافت ممکن ہو تو یوں ہی سہی مقصد تو وصول ہے۔"

اس عبارت کو پڑھ کر حضرت مجدد سرہندی، حضرات نقشبندیہ اور صاحبِ تحریر بزرگ کا
پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے، چند باتیں پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر اس دلیل کی بنا پر کہ لوگ پیکرِ محسوس کے خوگر ہیں اور بغیر کسی پیکرِ محسوس
ے ایک بے جہت و بے قیاس خدا کا تصور نہیں کر سکتے، ان کو تصورِ شیخ کا طریقہ استعمال کرایا
ا سکتا ہے۔ تو آخر ہندوؤں کی بت پرستی اور مظاہر پرستی میں کیا قباحت ہے؟ ان کے فلسفی
ی تو یہی کہتے ہیں کہ لوگ ایک مجرد حقیقت کا تصور نہیں کر سکتے اس لیے ناگزیر ہے کہ ان کو اس کا
ور محسوس مظاہر کی شکل میں کرایا جائے۔ مقصود تو حقیقتِ مجرد تک پہنچنا ہے، لہٰذا ہوائی جہاز
ے ذریعے اگر سفر نہیں ہو سکتا تو چھکڑے ہی کے ذریعے ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے! ہندوستا
ے ہندو ہی نہیں بلکہ عرب کے بت پرست بھی بتوں کی پوجا کچھ اس لیے نہیں کرتے تھے کہ ان کو
داوندِ عالم سمجھتے تھے بلکہ ان کو وہ خدا تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ان
ی بت پرستی تو شرک قرار پائے اور آپ کا تصورِ شیخ توحید! ـــــ یہی باتیں ہیں جن کے
سبب سے بہت سے لوگ تصوف کو برہمنوں کے جوگ سے ماخوذ بتلاتے ہیں اور ہمارے صاحبِ
ریر بزرگ کی مذکورہ بالا تقریر سے ان کے خیال کی پوری پوری تائید ہو رہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانوں کی فطرت اور اس فطرت کے تقاضوں، اس کی بیماریوں اور اس کے علاج کو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء بہتر جانتے ہیں یا مجدد صاحب اور حضرات نقشبندیہ؟ اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء بہتر جانتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ مجدد صاحب اور حضرات نقشبندیہ نے اس سلسلے میں جو طریقہ اختیار فرمایا وہ صریحاً اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کے اختیار کیے ہوئے طریقے سے مختلف ہے؟ بنی اسرائیل نے جب حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا کہ اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (ہمارے لئے بھی اس قسم کا معبود بنا دے جس قسم کے معبود ان بت پرست قوموں کے پاس ہیں) تو یقیناً انھوں نے یہ مطالبہ اسی وجہ سے کیا تھا کہ وہ صورتِ محسوس کے بغیر مجرد معنی تک وصول کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے لیکن اس کے جواب میں حضرت موسیٰ نے، بجائے اس کے کہ ایک بت گھڑ کے ان کے سامنے رکھ دیتے، یا ان کو تصورِ شیخ کا نسخہ استعمال کرا دیتے، فرمایا کہ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا (بدبختو، کیا میں خدا کے سوا تمہارے واسطے کوئی اور معبود لاؤں) انھوں نے اس کا ذرا لحاظ نہ کیا کہ یہ بیچارے خوگرِ پیکرِ محسوس ہیں اور ابھی ابھی مصر کے بت پرستانہ ماحول سے نکلے ہیں اس لئے ایک بے شبہ و بے مثال خدا کا تصور نہیں کر سکتے، اور مستحق ہیں کہ ان کو ایک بچھڑا بنا کر دیدیا جائے، مقصود تو پہنچنا ہے، خدا تک نہ پہنچے صنم ہی تک سہی۔

نہ صرف یہ کہ انھوں نے ان کو کوئی بت بنا کر دیا نہیں بلکہ ان کی عدم موجودگی میں جب بنی اسرائیل نے از خود ایک بچھڑا بنا لیا تو انھوں نے طور سے واپسی پر اس کو بھی ریزہ ریزہ کر کے سمندر میں پھنکوا دیا اور ان تمام لوگوں کو جو اس بت کے بنانے میں شریک رہے انھی کے بھائی بندوں کے ہاتھوں قتل کرا دیا اور ذرا اس بات کا خیال نہ کیا کہ یہ بیچارے خوگرِ پیکرِ محسوس تھے، ان کو ہوائی جہاز میسر نہیں آیا تھا اس لئے چھکڑے ہی پر سوار ہو لئے تھے۔

اسی طرح بنی اسرائیل نے جب یہ کہا کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (ہم تمہاری بات اس وقت تک نہیں ماننے کے جب تک اللہ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں) تو اس وقت بھی انھوں نے اپنی اسی کمزوری کا اظہار کیا تھا جس کمزوری کے مداوا کے لیے حضرت نقشبندیہ

تصورِ شیخ کا نسخہ تجویز فرمایا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس کمزوری کا لحاظ فرمانے کے بجائے تو ان کو ٹکا سا کہ تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے، تمہاری رسائی میری صفات کے مشاہدے سے آگے نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی جب وہ اپنی ضد پر مصر ہی رہے تو بجائے اس کے کہ ان کی کمزوری پر رحم کر کے ان کو تصورِ شیخ کا نسخہ استعمال کرا دیا جاتا ان کو خدا کی طرف سے ایک کڑک نے آدبایا۔

پیکرِ محسوس کے خوگروں کے لئے خدا اور اس کے نبی کا اختیار کیا ہوا طریقہ اور علاج تو یہ ہے جو بیان ہوا۔ لیکن مجدد صاحب اور حضرات نقشبندیہ کا طریقۂ علاج، صاحب تحریر بزرگ کے بقول، اس سے بالکل مختلف ہے۔ انھوں نے اس خیال سے کہ لوگ حقیقت مجرد کا تصور نہیں کر سکتے ان کو تصورِ شیخ کا رستہ دکھا دیا۔ اب بتائیے کہ ایک مسلمان جو خدا اور اس کے نبیوں پر ایمان رکھتا ہے ان میں سے کس کے طریقے کو اپنے لئے پسند کرے؟ اللہ اور اس کے رسول کے طریقے کو یا مجدد صاحب اور حضراتِ نقشبندیہ کے طریقے کو؟

تیسری گزارش یہ ہے کہ صاحب تحریر بزرگ فرماتے ہیں کہ "ہوائی سفر کے بجائے چھکڑے ہی کے ذریعے اگر قطعِ مسافت ممکن ہو تو یوں ہی سہی مقصود تو وصول ہے۔" اس میں شبہ نہیں کہ اگر موٹر میسر نہ آئے تو چھکڑے پر بھی سفر کیا جا سکتا ہے بلکہ پیدل بھی چلا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال "وصول" کے متعلق ہے کہ آپ پہنچنا کہاں چاہتے ہیں؟ خدا تک یا کہیں اور؟ اگر خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں تو لامحالہ آپ کو وہاں تک پہنچنے کے لئے وہی طریقے اختیار کرنے ہوں گے جو خدا نے اپنے تک پہنچنے کے لئے بتائے ہیں۔ اس طریقے کے سوا کوئی اور طریقہ اختیار کر کے آپ خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ اگر تصورِ شیخ خدا تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہے اور کتاب و سنت سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے تو اس سے بحث نہیں کہ یہ چھکڑا ہے یا موٹر، آپ شوق سے اس پر سوار ہو جائیے، ہم آپ کو ہرگز نہیں روکتے۔ لیکن اگر یہ کوئی ذریعہ سرے سے ہے ہی نہیں یا خدا تک پہنچانے کے بجائے منزل سے پھیرنے والا ذریعہ ہے تو اس کو اختیار کر کے آپ خدا تک نہیں پہنچیں گے بلکہ کسی کھڈ میں جا گریں گے۔ ہاں اگر مقصود بس کہیں نہ کہیں پہنچ جانا ہے، کوئی منزل متعین نہیں ہے

زیادہ تر ایسے جادہ پیماؤں سے بحث نہیں ہے، وہ جس وادی میں چاہیں بھٹکتے پھریں۔

بہر حال ہم جو تصوف کو بدعت کہتے ہیں وہ ارباب تصوف کی اس قسم کی کتاب و سنت سے ہٹی ہوئی باتوں ہی کی بنا پر کہتے ہیں۔

صاحب تحریر بزرگ نے تصوف کی حمایت میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت بھی نقل کی ہے لیکن امام غزالی کی شہادت ان لوگوں کو کیا مطمئن کر سکتی ہے جو ہر معاملہ میں کتاب و سنت کی دلیل ڈھونڈھتے ہوں۔ امام غزالی کے متعلق یہ نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے نبوت کی حقیقت اور خاصیت صوفیوں کے طریقوں سے سمجھی ہے۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو لیکن انھوں نے نبوت کی حقیقت کیا سمجھی ہے یہ سوال بجائے خود بڑا اہم ہے۔ امام غزالی کی تصنیفوں سے جو حضرات اچھی طرح واقف نہیں ہیں، محض ان کے نام ہی سے مرعوب ہیں، وہ ان کو جو چاہیں بنا کے رکھ دیں لیکن جن لوگوں نے ان کی تصنیفات اچھی طرح پڑھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ فلسفۂ یونان کے چکر سے آخر تک پوری طرح نہ نکل سکے۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں فلسفۂ یونان کی جتنی تردید کی ہے اس سے زیادہ فلسفۂ یونان کے غلط نظریات کو دین کی سند دی ہے۔ صاحب تحریر بزرگ نے امام صاحب کے جن رسائل کا حوالہ دیا ہے وہ اگر پسند فرمائیں تو میں انھی رسائل سے متعدد باتیں ایسی نکال دے سکتا ہوں جو امام غزالی نے فلسفہ یونان سے لی ہیں قرآن اور حدیث سے ہرگز نہیں لی ہیں۔ سرسید مرحوم نے بیشتر امام غزالی ہی کی کتابوں پر اپنے مجددانہ نظریات کی بنیاد رکھی ہے اور ان نظریات ہی کی بنا پر مولوی حضرات نے ان کو برا بھلا کہا ہے۔ خود نبوت کے مسئلے پر مجھے امام صاحب کی رائے سے شدید اختلاف ہے اور میں ان کی اس رائے کو فلسفۂ یونان سے مرعوبیت کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ علامہ ابن تیمیہ کی رائے تو ان کے متعلق یہ ہے کہ دخل فی بطن الفلسفة فلم یخرج منها (وہ فلسفہ کے پیٹ میں گھسے اور پھر اس سے نکلنا نصیب نہ ہوا) اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی مفید ترین کتاب "احیاء العلوم" ہے۔ بالخصوص محبت الٰہی وغیرہ موضوعات پر اس کی جو بحثیں ہیں وہ نہایت بیش قیمت ہیں لیکن اس

ں بھی صوفیانہ طرزِ فکر کی وہ ساری خرابیاں موجود ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

(۴) چوتھا بڑا الزام مودودی صاحب اور جماعت اسلامی پر یہ لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ دین کو
ں یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے براہِ راست کتاب وسنت سے سمجھنے کے مدعی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہم لوگ ہمیشہ دین کو کتاب وسنت ہی کے ذریعے سے سمجھنے کی کوشش
رتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب جیسا کہ صاحب تحریر بزرگ نے سمجھا ہے، ہرگز نہیں ہے کہ ہم
م فقہاء و محدثین اور ان کی تمام فقہی اور دینی خدمات سے بالکل مستغنی ہو گئے ہیں۔ بلکہ اس کا
طلب یہ ہے کہ ہم ماضی یا حال کے رجالِ دین کی چیزیں جب پڑھتے ہیں تو صرف انھی کی
لھوں سے نہیں دیکھتے بلکہ اپنی آنکھیں بھی کھلی رکھتے ہیں اور ان کی ہر بات کو جانچنے کی کوشش
رتے ہیں کہ جو بات وہ کہہ رہے ہیں اس کے لیے ان کے پاس کیا دلیل ہے اور اس دلیل کا
ا وزن ہے؟ یہ ہم اس لئے کرتے ہیں کہ ایسا کرنا عقیدۂ توحید کا لازمی تقاضا ہے۔ ایسا نہ کرنے
سے دنیا میں آباء پرستی کی بنیاد پڑی ہے اور خدا کے بندوں کا خدا کی شریعت سے رشتہ
ا ہے۔ اس بات کی تاکید ہمیں جس طرح قرآن و حدیث میں کی گئی ہے اسی طرح اس کی تاکید
دان بزرگ ائمۂ دین نے بھی کی ہے جن کی اندھی تقلید پر جینا اور مرنا آج نجات کے لئے ضروری
ل کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے واضح ہدایات امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہیں۔ انھوں
مختلف الفاظ میں بار بار اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ جو شخص یہ نہ جانے کہ فلاں بات ہم نے
اب وسنت کی کس دلیل کی بنا پر کہی ہے وہ ہماری اس بات کی بنا پر فتویٰ نہ دے۔

باقی رہی یہ بات کہ ہم اجتہاد کرتے ہیں تو اس کی نسبت بھی نہایت واضح الفاظ میں یہ
ہر کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم اپنی مادی زندگی کے باقی رکھنے کے لئے جتنا ضروری
اور پانی کو سمجھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ضروری اپنی روحانی زندگی کے لیے ہم اجتہاد کو
ھتے ہیں۔ اس معاملے میں ہماری ضرورتیں دوسروں کی ضرورتوں سے بالکل مختلف ہیں۔
سروں کا دین ان کی زندگی کے ایک نہایت ہی محدود حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے چند

بہت ضابطے ہیں اور وہ اس محدود دائرے کے اندر، اگر ان کا جی چاہتا ہے، اس کی پیروی کرتے ہیں۔ زندگی کے باقی گوشوں میں ان کو اس سے بحث نہیں کہ وہ کس کی پیروی کر رہے ہیں، خدا کی یا شیطان کی۔ لیکن ہمارا دین ہماری زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہے۔ وہ ہماری انفرادی زندگی کا بھی دین ہے اور ہماری اجتماعی زندگی کا بھی دین ہے۔ اور ہم اپنی زندگی کے کسی گوشے میں بھی اس سے بالارادہ انحراف کو کفر و فسق سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے جتنے معاملات بھی آئیں ہم ان پر غور کرکے یہ دیکھیں کہ ان کے بارے میں ہمارے دین کی رہنمائی کیا ہے۔ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں کتاب و سنت میں نہایت واضح احکام مل جاتے ہیں، چنانچہ ہم ان پر عمل کرتے ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں ہمیں کتاب و سنت میں کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ائمۂ سلف نے اس کے بارے میں کیا اجتہادات فرمائے ہیں۔ ان کے اجتہادات میں سے جس کے قول کو کتاب و سنت سے سب سے زیادہ لگتا ہوا پاتے ہیں اس کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اگر معاملہ ایسا ہے جو ائمہ کے زمانے میں پیش نہیں آیا ہے یا اس کے بارے میں ان کی رائیں ہم تک نہیں پہنچی ہیں تو ہم خود اس پر غور کرتے ہیں کہ کتاب و سنت سے لگتی ہوئی بات اس کے بارے میں کیا ہو سکتی ہے اور جس طرف ہماری تحقیق ہم کو لے جاتی ہے ہم اس کو عمل کے لئے اختیار کر لیتے ہیں۔ ہماری تحقیق غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی لیکن ہم دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ سے اجر کے امیدوار ہیں اس لئے کہ ہماری ذمہ داری صرف اسی قدر ہے کہ جن امور کے بارے میں خدا اور اس کے رسول کی کوئی واضح ہدایت نہ موجود ہو اور نہ ان کے بارے میں ہم سے بہتر لوگوں کے اجتہاد نے ہی کوئی رہنمائی کی ہو ان کے بارے میں ہم اپنی استعداد و استطاعت کی حد تک خدا کی مرضی سے اوفق بات معلوم کرنے کی کوشش کریں اور جس بات پر ہمارا دل ٹھک جائے کہ یہ بات خدا کی شریعت سے اوفق ہے اس کو اختیار کر لیں۔ ہم خلوص نیت کے ساتھ جو بات اختیار کر لیں گے وہی بات ہمارے لئے موجب اجر ہو جائے گی خواہ

یا تصنیف غلط ہو یا صحیح۔ ہم اس بات کو کسی حالت میں جائز نہیں سمجھتے کہ جس بارے میں ہمیں
صول کی کوئی واضح ہدایت نہ ملے تو ہم شریعت سے اوفق کی جستجو کئے بغیر باطل ہی کی
ی کر ڈالیں، یا اگر اہل بدعت حضرات مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے آنا چھوڑ دیں تو ہم بھی نماز
ھانے سے انکار کر دیں۔ ہم ایسی خاکساری کے قائل نہیں ہیں جو ادائے فرائض میں مانع ہو۔

اب صرف دو باتیں اس سلسلے میں قابلِ غور رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ کیا ہم نے کوئی اجتہاد
ا گیا ہے جو ائمۂ اربعہ یا ان کے اکابر متبعین کے اجتہاد کے خلاف ہے اور ہم نے ان سب کو
وڑ کر اپنی کوئی الگ راہ نکالی ہے؟ دوسری یہ کہ کیا ہم نے اپنے سے بہتر اہلِ علم کو نظر انداز
کے خود مسندِ اجتہاد سنبھال لینے کی کوشش کی ہے؟ میں ان دونوں باتوں کو بھی یہاں صاف
ردینا چاہتا ہوں۔

اگرچہ اس بات کی کوئی دلیلِ حصر موجود نہیں ہے کہ فقہ کو ائمۂ اربعہ ہی کے اندر دائر و سائر
ہنا چاہیے اور اس دائرے سے الگ ہو کر دین میں کسی اجتہاد کے لئے گنجائش نہیں ہے
ہ صاحب کے جس قول کا صاحب تحریر بزرگ نے حوالہ دیا ہے وہ بھی محض ان کا ذوق
ہے، اس کی کوئی شرعی یا عقلی دلیل انھوں نے نہیں دی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی
احب کا مسلک اس بارے میں وہی ہے جو صاحب تحریر بزرگ نے شاہ صاحب کا بیان
یا ہے۔ وہ ائمۂ اربعہ کے مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو بربنائے دلائل ترجیح تو دیتے
لیکن اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کے اجتہادات کو نظر انداز کر کے کوئی اجتہاد کیا جائے
ہم نے یہ بات متعدد بار ان کی تقریروں میں سنی ہے۔ اس وقت یہ نہیں عرض کر سکتا کہ انھوں
یہ بات کہیں لکھی بھی ہے یا نہیں۔ بہرحال وہ صاحب علم کے لئے کسی ایک فقہ کی تقلید کو تو
نہیں سمجھتے لیکن مذاہب اربعہ کی تقلید کو جہاں تک میں سمجھتا ہوں بہت ضروری خیال کرتے
ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اصولاً ہر مذہب کے صرف ان متقدمین کو لائقِ اعتنا سمجھتے ہیں
مجتہد تھے اور ان متاخرین کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے جو اگلوں کے [illegible]

کسی ایسے اجتہاد کا پتہ نہیں جس میں انھوں نے ائمۂ اربعہ کو چھوڑ کر تفرد اختیار کیا ہو۔ اگر صاحب تحریر بزرگ اُن کے کسی ایسے اجتہاد سے واقف ہوں تو اس سے ضرور آگاہ فرمائیں۔

رہی دوسری بات کہ ہم نے اپنے سے بہتر اہلِ علم کو نظر انداز کیا ہے تو یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ اول تو اس ملک میں ایسے اہلِ علم ہیں ہی کتنے جو اجتماعی اور سیاسی مسائل میں دین کا نقطۂ نظر سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور اگر کچھ لوگ ایسے ہیں بھی تو ابھی وہ ہم سے اس بات پر لڑ رہے ہیں کہ دین کا اجتماعی اور سیاسی زندگی سے کوئی علاقہ ہے بھی یا نہیں؟ حد یہ ہے کہ ہمارے ملک کے مغرب زدہ لیڈروں تک نے یہ تسلیم کر لیا کہ ہمارا دین جس طرح ہماری انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اس طرح ہماری سیاسی زندگی سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ لیکن ابھی ہمارے بزرگانِ دین کے دل کی کھٹک پوری طرح نہیں نکلی ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ ہمارے اور ان کے درمیان اصل مسئلہ ہی ما بہ النزاع ہے اور اس پر وہ ہم سے لڑ رہے ہیں کہ دین کو ان چیزوں سے کوئی تعلق بھی ہے یا نہیں جن چیزوں سے ہم اس کا تعلق جوڑ رہے ہیں تو ہمارے لئے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عرض کر سکیں کہ ہمارے سامنے یہ یہ مشکلات ہیں، ان میں ہماری رہنمائی فرمائیے۔ اس لئے مجبوراً ہمیں اپنا کام خود ہی سنبھالنا پڑا ہے لیکن ہم یقین دلاتے ہیں کہ جس دن ہم یہ محسوس کر لیں گے کہ ہمارے اور ان کے نقطۂ نظر میں کوئی بنیادی فرق باقی نہیں رہا ہے تو ہم سے زیادہ کسی کو اس بات میں خوشی نہیں ہوگی کہ ہم ان کی رہنمائی سے مستفید ہوں۔

بہر حال ہم نے اجتہاد کے کام کو کوئی فخر اور لذت کا کام کبھی نہیں سمجھا ہے۔ اور نہ کبھی اس دائرے کے اندر ہم نے کوئی اجتہاد کیا ہے جس دائرے کے اندر ہم سے بہتر لوگ اس فرض کو انجام دے چکے ہیں۔ ہم نے اس کام کو ایک ناگزیر دینی ضرورت کی حیثیت سے انجام دیا ہے اور صرف اس حد تک اس کی ذمہ داری اٹھائی ہے جس حد تک شریعت کے ساتھ اپنی زندگی کا ربط قائم رکھنے کے لئے ہم اس کے محتاج تھے۔

(۵) ایک الزام صاحب تحریر بزرگ نے تنقید میں بے اعتدالی کا بھی لگایا ہے۔ موصوف کا
ال ہے کہ مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں کو تنقید کا چسکا پڑ گیا ہے اور وہ اس کام کو
ض لذتِ نفس کے لئے کرتے ہیں اور چونکہ لذتِ نفس کے لئے کرتے ہیں اس لئے لازمی طور پر
سا میں غیر معتدل بھی ہو گئے ہیں۔

یہ بات واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ لذتِ نفس اور تسکینِ ذوق کے لئے اس زمانے میں مشاغل
ہی نہیں ہے کہ ہم اس کے لئے یہ راہ ڈھونڈتے۔ ہمارا کوئی کام بھی محض ایک مشغلہ کے طور پر
یں ہوتا۔ اور نہ ہم کبھی مضمون نگاری محض مضمون نگاری کی خاطر کرتے ہیں۔ ہماری تمام تحریری اور
ریری سرگرمیوں کا محور وہ دعوت ہے جو ہم اقامتِ دین کے لئے دے رہے ہیں۔ جب تک کسی
کا اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہ ہو وہ ہمارے ہاں زیرِ بحث نہیں آتی۔ اور تنقید
لئے تو ہم کبھی اس وقت تک قلم اٹھاتے ہی نہیں جب تک کسی چیز کی نسبت ہم یہ نہ محسوس کریں
، چیز دعوتِ دین کی راہ میں مزاحم ہو رہی ہے۔ تصوف پر ہمارے ہاں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے
) پہلو سے لکھا گیا ہے۔ ہم نے خود پیش قدمی کر کے کبھی اس سے تعرض کرنے کی کوشش نہیں
ہے۔ ہمارے سامنے بار بار یہ بات بڑے اصرار کے ساتھ لائی گئی کہ اصلاح و تزکیہ اور تجدید
ن کا اصلی راستہ وہ ہے جو اربابِ تصوف نے اختیار فرمایا۔ ہم نے ایمانداری کے ساتھ اس
ے کو غلط سمجھا اس لئے ہم نے اپنا یہ فرض جانا کہ جو کچھ ہمارے نزدیک صحیح ہے ہم اس کو
ن کر دیں تاکہ ہمارا موقف لوگوں کے سامنے اچھی طرح واضح ہو جائے۔ اب اگر آپ حضرات
مانتے ہیں کہ "یہ احوال و کوائف اور اسرار و مواجید ہیں جن پر تنقید کی ضرورت اور نہ اٹھانے کی
حاجت"، یا "عشاق کے یہ صحیفے صرف لپیٹ کر رکھ دینے کی چیزیں ہیں نہ انکار می کنم و نہ
انکار می کنم کا معاملہ اُن کے ساتھ مناسب ہے" یا "یہ خلوت کے انفرادی احوال جلوت کے
افشا کے لئے نہیں ہوتے،" تو کس نے آپ حضرات سے یہ کہا تھا کہ یہ خلوت کے اسرار
ت کے اسٹیج پر بیان فرمائیے اور عشاق کے ان صحیفوں کی منظرِ عام پر نمائش کیجئے؟ یقیناً

اس پردہ دری کے مجرم ہم نہیں ہیں بلکہ آپ ہی حضرات ہیں۔ جب آپ ان کو منظر عام پر لا چکے تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ ان کو صرف وہی پڑھیں جو جوہر شناس ہیں اس لئے کہ ان کے اندر اسرار بند ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کہنے کے معنی اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں کہ جن کی توجہ ان کی طرف نہ بھی ہونے والی ہو وہ بھی اس نقاب کو الٹنے کے مشتاق اور آرزومند ہو جائیں۔

جب آپ ایک کتاب لکھتے ہیں اور پریس اس کو چھاپ بھی دیتا ہے تو اس کو اہل اور نااہل سبھی پڑھیں گے۔ آپ کے اس کہہ دینے کی وجہ سے کہ نااہل اس کو نہ پڑھیں یہ نہیں ہوگا کہ نااہل لوگ اپنی نااہلیت کو ٹھیک ٹھیک جان کر اس کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیں گے بلکہ انسانی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس ممانعت کے بعد نااہلوں میں اس کی مانگ اور بڑھ جائے گی اور پریس بھی اس کے چھاپنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اگر اس کتاب کے سبب سے لوگوں میں کوئی فتنہ پھیلے گا تو اس کی ذمہ داری سے وہ لوگ عنداللہ بری نہیں ہو سکتے جو ایسی "پر اسرار" کتابوں کے شائع کرنے والے بنے۔ پھر انھوں نے یہ غضب بھی کیا کہ لوگوں کے ذوقِ جستجو کو شہ دینے کے لیے ان کتابوں پر یہ کتابہ بھی لگا دیا کہ ان کو صرف وہی پڑھیں جو اہل ہیں۔ اور اہل بھی کیسے، معمولی اہل نہیں، کیونکہ ان کتابوں کے اسرار اور رموز سمجھنے کے لئے مودودی صاحب اور ان کے رفقاء تو درکنار ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے لوگ بھی ان حضرات کے نزدیک نااہل ہی سمجھے جاتے ہیں اور ان کی نسبت بڑے طنطنہ کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ "ارباب ظاہر اور اصحاب نحو محض ان باتوں کو کیا جانیں"۔

اس علم باطن کے ثبوت میں صاحب تحریر بزرگ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کے اقوال کے اجمالاً حوالے دیئے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے کس قول کی طرف موصوف نے اشارہ فرمایا ہے، اس کے اصل الفاظ کیا ہیں اور سند کے اعتبار سے اس کا حال کیا ہے؟ البتہ حضرت ابوہریرہؓ کے جس قول کا موصوف نے حوالہ دیا ہے

ت کہہ سکتا ہوں کہ اس کا مطلب انھوں نے بالکل ہی غلط سمجھا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے یہ جو
ا کہ "میں نے رسول اللہ صلعم سے علم کے دو ظرف محفوظ کئے تھے، ایک میں نے لوگوں کے
بان پھیلا دیا اور دوسرا اگر پھیلاؤں تو میری گردن اڑا دی جائے گی" اس سے ہرگز ان کی مراد
ب تصوف کا علم باطن نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں اسلامی امراء
م کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں یا جن میں بنو امیہ کے دور کے فتنوں اور ان کے "ملک
ض" کی بابت حضورؐ نے پیشین گوئیاں فرمائی تھیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے بنو امیہ کا دور اور مروان
مراسے مروان کا جور دیکھا ہے۔ ان کی وفات غالباً ۵۸ھ یا ۵۹ھ ہجری میں ہوئی ہے جبکہ
مان بنو امیہ کے سیاسی شکنجہ میں کسے جا چکے تھے۔ اور بنو امیہ تلوار کے زور سے ان تمام اہل
کے دبا دینے کے درپے تھے جو ان کے استبداد کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔ انہی مستبدین
طرف حضرت ابوہریرہؓ نے اشارہ فرمایا ہے کہ اگر میں روزہ نماز کی حدیثوں کے سوا ان حدیثوں
ں سناؤں جو نبی صلعم نے موجودہ حالات کی بابت فرمائی ہیں تو میری گردن اڑا دی جائے گی۔
اگر ان کے ذخیرۂ علم میں اس طرح کی باتیں ہوتیں جیسی ہمارے اربابِ تصوف علم باطن کے
سے پیش کرتے ہیں تو اس کے اظہار پر اگر کوئی خطرہ ہو سکتا تھا تو حضرت عمرؓ کے دور میں ہو سکتا
بنو امیہ کے دور میں ان چیزوں سے تعرض کرنے والا کون تھا؟ وہ تو ان صوفیانہ نکتوں کی
زیادہ حوصلہ افزائی کرتے تاکہ مسلمان یہ افیون کھا کر سو رہیں اور انھیں پورے استبداد کے
ز حکومت کرنے کا موقع ملے۔ چنانچہ ان کے دورِ حکومت میں ہر قسم کے جور و استبداد کی
یں ملتی ہیں لیکن اس بات کی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ انھوں نے کسی بزرگ سے ان کے
صوفیانہ نکتہ پر کبھی تعرض کیا ہو۔

تنقید کی بے اعتدالی کے ثبوت میں صاحبِ تحریر بزرگ نے مولانا مودودی کے ایک
ین "مسلکِ اعتدال" کے بعض حصوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ صحابہ
حضرات نے ایک دوسرے کے خلاف جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان کی تشہیر کرکے

مودودی صاحب نے ان لوگوں کو شہ دی ہے جو پہلے ہی سے صحابہ و محدثین کی تحقیر کے درپے تھے

مودودی صاحب نے یہ ساری باتیں اپنے جی سے نہیں گھڑی ہیں بلکہ سیر و رجال اور دین کی معتبر کتابوں سے ہی لی ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب العلم میں اس طرح کی بہت سی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ محدثین ان معاملات میں اتنے نازک مزاج نہیں تھے جتنے ہمارے صاحب تحریر بزرگ ہیں، ورنہ جرح و تعدیل کا وہ فن وجود ہی میں نہ آتا جس پر مسلمان ناز کرتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ مودودی صاحب نے ان باتوں کا ذکر کس لئے کیا ہے؟ صحابہ اور محدثین کی تضحیک کے لئے یا جرح و تعدیل کے صحیح نقطۂ اعتدال کو نمایاں کرنے کے لئے؟ تو اس کا اندازہ ہر شخص مضمون کا مطالعہ کر کے خود کر سکتا ہے۔ یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ اگر مودودی صاحب اپنے مضمون میں ان باتوں کا ذکر نہ کرتے تو یہ ساری باتیں راز بنی پڑی رہتیں۔ کوئی ان کا جاننے والا دنیا میں نہ تھا۔ حالانکہ صاحب تحریر بزرگ ممکن ہے ان باتوں سے بے خبر رہے ہوں، لیکن اس زمانے میں یہ ساری باتیں اکثر پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں اور منکرینِ حدیث انہی باتوں کو اچھال اچھال کر اُن کو یہ ثابت کرنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں کہ پورے ذخیرۂ حدیث ہی کو دریا برد کر دینا چاہیے۔ ان حالات میں شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے کی پالیسی محض ایک احمقانہ پالیسی ہے۔ صحیح طریقہ اب صرف یہ ہے کہ اس طرح کی باتوں کے صحیح موقع و محل کو واضح کر دیا جائے اور ان سے نقدِ حدیث اور جرح و تعدیل کے سلسلے میں جو ٹھیک نتائج نکلتے ہیں ان کو سامنے رکھ دیا جائے تاکہ اگر کوئی شخص ان باتوں پر سے گزرے تو کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ علاوہ ازیں ہمیں اپنے بزرگ اسلاف کو معصوم فرشتے بنا کے بھی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بشری کمزوریوں کو رکھتے ہوئے جتنے کچھ ہیں دنیا کے سامنے ان کو اسی شکل میں پیش ہونا چاہیے۔ ان کی یہ شکل بھی اتنی خوبصورت ہے کہ دنیا کو موہ لینے کے لئے کافی ہے۔ البتہ اگر ہم نے لوگوں کو انھیں بناوٹی شکل میں دیکھنے کا عادی بنا دیا تو اس سے اندیشہ ہے کہ جب کبھی تاریخ و سیر اور رجال کی کتابوں میں ان کے متعلق کچھ ناگوار باتیں لوگوں کی نگاہ سے

یں گی، بہت سے لوگوں کے ایمان تک متزلزل ہو جائیں گے۔ آخر حضرت عثمان اور حضرت
کے زمانے کی تاریخ اور بعد کے فتنوں کے حالات آپ کہاں لے جا کر دفن کریں گے کہ کسی
ان پر نظر نہ پڑنے پائے؟

مودودی صاحب سے صاحب تحریر بزرگ کو یہ بھی شکایت ہے کہ انھوں نے امام
لی کو حدیث میں کمزور ٹھیرایا ہے اور امام مہدی کی علامات کے سلسلہ میں جو احادیث وارد
ان کا انکار کیا ہے۔

میں صاحبِ تحریر بزرگ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں جرموں میں سے کسی جرم
بھی مودودی صاحب منفرد نہیں ہیں۔ ناقدینِ حدیث نے خود ہی ان دونوں جرموں میں
کر کے دوسروں کے لئے راہ کھول دی ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں بکثرت کمزور
یثیں نقل کی ہیں جن کی ناقدینِ حدیث نے نشان دہی کی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو
صاحب نے عام صوفیہ کے طریقے پر پند و موعظت کے سلسلے کی حدیثوں میں محدثانہ چھان
کو ضروری ہی نہ خیال کیا ہو یا یہ بات ہو کہ فلسفۂ و تصوف کی دلچسپیوں نے ان کو حدیث کی
ن و تنقید کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ دیا ہو۔ بہرحال احیاء العلوم میں بکثرت کمزور حدیثیں
د ہیں اور اس معاملے میں ذوق کا سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ نقدِ حدیث کے لگے بندھے اصول
اگر صاحبِ تحریر بزرگ ان اصولوں سے واقف ہیں تو خود بھی وہ احیا کی حدیثوں کو تول کے
سکتے ہیں کہ وہ محدثانہ اصولوں پر پوری اترتی ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد اگر امام صاحب
ساتھ ان کے اندر حدیث کی حفاظت و صیانت کے لئے بھی کوئی حمیت ہوگی تو وہ بھی
کہیں گے جو مودودی صاحب نے کہا ہے۔ فن کے معاملے میں ذوق اور تکلفانہ احترام کوئی
یں ہے۔ ناقدینِ حدیث اس معاملے میں کسی کو بھی نہیں بخشتے۔

مہدی کی علامات سے متعلق جو روایتیں وارد ہیں ان کے درجے اور ان کی نوعیت سے

بحثوں پر مشتمل ہیں۔ اس نے تمام روایات کی حیثیت کو واضح کر دیا ہے۔ علامات مہدی میں سے جن جن کو مودودی صاحب نے ناقابلِ اعتبار ٹھیرایا ہے ان میں سے ہر ایک کے ناقابلِ اعتبار ہونے کی دلیل بھی بیان کر دی ہے۔ آپ ان پر شور مچانے کے بجائے ان دلائل پر تنقید فرمائیں۔

(۶) چھٹا الزام یہ ہے کہ مولانا مودودی کو جماعت اسلامی کے لوگ مجدد سمجھنے لگے ہیں۔ غنیمت ہے کہ صاحبِ تحریر بزرگ نے صرف مجدد سمجھے جانے ہی کا الزام لگایا ہے۔ ورنہ الزام تو بعض حلقوں سے دعوائے مہدویت بلکہ نبوت تک کے لگائے جا چکے ہیں۔

اس معاملے میں لوگ عجیب افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ اگر معاملہ اپنے حلقے کے کسی عالم یا شیخ طریقت کا ہو تو اس کو بے تکلف مجدد شریعت و طریقت بنا کے رکھ دیں گے، لیکن اگر معاملہ اپنے حلقۂ خاص سے باہر کے کسی شخص کا ہو تو اس کا کوئی قدردان جتنے ہی ہلکے الفاظ میں اس کی دینی خدمات کی تحسین کرے، ان حضرات کے دل پر اس کی سخت چوٹ پڑتی ہے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی گنجائشیں نکالنے لگتے ہیں کہ اس پر اور اس کے قدردانوں پر کوئی الزام چسپاں کیا جا سکے، تاکہ اور کچھ نہیں تو بدنام ہی کر کے دل ٹھنڈا کر لیا جائے۔ کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ یہ حضرات دین اور دینی معاملات کو اپنا اجارہ سمجھتے ہیں اور یہاں کسی اور کا چراغ جلتے دیکھنا ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہے؟

تجدید اور مجدد کے معاملے میں میرا نقطۂ نگاہ اوروں کے نقطۂ نگاہ سے بالکل مختلف ہے۔

اس امت میں چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، نبوت کا منصب آنحضرت صلعم پر ختم ہو چکا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے اندر شریعت کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دینے کے واسطے دو خاص انتظام فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن مجید کو ہر قسم کی تحریفوں سے ہمیشہ کے لئے مامون کر دیا۔ اگلی امتوں کے صحیفوں میں جس طرح کی تحریفات واقع ہو گئیں اور جس کے سبب سے وہ نئے نبیوں کی بعثت کی محتاج ہوئیں وہ بات اس امت کو نہیں پیش آئے گی۔ دوسرا یہ کہ اس امت میں ایسا فساد کبھی نہیں واقع ہو گا کہ

حق کی حامل کوئی جماعت سرے سے باقی ہی نہ رہ جائے۔ اس حقیقت کی طرف قرآن مجید
اشارات موجود ہیں اور آنحضرت صلعم نے بھی نہایت واضح الفاظ میں اس کا ذکر فرمایا ہے
روایت میں آیا ہے کہ اسلام غربت (اجنبیت اور بیکسی) کی حالت میں شروع ہوا اور
اس پر لوٹ آئے گی، مبارک ہیں وہ جو اجنبی سمجھے جائیں کیونکہ وہ لوگوں کی پیدا کی ہوئی
یوں کی اصلاح کریں گے۔ ایک دوسری روایت میں یہ مضمون ہے کہ میری امت کا ایک گروہ
حق پر قائم رہے گا اور حق کے مخالفین اس کو اقامت حق کے کام سے روک نہ سکیں گے
قال) اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ جب اس امت میں اس طرح فساد سرایت
جائے گا جس طرح اس شخص کے جسم میں زہر سرایت کر جاتا ہے جس کو باؤلے کتے نے کاٹ
ہو تب بھی اللہ تعالیٰ اس امت کے ایک عضو کو فساد سے محفوظ رکھے گا۔

یہ تمام حدیثیں اس بات پر شاہد ہیں کہ اس امت کے اندر صالحین و مصلحین اور دین حق پر
رہنے والوں اور لوگوں کے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کرنے والوں کا ایک گروہ ہمیشہ
رہے گا۔ مجددین اور مصلحین کا یہی گروہ ہے جس کا ذکر "من یجدد لھا دینھا" والی حدیث
یا ہے لیکن چونکہ اس حدیث میں "مائۃ" کا لفظ آیا ہے جو دور اور صدی دونوں معنوں کے لئے
ہے، نیز "من" کا لفظ آیا ہے جو واحد اور جمع دونوں کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اس لئے
لوگوں کو اس کا مطلب سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی۔ اکثر لوگوں نے "مائۃ" کو صدی کے معنی میں
"من" کو واحد کے مفہوم میں لیا اور یہ سمجھے کہ ہر صدی میں اللہ تعالیٰ کسی خاص شخص کو بھیجتا ہے
صدی کا مجدد بن کر آتا ہے۔ حالانکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ
لوگوں کو اٹھاتا رہتا ہے جو اس دور میں خدا کے دین کو تازہ کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ حقیقت
دوسرے الفاظ میں اعادہ ہے جو اوپر کی حدیثوں میں گزر چکا ہے۔ نہ اس سے کچھ
ہے اور نہ اس مضمون پر ایک حرف کا اضافہ ہے۔ لیکن لوگ "مائۃ" اور "من" دونوں کا
مفہوم سمجھنے میں غلطی کر جانے کی وجہ سے خواہ مخواہ کے تکلفات میں پڑ گئے۔ قطع نظر اس کے کہ

مطلب نے بہت سے کمزور نفوس کے اندر وسوسہ اندازی کی اور وہ مجددیت کے خواب
لگے، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ لوگوں نے ہر صدی کے آغاز و اختتام پر ایک
کی تلاش شروع کردی۔ اور اگر کوئی اہل آدمی نہ مل سکا تو اس حدیث کو صحیح ثابت کرنے
نے کسی نااہل ہی کو اس مسند پر لا بٹھایا کہ بہرحال جگہ خالی نہیں رہنی چاہیے۔[1]
میرے نزدیک مجدد والی حدیث کا مفہوم وہی ہے جو دوسری حدیثوں میں بیان
ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہر دور میں مصلحین و مجددین کی ایک جماعت کو برپا رکھے گا
للہ کے دین پر خود بھی قائم رہے گی اور دوسروں کو بھی قائم رکھنے کی کوشش
تی رہے گی۔ اس جماعت کی خاص پہچان یہ ہو گی کہ رسول اور صحابہ کے
طریق پر گامزن رہے گی اور اقلیت میں ہونے کے باوجود باطل سے کشمکش
تی رہے گی۔
جہاں تک اس مسئلے کی اصولی حیثیت کا تعلق ہے اس کے بارے میں
ا نقطۂ نگاہ یہ ہے۔ باقی رہا خاص مودودی صاحب کا معاملہ تو میں
اس سے اونچا سمجھتا ہوں کہ وہ اس قسم کے کسی وسوسے میں مبتلا ہوں۔
ایک دانشمند اور خدا ترس آدمی ہیں اور راہِ حق کی آزمائشوں اور
بتوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مجھے امید نہیں ہے کہ وہ خدا کے ہاں پہنچ

---

[1] بعینہ یہی بات مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے۔ ان سے پوچھا گیا ہر صدی میں
کا مبعوث ہونا ثابت ہے، اس صدی کا مجدد کون ہے؟ جواب میں فرمایا "ہر وقت میں جو علماء
ع بدعت اور محی سنت ہوں اُن کا مجموعہ مراد ہے۔ جو شخص بایں طرح ہو اُس مجموعے کا ایک
کرنا چاہیے۔ اور جن لوگوں نے ایک کو قرار دیا ہے اُن کو سخت مصیبت پیش آئی۔ ہر چند تاویلات کی
درست نہیں ہوا" (فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم۔ ص ۵۲)

سے پہلے ہی اپنے مرتبے اور درجے کا فیصلہ کرنے کی جسارت کریں گے۔ جماعت کے
اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو ان کو مجدد خیال کرتے ہیں تو میں ان کو بھی یہ مشورہ دوں گا کہ وہ
فیصلے میں جلدی نہ کریں۔ جب تک ایک شخص زندہ ہے وہ فتنوں سے مامون نہیں ہے
کیا خبر جس شخص کو آپ آج اس صدی کا مجدد ثابت کرتے ہیں کل کو وہ کس کیمپ میں ہو اور
آپ کس کیمپ میں ہوں۔ پھر جو باتیں خدا کے فیصلہ کرنے کی ہیں آپ ان کا فیصلہ کرنے والے
کون؟ کسی شخص کے مجدد ہونے کے لیے تنہا یہی بات تو کافی نہیں ہے کہ اُس نے آپ کے
نقطۂ نظر سے تجدید و اصلاح کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا خلوص اور اس کی نیک
نیتی بھی تو مطلوب ہے جس کا فیصلہ بہرحال ہم اور آپ نہیں کر سکتے بلکہ خدائے علام الغیوب
ہی کر سکتا ہے۔

(۷) آخری الزام جو صاحب تحریر بزرگ نے مولانا مودودی اور ان کے رفقاء پر لگایا
ہے وہ فوٹو کھنچوانے کا ہے۔ یہ الزام بالکل ہی بے بنیاد ہے۔ جیل سے رہائی کے بعد مولانا

لے اُن کا اپنا بیان اس سلسلے میں یہ ہے جو اب سے کئی سال پہلے "ترجمان القرآن میں" شائع ہو چکا ہے:

"اس قسم کے شبہات کا اظہار کرنا کسی ایسے آدمی کا کام تو نہیں ہو سکتا جو خدا سے ڈرتا ہو، جسے
سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو، اور جس کو اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت بھی یاد ہو کہ اجتنبوا کثیرا
من الظن ان بعض الظن اثم۔ جو حضرات اس قسم کے شبہات کا اظہار کر کے بندگانِ خدا کو تحریک
اسلامی کی دعوتِ حق سے روکنے کی کوشش فرما رہے ہیں، میں نے ان کو ایک ایسی خطرناک سزا دینے کا فیصلہ
کر لیا ہے جس سے وہ کسی طرح رہائی حاصل نہ کر سکیں گے، اور وہ سزا یہ ہے کہ انشاء اللہ میں ہر قسم کے شبہ
سے اپنا دامن بچائے ہوئے اپنے خدا کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا اور پھر دیکھوں گا کہ یہ حضرات خدا کے
سامنے اپنے ان شبہات کی، اور ان کو بیان کر کر کے لوگوں کو حق سے روکنے کی کیا صفائی پیش کرتے ہیں۔"

(ترجمان القرآن، بابت ماہ رجب ۱۳۶۵ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۶ء)

ودودی کے ایک دو فوٹو بعض اخباروں میں ضرور چھپے ہیں لیکن ان کے کھنچے جانے یا ان کے
ائع ہونے میں مولانا کی مرضی یا ان کے علم کو کوئی دخل نہیں ہے۔ کھینچنے والوں نے کھینچا اور
ھاپنے والوں نے چھاپا۔ اس کے عذاب و ثواب کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ مولانا مودودی اخلاقی
تبار سے اتنے بودے نہیں ہیں کہ ایک طرف تو تصویر کھنچوانے اور اس کے شائع کرانے کی
رمت کا فتویٰ دیں دوسری طرف اپنے ساتھیوں کو لے کر فوٹو کھنچوانے کھڑے ہو جائیں۔
صاحب تحریر بزرگ سے گزارش ہے کہ وہ اپنے حلقے کے لوگوں کے بارے میں جس حسن ظن
سے کام لینے کے عادی ہیں اگر اس کے دسویں حصہ حسن ظن سے بھی اس معاملے میں کام لیتے
ر ایک مسلمان کے متعلق وہ اس بدگمانی میں نہ مبتلا ہوتے لیکن یہ عجیب دردانگیز صورت
حال ہے کہ جہاں معاملہ اپنے حلقے سے باہر والوں کا ہوتا ہے وہاں تو یہ حضرات مچھر کو
بھی چھاننے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر معاملہ اپنوں کا ہو تو اونٹ تک نگل جائیں گے۔

جواب تتمہ

صاحب تحریر بزرگ نے اپنے مضمون کے اس ٹکڑے کو "روحِ مضمون" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے
رے نزدیک بھی اس ٹکڑے کی حیثیت فی الواقع یہی ہے۔ ان کے طول طویل مضمون سے بھی ان کا
ن اتنی خوبی کے ساتھ ہمارے سامنے بے نقاب نہیں ہو سکا تھا جتنی خوبی کے ساتھ ان کی ان
د سطروں میں وہ بے نقاب ہو گیا ہے۔ وہ ان سطروں میں اپنا باطن ہی بے نقاب کرنے پر مجبور
نہیں ہو گئے ہیں بلکہ انھوں نے ہماری دعوت کا وہ باب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا
جو اتنے نمایاں طور پر ہمارے سامنے یا تو آیا ہی نہیں تھا یا آیا تھا تو ہم نے اس کو سمجھنے
کی کوشش نہیں کی تھی۔

مولانا صاحب نے اپنے مخصوص عالمانہ انداز بیان میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ
ہے کہ جو لوگ مقبولِ خدا ہوتے ہیں ان کی مقبولیت کا آغاز خواص سے ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ

پہلے عوام کالانعام میں مقبول ہوں اور اس کے بعد خواص ان کی طرف متوجہ ہوں۔ اس اصول
تم کر لینے کے بعد وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مودودی صاحب کوئی مقبولِ خدا آدمی ہرگز نہیں ہو سکتے
وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اقامتِ دین کے نام سے جو دعوت شروع کر رکھی ہے اس میں
ان لوگوں نے ان کا ساتھ دیا ہے "جو کل تک یا رائے سے بے کورے تھے یا دین میں کورے
فکر سے عاری تھے یا تقویٰ و تورع سے فارغ، ختمِ نبوت میں مذبذب تھے یا خاکسار یت
لمبر دار، نیچریت سے مسموم تھے یا الحاد کے شکار۔ وہی متوجہ ہو رہے ہیں۔ اہلِ علم و تقویٰ گویا
ناس ہی نہیں۔ یا مدارسِ عربیہ کے چند نئے نئے فارغ شدہ جو زمانہ تحصیل میں بھی بخاری بدقسمتی
ہونزم بکف[1] تھے۔"

مولانا صاحب کی یہ سطریں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو کس طرح دہراتی ہے
دعوتِ دین کا ہر دور ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ واقع ہوا ہے!

جو طعنے آج مولانا صاحب جماعت اسلامی کے خادموں کو سنا رہے ہیں بعینہٖ یہی طعنے کم و
انھی الفاظ میں اُن لوگوں کو سنائے گئے تھے جنھوں نے اگلے زمانوں میں نبیوں اور رسولوں کا
دیا تھا۔ اور یہ طعنے دینے والے اپنی نسبت بعینہٖ وہی رائے بھی رکھتے تھے جو مولانا صاحب
نسبت اور اپنے زمرے کے دوسرے بزرگوں کی نسبت رکھتے ہیں۔ حضرت نوحؑ، حضرت
اور حضرت شعیب علیہم السلام کے زمانوں میں جن لوگوں نے دعوتِ حق کا ساتھ دیا ان کو
کے زمانے کے "اکابر" کی زبان سے یہ طعنہ سننا پڑا کہ یہ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ حقیر اور "رائے
کورے ہیں۔" حضرت مسیح علیہ السلام نے جب دعوتِ حق بلند کی تو وہ تمام علمائے یہود جو
علم، فکر و اخلاص، تجرد و تدین، رائے اور یمین کے اعتبار سے "عظیم القدر" ہونے کے مدعی تھے
بالکل غیر متوجہ رہے اور جن چند غریبوں نے ان کا ساتھ دیا ان کو ان "اہلِ علم و تقویٰ" حضرات
فقہا یعنی جاہل اور علم و فکر سے عاری قرار دیا اس لئے کہ وہ غربتِ مشیخت کی گدیوں اور
و افتا کی مسندوں سے ناآشنا دریا کے کنارے کے ماہی گیر تھے۔ اسی طرح ان غریبوں کو

فوقی اور تورات سے فارغ" بھی قرار دیا گیا اس لیے کہ علما حضرات کو ان سے یہ شکایت تھی کہ یہ
کبھی کبھی ہاتھ دھوئے بغیر ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔ انھی بزرگوں کے جواب میں حضرت مسیح علیہ السلام
نے یہ فرمایا تھا کہ "کتنے ہیں جو آگے تھے وہ پیچھے ہو جائیں گے اور کتنے ہیں جو پیچھے تھے وہ آگے ہو جائیں گے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوتِ حق بلند کی تو مکہ اور طائف کے تمام اکابر جو صاحب
الرائے سمجھے جاتے تھے اور قریش کے تمام صنادید جو بیت اللہ کی مختلف گدیاں سنبھالے ہوئے تھے
بالکل "غیر متوجہ رہے" اور صاف الفاظ میں انھوں نے کہا کہ کچھ سر پھرے چھوکروں اور کچھ
غلاموں نے یہ سارا ہنگامہ اٹھا رکھا ہے، بزرگوں میں سے کوئی اس فتنے میں شریک نہیں ہے
یہود کے علماء نے بھی آگے بڑھ کر انھی لوگوں کی تائید کی اور کہا کہ یہ کچھ سفہا یعنی "فکر و رائے سے
عاری" لوگ ہیں جو محمد کا ساتھ دے رہے ہیں۔

اگرچہ ہمارے حقیر کام کو انبیاء علیہم السلام کے عظیم کام سے وہی نسبت ہے جو ذرے کو آفتاب
سے ہوتی ہے، اور ہماری شخصیتوں کا تو ان سے کوئی مقابلہ ہی نہیں، لیکن دونوں کے مخالفین کے
لب و لہجے کی اس یکسانی اور ان کی ذہنیت کی اس مشابہت کو دیکھ کر کبھی کبھی دل میں یہ
خیال گزرتا ہے کہ ع گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ۔

اصل یہ ہے کہ آدمی جب تک حق کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسولوں کے طریقے سے پہچاننے کے بجائے
اشخاص و افراد کے ذریعے سے پہچاننے کی کوشش کرے گا اس پر حق کی راہ کبھی کھل ہی نہیں سکتی۔ اس ذہنیت
کے لوگ اپنے آگے چلنے والوں کے پیچھے چلتے ہیں اور اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح وہ
کسی کے پیچھے آنکھ بند کر کے لگ گئے ہیں اسی طرح حق بھی دست بستہ ان کے پیچھے پیچھے لگ گیا ہے
اور ممکن نہیں ہے کہ ان کی پیروی کے سوا حق کو پانے کا کوئی اور ذریعہ مل سکے۔ اسی ذہنیت کے لوگوں
نے مسیحؑ کے زمانے میں علمائے یہود کا ساتھ دیا اس لیے کہ بہرحال "خواص" کی حیثیت یروشلم کے
ان پشتینی دینداروں ہی کو حاصل تھی نہ کہ دریا کے کنارے کے ان ماہی گیروں کو جنھوں نے مسیح
کا ساتھ دیا تھا۔ اسی طرح اس زمرے کے لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مکہ کے

تمہا تھ دیا اور مسلمانوں کے نقش ان کو زیادہ راست رو (اصلاحی) قرار دیا اس لئے کہ وقت کے خواص
بالیٔے وہی تھے نہ کہ صہیب و سلمان جو وقت کے اکابر کی نگاہوں میں اراذل نا بادی الرائے کی حیثیت
ہم اس ذہنیت کے لوگوں سے ہمیشہ مایوس رہے ہیں۔ ہم نے اپنی دعوت میں کبھی ان کو پیش نظر نہیں
اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ لوگ دماغ سے دماغ حق کو کبھی قبول نہیں کر سکتے اگر وہ ان کے پاس ان کے
واسطے سے نہ آئے اور غلط سے غلط بات کو بھی اختیار کر لیں گے اگر ان کے اکابر اس کی علمبرداری پکم لو کہ
ردیں گے اس لئے ہم نے اپنا تخاطب براہِ راست اُنہی سے رکھا ہے جو موجودہ سوسائٹی کی قیادت
ہیں۔ عام اس سے کہ ان کا تعلق علماء کے طبقے سے ہو یا اہلِ سیاست کے طبقے سے۔
انا صاحب نے حدیث کا یہ مطلب تو بالکل ٹھیک سمجھا ہے کہ کسی دعوتِ حق کو سب سے پہلے آگے بڑھ کر قبول
لے ہمیشہ "خواص" ہی ہوتے ہیں لیکن ان خواص کی پہچان کیا ہے؟ کیا یہ کہ وہ رسمی دینداری کی موروثی
کے وارث ہوتے ہیں؟ کیا یہ کہ وہ درس و افتا کی مسندوں پر سرفراز ہوتے ہیں؟ کیا یہ کہ وہ لمبی لمبی
پہنتے ہیں اور ربی اور عالم کہلانا پسند کرتے ہیں؟ کیا یہ کہ جب وہ بازاروں میں نکلتے ہیں تو لوگ ان کے
ہاتھ چومتے ہیں؟ یقیناً مولانا تسلیم کریں گے کہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کو
ہکے "خواص" میں سے ہونے کی دلیل قرار دیا جاسکے پھر غور کرنا چاہیے کہ خواص کی پہچان ہے کیا؟ حق
لینے والے خواص کے اوصاف جہاں تک قرآن و حدیث سے میں سمجھ سکا ہوں، میں نے اپنی کتاب
ین اور اس کا طریقِ کار" میں تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا اس کتاب کا وہ
نزور ملاحظہ فرمائیں جو دعوتِ حق کے موافقین اور مخالفین سے متعلق ہے تا کہ وہ اچھی طرح سمجھ سکیں کہ
ی کیا شناخت ہے جو کسی دعوتِ حق کو قبول کیا کرتے ہیں۔
ا تفصیل کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن میں حق کو قبول کرنے والے خواص کے چند اوصاف کا اجمالاً
کا جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔
ہلی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے گروہی تعصبات اور آبائی تقلیدات سے بالکل آزاد ہوتے ہیں۔
[illegible] صفت یہ ہے کہ وہ اندھی تقلید کی بیماری سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کے

[illegible] ہوئے خود اپنی آنکھیں بھی کھلی رکھتے ہیں۔

— وہ حق کی کسوٹی صرف اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو مانتے ہیں۔ اشخاص کو حق و باطل کا معیار نہیں بناتے۔

— اخلاقی اعتبار سے اپنی سوسائٹی میں نمایاں ہوتے ہیں۔ پست ہمت، ضمیر فروش اور خود غرض نہیں ہوتے اور نہ باطل کا مقابلہ کرنے میں بزدل ہوتے ہیں۔

— وقت کے نظام باطل سے ان کی وابستگی اگر ہوتی بھی ہے تو خود غرضانہ نہیں ہوتی۔

— وہ غرور اور گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوتے کہ اپنی ذات اور اپنے حلقے سے باہر نہ کسی خیر کا تصور کر سکیں اور نہ کسی کی رہنمائی قبول کر سکیں۔

یہ علامات ہیں جو قرآن مجید میں ان لوگوں کی بیان کی گئی ہیں جو حق کو قبول کیا کرتے ہیں اور جن کو قرآن حق کے "خواص" میں سے شمار کرتا ہے۔ مولانا صاحب اگر ان کسوٹیوں پر جماعت اسلامی کے ارکان کو جانچیں گے تو مجھے امید ہے کہ وہ ان کو انشاء اللہ موجودہ سوسائٹی کا مکھن ہی پائیں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان کے اندر ہر گروہ اور ہر طبقے کے افراد شامل ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو انگریزی درس گاہوں کی قتل گاہوں سے بچ کے آئے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو عربی مدرسوں کے قبرستانوں سے نکل کے آئے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو وقت کی مختلف تحریکوں سے متاثر رہے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو مذہبی گروہوں دا[illegible] حلقوں سے کسی نہ کسی نوعیت سے وابستہ رہے ہیں ——— ہر طرح کے لوگ اس جماعت میں آ آ کے شامل ہوئے ہیں لیکن ان میں سے ہر شخص اپنے اندر وہ خوبیاں ضرور رکھتا رہا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں اور وہی خوبیاں تھیں جو اس کو اس دعوت کی طرف کھینچ کے لائیں جو اقامت دین کے لیے اس کے سامنے بلند کی گئی۔ آپ حضرات اگر ان کو سُفہاء اور اراذلنا بادی الرائے کہتے ہیں تو شوق سے کہیں۔ ہم اس کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو، دونوں کو حق پر چلنے والا بنائے اور کبر و غرور کی آفتوں سے محفوظ رکھے۔

———+———

ہماری اخلاقی صحت کا حال

اور

دعوتِ اصلاح

(نعیم صدیقی)

قرآن نے حیاتِ اجتماعی کے عروج وزوال کا جو فلسفہ ہمیں سکھایا ہے وہ مادّہ پرستانہ نظریوں
خلاف ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ایک قوم کی سرگرمی، جدوجہد، ترقی اور نشوونما ساری کی ساری
اس کی اخلاقی صحت پر منحصر ہے۔ جب یہ اخلاقی صحت برباد ہو جاتی ہے تو جمود اور زوال کا دور
ہے، اور اخلاقی پستی جب انتہا کو پہنچتی ہے تو ایک قوم بالکل ختم ہو کے رہ جاتی ہے۔ ایک اصول
کی شعوری محبت، ایک پاکیزہ نصب العین کی لگن، احساسِ ذمہ داری، نظم وضبط، دیانت و
ت بازی، مساوات واخوت، توازن وعدل، وحدت وتعاون وغیرہ کی بیش قیمت اخلاقی
یں کسی انسانی گروہ میں جتنی زیادہ فروغ پاتی ہیں اس کی سرگرمی جدوجہد، اس کی رفتار پیدائش
ت، اس کی دفاعی قوت کی ترقی اتنی ہی روز افزوں ہوتی ہے، اور دوسری طرف یہ قدریں
کمزور اور مضمحل ہوتی ہیں معاشی اور دفاعی قوت بھی اتنی ہی کمزور ہوتی چلی جاتی ہے، علم،
یب، معاش، دفاع اور بین الاقوامی اثر، پانچوں شعبوں میں حیاتِ اجتماعی کی بیش قدمی کا
انحصار اخلاقی قدروں کی مضبوطی پر ہے۔ جس قوم کے اخلاق کو گھن لگ رہا ہو اسے چاہے کتنے
دماغی اور عبقری فراہم کر دیجیے، اس کے خزانوں میں چاہے کتنا ہی سونا چاندی بھر دیجیے، اس کے
کیسے ہی شاندار میزانیے بنائیے اور منصوبہ بندیاں کیجیے، اس کے لیے کیسے ہی اعلیٰ درجے کے مشینی
خرید لیجیے، وہ کبھی بھی زندگی کی دوڑ میں آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ایک اخلاق باختہ قوم کا حال بالکل ایک
ندہ مریض کا سا ہوتا ہے کہ آپ اسے زرق برق لباس پہنا کر، اس کے بدن پر چمکیلے ہتھیار سجا کر

اس کی قوت وعظمت کا پروپگنڈا کر کے اس کو کسی طرح ایک صحت مند شخص کے برابر نہیں کر سکتے۔ اخلاقی انحطاط اگر اپنا کام کر رہا ہو تو قومی زندگی کے ظاہری پہلو چاہے کتنے ہی شاندار بنا دیے جائیں حقیقی قوت کبھی ہاتھ نہیں آسکتی۔

ہم ایک ایسی قوم ہیں جو ایک طویل دورِ زوال اور پھر ایک روح فرسا زمانۂ غلامی سے گزر کر اپنے موجودہ مقام تک پہنچی ہے۔ تباہیوں اور خستہ حالیوں کی پیچ در پیچ منازل سے گزرتے ہوئے اس قوم نے اپنے اصول، اپنے مقاصد اور اپنی اخلاقی قدریں ضائع کر دی ہیں۔ یہ اپنے موقف سے اکھڑ چکی ہے، اس کا شیرازہ جس ڈور سے باندھا گیا تھا وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ چکی ہے، اور اس کے قلعہ کی اینٹوں کی درزوں میں سے جوڑ لگانے والا مسالہ نکل چکا ہے۔

حقائق سے چشم پوشی ہم جس اخلاقی زوال سے دوچار ہیں اسے اپنی اور دوسروں کی نگاہوں سے چھپانے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں ہم نے اختیار کر رکھی ہیں۔ ہم مریض ہیں لیکن اپنے مرض کا علاج کرنے کے بجائے ہم نے مرض کے اخفا کے مختلف طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔ ہم اپنے اخلاقی زخموں پر ریشمی پردے ڈالے ہوئے ہیں، ہم نے اپنی سیرت کے برص کے داغوں کو برسوں سے ڈھانک رکھا ہے، ہم نے اپنے کیرکٹر کے رستے ہوئے ناسوروں پر نمائش کی پٹیاں باندھ رکھی ہیں۔ ہم اپنی آہوں کو تبسم میں بدل لینے کے فن میں پختہ مشق ہو چکے ہیں۔ ہم اپنی کراہوں کو نعرہ ہائے تکبیر میں بدلنے کا آرٹ خوب اچھی طرح سیکھ چکے ہیں۔ ہمیں اگر کسی طرف سے اپنے مہلک امراض کا احساس ہونے لگتا ہے تو ایسے موقعوں پر ہم خوش خیالیوں کی افیون گھول کر پی لیتے ہیں اور پھر دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر سمجھتے ہیں کہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔

عام حالات میں ہماری اخلاقی زندگی کی حالتِ مرض اتنی زیادہ نمایاں نہیں ہوتی کہ ایک عامی کی نگاہ بھی اسے محسوس کر لے، بلکہ بسا اوقات بڑے بڑے نبّاض دھوکے میں پڑے رہتے ہیں۔ مرض کے جراثیم ہمارے اجتماعی جسم کے رگ و پے میں مستقل چھاؤنیاں ڈالے پڑے [illegible]
قوت کو کھوکھلا کر رہے [illegible]

[illegible]

ے جماتے بیٹھی ہے، کون نہیں جانتا کہ رشوت کی جونکیں ہمارے ایک ایک ریشے سے خون چوسنے
مصروف ہیں، کسے نہیں معلوم کہ ضمیر فروشی نے ہر کوچہ و بازار میں نیلام گھر کھول رکھے ہیں، کس کی
ہوں پر یہ واضح نہیں کہ جاہ طلبی آکاس بیل بنی ہوئی ہمارے شجرِ ملت پر مسلط ہے؟ ـــــــ یہ
ب کچھ ہمارے سامنے ہے، لیکن ہم اس کا عام حالات میں کوئی احساس نہیں کرتے، بلکہ ان حالات
بالکل معمولی اور فطری سمجھتے ہیں، اور ان کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ انھیں دیکھ کر کبھی کوئی اضطراب
ا ہوتا۔ پوری قوم جن جونکوں کو اپنا خون پلاتی ہے اور دق کے جن جراثیم کو اپنے پھیپھڑوں کا گوشت
اپنی ہڈیوں کا گودا کھلاتی ہے اور جن سانپوں اور ناگنوں کو اپنی چھاتیوں کا دودھ پلا پلا کر آستین میں
ا ہے، ان کی ساری کرم فرمائیوں کے باوجود ان کی نیازمندی بھی کرتی ہے۔ یوں اخلاقی مفاسد ہماری
گی کا لازمہ بن کر چلتے ہیں اور برابر انڈے بچے دیتے چلے جاتے ہیں، ہمیں اس پر کوئی اضطراب نہیں ہوتا۔

[آزما]ئشی مراحل

ہاں مگر جب کبھی قوم کسی غیر معمولی صورتِ حالات کا سامنا کرتی ہے اور کسی اہم مرحلے سے گزر رہی ہوتی ہے تو اس کی اخلاقی کمزوریاں بالکل کھل کر سامنے آجاتی ہیں اور
[اس]ی کے لئے ممکن نہیں رہتا کہ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھ سکے۔ حوادث کا بے رحم ہاتھ جب ہما[ری زندگی]
کے سارے خوشنما پردے الٹ کر ہمارے باطن کو بالکل عریاں کر دیتا ہے اور ایک ایک لرزہ
بالکل آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے تو کم سے کم ایک لمحے کے لئے ضرور ہمیں یہ محسوس ہو جاتا ہے
[ہ]م کسی خوفناک مصیبت کا شکار ہو رہے ہیں۔

آزمائش

آج سے چار سال قبل جب دو قومی تصادم کی غیر معمولی صورتِ حالات پیش آئی تو اس نے ہماری اخلاقی صحت کی پوری حقیقت کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ ہندو مسلم فسادات نے
رتبہ خوب اچھی طرح اس حقیقت کو نمایاں کر دیا کہ اپنے اصول و اخلاق کے لحاظ سے خدا اور رسول اور
[آخرت] پر ایمان رکھنے والی قوم اپنی حریف قوم سے کسی درجے میں بھی برتر نہیں ہے۔ اس وقت مجاہدینِ
ملت کی پستیوں کو اجاگر کرنے والے کارنامے دیکھئے:

۱۔ جہاں کہیں مسلمان قلیل تعداد میں تھے اور انھوں نے مظالم کا طوفان اٹھتے دیکھا وہاں کٹ مرنے کا جذبہ پیدا ہونے کے بجائے زیادہ تر ہراس کی لہر تھی جو فضا میں پھیل گئی اور اس ہراس کی لہر نے رہی سہی قوت کو مضمحل کر دیا۔

۲۔ جہاں کہیں مسلمانوں نے غیر مسلم اقلیت کو اپنے سامنے بے بس پایا وہاں انھوں نے دوسرے علاقوں کے مظلوم مسلمانوں کا پوری بے دردی سے انتقام لیا، حالانکہ انتقام کی یہ صورت ایک مسلمان قوم کو زیب نہیں دیتی۔

۳۔ بوڑھوں اور بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے کی جو ذلیل کارروائی غیر مسلموں نے انجام دی، ٹھیک اسی کو مسلمانوں نے بھی اختیار کیا۔

۴۔ اغوا اور زنا اور عورتوں کو ننگا کرنے اور ان کے ساتھ ہر طرح کی بدسلوکی کرنے میں مسلمان بالکل غیر مسلموں کی سطح پر پائے گئے۔

۵۔ اس پورے "جہاد" میں امامت قوم کے غنڈوں اور اوباشوں کے ہاتھ میں رہی جن کے لئے ناممکن تھا کہ وہ کسی اخلاقی حد پر جا کر رک سکتے۔

۶۔ مسلمانوں کے اندر بعض ایسے "خادم" موجود پائے گئے جنھوں نے اسلحہ کے لئے چندے جمع کرکے کھائے اور وہ بھی کہ جنھوں نے قوم کو مصیبت میں گھرے ہوئے پا کر اسلحہ سے کھل کر نفع اندوزی کی۔

۷۔ قوم کے سامنے ایسے لیڈروں کو حالات نے بالکل نمایاں کر دیا جو اپنی جانیں ہی نہیں، اپنے مال بلکہ اپنے کتے تک لے کر بھاگ کھڑے ہوئے اور جن عوام کی وہ لیڈری کیا کرتے تھے ان کو عین سیاسی مرگھٹ کے اندر گھرا ہوا چھوڑ دیا۔

یہ موقع تھا کہ جو لوگ قوم کے خادم ہونے کے یا قوم کی قیادت کے دعویدار تھے یا جن کو قوم نے اقتدار کی کرسیوں پر بٹھا رکھا تھا، وہ اپنی اجتماعی زندگی کے انتہائی خطرناک اخلاقی پہلوؤں کا جائزہ لیتے اور اصلاحِ حال کے لئے طویل منصوبہ بندی کرکے پتہ ماری کا کام ہاتھ میں لیتے۔ لیکن ایسے خادم، ایسے لیڈر اور ایسے حکمران کہیں نہ تھے۔ یہ موقع آیا اور گزر گیا۔

دسری آزمائش پھر غیر مسلموں کے ترکِ وطن سے ایک اور آزمائشی گھڑی نمودار ہوئی۔ پنجاب [illegible] اور سرحد سے غیر مسلموں کے گروہ کے گروہ گھبراہٹ کی حالت میں نکل نکل کے [illegible]
ے پار چلے گئے اور اُن کے اموالِ متروکہ ہمارے قومی اخلاق کے لئے کسوٹی بن گئے۔ مالِ مفت کی
نگا جب بہہ رہی تھی تو ہماری قوم کے امیروں اور غریبوں، شریفوں اور رذیلوں، لکھے پڑھوں اور
پڑھوں میں سے ہر کوئی اس گنگا سے ہاتھ رنگنے کی مسابقت میں شریک تھا۔ بڑے بڑے پارسا
ی پارسائی کا جبہ اتار کر اس حمام میں ننگے ہوگئے۔ اس میکدے کے جب دروازے کھلے تو رند بچارے
رند تھے شہر کے قاضی و محتسب بھی اپنے اپنے جام تھامے موجود ہوئے۔ شاید ایک فی صدی، شاید
دو فی صدی یا شاید زیادہ سے زیادہ پانچ فیصدی افرادِ قوم ایسے ہوں گے کہ خوانِ یغما کی اس لوٹ
ے کوئی حصہ پائے بغیر رہ گئے ہوں۔ اموالِ متروکہ نے تو ہماری قوم کی اخلاقی صحت کو بالکل ناپ کر
تا دیا کہ یہاں کیا حال ہو چکا ہے۔

تیسری آزمائش پھر ایک تیسری آزمائش مہاجرین کی ایک کثیر تعداد کے وارد ہونے سے پیدا ہوئی۔ اس آزمائش نے ہمارے داخلی مفاسد کو اور زیادہ کھول کر رکھ دیا۔ اس موقع پر
ہمارے اجتماعی جسم کو روگ لگانے والے خطرناک جراثیم جو واقعات کے ذریعے بالکل نمایاں ہوگئے
یہ تھے:۔

۱۔ مہاجرین کے کیمپوں کا نظم و نسق چلانے والے کارکنوں نے ہر قسم کی بدعنوانیاں کیں۔ بعض لوگوں
نے مہاجرین کے لئے باہر سے آئی ہوئی امدادی اشیا میں سے اپنا حصہ اڑایا، مہاجرین کے بچوں اور
بیماروں کے لئے آنے والے دودھ میں سے "ٹیکس" وصول کیا اور پھر مظلوموں کی عزتِ نفس کو طرح
طرح سے کچلا گیا۔

۲۔ نوجوان بے فکروں کے غول کیمپوں میں جا کر کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے بسا اوقات
مہاجرین کی بہو بیٹیوں کو تاکتے پھرے ہیں۔

۳۔ بعض جماعتوں کے تحت جن رضاکاروں نے مہاجرین کی خدمت کا کام سنبھالا، انھوں نے

[illegible] ٹ کی بے تحاشا دوڑ دھوپ کی، بسکٹوں، [illegible] بیچنے [illegible]

بچ پیدا کرنے کا اہتمام کیا، دوا سخا لیکہ ان کے کیمپوں کے چاروں طرف نو وارد مہاجرین آ آکے مرتے

اور ان کی لاشوں کو اٹھانے تک کا انتظام نہ تھا۔

۴۔ مہاجرین کو مبتلائے مصیبت پا کر ہماری "قومی جونکوں" کی رگِ رشوت ستانی پھڑک اٹھی اور

ہوں نے املاک متروکہ پر اور کسی جگہ منتقل ہونے کے لئے ذریعۂ سفر مہیا کرنے پر خوب خوب نذرانے وصول

ئے، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مہاجرین کے بچوں کے جنازے پڑھنے، انھیں ضروری مقاصد کے

لئے عرضیاں لکھ کر دینے اور ان کو متعلقہ دفتر تک پہنچنے کا راستہ بتانے تک کا معاوضہ طلب کیا گیا۔

۵۔ خود مہاجرین نے مکان اور زمینیں حاصل کرنے کے لئے بری طرح مسابقت، باہمی حق ماری

اور چھچھورپن سے کام لیا، اپنی سابق مالی حالت کے متعلق کھلے کھلے جھوٹ بولے، اپنی جائدادوں اور

کاروبار کے متعلق صریح غلط بیانات دیے، اور پھر جو پہلے آ گیا وہ بہتر سے بہتر اور وسیع سے وسیع

عمارت پر قبضہ کر کے بعد میں آنے والے کا راستہ روک کر بیٹھ گیا۔

یہ واقعات بھی ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے سے بڑے پیمانے پر نمودار ہوئے، ہمیں وقتی

طور پر ان کا بہ شدت احساس ہوا، لیکن ہمارے احساس نے آنکھ جھپکنے کے بعد پھر موند لی اور خوابِ

خرگوش کی حالت پھر قائم ہو گئی۔

چوتھی آزمائش اس کے بعد پنجاب میں سیلاب کی آمد نے ایک مرتبہ پھر ہمیں بتایا کہ ہم کس پانی میں ہیں۔ سیلاب کی آمد پر جو کمزوریاں ابھر کے سامنے آئیں وہ یہ تھیں:-

۱۔ لاکھوں عوام جب سیلاب بلا کا شکار ہو رہے تھے تو لاہور شہر میں ایک ایسا سنگ دل طبقہ بھی

موجود تھا کہ مصیبت زدوں کی مدد کے لئے تو وقت اور مال صرف کرنے پر تیار نہ تھا، لیکن سیلاب کے

منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے اور لوگوں کی بربادی کا تماشا کرنے کے لئے بیوی بچوں تک کو

کاروں پر لاد کر گھما رہا تھا۔

۲۔ پھر یہ عبرتناک سماں بھی دیکھا گیا کہ لوگ جانیں بچا کر گھروں سے جب نکل گئے تو چور اچکے

میدان میں آگئے اور سیلاب زدہ گھروں میں گھس کر سامان نکالنے کی وارداتیں ہونے لگیں۔ اس کے
لیے حکومت کو خاص فکر کرنی پڑی۔

۳۔ اسی مصیبت کے دوران میں یہ بڑا نامرض بھی اور نمایاں ہو گیا کہ سیلاب زدگان کی خدمت
کرنے والوں میں اکثریت ان افراد اور ان جماعتوں کی تھی جنھوں نے اگر ایک روپے کا کام کیا تو اس
کے ساتھ لازماً دس روپے کا ڈھنڈورہ پیٹنے کا سامان بھی کیا۔ بعض تو ایسے بھی تھے جو یہ ساری تگ و دو
اگلے انتخاب کو نشانہ بنا کر کر رہے تھے اور ان کی مختلف حرکات سے یہ "نیتِ نیک" بالکل
نمایاں پڑتی تھی۔

۴۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ سیلاب زدگان کی امداد کے لیے جو نقدی اور سامان جمع ہوتے رہے
ان میں خیانت کی گئی۔ پھر خیانت کے عام روگ کی وجہ سے چندے اور سامان دینے والوں کو
عام طور پر یہ بھروسہ نہیں ہوتا تھا کہ ان کا دیا ہوا جو کچھ ہے وہ ٹھیک مستحقین تک پہنچے گا۔

۵۔ حکومت کا یہ کارنامہ بھی یادگار رہے گا کہ اس نے مسلم لیگ کو جو سہولتیں اور مراعات امداد
بہم کرنے کے لیے بہم پہنچائیں، دوسری جماعتوں کو نہ صرف یہ کہ ان سے محروم رکھا بلکہ بسا اوقات ان سے
کسی طرح کا تعاون کرنے یا ان کی کسی ضرورت کو پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ کرم اتنا ہی ہوتا تو بھی
غنیمت تھا۔ دوسری جماعتوں کے کارکنوں کو ستایا گیا اور ان کی جمع کردہ قربانی کی کھالیں چھینی گئیں۔
ہمارے حکمرانوں کا حال تھا کہ ان کو سیاسی رقابت کے احساس نے ایک مصیبت عام کے لمحے بھی نہ چھوڑا۔
یہ گھڑی بھی آئی اور گزر گئی۔ حالات وہیں رہے جہاں تھے۔

تجدیدِ آزمائش

ان سارے حوادث میں عبرت کے جو مناظر موجود تھے، ان پر سے اندھوں کی
طرح گزر جانے والی قوم کو آخر کار ایک اور آزمائش کی کسوٹی نے پرکھا اور
بڑی زیادہ وضاحت سے بتا دیا کہ تجھ میں کھوٹ کتنا ہے اور کھرے مال کا تناسب کیا ہے۔

یہ آزمائش صوبہ پنجاب کے انتخابات ۱۹۵۱ء کی آزمائش تھی۔

جس نے حکمرانوں، سرکاری کارکنوں، سیاسی لیڈروں، جماعتوں کے رضاکاروں، اخبارات کے ایڈیٹروں، مذہبی رہنماؤں، برادریوں اور محلوں کے چودھریوں اور صوبے کے عام شہریوں میں سے ہر ایک کے ذہنی، روحانی اور اخلاقی روگ کھول کھول کے ہر نگاہِ بینا کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ یہاں ہم قوم کے ان سارے عناصر کے اخلاقی مظاہروں کا تذکرہ کرتے ہیں جو انتخابات کے پردۂ سیمیں پر پیش کئے گئے۔

(۱) ہمارے حکمرانوں نے اپنے جس اخلاق کو نمونہ بنا کر قوم کے سامنے رکھا اس کے قابلِ توجہ پہلو یہ ہیں :۔

ا ــــــ ہمارے صوبے (بلکہ مرکز تک) کے حکمرانوں نے حکومت کے عہدوں پر قابض رہتے ہوئے مسلم لیگ کی خاص طور پر سرپرستی کی، اس کے لئے پروپگنڈا کیا، عوام کو اس کے حق میں ووٹ دینے کی تلقین کی، اور اس سلسلے میں جتنا کچھ ظاہر میں ہوا اس سے کئی گنا زیادہ پس پردہ ہوا۔

ب ــــــ انتخابات کے لئے جو قوانین اور ضابطے بنائے گئے اور جو اسکیم وضع کی گئی اس میں خاص طور پر مسلم لیگ کی ضروریات، اور اس کی کامیابی کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا۔

ج ــــــ مختلف امیدواروں کے بکسوں کے لئے ایک دوسرے سے کھلم کھلا متمیز رنگ مقرر کرنے کے بجائے دھندلے، مرکب، مغالطہ انگیز اور مشابہ رنگ اختیار کئے گئے اور خاص طور پر جماعت اسلامی کے براؤن بکس کے ساتھ جو سرخ بکس صوبے کے ہر پولنگ بوتھ پر رکھا گیا وہ ووٹروں کے لئے بے حد مغالطہ انگیز تھا اور واقعۃً اس سے جماعت اسلامی کے اندازاً ۵ فیصد ووٹروں کو مغالطہ ہوا۔

صوبے اور ملک کے چوٹی کے مصلحین کا جب یہ حال ہو تو نیچے اس کا جو اثر ہونا چاہیے وہ ظاہر ہے۔

(۲) سرکاری کارکنوں نے اپنے اخلاق کا مظاہرہ یوں کیا :۔

ا ــــــ بعض موقعوں پر کھلم کھلا کسی ایک جماعت (خصوصاً مسلم لیگ، اور اس سے کسی قدر کم درجے پر جناح لیگ) کی جانب داری کی، اس کے حق میں ووٹ ڈالنے کے لئے واضح طور پر اشارۃً ووٹروں سے مطالبہ کیا، بصورتِ دیگر ووٹروں کو پریشان کیا گیا۔

ب ــــــ ووٹرز کے حقوق کی بہم رسانی میں تساہل سے کام لیا، مثلاً بعض مقامات پر ووٹوں

نے نام کے جعلی ووٹ ڈلوائے جانے پر ٹینڈرڈ ووٹ بنوانا چاہا اور ان کو ٹال دیا گیا۔ یا کم سے کم یہ کہ

ں جگہ کافی زوردار مطالبے کے بعد ان کو ان کا یہ حق دیا گیا۔

ج ——— ملک کی تعلیمی حالت کی پستی کی وجہ سے بہت سے ووٹر پولنگ بوتھ پر ضابطے کی
نمائی کے محتاج بن کے سامنے آئے لیکن سرکاری عملے نے ان کی رہنمائی کا حق ادا نہیں کیا۔

د ——— جعلی ووٹر بار بار اور بکثرت ووٹ ڈالتے رہے اور اکثر اوقات عملہ ان کی
ش پر ہنس کر بات ٹال دیتا رہا اور جانتے بوجھتے ان پر جرح نہ کی گئی، پھر اگر مشکوک یا صریحاً
ی ووٹروں کا معاملہ پیش کیا گیا تو نوٹس لینے سے گریز کیا گیا۔ پھر اگر مطالبے پر گرفتاریاں کی گئیں
رفتار شدگان میں سے اکثر کو چھوڑ دیا گیا اور بہت ہی کم تعداد ایسی تھی جنہیں قانون کے حوالے کیا گیا۔

ص ——— کتنے ہی حلقوں میں ووٹروں خصوصاً عورتوں کے ہاتھوں سے ووٹ چھین
گئے اور یہ کارروائی سیاسی کارکنوں ہی کی طرف سے نہیں، بلکہ پولنگ اسٹیشن پر کام کرنے والے
لے نے بھی سرانجام دی ہے۔

س ——— عورتوں کے لئے بہت ہی کم مقامات پر پولنگ کے لئے پردے کے تسلی بخش
تظامات سرکاری عملے نے کئے۔ بالعموم فضا بے پردگی کی تھی۔

(۳) محلوں اور برادریوں کے چوہدریوں نے انتخابات میں جو پارٹ ادا کیا: اس کے دو پہلو
ص تھے :-

ا ——— انتخاب کے قریب آنے پر ہر سربراہ کار اور چوہدری اپنے اپنے ووٹروں کے
یڑ کو سمیٹ کر منڈی کے چکر لگانے لگا اور اپنی بھیڑوں بکریوں کی گنتی بتا بتا کر باقاعدہ سودے
نے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بارہا ایسا ہوا کہ پہلے کسی ریوڑ کے گڈریے نے ایک طرف معاملہ کیا اور
بھیڑ بکریوں کو ہدایت کی کہ وہ فلاں کو ووٹ دیں، لیکن جب اُدھر سے معاملہ بگڑ گیا یا دوسری زیادہ
ست زیادہ ملنے لگی تو اسے اپنی امت کے لئے نیا حکم جاری کرنا پڑا۔

ب ——— سربراہ کاروں اور چوہدریوں نے اپنے اپنے حلقۂ اثر کے ووٹروں کو جمع کر کے

ان پر دباؤ ڈالا اور ان کو دھمکایا کہ اگر ادھر اُدھر ہوئے تو عاقبت خراب ہوگی خاص طور پر مالکان زمین نے اپنے مزارعین کی آزادیٔ رائے کا گلا گھونٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اسی طرح مستاجروں نے اپنے اجیروں اور آقاؤں نے اپنے ملازموں کو ہانک کر جس امیدوار کے حوالے کرنا چاہا، کر دیا۔

(۴) مختلف جماعتوں اور امیدواروں کے انتخابی کارکن جو اکثر زر خرید تھے ان کی حسب ذیل کارروائیوں کے اثرات قوم کی اخلاقی صحت کے لئے بہت دور رس ثابت ہوں گے:۔

ا ـــــــ یہ چونکہ بیشتر ان پڑھ اور بازاری قسم کے لوگ تھے، بلکہ ان میں اکثریت غنڈوں کی تھی، اس لئے ان کی طرف سے بہت گھٹیا زبان استعمال کی جاتی رہی، بہت ذلیل حرکات سرانجام دی گئیں، ووٹروں کو گھیرنے اور اغوا کرنے کی بہت سے بری چالیں چلی گئیں۔

ب ـــــــ یہ لوگ پولنگ اسٹیشنوں پر جعل سازی کے باقاعدہ کارخانے قائم کر کے بیٹھ گئے ـــــــ بعض مقامات پر تو باقاعدہ "میک اپ سیلون" اور "ڈریسنگ روم" بھی بنا لیے گئے ـــــــ اور پھر قوم کے ہر ووٹر کو جوان میں آسکا غلط بیانی اور جعل سازی کی تعلیم دی، ایک ایک نوجوان کو کئی کئی باپوں کی اولاد بننے اور ایک ایک عورت کو کئی کئی شوہروں کی زوجیت کا شرف حاصل کرنے کے لئے باقاعدہ درس دئیے۔

(۵) ہمارے ووٹروں کی اکثریت نے جس اخلاق کا ثبوت دیا وہ یہ تھا:۔

ا ـــــــ کل ووٹروں کا بچھتر فی صدی حصہ وہ تھا جس کو سرے سے انتخاب سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی اور یہ سوال کہ ملک کی باگ ڈور کس کے حوالے کی جانی چاہیے ان کے لئے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ یہ لوگ اپنے کام کاج میں مصروف رہے یا گھروں میں بیٹھے رہے، اور انہی نے جعلی ووٹروں کو موقع دیا کہ وہ بیس بیس مرتبہ جا کے ووٹ دیں اور قلیل التعداد ہونے کے باوجود کثیر التعداد اصل ووٹروں کی رائے کو بے اثر بنا کے رکھ دیں۔

ب ـــــــ جو لوگ ووٹ دینے کے لئے آئے ان میں سے بھی بہت سے وہ تھے جو آئے نہیں تھے لائے گئے تھے اور جنھوں نے ووٹ ڈال کر کسی نہ کسی پر احسان دھر

بث دھاندلی کی ہے۔

ج ——— پھر جو لوگ خود گئے ان میں بھی کوئی قطعی رائے قائم کر کے آنے والے کم تھے۔ لوگوں کا حال یہ تھا کہ انھوں نے پولنگ اسٹیشن پر جا کر یا تو اپنے آپ کو اس بات کے لئے چھوڑ دیا کہ کوئی آگے بڑھ کے انھیں استعمال کر لے یا پھر انھوں نے رخ اُدھر کیا جدھر بھیڑ زیادہ دیکھی۔ ان کے ضمیر کی پستی کا حال یہ تھا کہ انھوں نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ایک شخص درست، اہل اور قابل ہے، اپنا ووٹ ایک نااہل اور ناقابل کو اس دلیل کے ساتھ دیا کہ اہل اور قابل آدمی کی کامیابی کا امکان نہیں لہٰذا ہمارا ووٹ ضائع جائے گا۔

د ——— ہمارے ووٹروں میں سے بے شمار ایسے بھی تھے جو بار بار وعدے کر کے مکر جاتے ہیں اور آخر کار جدھر چاہا رخ کر لیا۔ وعدہ خلافی کے روگ سے بہت کم لوگ بچ سکے ہوں گے یہاں تک کہ ہمارے سامنے ایسی قطعی مثالیں موجود ہیں کہ مسجدوں کے اماموں اور بڑے مذہبی قسم کے لوگوں نے ضمیر اور وعدے کے خلاف رائے دی ہے۔

س ——— ووٹروں میں بہت ہی قلیل تعداد ایسی ہوگی جو دباؤ اور دھمکی کا جم کر مقابلہ کر سکی ہو۔ بالعموم لوگوں نے اخلاقی قوت کے انتہائی ضعف کا مظاہرہ کیا ہے۔ حالانکہ ووٹ خفیہ ڈالا جانے والا تھا۔

ص ——— پھر وہ ہمارے ہی شہری اور قومی بھائی تھے جو بیس بیس پچیس پچیس کی ٹولیاں بنا کر ایک حلقے کے سارے پولنگ اسٹیشنوں پر گھوم گئے اور اپنے "خریدار" کے ووٹوں کی تعداد میں ہزاروں کا اضافہ کر دکھایا۔ ان لوگوں کی پستیٔ فطرت کا حال یہ تھا کہ انھوں نے فخریہ اس بات کا اظہار کیا کہ ہم نے بارہ یا پندرہ یا بیس یا اکیاون مرتبہ ووٹ ڈالے ہیں۔

ض ——— خواتین ووٹروں کی اکثریت ایسی تھی کہ جس کے لئے پولنگ کا ہنگامہ ایک اچھا خاصا میلہ بن گیا تھا، یہ بھڑکیلے لباس پہن کر نکلیں اور شان بے پردگی کے ساتھ، بلکہ بسا اوقات نازیبا حرکات کے ساتھ انھوں نے پولنگ اسٹیشن پر اپنا وقت گزارا۔

پھر یہ بھی اخلاقی انحطاط کا مظاہرہ تھا کہ اکثر زنانہ پولنگ اسٹیشنوں کو چاروں طرف سے تماش بینوں نے گھیرے رکھا تاکہ وہ اپنی ماؤں بہنوں کو آتے جاتے تاک سکیں۔

(۶) ہمارے اخبار نویس بھی اس کھیل میں اپنا پارٹ ادا کرنے سے کسی طرح قاصر نہیں رہے ملت کے ان ذہنی معلموں نے اخلاقِ حسنہ کی یہ یہ مثالیں قائم کیں :-

ا ـــــــ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو کہ جس نے کسی نہ کسی جاہ طلب فرد یا گروہ سے بالکل ویسا ہی معاملہ نہ کیا ہو جیسے حق مہر لے کر ایک عورت کسی مرد سے نکاح کا معاملہ کرتی ہے۔

ب ـــــــ ان حضرات نے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے، غیر موجود حالت کو موجود اور موجود حالت کو غیر موجود کر کے دکھانے کے فن کا "بے پناہ" مظاہرہ کیا ہے۔

ج ـــــــ اپنے ممدوحین کی قصیدہ گوئی میں زمین کے قلابے آسمان کے ساتھ ملانے کے ساتھ ساتھ ان سے اختلاف رکھنے والوں پر وہ وہ بہتان تراشتے ہیں اور ان کے لئے ایسے ایسے کلماتِ استہزاء استعمال کئے ہیں کہ ابتذال اور رکاکت کو وجد آ گیا ہو گا۔

(۷) امیدواروں اور انتخاب میں شریک ہونے والی جماعتوں ـــــــ خصوصاً مسلم لیگ ـــــــ کی پروپگنڈہ مشنری نے قومی ذہن کو بگاڑنے، جھوٹ اور بدگوئی کا زہر پھیلانے، الزام تراشی کا روگ لگانے، غلط فہمیوں کا دھواں چھوڑ کر عوام کے فکر کو پراگندہ کرنے کے لئے جو عظیم الشان اور جلیل القدر خدمات انجام دی ہیں وہ ہماری تاریخ سیاست میں زرّیں حروف سے منقش ہونی چاہئیں۔

(۸) سیاسی لیڈروں اور امیدواروں نے انتخاب میں جو کھیل کھیلا ہے، وہ ایک اَمٹ یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ حضرات قوم کے سامنے اس دعوے کے ساتھ آئے تھے کہ تمہارے حکمران اور کارفرما بننے کے سب سے زیادہ اہل ہم ہیں، لیکن انھوں نے اس کا ثبوت ذیل کی کارروائیوں سے دیا ہے :-

۱ ـــــــ اوپر جتنے مفاسد کا تذکرہ کیا گیا ہے اُن سب کے اصل محرک اور بانی مبانی

یسرپرست خود یہی حضرات تھے۔ انھوں نے ہر بداخلاقی کو اپنی انتخابی منصوبہ بندی میں خود شامل کیا،
یلنوں اور دوٹروں کو انھی نے ہر گمراہی کی چھوت لگائی اور یہی وہ اصل منبع ضلالت تھے جنھوں
کرسیاں حاصل کرنے کے جوئے میں پوری قوم کی اخلاقی متاع کو داؤں بنا کر لگا دیا۔

ب ـــــ پھر یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے پاکستان کے عوام کو کہیں برادری کی عصبیت کا،
ہیں پنجابی اور ہندوستانی کی کشمکش کا اور کہیں امیر اور غریب کے تنافر کا روگ لگانے کی ہر
یر اختیار کی۔

(۹) بحیثیت مجموعی قوم کی اسلامیت اور اخلاقی حِس کا پول پوری طرح کھل گیا ہے کہ اُس
سامنے جب ایک طرف علم و اخلاق کو اور دوسری طرف جہل و فسق کو رکھا گیا تو اس نے اپنا
تماعی ووٹ علم و اخلاق کو نہیں جہل و فسق کو دیا۔

علاوہ بریں بداخلاقی کے اتنے ہمہ گیر انتخابی ہنگامے کو دیکھ کر ایسے حسّاس لوگ کہیں نہ ابھرے
صلاح کا عَلَم اٹھا کر اُس سیلاب کے سامنے کھڑے ہو جاتے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکتے تو کم سے کم
ئی آنسو ہی بہا دیتے اور کوئی آہ ہی کر دیتے۔ یہ بھی قوم کے اخلاقی حس کے مردہ ہو جانے
ایک خطرناک علامت ہے۔

موقعِ عبرت

اس مرحلے پر ذرا سکون سے حالات پر غور کیجیے۔
انتخابات کے ہنگامے نے ایک بار پھر آپ کا اندرونی اخلاقی حال کھول کر آپ
سامنے رکھ دیا ہے۔ خدارا اپنے رِستے ہوئے ناسوروں، اپنے گندے داغوں، اپنے زہریلے
ڑوں اور ان سے بہتی ہوئی پیپ سے آنکھیں چرا کر نہ نکل جائیے، اور خود فراموشی کی چنیا بیگم
یار الے کر یا جذباتی پن کی مئے آتشین کے جام چڑھا کر، یا خوش فکریوں کی معجونِ فلک سیر
ں فرما کر عبرت کے مواقع کو ضائع نہ کر دیجیے۔ ایک مرتبہ مردانہ وار ہمت کر کے اپنا حالِ زار
طرح خود دیکھ لیجیے۔

یہ کمزوریاں، یہ امراض، یہ مفسدات جو آپ نے اپنے اجتماعی نظامِ جسمانی کے اندر پالی

ہے ہیں، ان کی پوری پوری تشخیص کر کے ان کے ازالے کی فکر کیجیے، ورنہ یہ داخلی دشمن تو کسی آپ کو
سدن اچانک پچھاڑ کے رکھ دیں گی، اور پھر اپنے اوپر ماتم کرنے سے کچھ نہ بنے گا۔

جماعت اسلامی کا تعمیری پروگرام

جماعت اسلامی روز اول سے ان حالات کو پیش نظر رکھ کر قوم اور پھر پوری انسانیت کی اصلاح کا کام کرنے میں معروف ہے۔ اس کے سامنے قوم کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر کے ساری دنیا کی اخلاقی فلاح کا پروگرام تھا جس کے تقاضوں کے تحت وہ عام سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے کنارہ کش ہو کر کئی سال تک اپنی داخلی تعمیر میں مصروف رہی۔ یہی پروگرام تھا جس کے پیش نظر اس نے جماعتی تنظیم کے روح نقشوں اور سیاسی تحریکوں کے سطحی، نمائشی اور جذباتی مظاہروں کو ترک کر کے ٹھیک اسلامی طریق تنظیم اور اسلامی انداز تحریک کو اختیار کیا۔ یہی پروگرام تھا جس کے لئے اس نے توسیع کے مقابلے میں ہمیشہ استحکام کو ترجیح دی۔ پھر یہی وہ پروگرام تھا جس کو ساتھ لے کر وہ ہر مرحلے میں قوم کے سامنے اسلامی اخلاقیات کی پابندی کے ساتھ اپنا وقتی فرض ادا کرتے ہوئے شہادتِ حق دیتی رہی اور قوم کے سامنے عملاً یہ واضح کرتی رہی کہ ایک مسلمان کا طرزِ عمل کسی معاملے میں کیا ہونا چاہیے۔ پھر یہی وہ پروگرام تھا جس کو اولین اہمیت دیتے ہوئے وہ انتخابات کے گندے میدان میں آئی اور اسی پروگرام کی خاطر اس نے اپنے اخلاقی اصولوں کی حفاظت کرتے ہوئے پنجاب اسمبلی کی سیٹوں کو قربان کر دیا، لیکن اس کے ایک ایک کارکن کا چہرہ اس احساس سے آج چمک رہا ہے کہ انتخابی ہنگامے میں انہوں نے عملاً یہ نمونہ دکھایا کہ ایک مسلم لیڈر کو، ایک مسلم نمائندے کو ایک مسلم پولنگ ایجنٹ کو، ایک مسلم سیاسی کارکن کو، ایک مسلم ووٹر کو کن حدودِ اخلاقی کا پابند ہونا چاہیے۔ پھر جماعت کا یہی پروگرام تھا جس نے ہر مرحلے میں جہاں ایک طرف قوم کے واقعی اسلام پسند اور صالح اور با اخلاق عناصر کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے وہاں اسلام سے بے نیاز اور اخلاقی حِس سے محروم عناصر کو دور دھکیل دیا ہے۔

یہ ایک مختصر سا گروہ ہے جس کے سامنے قوم کی اخلاقی حالت کا یہ افسوسناک نقشہ ہے کہ

ر آدمیوں میں سے بمشکل ایک آدمی ایسا ملتا ہے جو کیرکٹر کا پختہ ہو، بقیہ اکثریت وہ ہے جسے
نمائش کا ہر لمحہ ایک بے رحم کسوٹی بن کر کھوٹا کر کے پرے پھینک دیتا ہے۔ اخلاقی تعمیر و اصلاح
یا اور ادق کام کرنے کے لئے یہ طاقت میدانِ عمل میں موجود ہے۔ لیکن یہ صورتِ حال بڑی ہولناک ہے
اصلاح کرنے والے اس قلیل گروہ کے مقابلے میں جان بوجھ کر قوم میں اخلاقی بگاڑ پیدا کرنے اور
ڑ پیدا کر کے وقتی طور پر نا جائز فائدہ اٹھانے والوں کو اثبات ہے ہم اگر بھلائی کے فروغ کے لئے دس
تعداد میں نکلتے ہیں تو برائی کے خادم سیکڑوں کی تعداد میں پھیل جاتے ہیں، ہم اگر معروف کی دعوت
ینے کے لئے ایک روپیہ صرف کرتے ہیں تو منکر کے سرپرست اس دعوت کو بے اثر بنانے والے
نگاموں میں ہزاروں کے وارے نیارے کر دیتے ہیں، ہم اگر تعمیرِ اخلاق کے لئے کچھ سامان فراہم
تے ہیں تو قومی اخلاق کی تخریب کرنے والے اس سے بیس گنا زیادہ ذرائع و وسائل کے ساتھ موجود ہیں
یہ حالات ہمت آزما ضرور ہیں، مایوس کن نہیں ہیں ہمیشہ ہر اصلاح پسند طاقت کو یہی حالات پیش آئے ہیں
اصلاح کی صبح جب بھی نمودار ہوئی ہے اسی قسم کی طبق بر طبق تاریکیوں کا سینہ چیر کر نمودار ہوئی ہے۔ ان کو ہم
ں اس لئے واشگاف طور پر سامنے رکھ رہے ہیں کہ قوم کے جو افراد اجتماعی زندگی کی فلاح سے واقعی ہمدردی رکھتے
اور جن کے دلوں میں درحقیقت عوام کے لئے کوئی خیر خواہی موجود ہو وہ اپنی ذمہ داریوں کا کچھ احساس کریں
ضرورت دو چیزوں کی ہے :
ایک یہ کہ جن لوگوں کی نگاہ میں قوم کی اخلاقی صحت کو بچانے کی کچھ بھی اہمیت ہو وہ آگے بڑھیں اور اس
منظم تحریک کا ساتھ دیں جو تعمیرِ اخلاق کا پروگرام اپنے ساتھ رکھتی ہے خصوصیت سے حساس نوجوانوں کو اس
ذمہ داری کے لئے اپنے کندھے پیش کرنے چاہئیں قوم کے اندر بڑے پیمانے پر اگر ایک منظم طاقت اس پر تل
ئے کہ وہ بداخلاقی کے سرچشموں کا سدِ باب کر کے دم لے گی اور اجتماعی زندگی کو بداخلاقی روگ سے پاک
کے چھوڑے گی تو مفاسد کا فروغ رک سکتا ہے۔ جماعتِ اسلامی کو ہر مرحلہ کار سے گزرنے پہنچنے کا رکن
ملے ہیں اور تازہ انتخابی مہم سے گزرتے ہوئے بھی اس کی قوت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے لیکن حالات

دوسرے یہ کہ قوم میں ایسی رائے عام اور خیر و شر کا اتنا شعور پیدا ہو جانا چاہیے کہ وہ خود یہ پہچاننے لگے کہ اس کی واقعی بھلائی چاہنے والے کون لوگ ہیں اور اس کو اخلاقی روگ لگا کر ناجائز فائدے اٹھانے والے عناصر کونسے ہیں۔ وہ اپنی اخلاقی صحت کا تحفظ کرنے کے لئے جراثیم کے اڈوں کا سدباب کرنے پر تُل جائے۔ وہ ان سیاست بازوں کے مقابلے کے لئے کیل کانٹے سے لیس رہے جو اس کے شہریوں کو صحیح تربیت دینے، ان کے فکر کی تعمیر کرنے اور ان کو شعور دلانے سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں اور ان کو بہکا کر، پھسلا کر اور اکسا کر اُن سے وقتی طور پر فائدہ اٹھا کے اپنی راہ لیتے ہیں۔

مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ؟

ہمارے سامنے پتہ ماری کا لمبا کام ہے جسے کرنے پر کوئی دوسرا یہاں تیار نہیں۔ اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹانے کے لئے صرف وہی لوگ آگے بڑھیں جو برسوں ایک دہقان کے سے صبر کے ساتھ محنت کر سکتے ہوں اور آناً فاناً اپنی محنت کے نتائج وصول کرنے کے لئے جھولی نہ پھیلا دیں۔ یہ ایک ایسی مہم ہے جس کی کامیابی کا راستہ سینکڑوں ناکامیوں میں سے ہو کر گزرا ہے، لہٰذا یہ مہم اگر سر ہو گی تو ان عالی ہمت اور فراخ حوصلہ مردوں کے ذریعے ہو گی جنھیں ہر شکست اور زیادہ سرگرمِ عمل کر دے اور جو راستے کی ہر ٹھوکر کو ایک تازیانہ سمجھتے ہوئے اقدام کر سکیں۔

جب تک ہماری اجتماعی زندگی کی اخلاقی صحت مضبوط نہ ہو گی، اسلامی نظام کے قیام و نفاذ اور اس کے نشو و ارتقاء کا تو کیا سوال، خالص مادی حیثیت سے بھی ہم دنیا میں ایک کمزور قوم بن کے رہیں گے اور اوپر کی چھیڑ سے اندرونی مفاسد کا کبھی ازالہ نہ ہو گا!

اس مہم میں ہمارا ساتھ دینے کے لئے کون آگے بڑھتا ہے؟

کارروائی مجلسِ شوریٰ جماعتِ اسلامی پاکستان

منعقدہ ۱۵-۱۹ اپریل ۵۱ء

(میاں طفیل محمد صاحب قیم جماعت اسلامی پاکستان)

حسب پروگرام مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان کا ایک خاص اجلاس ۱۵ تا ۱۹ اپریل ۵۱ء صدارت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان لاہور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس مجلس شوریٰ کے حسب ذیل ارکان شریک ہوئے :

(۱) مولانا امین احسن صاحب اصلاحی، امیر جماعت اسلامی حلقہ لاہور۔

(۲) جناب ابوالسلام نعیم صدیقی صاحب، ایڈیٹر ماہنامہ چراغ راہ، کراچی۔

(۳) مولانا مسعود عالم صاحب ندوی۔ رئیس دارالعروبہ گوجرانوالہ و امیر جماعت اسلامی حلقہ گوجرانوالہ

(۴) چوہدری علی احمد خاں صاحب، قیم جماعت اسلامی حلقہ گوجرانوالہ۔

(۵) مولانا عبدالغفار حسن صاحب، امیر جماعت اسلامی شہر سیالکوٹ۔

(۶) چوہدری محمد اکبر صاحب، امیر جماعت اسلامی ضلع سیالکوٹ۔

(۷) ملک محمد سعید احمد صاحب امیر جماعت اسلامی حلقہ راولپنڈی۔

(۸) مولانا حکیم عبدالرحیم صاحب اشرف، امیر جماعت اسلامی حلقہ لائل پور۔

(۹) جناب خان محمد باقر خاں صاحب، امیر جماعت اسلامی حلقہ ملتان۔

(۱۰) جناب خان محمد ربانی صاحب، قیم جماعت اسلامی حلقہ ملتان۔

(۱۱) چوہدری نذیر احمد صاحب، امیر جماعت اسلامی ضلع ملتان

(۱۲) خان سردار علی خاں صاحب، امیر جماعت اسلامی حلقہ صوبہ سرحد۔

(۱۳) محمد سعید صاحب، امیر جماعت اسلامی، پشاور شہر و چھاؤنی۔

(۱۴) مولانا عبدالحق صاحب، امیر جماعت اسلامی حلقہ ریاست بہاول پور۔

(۱۵) سید امیر الدین صاحب، قیم جماعت اسلامی حلقہ ریاست بہاول پور۔

(۱۶) چوہدری غلام محمد صاحب، قیم جماعت اسلامی حلقہ سندھ۔

(۱۷) طفیل محمد، قیم جماعت اسلامی پاکستان۔

جناب محمد عبدالجبار غازی صاحب اور مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب بیماری کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ جناب سلطان احمد صاحب امیر جماعت اسلامی حلقہ سندھ و کراچی مشرقی پاکستان گئے ہوئے تھے اور مولانا صدر الدین صاحب کے تشریف نہ لانے کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔

۱۸ اپریل کو مجلس کا اجلاس ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز کے مکان پر منعقد ہوا اور اس روز وہ بھی شریک اجلاس رہے۔ باقی اجلاسوں میں وہ بیماری کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔

ایجنڈے کے اجراء کے بعد جو تجاویز اور مشورے مرکز میں موصول ہوتے تھے ان کو اور اصل ایجنڈے کو ملا کر ایجنڈا از سر نو مرتب کر لیا گیا۔ اور مجلس کی یہ کارروائی اس نئے ایجنڈے کے مطابق ہوئی۔

مجلس شوریٰ کے کل دس اجلاس منعقد ہوئے۔ اس میں جو فیصلے ہوئے وہ نمبر وار درج ذیل ہیں:

پنجاب کے حالیہ انتخابات کے نتائج کو دیکھتے ہوئے آیا الیکشن کے ذریعے یہاں اصلاح ممکن ہے؟

سب سے پہلے مجلس شوریٰ نے اس مسئلے پر غور کیا کہ پنجاب میں حالیہ انتخابات کے نتائج اور ان تمام خلاف قانون و خلاف اخلاق حرکات کے پیش نظر جن کا ارتکاب مختلف سیاسی پارٹیوں، آزاد امیدواروں اور خود حکومت کی انتظامی مشینری کی طرف سے انتخابات کے موقع پر اس قدر وسیع پیمانے پر کیا جاتا ہے، ابھی ابھی ہمارے سامنے کیا جا چکا ہے اور بظاہر ایک مدت تک اسی طرح کیا جاتا رہے گا، آیا الیکشن کے ذریعے سے اصلاح ممکن ہے؟ اگر مجلس کی رائے میں یہ ممکن ہو تو انتخابات کے ذریعے انقلاب و اصلاح کی کوشش کو جاری رکھا جائے ورنہ اس مقصد کے حصول کے لئے کوئی دوسری تدبیر سوچی جائے۔

ں مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد مجلس شوریٰ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اُن تمام خرابیوں کے
انتخاب کے موجودہ قوانین اور طریقوں میں پائی جاتی ہیں، اور ان تمام اخلاقی کمزوریوں کے باوجود جو
عوام اور خواص میں موجود ہیں اور پنجاب کے پچھلے انتخابات میں بالکل نمایاں ہو کر سامنے آ گئی ہیں
تمام ناجائز مداخلتوں کے باوجود جن کا ارتکاب حکومت کی انتظامی مشینری نے خود حکومت ہی کے
قوانین اور ضوابط کے خلاف پنجاب کے پچھلے انتخابات میں کھلم کھلا کیا اور جن کا ارتکاب ایک مدت
ں کی طرف سے اُن تمام انتخابات میں ہوتے رہنے کا اندیشہ ہے جو پاکستان میں کہیں منعقد ہوں، ا
بداخلاقیوں اور بے ضابطگیوں کے باوجود جن کا ارتکاب مخالف سیاسی پارٹیاں انتہائی بے باکی کے سا
ے وسیع پیمانے پر عام انتخابات میں کرتی ہیں، کر چکی ہیں اور بظاہر ایک مدت تک کرتی رہیں گی، اور اس
جود کہ جماعت اسلامی کے پاس وسائل اور مردانِ کار کی بہت کمی ہے، اس معاملہ میں مایوس ہونے
وجہ نہیں ہے کہ آخر کار یہاں آئینی ذرائع سے اصلاح کی جا سکے گی۔
مجلس شوریٰ جن ٹھوس حقائق کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچی ہے وہ یہ ہیں کہ پنجاب کے پچھلے انتخابات میں
محدود ذرائع کے ساتھ جماعت کی صرف پانچ مہینے کی انتخابی جدوجہد سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں
ہ ذیل ہیں :-

(۱) پنجاب کے ۲۷ انتخابی حلقوں میں تقریباً پچاس ہزار آدمی ایسے نکلے جنہوں نے ہماری انتخابی پالیسی
سمجھ کر ووٹر کے عہد نامے پر دستخط کئے۔

(۲) ان حلقوں میں ۳۹۰ بستیاں ایسی نکلیں جنہوں نے صالح نمائندوں کے انتخاب کے لئے اپنی
پنچایتیں بنائیں۔

(۳) ان حلقوں میں جو مرکزی پنچایتیں بنائی گئیں ان میں ۲۱۱۹ نمائندوں نے عملاً شرکت کی اور اپنی حد
ری دیانتداری کے ساتھ ۵۳ ایسے آدمیوں کو اپنے اپنے حلقوں کی نمائندگی کے لئے چنا جو علمی اور
حیثیت سے نمایاں طور پر دوسری پارٹیوں کے امیدواروں اور آزاد امیدواروں کے مقابلہ میں فائق تھ
جن کی سیرت پر ان کے مخالفین بھی کوئی حرف نہ رکھ سکے۔

(۴) اس انتخابی جدوجہد کے دوران میں عام پبلک میں سے سترہ سو ایسے شئے آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے
جنہوں نے ہمارے کارکنوں کا پوری طرح سے ہاتھ بٹایا اور بغیر کسی ذاتی غرض یا لالچ کے اُن تمام اخلاقی
پابندیوں کے ساتھ جو ہم نے اپنے کارکنوں پر عائد کر رکھی تھیں پوری طرح جان لڑا کر کام کیا۔

(۵) باوجودیکہ پنجاب کے اتنے وسیع رقبوں میں جماعت کے تین چار ہزار کارکنوں نے اتنے وسیع پیمانے
پر انتخابی جدوجہد کی اور اُس میں مخالف جماعتوں اور امیدواروں کی شدید بداخلاقیوں اور بے ضابطگیوں
سے ان کو مقابلہ کرنا پڑا، تاہم پولنگ کے انتہائی بحرانی زمانے میں بھی جماعت کے کارکنوں نے بحیثیت
مجموعی اخلاقی طہارت اور ضابطہ وقانون کی پابندی کا ایسا بے نظیر نمونہ پیش کیا جس کا اعتراف حکومت کے
عمال اور مخالف پارٹیوں کے کارکنوں تک کو کرنا پڑا۔ الیکشن کے پورے کام کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ
چار حلقوں کے سوا پورے پنجاب میں کہیں جماعت کے کارکنوں سے کسی اخلاقی کمزوری یا قانون وضابطہ
کی خلاف ورزی کا ارتکاب نہیں ہوا اور ان دو تین حلقوں میں بھی جماعت کے کارکن بحیثیت مجموعی اس
سے ملوث نہیں ہوئے بلکہ چند منفرد کارکنوں سے ——— اور زیادہ تر نئے کارکنوں سے ——— اس کا صدور ہوا۔

(۶) پورے پنجاب کی اس انتخابی جدوجہد میں جماعت اور پنچایتوں کا مجموعی خرچ صرف ایک لاکھ
بائیس ہزار روپیہ ہے درآں حالیکہ مقابلہ اُن لوگوں سے تھا جنہوں نے بعض جگہ ایک ایک سیٹ پر
قریب قریب اتنا روپیہ خرچ کیا ہے۔

(۷) باوجودیکہ پنجاب کے اس انتخاب میں حکومت کے دباؤ، زمینداری کے دباؤ، برادری کے
تعصب، اور روپے کے لالچ سے ووٹ حاصل کرنے کی بے تحاشا اور بہت بڑے پیمانے پر کوششیں
کی گئیں اور ہر طرح دھاندلیوں سے کام لیا گیا، پھر بھی جماعت اسلامی کی دعوت پر پنچایتی نمائندوں کے
حق میں ۲۱۷۸۵۹ آدمیوں نے ووٹ دیئے۔ (یہ شمار ووٹروں کا ہے نہ کہ ووٹوں کا۔ کیونکہ اکثر
مقامات پر ایک ایک ووٹر کو دو دو آدمیوں کے لئے اپنا ووٹ استعمال کرنا تھا)۔ ان لوگوں کے ووٹ
بہرحال دھن، دھونس، دھوکے اور دھاندلی کے ذریعہ سے تو کسی جگہ بھی حاصل نہیں کئے گئے۔ البتہ
اس کا امکان ہے کہ بعض مقامات پر پنچایتی نمائندوں کو اُن کی برادری کے لوگوں نے برادری کے تعصب

پر رائے دی ہو۔ اگر ہم مبالغہ کے ساتھ ایسے لوگوں کی تعداد کا تخمینہ مذکورۂ بالا تعداد کا ۱۰ بھی لگائیں
ہم کہہ سکتے ہیں کہ پنجاب کے ان حلقوں میں جنہیں ہم نے انتخابی جدوجہد کے لئے اپنے جانچ میں
کم ازکم ایک لاکھ ساٹھ ہزار آدمی ایسے ضرور تھے جنہوں نے ہر دھمکی اور ہر لالچ کو نظر انداز کر کے
اصول کی خاطر اپنا ووٹ استعمال کیا۔
(۸) خصوصیت کے ساتھ جو چیز ہمارے لئے انتہائی قابلِ اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ اس انتخابی
بد میں جتنی خواتین نے پنچایتی نمائندوں کے لئے کام کیا انہوں نے ہر جگہ شرعی پردے کے تمام حدود
ی طرح پابندی کی۔ درآں حالیکہ ایک آدھ پولنگ سٹیشن کے سوا پورے پنجاب کا کوئی پولنگ سٹیشن
ہیں تھا جہاں زنانہ پولنگ کے وقت حکومت اور سیاسی پارٹیوں اور مخالف امیدواروں نے پردے
دود کا کچھ بھی لحاظ کیا ہو۔
یہ نتائج اس حالت میں نکلے ہیں کہ:۔
(۱) جماعت کو انتخابی جدوجہد کے آغاز ہی میں پریس کی طاقت سے محروم کر دیا گیا اور اس کے
۔ اخبار بند کر دیئے گئے۔
(۲) پورے پریس اور خبر رساں ایجنسیوں نے جماعت کا عملاً بائیکاٹ کیا اور پریس کی اکثریت
ت کی شدید مخالف رہی۔
(۳) اخبارات، رسائل اور اشتہارات اور تقریروں کے ذریعے سے جماعت کے خلاف جھوٹے
پیگنڈا کی نہایت مکروہ اور گھناؤنی مہم چلائی گئی اور خاص طور پر مولوی صاحبان اور پیروں کے ذریعہ
مذہبی بدگمانیاں پھیلانے کا ایک طوفان برپا کر دیا گیا۔
(۴) جماعت کے کارکن پہلی مرتبہ انتخاب کے میدان میں اترے تھے۔ ان کی اکثر و بیشتر کو پہلے سے انتخاب
تجربہ نہیں تھا اور اخلاقی قیود اور قانون وضابطے کی پوری پابندی کے ساتھ الیکشن لڑنے کا تو موجودہ
یت کی تاریخ میں یہ شاید پہلا تجربہ تھا۔
ان وجوہ سے مذکورۂ بالا نتائج کو دیکھ کر مجلس شوریٰ یہ سمجھتی ہے کہ ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ

[illegible] توقع ہے کہ اگر ہم رائے عام کی تربیت، کارکنوں کی تیاری اور [illegible] ملک

اخلاقی اصلاح کے لئے پیہم کوشش کرتے چلے جائیں تو آخرکار پُرامن آئینی ذرائع ہی سے یہاں اسلامی

انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا انتخابات کے بارے میں جماعت کی پالیسی کو حسبِ سابق جاری رہنا

چاہئے اور جہاں کہیں ملک میں انتخابات ہوں اُن میں حصہ لینے کی کوشش کرنی چاہئے۔

۲۔ طریقۂ انتخاب کی اصلاح کا مسئلہ

پنجاب کے تازہ انتخابی تجربے کے دوران میں یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی گئی ہے کہ ایک جمہوری نظام میں انتخابات کی آزادی اور صحت بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور پُوری قومی زندگی کی بہتری کا انحصار اس پر ہے کہ عام رائے دہندے آزادی کے ساتھ اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق اپنے ووٹ کا استعمال کر سکیں۔ اگر انتخابات میں حکومت کی طاقت کے ذریعہ سے مداخلت کی جائے، یا با اثر لوگ اپنی طاقت کے دباؤ سے ووٹ حاصل کریں، یا دولت مند لوگ اپنے مال سے ووٹ خریدیں، یا رائے عام کو ناجائز طریقوں سے دھوکا دینے کی کوششیں کی جائیں، یا رائے شماری میں دھاندلیوں سے کام لیا جائے تو اس کے نتائج اس قدر خطرناک ہیں کہ اُن سے نہ صرف پُورے ملک کا نظام بگڑ سکتا ہے بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ لوگ آئینی نظام سے مایوس ہو کر غیر آئینی ذرائع کی طرف متوجہ ہو جائیں اور پُوری قومی زندگی کا ارتقاء پُرامن جمہوریت کے راستے سے ہٹ کر دہشت پسندی، ڈکٹیٹرشپ اور خونی انقلاب کے راستے کی طرف مڑ جائے۔ اس لئے مجلس شوریٰ یہ ضروری سمجھتی ہے کہ تمام اُن عناصر سے جو انتخابات کے ساتھ بالواسطہ یا بلا واسطہ تعلق رکھتے ہیں، خواہ وہ اربابِ حکومت ہوں، یا سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اور کارکن ہوں، یا آزاد امیدوار ہوں، اپیل کی جائے اور پیہم کی جاتی رہے کہ وہ اپنی شخصی یا جماعتی اغراض کی خاطر ملک کو اتنے بڑے نقصان اور خطرے میں مبتلا نہ کریں اور انتخابات کو دھن، دھونس، دھوکے اور دھاندلی سے پاک رکھنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں مجلس شوریٰ کی رائے یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کو ہر انتخاب کے موقع پر خصوصیت کے ساتھ ان ناجائز ذرائع کے خلاف تبلیغ کرنی چاہئے، ان کے نقصانات تقریر اور تحریر میں پوری وضاحت کے

بیان کرنے چاہئیں اور عام طور پر یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ ان تدابیر کے استعمال
ہد کہ اس ملک کے ساتھ اور کوئی غداری نہیں ہو سکتی۔

۳۔ انتخابات کے قواعد اور طریقِ کار میں ترمیم کی ضرورت

مجلس شوریٰ نے اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ دوسری اصلاحات کے علاوہ انتخاب کے قواعد و طریق کار
ں اصلاح کی ضرورت ہے۔ خصوصیت کے ساتھ حسب ذیل اصلاحات ضروری ہیں :-
ا) فہرست رائے دہندگان اس تفصیل کے ساتھ مرتب ہونی چاہیئے کہ اس میں ووٹر کے نام، اس کے
کے نام، اس کی قومیت، اس کی عمر، اس کی تعلیم، اس کے پیشے اور اس کے مکمل پتے کی تصریح ہو
رتیں مردم شماری کے طریقے پر محلہ وار مرتب ہونی چاہئیں، تاکہ جعلی ووٹوں کا بآسانی سراغ لگایا جا سکے
۲) جعلی ووٹوں کی روک تھام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک ایسا کیمیاوی رنگ تجویز کیا جائے
مدت تک کسی طرح مٹایا نہ جا سکتا ہو اور ہر ووٹر کے ہاتھ یا انگلی پر پولنگ سٹیشن چھوڑنے سے
نا اس کا نشان لگا دیا جائے۔
۳) تعزیرات پاکستان کے باب نمبر ۹ (الف) میں جن باتوں کو انتخابی جرائم (ELECTION
OFF) قرار دیا گیا ہے، ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۹۶ نے اُن سے فائدہ اٹھانے کے حق سے مستغیث
محروم کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے انتخابات میں کتنے وسیع پیمانے پر ناجائز دباؤ کے استعمال، ووٹوں کی خرید
ہ اور سراسر جھوٹے پروپیگنڈے کے باوجود شاذونادر ہی کبھی کوئی شخص ان دفعات سے فائدہ اٹھا
ے۔ لہٰذا استغاثہ کی راہ میں دفعہ ۱۹۶ مذکورۂ بالا کی عائد کردہ رکاوٹ کو دور ہونا چاہیئے تاکہ مستغیث
ہ میں براہ راست جا کر انصاف حاصل کر سکے۔
۴) جب کسی علاقے میں انتخابات کے انعقاد کا اعلان ہو جائے تو ایسی تمام پارٹیوں اور ان کے
ں اور ایسے تمام اشخاص کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے اور غلط بیانیوں کو قطعی طور پر ممنوع ہونا
جنہوں نے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا ہو۔ اس غرض کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس فعل

کو بھی انتخابی جرائم (ELECTION OFFENCES) میں شامل کیا جائے اور متعلقہ پارٹیوں اور اشخاص کو یہ حق دیا جاتے کہ وہ جھوٹا پروپیگنڈا یا غلط بیانی کرنے والے لوگوں کے خلاف براہِ راست استغاثہ دائر کر سکیں۔

اس سلسلے میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۷۱-ایف بالکل ناکافی ہے۔

(۵) کاغذات نامزدگی پُر کرنے کے لئے گزٹ میں جہاں فارم کا نمونہ دیا جاتا ہے وہیں اُسے پُر کرنے کے لئے واضح ہدایات بھی دی جانی چاہئیں بلکہ نمونہ کے طور پر ایک فارم پُر کرکے شائع کر دینا چاہئے تاکہ کاغذات نامزدگی پُر کرنے کا معاملہ بالکل جُوا کھیلنے کا ہم معنی بن کر نہ رہ جائے۔ نیز قواعد میں اس کی گنجائش ہونی چاہئے کہ اگر مجسٹریٹ کو کاغذات نامزدگی پر کوئی اعتراض ہو تو اس کے مطابق کاغذات کی اصلاح کا موقع دیا جائے۔

(۶) تمام اُمیدواروں کے بکس سفید رنگ کے ہونے چاہئیں اور ہر اُمیدوار کے بکس پر اُس کا نام اور جس پارٹی سے وہ تعلق رکھتا ہے اس کا نام لکھا جانا چاہئے۔ نیز ہر بکس پر ایک عام فہم نشان مثلاً موٹر، سائیکل، بیل گاڑی وغیرہ بنا دینا چاہئے تاکہ اَن پڑھ ووٹر بھی مطلوبہ بکس کو بآسانی پہچان سکیں۔

(۷) پولنگ سٹیشن سے ایک ایک فرلانگ کے اندر کسی پارٹی یا امیدوار کو نہ کیمپ لگانے کی اجازت ہو اور نہ کسی کے حق میں یا خلاف کوئی کنویسنگ کرنے کی۔

(۸) کوئی سرکاری ملازم جب پولنگ سٹیشن پر کسی حیثیت سے مامور ہو، اگر کسی ووٹر کے آزادانہ استعمالِ رائے میں مداخلت کرے یا انتخابی ضابطے کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرے یا اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے سے دانستہ پہلوتہی کرے جس کا فائدہ لازماً کسی خاص امیدوار یا پارٹی کو پہنچتا ہو، تو اس کے خلاف متعلقہ پارٹی، امیدوار یا ووٹر کو عدالت میں براہِ راست استغاثہ دائر کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔

(۹) ووٹروں کو لانے کے لئے سواری کا استعمال فوجداری جرم قابلِ دست اندازیِ پولیس ہونا چاہئے۔

(۱۰) پریذائیڈنگ آفیسر کو پولنگ سٹیشن کے حدود میں اُن تمام بے قاعدگیوں کے روکنے کے پورے اختیارات ہونے چاہئیں جن کو قانون میں جرم یا بے قاعدگی قرار دیا گیا ہے۔

(۱۱) پولنگ شروع ہونے کے وقت بکسوں پر امیدواروں کی اپنی مُہریں بھی ہونی چاہئیں اور پولنگ
[illegible]ان میں ایک گھنٹے کی چھٹی کے وقت تمام بکس پولنگ ایجنٹوں کے سامنے رہنے چاہئیں اور پولیس کا
[illegible] پہرہ رہنا چاہئے۔
(۱۲) پولنگ بوتھ میں بکسوں کا نگران لازماً حلقہ انتخاب سے باہر کا کوئی آدمی ہونا چاہئے، جو نہ اس
[illegible] کا رہنے والا ہو اور نہ اس حلقہ میں ملازم ہو۔ نیز یہ کہ نگران کو سرکاری وردی میں نہ ہونا چاہئے۔
(۱۳) انتخابی عذرداری کے لئے ٹریبیونل کا تقرر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے سپرد ہونا چاہئے
[illegible]ل کے فیصلے کی حیثیت سفارش کی نہیں بلکہ عدالتی فیصلے کی ہونی چاہئے اور ایک میعاد مقرر ہونی چاہئے
[illegible]کے اندر اندر انتخابی عذرداریوں کا فیصلہ ہونا لازمی ہو۔
(۱۴) حکومت نے اگر قواعد انتخابات کے مطابق عمل کرنے میں غفلت یا جانبداری سے کام لیا ہو
[illegible]کے خلاف ہائیکورٹ میں دعویٰ دائر کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے۔
(۱۵) عورتوں کے لئے پولنگ کا ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ پولنگ سٹیشن پر مرد موجود نہ ہوں تاکہ خواتین
[illegible] آزادی سے کام کر سکیں اور ووٹ ڈالنے والی خواتین بھی بے نقاب ہو سکیں۔

۴۔ انتخابی قوانین سے عوام کو واقف کرانے کی ضرورت

مجلس شوریٰ نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ انتخابات کے معاملہ میں ملک کے موجودہ قوانین سے عوام کی
[illegible]نیت بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ آئندہ ہر انتخابی جدوجہد کے موقع پر
[illegible]ت کے کارکن وسیع پیمانے پر عوام کو انتخابی قواعد سے آگاہ کرنے کی کوشش کریں۔

۵۔ انتخابات میں عورتوں کے حصہ لینے کا مسئلہ

جہاں تک عورتوں کے لئے حق رائے دہندگی کا تعلق ہے اس مسئلے میں جماعت اسلامی کے اہل
[illegible] درمیان بھی اتفاق نہیں ہے اور ہندوستان اور پاکستان اور دوسرے ممالک اسلامیہ کے علاوہ بھی

سی حتمی علمی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے ہیں کہ اسلام کے سیاسی نظام میں عورتوں کو حق رائے دہندگی حاصل ہے یا نہیں۔ اس لئے مجلس شوریٰ نے اس مسئلے کی اصولی حیثیت سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف مصالح قت کے لحاظ سے اس پر غور کیا ہے اور بالاتفاق اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ موجودہ حالات میں ہر بالغ عورت کو حق رائے دہندگی دینا اُس سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے جو ہر بالغ مرد کو یہ حق دینے سے پہنچنے امکان ہے۔ پنجاب کے تازہ انتخابی تجربے کے بعد مجلس شوریٰ اپنی اس رائے میں اور بھی زیادہ پختہ ہوگئی ہے اور اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں:۔

اولاً ہمارے مرد عوام کی بہ نسبت ہماری عورتیں زیادہ جہالت میں مبتلا ہیں اور ملک کے معاملات میں آزادانہ رائے قائم کرنے کی بہت کم اہلیت رکھتی ہیں۔ ان کی رائے زیادہ تر مردوں کی رائے کے تابع ہے اور ان کی رائے دہندگی کے معنی صرف مرد آبادی کی قوت رائے دہی (VOTING STRENGTH) میں اضافہ کرنے کے ہیں۔

ثانیاً عورتوں کو مردوں کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے دھوکا دیا جا سکتا ہے، مرعوب کیا جا سکتا ہے اور ان کے پولنگ سٹیشنوں پر زیادہ آزادی کے ساتھ دھاندلیاں کی جا سکتی ہیں۔

ثالثاً موجودہ حالات میں عورتوں کے عام حق رائے دہی کی حیثیت صرف سیاسی ہی نہیں ہے بلکہ معاشرتی بھی ہے، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس چیز کو مسلمان عورتوں میں بے پردگی اور بے حیائی کی اشاعت وسیع پیمانے پر ایک مؤثر ذریعہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

رابعاً پنجاب میں سیاسی پارٹیوں نے ووٹ حاصل کرنے کے لئے جو ہتھکنڈے استعمال کئے اور حکام نے جس طرح اس معاملہ میں کھلی کھلی مداخلت کی، اس کو دیکھتے ہوئے ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ مردوں کی نسبت رائے دہی کی بہ نسبت عورتوں کی قوت رائے دہی سے اور بھی زیادہ ناجائز فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور سیاسی پارٹیوں کے ہاتھ میں اس حربے کا رہنا صرف ہمارے ملک کے سیاسی نظام ہی کے لئے نہیں بلکہ ہماری پوری قومی زندگی کے لئے گہری اور دور رس خرابیوں کا موجب ہے۔

ان وجوہ سے جماعت اسلامی پاکستان کی مجلس شوریٰ یہ قطعی رائے رکھتی ہے کہ اگر اسلام میں عورتوں

صولا یہ حق حاصل ہے بھی تو اسے اُس وقت تک ملتوی رہنا چاہئے جب تک ہماری قومی زندگی کی باگیں
ے لوگوں کے ہاتھ میں نہ آجائیں جو حدود شرعیہ کے پابند ہوں اور اپنی قوم کے عوام کی ذہنی و اخلاقی پستی
، ناجائز فائدہ اٹھانے کے بجائے ان کی تربیت اور اصلاح کی فکر رکھتے ہوں۔

لیکن مجلس شوریٰ کو یہ توقع نہیں کہ جن لوگوں نے خوب سوچ سمجھ کر اس موقع پر عورتوں کو عام حق
تے دہی دیا ہے وہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں گے۔ بظاہر اندیشہ یہی ہے کہ یہاں اب یہ طریقہ جاری
رہے گا۔ اس لئے مجلس شوریٰ نے معاملے کے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ اگر یہ طریقہ جاری رہے تو ہمارے
صحیح پالیسی کیا ہے؟ مجلس شوریٰ کو ان لوگوں کی رائے سے اتفاق نہیں ہے جو اس صورتِ حال میں
توں کی حد تک انتخابات سے مقاطعے کا مشورہ دیتے ہیں، کیونکہ اس صورت میں آئینی ذرائع سے تبدیلی
ت کا قریب قریب کوئی امکان نہیں رہتا۔ لہٰذا مجلس شوریٰ مقاطعے کے بجائے حسب ذیل طریق کار
کرتی ہے:۔

(۱) عورتوں کی ذہنی تربیت، اخلاقی اصلاح، اور اجتماعی تنظیم کا کام پوری تیزی کے ساتھ اور وسیع پیمانے
روع کر دیا جائے۔ اس کے لئے طریق کار وہی ہوگا جو آگے تجویز ۲ میں بیان کیا جا رہا ہے۔ اس طریقے
طابق عورتوں کے حلقہ ہائے متفقین کثرت سے منظم کئے جائیں اور ان میں سے بہتر کارکن خواتین کو
ت کی رکنیت کے دائرے میں لینے کی کوشش کی جائے۔

(۲) زنانہ حلقہ ہائے متفقین کے اجتماعات میں ایسا پروگرام رکھا جائے جس سے نہ صرف یہ کہ عورتوں
نی معلومات بڑھیں اور ان کی اخلاقی اصلاح ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کو ملک کے نظم و نسق اور
ی معاملات کے متعلق واقفیت بھی بہم پہنچائی جائے اور انھیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ ان معاملات
حیح رائے قائم کر سکیں۔ نیز پڑھی لکھی خواتین کو مطالعہ کا شوق بھی دلایا جائے اور ان کے اندر اخبار بینی
وق بھی پیدا کیا جائے۔

(۳) آئندہ سے تمام مقامی جماعتیں اپنی رپورٹوں میں بالالتزام یہ بھی بتاتی رہیں کہ زنانہ حلقوں کی
ام کس رفتار سے ہو رہی ہے اور ان حلقوں میں کیا کام ہو رہا ہے۔

(۴) انتخابات کے موقع پر کوشش کی جائے کہ خواتین کو انتخاب کے طریق کار اور قانون کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچائی جائیں اور جہاں تک ممکن ہو عملاً پولنگ کاری ہرسل (REHEARSAL) بھی کرا دیا جائے۔

(۵) خواتین کارکنوں میں یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے پوری خود اعتمادی اور جرأت کے ساتھ انتخابی جنگ میں حصہ لے سکیں، کسی بے قاعدگی کو نہ چلنے دیں اور کسی سے مرعوب نہ ہو سکیں۔

(۶) ہر انتخاب کے موقع پر جب خواتین کارکنوں کو کسی پولنگ سٹیشن پر مامور کیا جائے تو ان کی مدد اور حفاظت کے لئے جماعت کے مرد کارکن کافی تعداد میں پولنگ سٹیشن سے باہر مامور کئے جائیں۔

(۷) ہر انتخاب کے موقع پر زنانہ پولنگ سٹیشن کے گرد و پیش کی شریف آبادی سے اپیل کی جائے کہ وہ غنڈہ گردی سے خواتین کی حفاظت کے لئے ہمارے کارکنوں سے تعاون کریں۔ نیز سیاسی پارٹیوں کے کارکنوں اور آزاد امیدواروں کے حامیوں سے بھی اپیل کی جائے کہ اپنی عارضی کامیابیوں کی خاطر پوری قوم کے اخلاق کو تباہ کرنے سے باز آئیں۔

۲۔ جماعت کے انتخابی کام کی خرابیوں کا جائزہ اور ان کی اصلاح

پنجاب کے پچھلے انتخابات میں جماعت کے کارکنوں نے جن ۴۲ حلقوں میں انتخابی کام کیا ہے مجلس شوریٰ نے ان تمام حلقوں کے کام کا فرداً فرداً اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیا کہ ان میں ہمارے کارکنوں کا اخلاقی رویہ کیسا رہا ہے اور انہوں نے قانون اور ضابطے کی کس حد تک پابندی کی ہے۔ اس سلسلے میں ان تمام شکایات کی بھی تحقیقات کی گئی جو جماعت کے اندر یا باہر سے مرکزی دفتر میں پہنچی تھیں۔ اس جائزے سے یہ معلوم ہوا کہ صرف دو حلقے ایسے ہیں جن میں غیر اخلاقی کارروائیاں اور بے ضابطہ حرکات زیادہ وسیع پیمانے پر ہوئی ہیں اور یہ دونوں حلقے وہ ہیں جن میں انتخابی تنظیم کا ذمہ جماعت نے براہ راست نہیں لیا تھا بلکہ جنہیں بے ضابطہ حلقوں کی حیثیت سے قبول کیا گیا تھا۔ ان دونوں حلقوں

بارے میں مجلس شوریٰ نے امیرِ جماعت کو مشورہ دیا ہے کہ جماعت اسلامی کے جن کارکنوں نے
لقوں کو منظم کرنے کی سفارش کی اور پھر ان کارروائیوں کو روکنے میں ناکام رہے ان کے خلاف
دیبی کارروائی کی جائے۔

اس کے علاوہ چار حلقے ایسے ہیں جو براہِ راست جماعت کے چارج میں تھے اور وہاں جماعت کے
ن کارکنوں نے یا تو خود خلاف اخلاق اور خلاف ضابطہ کارروائیاں کیں یا اپنے حامیوں کو ان کے ارتکا
، روکنے میں کوتاہی برتی۔ ایسے کارکنوں کے خلاف بھی تادیبی کارروائی کرنے کا امیرِ جماعت کو مشورہ
ہے۔ اس کے ساتھ مجلس شوریٰ نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ہر انتخاب کے موقع پر یہ بات
ت کارکنانِ جماعت پر بلکہ جماعت کی حمایت میں جو لوگ کام کریں ان پر بھی اچھی طرح واضح کر دی
ئے کہ جماعتِ اسلامی انتخاب میں کسی نشست کو جیتنے کی بہ نسبت زیادہ اور بدرجہا زیادہ اہمیت
امر کو دیتی ہے کہ انتخابات کو بداخلاقیوں اور بے ضابطگیوں سے پاک کیا جائے اور انتخابی جنگ میں
لاقی حدود اور قانون و ضابطے کی پوری پوری پابندی کا نمونہ پیش کیا جائے۔ کیونکہ سیاست کو صداقت
دیانت پر قائم کرنا جماعت اسلامی کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے اور اس مقصد کو ہم کسی بڑے
بڑے وقتی فائدے پر بھی قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس بنا پر مجلس شوریٰ نے یہ بھی فیصلہ کیا
کہ آئندہ کسی ایسے رکنِ جماعت کو ہرگز معاف نہ کیا جائے جو کبھی انتخابی جدوجہد میں اخلاق اور ضابطے
حدود سے تجاوز کرے۔ اور جماعت کے باہر کے جن لوگوں سے اس طرح کی حرکات کا صدور ہو آئندہ
لئے ان کا تعاون قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے۔

۷۔ انتخابی غدر داریوں کا مسئلہ

مجلس شوریٰ نے انتخابی غدر داریاں داخل کرنے کے مسئلہ پر بھی غور کیا۔ جہاں تک ان اہم حلقوں کا
ہے جن میں جماعت اسلامی نے شکست کھائی ہے، یہ مجلس اپنے ذاتی علم، تجربے اور قومی
ذتوں کی بنا پر یہ رائے رکھتی ہے کہ ان میں کوئی ایک حلقہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے انتخاب کو

جائز ثابت نہ کیا جا سکتا ہو۔ اگر کوئی غیر جانبدار کمیشن تحقیقات کے لئے مقرر کیا جائے تو اس کے سامنے پیش کرنے کے لئے ہمارے پاس ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے ان پورے اکتالیس حلقوں کے انتخاب کو سراسر غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بحالت موجودہ مجلس شوریٰ انتخابی عذر داریاں داخل کرنے کو اس لئے لاحاصل سمجھتی ہے کہ

اولاً یہاں الیکشن ٹربیونل جس طریقے سے بنایا جاتا ہے اور جس طرح اس کی کارروائیاں ہوتی ہیں، اور جو حیثیت اس کے فیصلوں کو دی گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی انتخابی عذر داری مشکل ہی سے مفید نتیجہ پیدا کر سکتی ہے۔

ثانیاً اس کے مصارف اتنے زیادہ ہیں کہ جماعت کے موجودہ مالی ذرائع ان کا مالی بار اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

ثالثاً اگر کوئی انتخابی عذر داری کامیاب بھی ہو جائے تو اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ ضمنی انتخاب میں ان تمام خرابیوں کا اعادہ نہ ہو سکے جن کی بنا پر پچھلے انتخاب کو ناجائز ٹھیرایا گیا ہو۔

ان وجوہ سے انتخابی عذر داری داخل کرنے کو بطور پالیسی کے تو مجلس شوریٰ پسند نہیں کرتی۔ البتہ اگر کسی حلقۂ انتخاب کے مخصوص حالات اس بات کے متقاضی ہوں تو امیر جماعت مرکزی الیکشن بورڈ کے مشورے سے اس کی اجازت دے سکتے ہیں۔

۸۔ ضمنی انتخابات کا مسئلہ

پنجاب میں عام انتخابات کے بعد جو نشستیں خالی ہوئی ہیں ان کے بارے میں مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کے ضمنی انتخاب میں کوئی حصہ نہ لیا جائے۔ کیونکہ ان حلقوں میں جن وجوہ سے ہمیں ناکامی ہوئی ہے وہ وجوہ بدستور باقی ہیں، نہ عوام کی ذہنی و اخلاقی حالت میں کوئی تغیر واقع ہوا ہے اور نہ سیاسی پارٹیوں اور سرکاری حکام ہی کے رویے میں کسی تغیر کا امکان نظر آتا ہے۔

۹۔ لوکل باڈیز کے انتخاب کا مسئلہ

میونسپل کمیٹیوں، کارپوریشنوں، اور دوسری لوکل باڈیز کے انتخابات کے بارے میں مجلس شوریٰ کا

ئے یہ ہے کہ جہاں کہیں اس کی نوبت آئے مقامی جماعتیں خود اس بارے میں رائے قائم کریں کہ

وہ وہاں انتخابات میں حصہ لے سکتی ہیں یا نہیں اور اگر لے سکتی ہیں تو کس حد تک ؟ اگر وہ حصہ لینا

ہیں تو مقامی حالات، اپنی طاقت اور اپنے مجوزہ طریق کار کے متعلق ضروری معلومات مرکز میں بھیجکر

یات حاصل کریں۔

۱۰۔ پنچایتی نظام کی تشکیل جدید

پنجاب میں پنچایتی طریقے پر جدوجہد کے پہلے تجربے سے اس طریق کار میں جو نقائص پائے گئے

ان کا پورا جائزہ لینے کے بعد مجلس شوریٰ پنچایتی نظام کی تشکیل جدید کے لئے یہ تجویز کرتی ہے کہ

ہ جہاں کہیں انتخابی جدوجہد شروع کی جائے وہاں حسب ذیل طریق کار اختیار کیا جائے۔

(۱) اس پورے علاقے میں جہاں انتخابات منعقد ہونے والے ہوں جگہ جگہ وسیع پیمانے پر لٹریچر، تقریروں

انفرادی ملاقاتوں کے ذریعہ سے جماعت کے مقصد، طریق انتخاب اور منشور کی تشریح کی جائے اور لوگوں

ں کی طرف عام دعوت دی جائے

(۲) جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں ان کے سامنے حلقہ متفقین جماعت اسلامی (جن کا دوسرا نام اسلامی

ت بھی ہوگا) کی رکنیت کا ترمیم شدہ عہدنامہ (جس کا نمونہ اس قرارداد کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کیا جارہا ہے)

کیا جائے اور انہیں اس عہد کی ذمہ داریاں اچھی طرح سمجھا کر اس پر ان سے دستخط لئے جائیں۔

(۳) جس محلے یا بستی یا گاؤں میں کم از کم ۵ آدمی متفقین کے عہدنامے پر دستخط کر چکے ہوں وہاں ان کا

باقاعدہ منظم کر دیا جائے اور اگر وہاں کچھ ہمدرد اور متفقین پہلے سے موجود ہوں تو ان کو بھی اسی طریقہ سے

حلقے میں شامل کر لیا جائے۔ جماعت اسلامی کے مقامی ارکان اپنے محلے بستی یا گاؤں کے حلقہ متفقین

پ سے آپ (EXOFFICIO) ممبر ہوں گے۔

(۴) حلقہ ہائے متفقین کے ارکان کو ترغیب دی جائے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو، اپنے حلقے کو وسیع

کی کوشش کریں اور جس قدر ممکن ہو اپنے حلقہ میں جماعت کا لٹریچر فراہم کر کے خود پڑھیں اور دوسروں

پنچایتیں۔

(۵) جو لوگ حلقۂ متفقین کے عہدنامہ پر دستخط کرنے سے گریز کریں ان کے سامنے ووٹر کا عہدنامہ پیش کیا جائے اور اگر وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اس پر دستخط کرنے کے لئے آمادہ ہوں تو ان سے دستخط لئے جائیں۔ مگر ان پر یہ واضح کر دیا جائے کہ محض ووٹر کے عہدنامہ پر دستخط کرنے سے وہ اسلامی پنچایت کے رکن نہیں بن جائیں گے اور نہ اپنے حلقے کا نمائندہ نامزد کرنے میں ان کی رائے کا کوئی دخل ہو سکے گا۔ بلکہ اس عہدنامہ پر دستخط کرنے کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ اپنا ووٹ صحیح طریقے سے استعمال کرنے کا عہد کر رہے ہیں اور اگر اسلامی پنچایت اُن کے حلقے کے لئے کوئی ایسا نمائندہ نامزد کرے جسے وہ خود بھی ایمانداری کے ساتھ صالح اور اہل سمجھتے ہوں تو وہ اسے ووٹ دینے کے دیانتہً پابند ہوں گے۔

(۶) ایک تھانہ کے علاقے میں جتنے حلقہ ہائے متفقین ہیں ان سے ایک ایک دو دو نمائندے لے کر (جن کی تعداد کا انحصار ہر حلقے کے ارکان کی تعداد پر ہوگا) تھانے کی مرکزی پنچایت بنا دی جائے گی۔ انتخابی اغراض کے لئے ایک حلقۂ انتخاب کی مرکزی پنچایت اُن تھانوں کی مرکزی پنچایتوں یا ان کے نمائندوں کو ملا کر بنائی جائے گی جو اس حلقۂ انتخاب میں واقع ہوں۔ جماعت اسلامی کے جو ارکان کسی تھانے کے علاقے میں آباد ہوں وہ اس تھانے کی مرکزی پنچایت کے اور انتخابات کے موقع پر اس حلقۂ انتخاب کی مرکزی پنچایت کے آپ سے آپ رکن ہوں گے۔

(۷) جس انتخابی حلقے کی کم از کم ایک تہائی بستیوں میں حلقہ ہائے متفقین قائم ہو چکے ہوں اور جہاں کی کل رائے دہندہ آبادی کا کم از کم ۵ فیصدی حصہ ووٹر کے عہدنامہ پر دستخط کر چکا ہو۔ صرف اس کے بارے میں یہ غور کیا جا سکتا ہے کہ جماعتِ اسلامی وہاں انتخابی جدوجہد کرنا منظور کرے۔ لیکن اس کا آخری فیصلہ کرنے میں حسب ذیل امور کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوگا۔

(ا) یہ کہ اس حلقۂ انتخاب کی مرکزی پنچایت نے خود اس خواہش کا اظہار کیا ہو اور اس اظہار کے ساتھ انتخابی جدوجہد کے لئے اپنا عملی تعاون بھی پیش کیا ہو۔

(ب) اس حلقۂ انتخاب میں جماعت کے کم از کم تین رکن اور کم از کم دس سرگرم کارکن متفقین موجود ہوں۔

(ج) اس حلقۂ انتخاب کی مرکزی پنچایت نے یہ ذمہ لیا ہو کہ وہ اپنے حلقے کی انتخابی جدوجہد کا کم از کم

بسے خود فراہم کرے گی۔

(۸) ایک صوبے کے جتنے انتخابی حلقے اس طور پر تیار ہو چکے ہوں ان کے حالات کا جائزہ لینے اور پوری طرح اپنا اطمینان کر لینے کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کا مرکزی الیکشن بورڈ یہ فیصلہ کریگا کہ کتنے حلقوں میں انتخابی جدوجہد کی ذمہ داری قبول کی جائے۔ مگر یہ فیصلہ فہرست رائے دہندگان کی اشاعت کے بعد سے حد ایک مہینے کے اندر ہو جانا چاہیئے۔ اور جماعت کے ذمہ دار کارکنوں کا یہ فرض ہے کہ مرکزی الیکشن بورڈ کو تمام ضروری معلومات بہم پہنچا دیں۔

نوٹ:- یہاں جماعت کے ذمہ دار کارکنوں سے مراد جماعت کے انتظامی حلقوں کے امراء ہیں۔ وہ یہ معلومات اپنی مجالس شوریٰ کے ارکان کی مدد اور مشورے سے فراہم کر کے مرکزی الیکشن بورڈ کو بھیجیں گے۔ مختلف حلقہ ہائے انتخاب کے ناظمین اور دوسرے کارکن جو معلومات الیکشن بورڈ تک پہنچانا ضروری سمجھتے ہوں اپنے حلقہ کے امیر یا ارکان شوریٰ تک پہنچا سکتے ہیں۔ اگر وہ اس بارے میں اُن سے بالا بالا کوئی کارروائی کرنے کرانے کی کوشش کریں گے تو ان کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی جائے گی۔

(۹) مرکزی الیکشن بورڈ جن حلقوں میں انتخابی جدوجہد کی ذمہ داری قبول کرنے کا فیصلہ کرے۔ ان میں متفقین کی بھرتی، حلقہ ہائے متفقین کی تنظیم اور ووٹر کے عہد نامے پُر کروانے اور نئے حلقہ ہائے متفقین سے پنچایت کے لئے نمائندے لینے کی مہم پُوری قوت کے ساتھ شروع کر دی جائے۔

(۱۰) کوشش کی جائے کہ ہر حلقہ انتخاب میں کاغذات نامزدگی کے داخلہ کی تاریخ سے پہلے مرکزی پنچایت کے دو تین اجلاس ہو جائیں تاکہ تمام شرکاء پنچایت اچھی طرح ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں۔ انتخاب کے متعلق جملہ مسائل کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں اور اپنے حلقہ کی نمائندگی کے لئے موزوں اشخاص بھی خوب سوچ سمجھ کر تجویز کر سکیں۔

مرکزی پنچایت کے پہلے ہی اجلاس میں یہ بات واضح کر دی جائے کہ اپنے علاقے کی پوری جدوجہد مالی اور کوشش دونوں کے لحاظ سے ان کو خود ہی کرنی ہے۔ علاقے سے باہر کی امداد کے بھروسہ پر

کوئی کام نہیں کرسکتے ہیں۔

(۱۱) مرکزی پنچایت میں جن لوگوں کے نام اپنے حلقۂ انتخاب کی نمائندگی کے لئے پیش کئے جائیں ان میں سے جن کے نام پنچایت کے حاضر ارکان کی اکثریت نے تجویز کئے ہوں ان کے نام چھانٹ لئے جائیں پھر ان ناموں پر پنچایت کے ایک مجموعی اجلاس میں غور کیا جائے اور جن کو زیادہ سے زیادہ ارکان پنچایت کی پسندیدگی حاصل ہو ان کے نام جماعت اسلامی پاکستان کے مرکزی الیکشن بورڈ کو بھیج دیئے جائیں۔ ان کے ساتھ ان اشخاص کی سیرت، اخلاق، دینی حالت، علمی قابلیت، اور سابق زندگی کے متعلق وہ تمام ضروری علومات بھی بھیجی جائیں جو ان کے متعلق رائے قائم کرنے میں مددگار ہو سکیں۔

(۱۲) مرکزی الیکشن بورڈ ان ناموں پر غور کر کے آخری فیصلہ کرے کہ ان میں سے کون اصلح اور اہل تر ہے۔ اس کے کاغذات نامزدگی داخل کئے جائیں۔

[illegible] اگر پنچایت نے کسی ایک ہی شخص کو بالاتفاق تجویز کیا ہو اور مرکزی الیکشن بورڈ یا تو اسے منظور کرے، یا اعتراض ہونے کی صورت میں اپنے وجوہ اعتراض واضح طور پر بتلائے اور مرکزی پنچایت سے درخواست کرے کہ وہ ان اعتراضات کی روشنی میں اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کرے۔ بہرحال کوشش کی جائے کہ جس شخص کو بالآخر نامزد کیا جائے اس کے بارے میں حلقے کی مرکزی پنچایت اور جماعت اسلامی کے مرکزی الیکشن بورڈ دونوں کو پورا اطمینان حاصل ہو۔

(۱۳) ایک سے زائد حلقوں سے ایک ہی شخص کے نامزد ہو جانے کی صورت میں الیکشن بورڈ اس وقت تک نامزدگی کی منظوری نہیں دیگا جب تک کہ متعلقہ پنچایتوں پر یہ بات واضح نہ کر دی جائے کہ ایک سے زیادہ حلقوں سے کامیابی کی صورت میں نمائندہ بہرحال ایک ہی حلقہ کی نمائندگی کر سکے گا اور باقی حلقوں سے اسے استعفا دینا پڑے گا۔

(۱۴) ہر جگہ جہاں حلقہ متفقین قائم ہو اس کے قیام کے ساتھ ہی اس کا بیت المال بھی قائم ہو جانا چاہئے اور حلقہ کے متفقین کی اعانت، زکوٰۃ اور صدقات کی رقوم اس بیت المال میں جمع اور اس کے ذریعہ سے صرف ہونی چاہئیں۔ مگر ارکان جماعت اسلامی اس سے مستثنیٰ ہونگے کیونکہ ان کی رقمیں جماعت کے بیت المال میں داخل ہوں گی

نوٹ:۔ حلقہ ہائے متفقین کے ممبرشپ فارم کے لئے الگ رسیدیں چھپوائی جائیں گی البتہ انتظام جماعت کے تنظیمی حلقوں کے امراء اپنے اپنے حلقوں کی ضرورت کے مطابق خود کریں گے۔

نمونہ عہدنامہ حلقہ متفقین جماعت اسلامی پاکستان

مذکورہ شق ع۲ بالا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حلقۂ متفقین جماعت اسلامی پاکستان

(اسلامی پنچایت)

میں اللہ رب العالمین کو گواہ کرکے اقرار کرتا ہوں / کرتی ہوں کہ

(۱) میری دلی خواہش یہ ہے کہ پاکستان میں پورا اسلام پوری طرح قائم ہو۔

(۲) اس مقصد کے لئے مجھے جماعت اسلامی کے پروگرام، منشور اور طریقۂ انتخاب سے پورا اتفاق ہے

(۳) اس کام میں، جہاں تک میرے بس میں ہوگا، میں جماعت کا ساتھ دوں گا / دوں گی۔

(۴) میں انشاء اللہ خود بھی دینی فرائض کو ادا کرنے اور اپنی زندگی کو اسلام کے مطابق بنانے کی کوشش کروں گا / کروں گی اور دوسروں کو بھی اس کی نصیحت کرتا رہوں گا / کرتی رہوں گی۔

اللہ تعالیٰ مجھے اس عہد کو وفا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

دستخط یا نشان انگوٹھا ....

متفقین کے عہدنامہ کے یہ فارم سندھ اور کراچی کیلئے کراچی کی جماعت شائع کرے گی باقی سارے ملک کیلئے یہ فارم مرکز سے شائع کئے جائیں گے

۱۱ پنچایتی نظام کا مستقل پروگرام

مجلس شوریٰ کی تجویز ہے کہ انتخابی کام کے علاوہ اس پنچایتی نظام کو عوام کی اصلاح اور دعوت کی توسیع کے لئے ایک مستقل ذریعہ بھی بنایا جائے۔ اس غرض کے لئے جماعت اسلامی کے کارکن جہاں بھی وہ ہوں حلقہ ہائے متفقین کی تنظیم کا سلسلہ پوری طاقت کے ساتھ شروع کر دینا چاہئے جہاں انتخابی کام درپیش ہو یا نہ ہو۔ پہلے جہاں جہاں بھی حلقہ ہائے ہمدرداں بنے ہوئے تھے ان کو

مداد منشا کے مطابق نئے حلقہ ہائے متفقین میں تبدیل کر دیا جائے پہلے جن لوگوں نے حلقہ متفقین کے
نے عہدنامے پر دستخط کئے تھے اُن کے سامنے نیا ترمیم شدہ عہدنامہ پیش کیا جائے اور اگر وہ نئے
لقہ ہائے متفقین میں شامل ہونے کے لئے تیار ہوں تو ان سے جدید عہدنامۂ متفقین پر دستخط لے لئے
ئیں۔ اسی طرح پنجاب میں جہاں جہاں انتخابی اغراض کے لئے پنچایتیں بنائی گئی تھیں وہاں ان پنچایتوں
ے ارکان کو حلقہ ہائے متفقین کی تنظیم میں لانے کی کوشش کی جائے۔ جن لوگوں نے ووٹر کے عہدنامے پر
ستخط کئے تھے یا جن کے متعلق معلوم ہے کہ انہوں نے پچھلے انتخاب میں ہمارے ساتھ ووٹ دیئے ہیں
ن کو بھی اس تنظیم میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے۔

ان حلقہ ہائے متفقین و اسلامی پنچایتوں کے لئے مستقل پروگرام یہ ہوگا کہ اجتماعی اور معاشرتی اصلاح کے لئے
کوشش کریں مثلاً

(۱) اپنی بستی کی مسجدوں کی اصلاح حال۔

(۲) عوام میں علم دین پھیلانا۔

(۳) عام طور پر لوگوں کو ظلم و ستم سے بچانا اور خصوصاً ان لوگوں کو جنہوں نے پچھلے انتخابات میں
جماعت اسلامی کا ساتھ دیا ہے۔

(۴) قصبات اور دیہات میں دارالمطالعوں کا قیام۔

(۵) ایسے پرائمری سکول اور ہائی سکول اور مذہبی تعلیم کے مدرسے قائم کرنا جن میں تعلیم کے ساتھ
اخلاقی تربیت کی بھی کوشش کی جائے۔

(۶) تعلیم بالغاں کا انتظام۔

(۷) بستی کے عام لوگوں کے تعاون سے صفائی اور حفظانِ صحت کی کوشش۔

(۸) بستی کے یتیموں، بیواؤں، معذوروں اور غریب طالب علموں کی فہرستیں تیار کرنا اور جن جن طریقوں
سے ممکن ہو ان کی مدد کا انتظام کرنا۔ وغیرہ۔

۱۲۔ کارکنوں کی اخلاقی، روحانی اور ذہنی تربیت کا پروگرام

مجلس شوریٰ یہ محسوس کرتی ہے کہ تحریک اسلامی اب جس شدید جدوجہد کے مرحلے میں داخل ہوئی ہے

ایں ہماسے کارکنوں کی اخلاقی، روحانی اور ذہنی تربیت نہایت ضروری ہے۔ اس غرض کے لئے حسب
ا پروگرام تجویز کیا گیا ہے

(۱) جہاں کہیں جماعت میں کوئی عالمِ دین موجود ہے وہاں درسِ قرآن و حدیث کا سلسلہ شروع کر
یا جائے اور ارکان پر لازم کیا جائے کہ وہ اس درس میں شریک ہوں نیز متفقین کو بھی ترغیب دی
تے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

(۲) جہاں کوئی اہل آدمی موجود نہیں ہے وہاں کسی مستند ترجمہ و تفسیر کا اجتماعی مطالعہ کیا جائے۔
یت نہ رکھنے والے لوگوں نے اگر کہیں قرآن اور حدیث کا درس شروع کر رکھا ہو تو اسے لازماً بند کر
جائے اور صرف اس اجتماعی مطالعہ پر اکتفا کیا جائے۔

(۳) جماعت کے ہر تنظیمی حلقے میں ایک تربیت گاہ قائم کی جائے جس کا نگران یا تو امیرِ حلقہ
ہو یا حلقے کی مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے کسی اہل آدمی کو مقرر کیا جائے۔ اس تربیت گاہ کا
س پندرہ دن سے زیادہ کا نہ رکھا جائے اور کوشش کی جائے کہ ایک سال کے اندر اندر حلقے
تمام نئے اور پرانے ارکان اس سے گذر جائیں۔ ارکان کا اس تربیت گاہ میں آنا تو لازمی ہونا چاہئے
ن ان کی شرکت کی تاریخیں متعین کرنے میں ان کی زیادہ سے زیادہ سہولت کو مدِ نظر رکھا جائے۔ ارکان
علاوہ حلقہ ہائے متفقین کے کارکنوں کو بھی ترغیب دی جائے کہ وہ بھی اس تربیت گاہ سے فائدہ اٹھائیں
تربیت کے نصاب میں جو چیزیں شامل ہونی چاہئیں وہ یہ ہیں۔

ا۔ قرآن مجید کی ایسی آیات کا مجموعہ جو اخلاقی اور روحانی تربیت کے لئے مناسب ترین ہوں۔
(اس مجموعے کی تیاری کا کام مولانا مسعود عالم صاحب کے سپرد کیا گیا ہے)۔

ب۔ ایسی احادیث کا مجموعہ جن میں دین کی روح اور عبادات کے مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہو
رادی اور اجتماعی اخلاق کے متعلق ہدایات دی گئی ہوں اور جماعتی زندگی کے آداب اور اصول بتائے
ہوں۔ (اس مجموعے کی تیاری کا کام مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے سپرد کیا گیا ہے)

ج۔ فقہی احکام کے متعلق کوئی ایسا مختصر رسالہ جس سے روزمرہ کی زندگی کے ضروری مسائل کے

جائے۔ (شائع شدہ علمی لٹریچر میں سے کسی مفید سلسلے کا انتخاب ...
یم اشرف صاحب اور مولانا صدر الدین صاحب کے سپرد کیا گیا ہے)

عت کے لٹریچر کا ایسا خلاصہ جس سے جماعت اسلامی کی دعوت، اس کے طریق کار اور
، کو اچھی طرح سمجھا جا سکے۔ (اس خلاصے کی تیاری کا کام ملک محمد سعید احمد صاحب کے
ہے)

؛ رمضان میں نہ صرف نماز با جماعت کا اہتمام پوری پابندی سے کیا جائے بلکہ نماز تہجد بھی سب لوگ
نیز اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ تربیتی پروگرام کے رمضان میں گفتگو، نشست و برخاست اور
سکنات میں ہر طرح کے مکروہات سے پرہیز ہو اور ہر طرح آداب شرعی ملحوظ رکھے جائیں۔

۔ مذکورۂ بالا مجموعوں کیلئے مواد چھانٹنے اور تبلیغی رسالہ کے انتخاب کا کام ایک ماہ کے اندر اندر یعنی ... شعبان
لہ مکمل ہو کر مرکز میں آجانا چاہئے تاکہ تربیت گاہ کا پروگرام رمضان کے بعد شروع کیا جا سکے۔
ر اور حلقہ رمضان کے بعد تربیت گاہوں کے اجراء کے لئے انتظامات ابھی سے شروع کر دیں۔

مرکز اور مختلف مقامی جماعتوں کی طرف سے آیات قرآنی، احادیث اور جماعت کے لٹریچر کے اقتباسات
ور کتبے وقتاً فوقتاً شائع کئے جاتے رہے ہیں ان کی مدد سے اخلاقی، روحانی اور ذہنی تربیت کے لئے
کتنے منتخب کر کے خوبصورت طریقے سے شائع کر دیئے جائیں اور ان کو جماعت کے تمام دفاتر،
، دارالمطالعوں اور تربیت گاہوں میں آویزاں کیا جائے اور ان کی عام اشاعت اور فروخت بھی کی جائے۔
، لئے منیجر مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان کو ہدایت کر دی جائے۔

۱۴۔ تعلیم کا مسئلہ

ں تعلیم کے انتظام کی ابتری اور خصوصیت کے ساتھ اخلاقی تربیت کے فقدان کی وجہ سے جماعت کے
ں اور عموماً صحیح الخیال مسلمانوں کو اپنی نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے بارے میں جو پریشانیاں پیش آ رہی ہیں
ہوئے مجلس شوریٰ اب یہ مناسب سمجھتی ہے کہ

ں جہاں بھی مقامی حالات سازگار ہوں اور مقامی جماعتیں اپنے ارکان اور متفقین کے تعاون سے

انتظام کر سکیں وہاں پرائمری اور ہائی سکول قائم کئے جائیں اور ان میں رائج الوقت نصاب کو پڑھانے کے
ساتھ دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا خاص اہتمام کیا جائے لیکن اس کے ساتھ یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ ایسے ادارے
بار جماعت کے مالیات پر نہ پڑے۔

۲۔ اسی طرح لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کیلئے حلقہ ہائے خواتین زنانہ مدرسے قائم کرنے کی کوشش کریں لیکن
میں سر دست مناسب یہ ہوگا کہ لڑکیوں کا ایک مرکزی مدرسہ شہر لاہور میں مرکز کی براہ راست نگرانی و رہنمائی میں
لیا جائے اور جب یہ مدرسہ اطمینان بخش طریق پر چلنے لگے تو اسی نمونے پر دوسرے مقامات پر زنانہ مدرسے قائم
کی کوشش کی جائے۔ مرکزی مدرسہ کا انتظام اور اس کے لئے وسائل کی فراہمی کا کام حلقہ خواتین شہر لاہور امیر
ت کے مشورے اور رہنمائی سے کرے۔

۳۔ جناب محمد عبد الجبار غازی صاحب کو دوسرے سب کاموں سے فارغ کرکے جماعت کے تجویز کردہ نظام
کے مطابق ایک معیاری درسگاہ کے قیام کے لئے مختص کر دیا جائے۔ جماعت کے اندر اور باہر جو لوگ اس
ہ کی ضرورت اور اہمیت کا احساس رکھتے ہیں ان کو چاہئے کہ اس کے لئے ضروری وسائل کی فراہمی میں غازی
صاحب کا ہاتھ بٹائیں۔

بر دست اس مرکزی مدرسے کا قیام بھی تجویز ہی کی حد تک ہے کیونکہ عملاً اس کی راہ میں بہت سی مشکلات حائل ہیں
بڑی مشکل مدرسے کے لئے مناسب مکان کی ہے۔ بہرحال کوشش کی جا رہی ہے۔
س شوریٰ نے اس سلسلہ میں سردار محمد اجمل خاں صاحب کی اس پیشکش پر بھی غور کیا کہ یہ درسگاہ رحیم آباد ریاست بہاولپور
قائم کی جائے تو اس کے سارے مصارف وہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ معاملہ کے سارے پہلوؤں پر غور
نے کے بعد مجلس اس نتیجے پر پہنچی کہ سردار صاحب کی اس پیشکش کو مختلف وجوہ سے قبول نہیں کیا جا سکتا جن میں
ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جماعت کا کوئی مرکزی اور اہم ادارہ ایک ریاست کے حدود کے اندر قائم
مناسب نہیں ہے۔ سردار صاحب کے پیش نظر درسگاہ کو چلانے کے لئے مشورے اور رہنمائی کی نوعیت
یتی مدد ممکن ہو امیر جماعت اپنی صوابدید کے مطابق دیتے رہیں۔

۱۴۔ بیرون پاکستان میں تبلیغ و اشاعت

مجلس شوریٰ کی رائے میں یہ بھی ضروری ہے کہ

(۱) جتنے لوگ جماعت کے ارکان یا متفقین میں سے حج کے لئے جانے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ پہلے سے مرکز کو مطلع کر دیا کریں تاکہ ایسے سب لوگوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرا دیا جایا کرے اور اگر ان کا اجتماعی سفر ممکن نہ بھی ہو تو کم از کم زمانۂ حج میں وہ باہم مل سکیں اور ثواب زیارت کے ساتھ ساتھ تحریک اقامت دین کی توسیع کیلئے بھی کچھ کام کر سکیں

(۲) مجلس شوریٰ نے اپنے گزشتہ اجلاس میں جماعت کے تعارف کیلئے ایک دو ورقہ شائع کرنے کی جو ہدایت کی تھی اسے جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے تاکہ بیرونی ممالک کے لوگوں کو جماعت سے متعارف کرانے میں آسانی ہو۔

۱۵۔ جماعت کے نظام سے متعلق

مجلس شوریٰ نے جماعت کے موجودہ نظام کا بھی جائزہ لیا اور اس کے انتظامی قواعد میں سے بعض کو طول عمل کا موجب اور بعض کو بدلے ہوئے حالات میں غیر ضروری ٹھہراتے ہوئے ان میں حسب ذیل تبدیلیاں تجویز کیں۔

(۱) جبکہ امراء حلقہ اپنے حلقوں کی مفصل رپورٹیں ہر سہ ماہی اور سال کے اختتام پر مرکز میں بھیج دیتے ہیں تو حلقوں کے ماتحت ضلعی جماعتوں سے بھی رپورٹیں مرکز میں طلب کرنا غیر ضروری ہے۔ اس لئے آئندہ مرکز میں صرف حلقوں سے رپورٹیں طلب کی جائیں اور ضلعی جماعتوں کی رپورٹیں صرف حلقے کے دفتر میں بھیجی جایا کریں۔

(۲) رپورٹوں کی ترتیب کے بارے میں موجودہ ہدایات بہت طویل اور پیچیدہ ہیں۔ ان کو نظر ثانی کر کے از سر نو مرتب اور شائع کیا جائے

(۳) مقامی ضلعی اور حلقوں کے بیت المالوں کی رپورٹیں مرکز میں طلب کرنے کا قاعدہ بھی بند کر دیا جائے حلقے کے اندر انتظامی اور مالی سارے معاملات امیر حلقہ ہی سے متعلق ہونے چاہئیں اس لئے مقامی اور ضلعی بیت المالوں کی رپورٹیں صرف متعلقہ حلقے کے دفتر میں بھیجی جایا کریں۔ اور حلقے اپنے حسابات مرکز کو دیا کریں۔

(۴) تمام حلقوں میں بجٹ کا طریقہ رائج کیا جائے اور مرکز میں حلقہ کے بیت المال کی رپورٹ بھیجنے کے بجائے ہر سال کے شروع میں آئندہ سال کی متوقع آمدنی اور پیش نظر پروگرام اور منصوبوں کے جملہ مصارف کا مدوار زیادہ سے زیادہ صحیح تخمینہ مرتب کر کے حلقے کی مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کیا جائے۔ مجلس میں بحث و تمحیص کے بعد اس کی جو آخری صورت تجویز ہو اسے امیر جماعت اسلامی پاکستان کے پاس بھیج دیا جائے اور پھر ان کی رائے کی روشنی میں حلقہ کی مجلس شوریٰ بجٹ پر دوبارہ غور کر کے اس کا آخری فیصلہ کرے۔

مالی سال یکم اپریل سے ۳۱ مارچ متصور ہوگا۔ اور بجٹ کا طریقہ اسی سال سے شروع ہو جانا چاہئے۔

رسائل و مسائل

چند نئی موشگافیاں

سوال :-

"خدا کے دین کی اشاعت کا جو کام اپنی توفیق کے مطابق ہم لوگ سرانجام دے رہے ہیں، اس کے پھیلنے میں آپ کی بعض کتابیں، مثلاً دینیات، خطبات وغیرہ بہت مدد دے رہی ہیں اور ان کی مانگ بڑی بڑھ رہی ہے۔

لیکن دوسری طرف یہ کتابیں مخالفینِ کرام کا خاص ہدف بھی بنی ہوئی ہیں۔ ان کی بعض عبارات کو چھانٹ چھانٹ کر غلط فہمی پھیلانے اور ہمیں بدنام کرنے کی مہم جاری ہے۔ یہاں تک کہ دنیا پرست مفتیان کرام ان عبارات کی بنیاد پر ہمارے خلاف فتوائے کفر تک جاری کر چکے ہیں۔ ان حالات میں گفتگووں کا محور تمام تر چند خاص عبارات بن گئی ہیں۔ یہ عبارات حسبِ ذیل ہیں :-

۱۔ رسالۂ دینیات باب چہارم کے آخر میں آپ نے لکھا ہے کہ "یہ پانچ عقیدے ہیں۔ جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے۔ ان پانچوں عقیدوں کا خلاصہ صرف ایک کلمہ میں آجاتا ہے۔" پھر باب پنجم میں درج ہے کہ "پچھلے باب میں تم کو بتایا گیا ہے کہ حضرت محمد صلعم نے پانچ امور پر ایمان لانے کی تعلیم دی ہے" حالانکہ حدیث میں "والقدر خیرہ وشرہ" کو ملا کر ایمان کو چھ چیزوں پر مشتمل قرار دیا گیا ہے (نہ کہ پانچ پر) اس سے معترضین نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ "فرقۂ مودودیہ تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہ لوگ خیر و شر کے خدا کی طرف سے ہونے کے منکر ہیں۔ یہ وہی قدریہ ہیں جن کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ وہ اس امت کے آتش پرست ہیں۔" اس استدلال کی بنیاد پر صرف جھوٹی الزام تراشی ہی نہیں کی جا رہی ہے بلکہ ہمیں مرتد کا فر کہا جاتا ہے اور ہم پر طرح طرح کے مظالم توڑے جا رہے ہیں۔ بعض جگہ ہمدردوں کو مجبور

میں داخل ہونے سے روک دیا گیا ہے۔ علماء سوء عوام میں وعظ کہتے پھرتے ہیں کہ "لوگو خبردار ایسے لوگ ہیں جنہوں نے تمہارا ایمان چوری کیا ہے، انھیں جتنی اذیت دو کم ہے"

اس اعتراض کے جواب میں ہم نے واضح کیا ہے کہ ہمارا ایمان قدر پر ہے لیکن رسالہ دینیات میں ایمان صرف پانچ چیزوں پر مشتمل اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ قدر پر ایمان، ایمان باللہ کے اندر شامل ہے۔ اس جواب کی تائید میں ہم "مسئلہ جبر و قدر" کو پیش کرتے ہیں مگر معترضین آپ کے جواب پر معترض ہیں۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ "خطبات" میں آیت وقال اللہ انی معکم لئن اقمتم الصلوٰۃ ...... الخ کی آپ نے جو تفسیر کی ہے وہ عام مفسرین سے مختلف ہے۔ آپ نے "انی معکم" کو "لئن اقمتم" کا جواب بتایا ہے، حالانکہ عام مفسرین نے "انی معکم" کو جملہ مستانفہ قرار دیا ہے اور "لئن اقمتم" کا جواب "لاکفرن عنکم" بتایا ہے۔ آپ نے تو نہ صرف "لاکفرن" کو جواب نہیں لکھا ہے بلکہ خطبات میں آیت کے اس آخری حصہ کو بالکل چھوڑ ہی دیا ہے۔ معترضین کا دعویٰ ہے کہ نحوی قاعدے کے مطابق بھی "انی معکم" کا فقرہ "لئن اقمتم" کا جواب نہیں ہو سکتا کیونکہ "انی معکم" اور "لئن اقمتم" کے درمیان وقف جائز ہے، حالانکہ شرط و جواب کے درمیان تو وقف جائز نہیں ہو سکتا۔ ہم اس اعتراض کا کوئی جواب دیتے ہیں تو حضرات علماء فوراً یہ کہہ کر ہمارا منہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تم مودودی صاحب کے اندھے مقلد ہو اور عربی کے نحوی قواعد کا انکار کر کے بھی ان کی "تفسیر بالرائے" کی حمایت میں دلیلیں ڈالتے ہو۔ براہ کرم واضح فرمائیے کہ آپ کی تفسیر صحیح ہے تو کن دلائل کی بنا پر؟ اور کیا متقدمین میں سے بھی کسی نے یہ تفسیر کی ہے؟ نہیں تو وہ کیا اسباب تھے کہ آپ نے اس نئی تفسیر کی ضرورت محسوس کی؟ فصیح عربی زبان میں اس کی کوئی نظیر ہو تو اس سے ضرور مطلع کیجئے۔

۳۔ خطبات میں عبادات کے مقاصد کے تذکرے پر یہ اعتراض اٹھایا گیا ہے کہ آپ نے صرف ان کے دنیوی فوائد کا تذکرہ کیا ہے اور انہی کو اہم بتایا ہے، اور عبادات کے اخروی فوائد کا یا تو ذکر ہی نہیں کیا، یا اگر کیا ہے تو بھی ثانوی درجے کی حیثیت سے۔ اس کے جواب میں گو ہم اپنے علم

کے مطابق وضاحت کی کوشش کرتے رہتے ہیں مگر معترضین ہمارے جواب سے مطمئن نہیں ہوتے۔

بہرحال ان مسائل میں کتابوں کے اصل مصنف کی تشریحات کا مطالبہ عام طور پر کیا جاتا ہے اور ہم سب کا یہی رائے رکھتے ہیں کہ خود آپ کی توضیح زیادہ مفید ہوگی۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کتابوں کی عبارتوں میں ضروری ترمیم کر دی جائے۔

آخر میں یہ خوشخبری بھی عرضِ خدمت ہے کہ اندھی مخالفت کا یہ طوفان جتنا جتنا زور پکڑ رہا ہے ہماری دینی دعوت بھی اسی کے ساتھ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ ہمارے لئے خدا تعالیٰ سے دعا فرمائیے۔

جواب:-

آپ کو مالابار میں جس قسم کی مخالفتوں سے سابقہ پیش آ رہا ہے اس سے بدتر اور اس سے بہت زیادہ کمینہ قسم کی مخالفتوں سے ہم یہاں دو چار ہیں۔ بہرحال ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ صبر کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے کام کرتے چلے جائیں اور اپنی حد تک صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں۔ جو لوگ جس غرض اور جس نیت سے بھی ہماری مخالفت چاہیں، کریں، آخرکار فیصلہ اس خدا کو کرنا ہے جو ہماری نیت و عمل سے بھی واقف ہے اور ان کی نیت و عمل سے بھی!

(۱) رسالۂ دینیات بابِ چہارم کے آخر میں جہاں یہ فقرہ لکھا ہے کہ "یہ پانچ عقیدے ہیں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے"۔ وہاں میری طرف سے یہ حاشیہ لکھ دیا جائے:-

"میں نے یہاں ایمانیات کی تعداد پانچ بتائی ہے۔ یہ شمار قرآن مجید کے ارشاد آمن الرسول بما انزل الیہ ...... الآیہ (بقرہ۔ رکوع ۴۰) اور ومن یکفر باللہ وملئکتہ ..... الآیہ (نساء۔ رکوع ۱۹) پر مبنی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حدیث میں والقدر خیرہ وشرہ کو بھی ایمانیات میں شمار کیا گیا ہے اور اس طرح بنیادی عقائد پانچ کے بجائے چھ قرار پاتے ہیں لیکن درحقیقت ایمان بالقدر ایمان باللہ کا ایک جزء ہے اور قرآن میں اس عقیدے کو اسی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے میں نے بھی اس عقیدے کو عقیدۂ توحید کی تشریح میں داخل کر دیا ہے۔ بالکل اسی طرح بعض احادیث

میں جنت اور دوزخ اور صراط اور میزان کو الگ الگ عقائد کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ یہ سب ایمان بالآخرۃ کے اجزا ہیں۔"

مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ مالابار میں بعض علماء نے میری ان عبارتوں کو غلط معنی پہنا کر خواہ مخواہ یہ مشہور کرنا شروع کر دیا ہے کہ میں قدر کا منکر ہوں۔ حالانکہ اگر وہ اسی کتاب کے اسی باب میں وہ بحث پڑھ لیتے جو "انسان کی زندگی پر عقیدۂ توحید کا اثر" کے زیرِ عنوان کی گئی ہے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ میں تقدیر کی بھلائی اور برائی کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے مانتا ہوں۔ یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ لوگ تحقیق کے بغیر دوسروں کی طرف غلط عقیدے منسوب کرتے اور زبردستی ان کو گمراہ ٹھیرانے کی کوشش کرتے ہیں، اور ذرا نہیں ڈرتے کہ اس طرح کے بہتان لگانے پر وہ اللہ کے ہاں ماخوذ ہوں گے۔

(۲) آیت (قال اللہ انی معکم) کی تفسیر میں معیت کو میں نے نصرت کے معنی میں لیا ہے اور اس بنا پر یہ سمجھا ہے کہ اس نصرت کے لئے اقامتِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ وغیرہ بطور شرط کے ارشاد ہوئے ہیں۔ لیکن اگر انی معکم کے معنی یہ لئے جائیں کہ انی معکم بالعلم والقدرۃ فاسمع کلامکم واری افعالکم واعلم ضمائرکم واقدر علی ایصال الجزاء الیکم (یعنی میں اپنے علم وقدرت کے اعتبار سے تمہارے ساتھ ہوں اور تمہاری گفتگوئیں سنتا ہوں، تمہارے اعمال کو دیکھتا ہوں، تمہاری نیتوں کو جانتا ہوں اور تم کو جزا و سزا دینے پر پوری طرح قادر ہوں) تو اس صورت میں بلاشبہ یہ فقرہ بجائے خود ایک مکمل فقرہ ہوگا اور اس کے بعد لئن اقمتم کو اس سے جدا ایک الگ فقرہ قرار دینا درست ہوگا۔ اس معاملہ میں چونکہ دو تفسیروں کی گنجائش ہے اس لئے انی معکم کے بعد وقف جائز ہے مگر لازم نہیں اور وصل ممنوع نہیں!

جو لوگ میری اس تفسیر کو "تفسیر بالرائے" کہتے ہیں ان کو تفسیر بالرائے کے معنی معلوم نہیں۔ تفسیر بالرائے کے معنی پچھلے مفسرین سے اختلاف کرنے کے نہیں ہیں، بلکہ ایسی تفسیر کرنے کے ہیں جو قرآن یا حدیثِ صحیح کے خلاف پڑتی ہو، یا جو قواعدِ لغت کے خلاف ہو۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ نظیر کس چیز کی مانگتے ہیں۔ اگر شرط وجوابِ شرط کے درمیان تقدیم و تاخیر کی نظیر درکار ہے تو اس کی نظیریں بے شمار ہیں۔ خود قرآن میں ہے: قد افترینا علی اللہ کذباً ان عدنا فی ملتکم (اعراف۔۱۱)۔ اور اگر شرط اور جوابِ شرط کے درمیان وقف کی نظیر مانگتے ہیں تو میں اس کا قائل کب ہوں کہ اس کی نظیر پیش کروں۔ میں تو خود کہتا ہوں کہ انی معکم کے بعد وقف اس صورت میں جائز ہے جب کہ اس کو جملہ مستانفہ مانا جائے، اور اگر اسے جوابِ شرط مانا جائے تو وقف جائز نہیں۔

(۳) خطبات میں عبادات کے دُنیوی نہیں بلکہ اخلاقی فوائد کو میں نے زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں اخروی فوائد کا قائل نہیں ہوں یا انھیں کم اہمیت دیتا ہوں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے لوگوں کی نگاہوں سے عبادات کے اخلاقی، اجتماعی، اور تمدنی فوائد اوجھل ہو گئے ہیں، اور ان کے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے لوگ ان عبادات سے غفلت برتنے لگے ہیں۔ اس لئے میں نے ان پہلوؤں کو زیادہ نمایاں کیا ہے۔ نمایاں وہی چیز کی جاتی ہے جو مخفی ہو یا جس سے عموماً لوگ غافل ہوں، نہ کہ وہ چیز جس سے پہلے ہی [illegible] واقف ہوں۔

آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کی مدد فرمائے، اور فتنہ پردازوں سے آپ کی حفاظت کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسے موقع پر دعا فرمایا کرتے تھے۔ اللھم انا نجعلک فی نحورھم ونعوذ بک من شرورھم۔ یہی دعا میں بھی مانگتا ہوں۔ جو لوگ محض نفسانیت اور تعصب اور حسد کی بنا پر ہمارے خلاف طرح طرح کے فتنے اٹھا رہے ہیں اور محض اپنے ذاتی [illegible] کی وجہ سے اُس خیر کا راستہ روکنا چاہتے ہیں جس کے لئے ہم کوشش کر رہے ہیں، ان کے [illegible] سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور خدا سے یہی درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان سے نمٹ لے۔

(ا۔م)

جماعت اسلامی کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کی مہم

سوال :

میں اپنے قصبہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں جماعت اسلامی کی طرف سے کام کر رہا ہوں۔ چند اور رفیق بھی میرے ساتھ ہیں۔ ماہ فروری میں ساعت بھیجی تھی جس کی رپورٹ میں اپنی جماعت کے مرکز کو بھیج چکا ہوں لیکن اب ایک معاملہ ایسا پیش آگیا ہے کہ آپ سے استفسار کرنا ناگزیر ہوگیا ہے۔

پرسوں سے ایک مولانا صاحب جن کا نام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہے یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں اور انھوں نے قصبہ میں اپنے خاص اشتہارات (ایک نقل منسلک ہے[1]) کافی تعداد میں تقسیم کرائے ہیں پھر شام کو ایک بہت بڑے مجمع میں تقریر کر کے جماعت اسلامی کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا ہے۔ میں چند باتیں ان کی عرض کر کے ملتمس ہوں کہ ضروری تصریحات سے جلد از جلد میری رہنمائی فرمائی جائے۔

مولانا مذکور کے ارشادات یہ تھے :۔

(۱) جماعت اسلامی کے بڑے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب نہ تو کوئی مستند عالم ہیں نہ کوئی مفسر مگر اپنے ذاتی علم کی بنا پر ترجمہ اور تفسیر کرتے ہیں۔ اس کی مثال انھوں نے یہ دی ہے کہ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون کا ترجمہ خطبات میں یہ ہے کہ " نیکی کا مرتبہ تم کو نہیں مل سکتا جب تک کہ تم وہ سب چیزیں خدا کے لئے قربان نہ کر دو جو تم کو عزیز ہیں " اس کی تشریح میں مولانائے مذکور نے یہ فرمایا کہ دیکھو جماعت اسلامی تم کو نیک اور مسلمان نہیں سمجھتی جب تک کہ تم کل مال خدا کی راہ میں جماعت کو نہ دے دو۔ ورنہ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ تم نیکی میں کمال حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ اپنی پیاری چیزوں میں سے کچھ خدا کی راہ میں قربان نہ کر دو۔ مطلب یہ ہے کہ نیک اور مسلمان تو تم ہر وقت ہو ہی، جب تک تم یہ کہتے ہو کہ ہم مسلمان ہیں، البتہ کامل جب ہوگے جب پیاری شے میں سے کچھ خدا کی راہ میں قربان کر دوگے۔

قرآن کے چند ترجموں میں میں نے بھی دیکھا ہے کہ لفظی ترجمہ یہی ہے جو انھوں نے کیا ہے۔

[1] یہ ایک مطبوعہ اشتہار ہے۔ جس میں تین دیوبندی علماء کے فتوے درج ہیں۔

اس کی کیا تاویل ہو سکتی ہے؟

(۲) پھر انھوں نے یہ کہا کہ دیکھو جماعت اسلامی قرآن میں تحریف کرکے اس کو اپنے منشا کے مطابق ڈھالنا چاہتی ہے جو بہت بڑا ظلم ہے۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے ایک رسالہ ترجمان القرآن جلد ۱۲، عدد ۲، ۱۰ صفر مطابق اپریل ۱۹۳۹ء ص ۱۳۹ پر سورۂ بقرہ رکوع ۲۴ کی ایک آیت پیش کی ہے رسالۂ مذکور میں تحریر کردہ آیت یہ ہے: یا ایہا الناس ادخلوا فی السلم کافۃ الخ حالانکہ قرآن پاک میں یہی آیت اس طرح درج ہے: یا ایہا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ۔ الخ۔ یہ اُن کی ایسی دلیل ہے جو واقعی ہے اور مخالف لوگ اس تحریف سے جتنا بھی مشتعل ہوں کم ہے۔ چونکہ یہ قرآن کا معاملہ ہے جس کی بقا کے لئے ہر مسلمان خواہ وہ بے عمل ہی کیوں نہ ہو جان کی بازی لگا سکتا ہے، تو آپ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟

مولانا مذکور نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ میں نے جماعت اسلامی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور جب تک اس کام میں کامیابی حاصل نہ کر لوں گا دوسرا کام اپنے اوپر حرام سمجھوں گا۔ اسی لئے انھوں نے چند سو روپے کے فنڈ وصول کر کے چھپنے کے لیے بھیجے ہیں جن کے ذریعے پروپگنڈہ کیا جائے گا۔

جواب:

جو حالات آپ نے لکھے ہیں وہ اس سے کچھ مختلف نہیں ہیں جو پاکستان میں ہر جگہ رونما ہیں۔ ہم اور ہمارے مخالفین، دونوں اپنا اپنا نامۂ اعمال خود تیار کر رہے ہیں۔ جن اعمال کو ہم اپنے حساب میں درج کرانا چاہتے ہیں اُن کے لئے کوشاں ہیں اور دوسرے فضول کاموں میں اپنا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس کے برعکس ہمارے مخالفین نے اگر اپنے لئے یہی پسند کیا ہے کہ ان کے نامۂ اعمال میں ہماری مخالفت ہی سب سے نمایاں مقام پائے تو ضرور وہ اس کار خیر کو بڑھ چڑھ کر انجام دیں۔ ایک وقت آئے گا کہ ہم سب کے ہاتھ میں اپنا اپنا تیار کردہ کارنامۂ حیات دے دیا جائے گا اور حکم ہوگا کہ اقرأ کتابک کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا۔

جو مولانا صاحب آپ کے علاقے میں جماعتِ اسلامی کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کا بیڑا اٹھائے پھر رہے ہیں ان کے اعتراضات کا مختصر جواب یہ ہے:

(۱) خطبات کے جس مقام کو انھوں نے نشانۂ ملامت بنایا ہے وہ "زکوٰۃ کی حقیقت" کے زیرِ عنوان آپ خود تلاش کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ لن تنالوا البر الخ کا ترجمہ میں نے یہ کیا ہے "تم نیکی کے مقام کو نہیں پا سکتے جب تک کہ وہ چیزیں خدا کی راہ میں قربان نہ کرو جن سے تم کو محبت ہے۔" اور اس سے میں نے مراد یہ لی ہے کہ اللہ کا دوست بننے اور اس کی پارٹی (حزب اللہ) میں شامل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اللہ کی محبت پر جان، مال، اولاد، خاندان، وطن، ہر چیز کی محبت کو قربان کر دے۔ اس کے ساتھ ذرا مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ و تشریح پر بھی نگاہ ڈال لیں۔ وہ ترجمہ یہ فرماتے ہیں کہ "تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے۔" اور اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "شاید یہود کے ذکر میں یہ آیت اس واسطے فرمائی کہ ان کو اپنی ریاست عزیز تھی جس کے تھامنے کو نبی کے تابع نہ ہوتے تھے۔ تو جب تک وہی نہ چھوڑیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں درجۂ ایمان نہ پائیں" (ملاحظہ ہو: معجز نما حمائل شریف۔ مطبوعہ ۱۳۵۷ھ ۔ص ۹۷)۔ اب ہر شخص خود دیکھ لے کہ نہ میرا ترجمہ ہی مولانا ممدوح کے ترجمہ سے کچھ زیادہ مختلف ہے اور نہ اس کی تشریح ہی میں معنی کے لحاظ سے کوئی بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد معترض نے میرے ترجمہ و تشریح سے جو نتائج نکالے ہیں ان پر دوبارہ ایک نظر ڈال لیجیے۔ آخر میرے ترجمہ و تشریح سے یہ مطلب کیسے نکل آیا کہ جب تک کوئی شخص اپنا سارا مال خدا کی راہ میں جماعتِ اسلامی کے حوالے نہ کر دے، جماعت اس کو نیک اور مسلمان نہیں سمجھتی؟ اس طرح جو لوگ دوسروں کو مطعون کرنے کے لئے اپنی طرف سے غلط باتیں گھڑ کر ان کی طرف منسوب کرتے ہیں ان کی یہ حرکت خود ہی ظاہر کر دیتی ہے کہ وہ نفسانیت کی بنا پر مخالفت کر رہے ہیں نہ کہ للّٰہیت کی بنا پر۔

(۲) دوسری مثال جو انھوں نے دی ہے اس کو آپ کے دیئے ہوئے حوالے سے میں نے

اپریل [illegible] کے ترجمان القرآن میں نکال کر دیکھا اور معلوم ہوا کہ یہاں آیت نقل کرنے میں واقعی مجھ سے سخت غلطی ہوگئی ہے اور افسوس ہے کہ اس غلطی کی وجہ سے ترجمہ بھی غلط ہوگیا ہے۔ اس غلطی کو آج تیرہ سال ہوگئے۔ اس دوران میں آج تک نہ میری ہی نگاہ اس پر پڑی اور نہ کسی نے مجھ کو اس طرف توجہ دلائی۔ معترض بزرگ کا شکریہ کہ انھوں نے اس دیدہ ریزی کے ساتھ میری خطاؤں کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور ایسی سخت غلطی پر ان کے ذریعے مجھے تنبہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے، وہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سہو تھا یا دانستہ تحریف۔ بہرحال میرا معاملہ تو اللہ سے ہے۔ معترض بزرگ اگر پبلک کو حاکم حقیقی سمجھتے ہیں تو انھیں پورا اختیار ہے کہ اس کو دانستہ تحریف قرآن کے جرم کا ایک کھلا ہوا ثبوت کہہ کر لوگوں کے سامنے پیش کریں اور اس کا جتنا فائدہ اس دنیا میں اٹھا سکتے ہوں اٹھائیں۔

اب چند کلمات ان فتووں کے متعلق بھی عرض ہیں جو جناب مولانا مہدی حسن صاحب اور مولانا اعزاز علی صاحب اور مولانا فخرالحسن صاحب نے جماعت اسلامی کے خلاف صادر فرمائے ہیں۔ ان فتووں میں مجرد حکم بیان کیا گیا ہے۔ نہ تو مولانا مہدی حسن صاحب نے یہ بتایا کہ میری کتابوں اور مضامین میں کیا باتیں "اہل السنت والجماعہ کے طریقہ کے خلاف" ہیں اور انھوں نے کہاں سے یہ نتیجہ نکالا کہ میں "صحابۂ کرام اور ائمۂ مجتہدین کے متعلق اچھا خیال نہیں رکھتا" اور احادیث کے متعلق میرے کیا خیالات ہیں جو ان کے نزدیک "ٹھیک نہیں ہیں"، اور میں نے کہاں یہ لکھا ہے کہ میں "بے عمل مسلمانوں کو مسلمان ہی نہیں سمجھتا"۔ اور نہ مؤخرالذکر دونوں بزرگوں ہی نے کچھ تھوڑی سی مزید تکلیف گوارا کر کے وہ زہر پیش کیا جو جماعت کی جانب سے شہد میں ملا کر مسلمانوں کو استعمال کرایا جا رہا ہے اور نہ وہ دلائل ارشاد فرمائے جن کی بنا پر وہ مرزائیوں کو جماعت اسلامی کے "اسلاف" (افسوس کہ دونوں صاحبوں کو شریف آدمیوں کی سی زبان لکھنے کی توفیق بھی میسر نہ ہوئی) قرار دیتے ہیں اور اس جماعت کو اُن سے بھی زیادہ دین کے لئے مضر رساں بتاتے ہیں۔ اگر یہ اجمال و اختصار محض ضیق وقت کی وجہ سے ہے، جیسا کہ انھوں نے بیان فرمایا ہے، تو یہ بات نہایت افسوسناک

ہے کہ جن لوگوں کے پاس دلائل و وجوہ بیان کرنے کے لئے وقت نہیں ہے ان کو دوسروں پر اس قسم کے لغو اور مہمل فتوے جڑنے کے لئے کافی وقت مل جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے فتووں کے لئے کوئی معقول دلیل اپنے پاس نہیں رکھتے اس لئے انھوں نے محض چند سفری احکام جاری کر کے اپنے بغض کی تسکین کا سامان کیا ہے، تو میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان کے حق میں خدا سے نیک ہدایت کی دعا کر دوں۔ بہر حال، آپ موقع پائیں تو ان صاحبوں کو میرا یہ پیغام پہنچا دیں کہ آپ پر میرا اور جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے لوگوں اور عام مسلمانوں کا یہ اخلاقی حق ہے کہ آپ اپنے فتوے کے دلائل و وجوہ بیان فرمائیں۔ ان کی جو بات حق ہوگی اسے قبول کرنے میں انشاء اللہ دریغ نہ کیا جائے گا، اور میں اپنی حد تک یقین دلاتا ہوں کہ مجھے کبھی اپنی غلطی تسلیم کرنے میں نہ تامل ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا، بشرطیکہ میری غلطی دلائل سے ثابت کی جائے نہ کہ سب و شتم سے۔ اور اگر انھیں کوئی غلط فہمی لاحق ہوئی ہوگی تو اسے دلائل کے ساتھ رفع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ "ترجمان القرآن" کے صفحات خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ جس طرح مولانا حکیم عبدالرشید محمود صاحب گنگوہی کا مضمون بے کم و کاست یہاں شائع کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، اسی طرح ان کے ارشادات بھی کسی حذف و ترمیم کے بغیر درج کئے جائیں گے اور جواب حاضر کر دیا جائے گا۔ اشتہار بازوں کے لئے اوچھے ہتھیار فراہم کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے علمی وقار کے ساتھ سامنے تشریف لائیں اور اپنی پوری بات کہہ کر دوسرے کا پورا جواب سننے کے لئے تیار رہوں۔

دوسرے وہ حضرات بھی جو وقتاً فوقتاً اپنی مجلسوں میں میرے اور جماعت اسلامی کے خلاف اظہار خیال فرماتے رہتے ہیں، میری اس گزارش کے مخاطب ہیں۔ ان سے کہیں سابقہ پیش آئے تو عرض کر دیجئے کہ آپ کی شانِ تقویٰ اور جلالتِ قدر کے لحاظ سے یہ طریقہ کچھ موزوں نہیں ہے اولیٰ یہ ہے کہ شخصِ متعلق کو اپنے اعتراضات سے آگاہ فرمائیے تاکہ یا تو اس کی اصلاحِ خیال ہو جائے یا آپ کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے اکثر اصحاب نے جماعت اسلامی کی

ءات کو بالاستیعاب نہیں دیکھا ہے بلکہ یا تو کچھ نیازمندوں سے سنی ہوئی باتوں پر یقین کر لیا ہے
ض ہوشیار لوگوں نے خاص خاص عبارتیں پوری ہوشیاری کے ساتھ انھیں دکھائی ہیں،
نہی کمزور بنیادوں پر بدگمانیوں کے بڑے بڑے قصر تعمیر کر ڈالے گئے ہیں۔ اگر یہ حضرات کچھ اپنی
ذاری کو محسوس کر کے اور کچھ اخلاقی جرأت سے کام لے کر ہمیں اپنے اعتراضات سے مطلع
یں تو ہم پوری کوشش کریں گے کہ ان کو اپنے موقف سے اچھی طرح آگاہ کر دیں۔ ہاں یہ ضرور
کہ اشتہار باز حضرات کو اور ان لوگوں کو جو اپنے رسائل و جرائد میں مسلسل کینہ توزی کا مظاہرہ
تے رہتے ہیں، ہم منہ لگانے کے قابل نہیں سمجھتے۔ (ا-م)

تحریکِ اقامتِ دین پر دین کے سرپرستوں کی مزید عنایات

سوال:

جماعتِ اسلامی کے تحت قائم شدہ حلقۂ ہمدرداں تو ہمارے علاقے میں پہلے سے تھا،
لیکن باقاعدہ جماعتی کام حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ عوام کا رجحان جماعت کی طرف کثرت کے ساتھ
دیکھ کر ہمارے علمائے دیوبند، سہارنپور، دہلی اور تھانہ بھون نے جو فتادے شائع کئے ہیں وہ
ارسالِ خدمت ہیں، اور علمائے دیوبند کا ایک فتویٰ جو کہ ابھی زیرِ کتابت ہے، مفصل کتابی شکل میں
آنے والا ہے۔ آنے پر ارسال کر دیا جائے گا۔
ان فتووں کے جواب میں سکوت مناسب نہیں۔ غور کر کے جواب دیجیے[1]، یہ بھی تحریر فرمایئے کہ
اب آپ کا تعلق ہندوستان کی جماعتِ اسلامی سے کیا ہے؟ کچھ تعلق ہے یا نہیں؟ مولانا ابواللیث اصلاحی
جو کہ ہندوستان کی جماعت کے امیر ہیں حقیقت میں امیر ہیں یا صرف خانہ پُری کے لئے فرضی ہیں؟ نیز کہ

---

[1] حضرات علماء کی طرف سے فتووں کی بوچھاڑ کیے جانے پر پے در پے جو سوالات موصول ہوئے ہیں ان کو اس عنوان کے تحت یکجا کر دیا گیا ہے (ا-م)

اگر آپ نے کسی عالم سے فیض حاصل کیا ہو تو ان کا نام بھی تحریر فرمائیں اور اگر کوئی اور وجوہ آپ کو ان فتووں کے بارے میں معلوم ہوں تو وہ بھی تحریر کریں کہ اس قدر شدت کے ساتھ یہ طوفان کیوں اٹھ رہا ہے؟

جواب:

میں نے ان سب فتووں کو بغور پڑھ لیا ہے۔ یہ کسی جواب کے لائق نہیں ہیں۔ صرف اس لائق ہیں کہ انھیں اٹھا کر رکھ لیا جائے اور اُس وقت کا انتظار کیا جائے جب اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ میں نے پوری کوشش کی کہ ان فتووں میں مجھے اپنی کسی ایسی غلطی کا نشان مل جائے جو واقعی میں نے کی ہو اور ان حضرات نے دلائل کے ساتھ ثابت کر دی ہو۔ ایسی کوئی چیز ملتی تو میں یقیناً اس کا جواب دینے کے بجائے مان لیتا اور اپنی اصلاح کر لیتا۔ میں نے یہ کوشش بھی کی کہ اگر فی الواقع ان حضرات کو کوئی ایسی غلط فہمی ہوئی ہے جو دیانۃً کسی شخص کو میری کسی تحریر یا کسی عمل سے ہو سکتی ہو تو اسے معلوم کروں۔ اگر ان فتووں میں اس طرح کی کوئی چیز نظر آجاتی تو میں اسے صاف کرنے میں بھی ہرگز تامل نہ کرتا۔ لیکن مجھے ان کے غائر مطالعہ کے بعد یہ اطمینان ہو چکا ہے کہ یہ فتوے ان دونوں طرح کی باتوں سے بالکل خالی ہیں، اور ان میں بجز تحریف، بہتان اور الزام تراشی کے اور کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا میں ان پر سکوت اختیار کرنے میں حق بجانب ہوں۔ اگر کوئی مسلمان ان فتووں کو دیکھ کر مجھ سے بدگمان ہو یا اُس خیر سے رک جائے جس کی طرف میں دعوت دے رہا ہوں تو اس کی ذمہ داری سے میں عنداللہ بری ہوں۔ اس کی پوری ذمہ داری خالصۃً ان لوگوں پر ہے جو مناع للخیر بنے ہیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس نیت سے بنے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم ان غلط بیانیوں اور تحریفات کا پردہ کیوں نہیں چاک کر دیتے جو دعوت الی الخیر کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ میں عرض کروں گا کہ اگر کوئی ایک فتویٰ یا ایک اشتہار ہوتا تو شاید میں بادلِ ناخواستہ اس کی غلطیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش بھی کر گزرتا، اگرچہ ایسی چیزوں کی طرف توجہ کرنا میرے لئے سخت کراہیت کا موجب ہوتا ہے، لیکن یہاں تو پاکستان...

ہندوستان تک ہر طرف فتووں، پمفلٹوں، اشتہاروں اور مضامین کی ایک فصل اُگ رہی ہے جس میں کمیونسٹ، سوشلسٹ، فرنگیت زدہ ملحدین، قادیانی، منکرین حدیث، اہل حدیث، بریلوی اور دیوبندی سب ہی اپنے اپنے شگوفے چھوڑ رہے ہیں اور آئے دن نئے نئے شگوفے پھوٹتے رہتے ہیں۔ اس فصل کو آخر کون کاٹ سکتا ہے اور کہاں تک کاٹ سکتا ہے۔ مجھے اگر دنیا میں اور کوئی کام نہ کرنا ہو تو میں اسے کاٹنے میں اپنی عمر کھپاؤں، اور جماعت اسلامی اگر اپنے مقصد اور اپنے کام سے دست بردار ہو جائے تو اس پر اپنی محنت ضائع کرے۔ ہمارے مخالفین تو یہی چاہتے ہیں کہ ہم اس حماقت میں مبتلا ہوں اور اس جھاڑ جھنکار سے الجھ جائیں تاکہ فساق وفجار کی قیادت کو اپنا کام کرنے کے لئے صاف راستہ مل جائے۔ لیکن ہم نے ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں، ہم کہتے ہیں کہ یہ شیطان کی فصل ہے، وہی اسے کاٹے گا، خود نہ کاٹے گا تو سنۃ اللہ یہی ہے کہ بالآخر اس کو خود ہی اسے کاٹنا پڑے گا۔

آپ نے جو سوالات کئے ہیں ان کے مختصر جوابات یہ ہیں:۔

(۱) تقسیم کے بعد فروری ۴۸ء میں جماعت اسلامی بھی مسلم لیگ کی طرح باقاعدہ تقسیم ہو گئی تھی۔ اب ہندوستان کی جماعت اسلامی کا نظام پاکستان کی جماعت اسلامی سے بالکل الگ ہے۔ نہ اس کی ذمہ داری میں ہم شریک ہیں اور نہ ہماری ذمہ داری میں وہ شریک ہے۔

(۲) مولانا ابواللیث جماعت اسلامی ہند کے ویسے ہی امیر ہیں جیسا میں جماعت اسلامی پاکستان کا امیر ہوں۔ اگر میں فرضی یا خانہ پُری کا امیر نہیں ہوں تو آخر ان کے متعلق ایسا گمان کیوں کیا جائے۔ اس طرح کی بدگمانی کے لئے کوئی معقول بنیاد اگر ہو سکتی تھی تو یہ ہو سکتی تھی کہ ہماری یہاں کی پالیسی میں ان کا، یا وہاں کی پالیسی میں میرا کوئی دخل ہوتا۔ لیکن تقسیم کے بعد سے کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ ایسا کوئی تعلق ہمارے درمیان ہے۔ حد یہ ہے کہ ہمارے درمیان خط و مراسلت تک بند ہے تاکہ کسی کو فتنہ انگیزی کا بہانہ نہ مل سکے۔ افسوس ہے کہ لوگ مخالفت کے جوش میں اندھے ہو کر بلا ثبوت ایسی باتیں زبان سے نکال دیتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ ان کے لئے

تو یہ صرف دل کے بخار نکالنے کا ایک راستہ ہے مگر دونوں ملکوں کے موجودہ سیاسی حالات میں یہ سیکڑوں خاندانوں کی زندگی کے لئے ایک تباہ کن الزام بن سکتا ہے۔

(۳) یہ ایک لاحاصل سوال ہے کہ میں نے کس عالم سے فیض حاصل کیا ہے۔ یہ سوال تو اُس سے کرنا چاہیئے جس نے کوئی علمی کام نہ کیا ہو اور جس کے علمی مرتبہ و مقام کو جاننے کے لئے مدرسہ کی سند اور استادوں کے ناموں کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ ہو۔ میں نے کام کیا ہے اور میرا کام کوئی چھپا ہوا نہیں بلکہ چھپا ہوا سب کے سامنے موجود ہے۔ اُس کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ میں نے کیا کچھ پڑھا ہے اور جو کچھ پڑھا ہے اسے کتنا ہضم کیا ہے۔

(۴) میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ میری اور جماعت اسلامی کی اس قدر شدت کے ساتھ مخالفت یکایک اب کیوں شروع ہو گئی ہے اور یہ فتوے کن وجوہ سے دیئے جا رہے ہیں لیکن اگر میں اس کو جان بھی لیتا تو یہ غیر ضروری بحث ہے کہ کسی نے اعتراض کیا تو کیوں کیا۔ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا اعتراض معقول ہے یا نامعقول۔ معقول اعتراض ہوتا ہے تو اسے مان لیتے ہیں یا اس کا معقول جواب دیتے ہیں اور اگر نامعقول اعتراض ہوتا ہے تو اسے ہوا میں تحلیل ہونے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔

(ا۔م)

سوال:

عنایت نامہ مایوسی کی حالت میں پہنچا، اس سے میرے قلب و دماغ پر جو کچھ اثر کیا وہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔

میں نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کو لے کر میں ہر جماعت میں داخل ہوا لیکن ہر جگہ سے بد دل ہو کر لوٹا اور آخر کار فیصلہ کر لیا کہ اب کسی جماعت میں داخل نہ ہوں گا بلکہ انفرادی حیثیت سے جو کچھ خدمتِ دین ممکن ہو گی انجام دوں گا۔ اسی خیال کے تحت محلے کی مسجد میں بعد نماز فجر تفسیر حقانی اور بعد نمازِ عشاء رحمۃ للعالمین مولفہ قاضی سلمان منصور پوری یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء سے سنانی شروع کی میرے خیالات اس کام سے اور پختہ ہو گئے۔ ستمبر ۵۱ء میں اتفاقیہ ایک شخص کے ذریعہ مجھے "سیاسی کشمکش" کا تیسرا حصہ

مل گیا۔ میں نے اس کو کئی مرتبہ پڑھا، میرے خیالات کی دنیا نے پلٹا کھایا اور اب میں جماعت اسلامی کی
طرف متوجہ ہو گیا۔ لٹریچر کا خوب اچھی طرح مطالعہ کیا اور پھر مسجد میں خطبات سنانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔
اس کو شروع کرنے کے بعد وہ فتنہ پھوٹا جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

یہاں فضا میں یکے بعد دیگرے نوبہ نو فتوے پھیل رہے ہیں جن کی نقلیں ارسالِ خدمت ہیں۔
ادھر میں جماعت کے اجتماع میں شرکت کے بعد جب لوٹا تو معلوم ہوا کہ بستی میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ اب
اگر "مودودی خیالات" کے لوگ مسجد میں خطبہ وغیرہ پڑھیں تو ان کو پیٹ دینا چاہیے۔ چنانچہ اپنے امیر
جماعت نے استفسار کے جواب میں مشورہ دیا کہ اس سلسلے کو روک دیا جائے۔

اس دوران میں میں نے بعض بڑے علما سے خط و کتابت بھی کی اور ان حضرات کے خطوط میں
سے بعض کی نقلیں بھیج رہا ہوں۔ نقلوں پر ترتیب کے لئے میں نے نمبر ڈال دیئے ہیں۔

یوں تو میں عملی کام کے لئے ساری ہدایات اپنی مقامی جماعت سے حاصل کرتا ہوں، لیکن
چونکہ ان فتووں اور خطوط کا تعلق آپ کی ذات سے اور آپ کی تصانیف سے ہے، لہٰذا ان کو آپ
تک پہنچا رہا ہوں۔ آپ براہِ کرم ان کے جوابات تحریر فرمائیں اور اس کی اجازت دیں کہ جوابات کو
شائع کیا جا سکے۔

جواب:

آپ کے عنایت نامے سے اُن اسباب کا سراغ ملا جن کی وجہ سے دیوبند اور سہارنپور سے
لے کر مدرسۂ امینیہ تک یکایک یہ طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ ممکن ہے اسباب کچھ اور بھی ہوں، لیکن
ل قریبی سبب آپ کا (اور شاید آپ جیسے بعض اور لوگوں کا بھی) وہ بے جا جوشِ تبلیغ ہے جس
ے مغلوب ہو کر آپ نے بطورِ خود درس و افتاء اور مذہبی پیشوائی کے بڑے بڑے مسند نشینوں کو
اعت اسلامی اور اس کی تحریک کی طرف دعوت دے ڈالی، حالانکہ اس سے بارہا منع کیا
چکا تھا۔ بعید نہیں کہ آپ کی طرح کے بعض جوشیلے حضرات نے ان دینی مراکز کے گرد و پیش کی دنیا
ابھی پہنچ کر کچھ تبلیغی سرگرمیاں دکھائی ہوں اور وہ ان حضرات کے بھڑک اٹھنے کی موجب ہو

گئی ہوں۔ آپ تقسیم ہند سے پہلے کی روداد یں اٹھا کر دیکھ لیجئے، ان میں جگہ جگہ یہ چیز آپ کو ملے گی کہ لوگوں نے بار بار اکابر علماء کو دعوت دینے پر اصرار کیا ہے اور میں نے ہمیشہ نہ صرف خود اس سے پہلو تہی کی ہے، بلکہ جماعت کے عام ارکان کو بھی (بجز ان لوگوں کے جو خود اس کوچے سے تعلق رکھتے ہوں) تاکید کی ہے کہ دعوت کی غرض سے علماء کے پاس جانا تو درکنار ان کے قریب تک نہ پھٹکیں۔ مگر افسوس ہے کہ لوگوں نے میرے اس انکار اور ممانعت کے راز کو نہ سمجھا اور آخر کار اس کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ بعض لوگوں نے مجھ پر الٹی یہ بدگمانی بھی کی کہ میں نخوت اور تکبر کی بنا پر مذہبی آستانوں کی حاضری سے انکار کرتا ہوں۔ حالانکہ میرا حال یہ ہے کہ میں اپنے اس نصب العین کی خاطر "کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل" جانے کے لئے تیار رہوں اور ان شاء اللہ ہمیشہ تیار رہوں گا۔ ان آستانوں سے میرے گریز اور دوسروں کو بغرضِ دعوت ان کے پاس جانے سے منع کرنے کی وجہ ہرگز وہ نہ تھی جو لوگوں نے بدگمانی کی بنا پر سمجھی، بلکہ ایک دینی مصلحت تھی جس کو میں اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر ایک مدت سے خوب سمجھ چکا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام کی اکثریت یا تو قلتِ فہم کے باعث، یا کم ہمتی کے سبب یا پھر اپنی نااہلی کے اندرونی احساس کی وجہ سے دین و دنیا کی اُس تقسیم پر راضی ہو چکی ہے جس کا تخیل اب سے مدتوں پہلے عیسائیوں سے مسلمانوں کے ہاں درآمد ہوا تھا۔ انھوں نے چاہے نظری طور اسے پوری طرح نہ مانا ہو، مگر عملاً وہ اسے تسلیم کر چکے ہیں کہ سیاسی اقتدار اور دنیوی ریاست قیادت غیر اہلِ دین کے ہاتھ میں رہے، خواہ وہ فساق و فجار ہوں یا کفار و مشرکین، اور مذہب کی محدود دنیا میں ان کا سکہ رواں رہے، چاہے یہ محدود دنیا بے دین سیادت و قیادت کی مسلسل تاخت سے روز بروز سکڑ کر کتنی ہی محدود ہوتی چلی جائے۔ اس تقسیم کو قبول کر لینے کے بعد یہ حضرات اپنی تمام تر قوت دو باتوں پر صرف کرتے رہے ہیں: ایک اپنی محدود مذہبی ریاست کی حفاظت جس کے مسائل اور معاملات میں کسی کی مداخلت انھیں گوارا نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسی بے دین قیادت سے گٹھ جوڑ جو مذہب کے محدود دائرے میں ان کی اجارہ داری کے بقا

ضمانت دے دے اور اس دائرے سے باہر کی دنیا پر جس فسق اور جس ضلالت کو چاہے فروغ دیتی رہے۔ اس طرح کی ضمانت اگر کسی قیادت سے انھیں مل جائے تو یہ دل کھول کر اس کا ساتھ دیتے ہیں اور خود جان لڑا کر اسے قائم کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے، خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ کفر و الحاد اور فسق و ضلالت تمام سیاسی، معاشی اور تہذیبی قوتوں پر قابض ہو کر پورے دین کی جڑیں ہلا دے اور اُس محدود مذہبیت کے پنپنے کے امکانات بھی باقی نہ رہنے دے جس کی ریاست اپنے لئے محفوظ رکھنے کی خاطر یہ لوگ اس قدر پاپڑ بیل رہے ہیں۔

ان حالات میں اگر کوئی شخص یا گروہ دین اور اہلِ دین کی قیادت قائم کرنے کا ارادہ کرے اور دین و دنیا کی اس تقسیم کو توڑ کر زندگی کے پورے دائرے میں دین کا سکہ رواں کرنے کی کوشش شروع کر دے، تو بجائے اس کے کہ یہ حضرات خوش ہوں اور آگے بڑھ کر اس کا ساتھ دیں، یا کم از کم اس کام کو ہونے ہی دیں، ان کے آستانوں میں ایک کھلبلی سی مچ جاتی ہے، کیونکہ انھیں فوراً یہ خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ اس نوعیت کی قیادت قائم ہو جانے سے وہ ذرا سی جائداد بھی ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی جسے اتنی بڑی قیمت دے کر انھوں نے بچایا تھا۔ تاہم چونکہ معاملہ دین کا ہوتا ہے اس لئے کچھ مدت تک وہ خون کا گھونٹ پی کر اس کی باتوں کو برداشت کرتے رہتے ہیں اور احتیاط کے ساتھ اس امر کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ یہ بلا ان کی سرحدوں سے ذرا دور دور رہے۔ پھر اس کو جتنا جتنا فروغ ہوتا جاتا ہے ان کی بے چینی بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت وہ آ جاتا ہے کہ مقدس محفلوں میں سرگوشیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور کوشش کی جانے لگتی ہے کہ ہر آیندہ روندہ کے دل میں اس کے خلاف ایک نہ ایک وسوسہ ڈال دیا جائے۔

بات اگر اس حد تک بھی ٹھیری رہے تو بسا غنیمت ہے لیکن اگر کہیں ان کی مخصوص "رعیت" میں سے کچھ زیادہ آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر اس تحریک میں شامل ہونے لگیں، یا اس کے کچھ غیر محتاط کارکن خاص طور پر ان کے مراکز کے گرد و پیش چکر کاٹنے لگیں، یا کوئی جوشیلا فرد کسی بڑے

حضرت کو براہِ راست دعوت دے بیٹھے، تو پھر معاملہ حدِ برداشت سے گزر جاتا ہے۔ اُس وقت ان کی نگاہ میں کوئی کفر، کوئی الحاد، کوئی بڑے سے بڑا فتنۂ ضلالت، اور کوئی سخت سے سخت سیلابِ فسق و فجور بھی اتنا اہم نہیں رہتا کہ اس کے استیصال کی فکر انھیں اس دینی تحریک کے استیصال کی فکر سے زیادہ یا اس کے برابر لاحق ہو۔ وہ خود اور ان کے سارے متوسلین خاص طور پر اس شخص کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو اس تحریک کے چلانے کا اصل ذمہ دار ہو۔ خورد بینیں لگا لگا کر دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ کہاں کوئی ایسی گنجائش ملتی ہے کہ اس پر کفر یا کم از کم گمراہی کا فتوی لگایا جاسکے، یا اس کے سر کسی دعوے کا الزام تھوپا جاسکے، یا اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک فرقہ بنا کر عام مسلمانوں سے کاٹا جاسکے۔ یا اور کچھ نہیں تو اسے کم از کم اتنا بدنام ہی کر دیا جائے کہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ عناد کی نگاہ سے دیکھنے والوں کو جب خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی احادیث تک میں ایسے فقرے مل سکتے ہیں جنھیں سیاقِ عبارت سے الگ کر کے اور توڑ مروڑ کر بدترین اعتراضات کا ہدف بنانے کی گنجائشیں نکل آتی ہیں تو پھر کسی اور کی کیا ہستی ہے کہ اس کی تحریر و تقریر میں اس طرح کے لوگوں کو کہیں سے کچھ ہاتھ نہ آسکے۔ سیدھی طرح اگر کوئی چیز نہیں ملتی تو وہ ٹیڑھی ترکیبوں سے (جی ہاں! انھی ترکیبوں سے جو بریلوی حضرات نے مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود الحسن اور مولانا اشرف علی رحمہم اللہ کے خلاف استعمال کیں) کچھ نہ کچھ نکال کر رہتے ہیں اور ان پر فتوے جڑتے ہیں۔

میں اس راز سے واقف تھا اس لیے اول روز سے ہی میں ان حضرات کے ساتھ سخت احتیاط کی روش برتتا رہا اور دوسروں کو احتیاط کا مشورہ دیتا رہا۔ لیکن افسوس کہ رفیقوں اور ہمدردوں نے میری بات نہ مانی اور قریب قریب وہ ساری ہی غلطیاں کر بیٹھے جن کی وجہ سے تمام مذہبی توپ خانوں کے دہانے بیک وقت ہماری طرف کھل گئے۔ اب اگر آپ لوگ واقعی اس تحریک کے خیر خواہ ہیں تو براہِ کرم میری نصیحت قبول کریں اور حسبِ ذیل ہدایات کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے رہیں:

(۱) کسی بڑے حضرت کو زبان و قلم سے براہِ راست دعوت دینے کی ہرگز جرأت نہ کریں۔ آپ لوگ تو کلمۂ حق سمجھ کر اُن تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ یہ حضرات اس کے لئے احق ہیں، مگر وہاں یہ حرکت بالکل ہی ایک دوسری نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

(۲) طبقۂ علماء میں کوئی ایسا شخص تبلیغ کا خیال تک نہ کرے جو خود اس طبقے سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ علماء میں سے جو لوگ حق پرست ہیں ان تک بالواسطہ دعوت پہنچ رہی ہے اور وہ خود آہستہ آہستہ تو جذب ہو رہے ہیں۔ مگر ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ اس لباس میں کہاں حق پرست دل چھپے ہوئے ہیں اور کہاں متقیانہ شان کے ساتھ نفس کی بندگی ہو رہی ہے۔ اس لئے ایک مردِ حق کے مل جانے کی امید پر اُن جگہوں میں ہاتھ نہ ڈال دیجئے جہاں پچاس فتنے بھڑک اٹھنے کے لئے تیار ہوں۔

(۳) بڑے بڑے آستانوں سے ذرا دور دور رہ کر تبلیغ فرمائیے۔ اِن کے حمیٰ کے قریب اگر آپ جائیں گے تو یاد رکھیے کہ فوراً خطرے کی گھنٹی بج جائے گی۔

(۴) کوئی کارِ خیر اگر یہ حضرات کر رہے ہوں تو اس میں جہاں تک ممکن ہو دل کھول کر حصہ لیجیے، یا کم از کم تعریف کیجئے، اور حتی الامکان مین میکھ نکالنے سے قطعی پرہیز کیجئے۔

(۵) مجھے ہر کلمۂ تحسین سے بالکل معاف رکھیے۔ آپ لوگ تو ایک آدھ لفظ کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں اور مجھے مدتوں اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے، حتیٰ کہ اپنے سر کی ٹوپی تک بچانی مشکل ہو جاتی ہے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مذہبی دنیا میں "ساری حمد خاص واسطے ان حضرات کے" ہے۔ بے دین سیاست کے لیڈروں کی حمد و ثنا جتنی بھی ہو جائے مضائقہ نہیں، بلکہ ان میں سے کوئی بہت زیادہ مقبول ہو جائے تو وہ خود اِن حضرات کی زبانوں سے بھی مبالغہ آمیز حمد کا مستحق ہو جاتا ہے لیکن دین کی راہ سے جو شخص آئے اور ان آستانوں کا پروانہ لے کر نہ آئے اس کے حق میں ایک ادنیٰ سے ادنیٰ کلمۂ تعریف بھی ان کے دلوں پر تیر کا سا کام کرتا ہے! ان کی اس کمزوری کا لحاظ کر کے اگر آپ لوگ اس طرح کے کلمات زبان سے نکالنا بالکل بند کر دیں تو یہ میرے حق میں بھی بہتر ہے اور اس تحریک کے حق میں بھی۔ میں خدا کے فضل سے کسی تو

حاجت مند نہیں ہوں۔ جو کچھ کر رہا ہوں اپنے اندرونی احساسِ فرض کی بنا پر کر رہا ہوں۔ لوگوں کی
تعریف کے بغیر بلکہ مذمت کے باوجود انشاءاللہ اپنا کام اسی طرح کرتا رہوں گا۔

(۶) میری ذات پر جو حملے کئے جائیں ان کی مدافعت آپ لوگوں کے ذمے نہیں ہے۔ اگر میر
منع کرنے کے باوجود آپ لوگ اس سے باز نہ رہ سکیں تو براہِ کرم اس معاملے میں حدِ اعتدال
سے بھی کچھ کم ہی پر اکتفا کریں۔ زیادہ سے زیادہ بس اس قدر کافی ہے کہ اگر کوئی الزام مجھ پر
لگایا جائے یا کوئی علمی اعتراض مجھ پر ہو تو اپنے علم کی حد تک اس کی تردید کر دیں، یا مجھ
اس کی حقیقت پوچھ لیں اور اس کا جواب دے دیں۔ باقی رہی میری تذلیل و تحقیر، تو اس
میرے کسی دوست یا رفیق کو برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ اسے میں پہلے ہی ہر ایک کے لئے
معاف کر چکا ہوں۔ اور ہمارے موجودہ دور کے بزرگانِ دین کے لئے تو وہ آپ سے آپ
مباح ہے خواہ کوئی اسے معاف کرے یا نہ کرے۔ وہ چاہے کتنے ہی صریح اور رکیک الفا
میں دوسروں کو جاہل، احمق، گمراہ اور ہادمِ دین کہہ دیں، قابلِ مواخذہ نہیں۔ البتہ دوسرا
ان کی کسی بڑی سے بڑی غلطی پر بھی ٹوک دے، خواہ کتنے ہی ادب و احترام کے ساتھ ٹوکے،
تنقیص اور توہین کا مجرم ہے۔ اس کا مستقل زخم ان کے شاگردوں اور مریدوں کے دلوں
لگ جاتا ہے اور مدت العمر رستا رہتا ہے۔ یہ عالی ظرف لوگ ہیں، ان کی کسی بات پ
برا نہ ماننا چاہیئے۔

یہ نصیحتیں میں صرف اس لئے کرتا ہوں کہ ہمیں جہاں تک ممکن ہو فتنوں سے بچ کر چلنا چا
ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ان حضرات کی مخالفت سے کسی بڑے نقصان تو درکنار کسی ق
لحاظ نقصان کا بھی خوف نہیں ہے۔ بلکہ ان کی مخالفت ایک پہلو سے ہمارے لئے مفید بھی
اپنی تحریک کے اس دورِ توسیع میں ہمیں سخت اندیشہ ہے کہ کم فہم، ضعیف الاخلاق، اور پسد
ہمت لوگوں کی ایک بڑی تعداد، جو فی الواقع ہمارے کام کی نہیں ہے، محض ایک سطحی مذ
رجحان کی بنا پر کہیں ہمارے ساتھ شامل نہ ہو جائے۔ ہمارے پاس ان کے روکنے کا کوئی ذ

نہیں ہے، کیونکہ جو شخص ہمارے مقصد سے اتفاق ظاہر کر رہا ہو اور خود ساتھ دینے کا خواہش مند اسے آخر ہم کیا کہہ کر روک دیں۔ ہماری اس مشکل کو اللہ کے فضل سے ان حضرات کی بروقت مخالفت نے حل کر دیا ہے۔ جو لوگ درحقیقت ہمارے کام کے ہیں وہ تو انشاء اللہ پہلے سے زیادہ ہماری طرف توجہ کریں گے۔ اور جو بیکار رہیں، یا ہمارے لئے الٹے سبب ضعف بن سکتے ہیں انھیں یہ حضرات روکے کھڑے رہیں گے تاکہ ہمارا کام زیادہ اچھی طرح چل سکے۔ ممکن ہے کہ کام کے آدمی بھی کچھ ان کے روکے رک جائیں۔ مگر میں امید رکھتا ہوں کہ ان کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہ ہوگی جس کے لئے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت ہو۔ اُن پر بھی دیر سویر حقیقت کھل کے رہے گی اور وہ ایک صحیح کام کو سامنے ہوتے دیکھ کر زیادہ مدت تک اس سے الگ پڑے نہ رہ سکیں گے۔ (ا۔م)

سوال:

اقامتِ دین کی تحریک حسبِ معمول قدیم نئے فتنوں سے دوچار ہو رہی ہے۔ فتویٰ بازی اور الزام تراشی جس طبقہ کا مخصوص شعار تھا وہ تو اپنا ترکش خالی کر کے ناکام ہو چکا ہے۔ اب اصحابِ غرض نے ہمارے سلسلۂ دیوبند کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں کی جماعت اسلامی نے کچھ تنقید و تبلیغ میں بے اعتدالی سے کام لیا ہو اور اس کا ردِ عمل ہو۔ وہاں کے استفتاء کے جواب میں بھی اور یہاں پاکستان کے استفتاؤں کے جواب میں بھی مستند و محتاط حضرات کے فتاویٰ شائع ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ پاکستان میں اہلِ علم کا بہت زیادہ طبقہ دیوبند سے وابستہ ہے اور وہاں کے فتوے سے اثر پذیر ہونا بھی لازمی ہے جس کا اثر تحریک پر بھی پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا آپ مزید مناسب طریقے سے اس کی مدافعت کیجئے۔ ۳۲ صفحے کا ایک فتویٰ دارالافتاء سہارنپور کا شائع ہوا ہے جس کے آخر میں مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری اور مولانا اعزاز علی صاحب کا فتویٰ بھی ہے۔ رسالۂ دارالعلوم کا جو پہلا نمبر نکلا ہے اس میں حضرت مولانا گنگوہی کے پوتے حکیم محمود صاحب کا ایک طویل مکتوب ہے، اگرچہ انھوں نے تو

نہایت محتاط طریقے سے اور متانت کے رنگ میں لکھا ہے اور میرے خیال میں یہ انداز تعمیری ہے
لیکن بہرحال انھوں نے بھی تحریک کو عوام کے لئے دینی لحاظ سے مضر بتایا ہے۔ اثر انگیز ہونے کے لحاظ
سے جوشیلے اور غیر معتدلانہ فتووں سے یہ زیادہ مہلک ہوتا ہے۔ کل مجھے بٹالہ کے ایک بزرگ کا ضلع
.... سے خط آیا ہے جن کا حضرت گنگوہی سے تعلق تھا اور اس کے بعد سے دوسرے تمام
بزرگانِ دیوبند سے تعلق رہا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "ابھی مجھے حضرت .... کا خط
سہارنپور سے آیا ہے اور انھوں نے تحقیقِ حال کے طور پر پوچھا ہے کہ ایک واقعہ مجھے صحیح طور پر معلوم
کرکے لکھو" پاکستان سے برابر خط آرہے ہیں کہ مولانا مودودی حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت
مولانا نانوتوی کا نام لے لے کر ان کی مخالفت میں تقریریں کرتا رہا ہے اور کہتا پھرتا ہے کہ ان لوگوں
کو دین کے ساتھ مناسبت ہی نہ تھی اور خاص طور سے سرگودھا کی تقریروں کا حوالہ دیا ہے کہ وہاں
نام لے کر یہ مخالفت کی گئی" بٹالوی بزرگ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ صحیح واقعہ کیا ہے میں نے انھیں
جواب دے کر تردید کردی ہے کہ یہ محض افترا ہے، اور خود سہارنپور بھی حضرت ...... کو خط
لکھ دیا ہے۔ تاہم آپ خود بھی ان الزامات کی تردید کردیں، جواب در جواب کا سلسلہ بھی غلط
ہے اور سکوتِ محض سے بھی لوگوں کے شبہات قوی ہو جاتے ہیں، اس طرح اصل مقصد یعنی
تحریک اقامتِ دین کو نقصان پہنچتا ہے علی الخصوص حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی، حضرت مولانا اعزاز علی
صاحب، حضرت مولانا محمد طیب صاحب، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا حفظ الرحمن
صاحب، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، مولانا حافظ عبداللطیف
صاحب سے خط و کتابت کرکے انھیں مشورہ دیں کہ اگر میرے متعلق یا جماعت کے متعلق کوئی استفسار
آپ کے سامنے آئے تو جواب دینے سے پہلے آپ مجھ سے اصل حقیقت معلوم کرلیا کریں۔

جواب:

آپ کے مخلصانہ مشوروں کا بہت شکرگزار ہوں۔ ممکن تھا کہ میں ان مشوروں پر عمل بھی کرتا
لیکن اتفاق کی بات کہ آپ کا عنایت نامہ ملنے کے دوسرے ہی روز ایک صاحب نے مجھے

سعید احمد صاحب کا مفصل فتویٰ جو "کشفِ حقیقت" کے نام سے چھپا ہے بھیج دیا اور اس کے ساتھ دو تین اور اشتہار بھی بھیجے جن میں مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا جمیل احمد صاحب تھانوی، مولانا اعزاز علی صاحب اور مفتی مہدی حسن صاحب کے فتوے درج تھے۔ ان تمام فتووں کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی۔ اب یہ حضرات اس مقام سے گذر چکے ہیں جہاں ان کو خطاب کرنا مناسب اور مفید ہو۔ سب سے زیادہ افسوس مجھے مولانا کفایت اللہ صاحب پر ہے، کیونکہ میں ۴۲ سال سے ان کا نیازمند ہوں اور ہمیشہ ان کا احترام کرتا رہا ہوں۔ افسوس کہ انھوں نے جماعتی عصبیت میں آنکھیں بند کر کے یہ فتویٰ تحریر فرما دیا۔ یہ بہت بُرا توشۂ آخرت ہے جو انھوں نے اپنی عمر کے آخری دور میں اپنے ساتھ لیا ہے۔ باقی رہے دوسرے حضرات تو ان کے فتوے پڑھ کر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ جس وقت یہ فتوے لکھے جا رہے تھے اس وقت خدا کا خوف اور آخرت کی جوابدہی کا احساس شاید ان کے قریب بھی موجود نہ تھا۔ خصوصاً مفتی سعید احمد صاحب کے فتووں میں تو صریح بددیانتی کی بدترین مثالیں پائی جاتی ہیں جنھیں دیکھ کر گھن آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان حضرات کے ساتھ بڑا حسنِ ظن رکھتا تھا، مگر اب ان کے یہ فتوے دیکھ کر تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ بریلوی طبقہ کے فتوے باز و کافر ساز مولویوں سے ان کا مقام کچھ بھی اونچا نہیں ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں اس قسم کی تحریروں کا جواب کبھی نہیں دیا کرتا، اس لئے یہ اندیشہ نہ فرمائیں کہ ان فتووں کے جواب میں یہاں سے کچھ لکھا جائے گا اور بات بڑھے گی۔ لیکن اس کے ساتھ میرا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ جو مجھے ٹھوکر مارے میں اس کے آگے سر جھکا دوں۔ یہ طریقہ نہ کسی کام کی عزت کے مطابق ہے جسے میں کر رہا ہوں، اور نہ اس طریقے سے فی الواقع دین ہی کی کوئی مصلحت پوری ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ اگر دیانت اور سچائی کا ہتھیار لے کر حملہ آور ہوتے اور مجھ میں یا جماعت اسلامی کی تحریک و نظام میں کوئی ایسی خرابی بتلاتے جو فی الواقع ان کے دلائل سے ثابت ہوتی تو میں یقیناً ان کے آگے جھکتا اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے اپنی اصلاح کرتا، لیکن انھوں نے تو صاف جھوٹ کا استعمال کیا ہے اور حملہ آور ہونے میں دنائت کی راہ اختیار کی ہے۔

میں ان کے ساتھ وہی طریقہ اختیار کروں گا جو ایک شریف آدمی کو کرنا چاہیے۔ یعنی اذا مروا باللغو مروا کراما۔

اس میں شک نہیں کہ دیوبند اور سہارنپور کے ان فتووں کا ان لوگوں پر برا اثر پڑے گا جو ان دونوں مراکز علمی سے وابستہ ہیں لیکن سنۃ اللہ کے مطابق آزمائش ضروری ہے، اور اب اس پورے دیوبندی و مظاہری گروہ کے لئے آزمائش کا وقت آگیا ہے۔ دیکھنا ہے کہ ان میں سے کتنے لوگ حق پرست ہیں اور کتنے اشخاص پرست! جو حق پرست ہیں وہ انشاء اللہ ہمارے ساتھ رہیں گے اور آئندہ بھی ہمارے ساتھ آتے رہیں گے، اور جو اشخاص پرست ہیں اور جماعتی عصبیت میں مبتلا ہیں وہ ہم سے الگ ہو جائیں گے اور آئندہ بھی ہمارے ساتھ نہ چلیں گے۔ ہمیں صرف پہلے گروہ ہی کی ضرورت ہے، دوسرے گروہ سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ وہ ہٹ جائے گا تو ہم خدا کا شکر ادا کریں گے اور آئندہ ہم سے بے تعلق رہے گا تو مزید شکر کریں گے۔

حکیم محمود صاحب گنگوہی کا مضمون ایک واسطے سے ترجمان القرآن میں چھپنے کے لئے آیا ہے اور وہ مع جواب شائع کیا جا رہا ہے۔ آئندہ بھی اگر اس گروہ کے کوئی صاحب مجھ پر یا جماعت اسلامی پر کوئی علمی تنقید فرمائیں گے تو اسے بلا تامل شائع کیا جائے گا اور قابل جواب باتوں کا جواب بھی دے دیا جائے گا۔ (ا۔م)

اعتراضات بلا ادنیٰ تحقیق

سوال :-

آپ کی کتابوں کی بعض باتوں پر مجھے شک ہے۔ اس سلسلے میں چند سوالات بھیج رہا ہوں۔ ان کے جواب دے کر مطمئن کریں:

۱۔ آپ قضا و قدر کو جزوِ ایمان نہیں سمجھتے جیسا کہ آپ کی مندرجہ ذیل تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ "ہر چند میرے نزدیک مسئلہ قضا و قدر جزوِ ایمان نہیں ہے۔" (مسئلہ جبر و قدر، ص: ۱۵) لیکن علمائے دین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ جزوِ ایمان ہے۔ جیسا کہ آتا ہے: اٰمنت باللّٰہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاٰخر والقدر خیرہ وشرہ من اللّٰہ تعالٰی والبعث بعد الموت۔

۲۔ آپ نے رسالہ تجدید و احیائے دین میں فرمایا ہے کہ "نماز ایک ٹریننگ ہے، اصلی عبادت نہیں ہے بلکہ اصلی عبادت کے لئے تیار کرتی ہے۔" یہی عقیدہ علامہ عنایت اللہ المشرقی رکھتے ہیں جو کہ اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ جواب میں بتلایئے کہ نماز اصلی عبادت کیوں نہیں؟

۳۔ حضرت امام مہدی علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے صعود یا نزول کے متعلق آپ کا کیا عقیدہ ہے؟

۴۔ کیا مسیح اور مہدی ایک ہی وقت میں نازل ہوں گے، یا علیحدہ علیحدہ وقتوں میں تبلیغِ اسلام کریں گے؟

۵۔ کیا امام مہدی اور مسیح دونوں ایک ہی وجود میں نازل ہوں گے یا علیحدہ علیحدہ وجود میں؟

۶۔ اگر وہ ایک ہی وقت میں نازل ہوں گے تو وہ اپنا امیر کس کو بنائیں گے؟ ان میں کون ایک کی بیعت کرے گا اور کیوں؟

۷۔ کیا مسیح نبی اللہ ہوں گے؟ اگر ایسا ہے تو ان پر وحی ہونا لازم ہے یا نہیں؟ اور وہ کس عقیدے کی تبلیغ کریں گے؟ کیا اسلام کی یا عیسائیت کی؟[1]

---

[1] خدا کے نازل کئے ہوئے دین کی کوئی قسم عیسائیت نام کی نہیں ہے۔ عیسائیت تو اس گروہ کے تحریف کردہ مذہبی نظام کا نام ہے جو مسیح علیہ السلام پر ایمان لانے کا مدعی ہو گیا تھا۔ (فاضل مجیب)

۸۔ مسیحؑ کی حیات و وفات کے متعلق آپ اپنا عقیدہ قرآن و حدیث کی روشنی میں ظاہر کریں۔ اسی طرح نزول و صعود کے متعلق بھی آپ کی تحریروں سے شبہ پڑتا ہے کہ مسیحؑ اور مہدی کے آپ منکر ہیں؟

جواب کو خبر یا ترجمان القرآن میں شائع فرما دیں تو زیادہ بہتر ہوگا![1]

جواب :-

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ کے سوالات پر کچھ عرض کرنے سے پہلے میں آپ کو یہ نصیحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اول تو اپنی دنیا و عاقبت کی فکر چھوڑ کر دوسروں کے خیر و شر کی کھوج میں پڑنا ہی کوئی معقول کام نہیں ہے، تاہم اگر آپ کو ایسا ہی کچھ شوق ہے کہ دوسروں کے حقائق کی ٹوہ لیتے پھریں یا کچھ ایسی ضرورت لاحق ہو گئی ہے کہ دوسروں کے متعلق رائے قائم کریں تو کم از کم آپ کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی شخص کے متعلق کوئی اچھی یا بری رائے تحقیق کے بغیر قائم کرنا بہت بری بات ہے۔ آج کل بہت سے پیشہ ور لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو خواہ مخواہ کسی فائدے کے لالچ کی بنا پر یا محض بغض و حسد کی بنا پر دوسروں کو بدنام کرنے کے لئے طرح طرح کے اشتہارات شائع کرتے ہیں اور ان میں ہر قسم کی غلط باتیں دوسروں کی طرف منسوب کرکے خلق اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان اشتہارات کو دیکھ کر اور ان کے غلط حوالوں کو پڑھ کر کسی شخص کے متعلق رائے قائم کرنے کے بجائے آپ کو خود وہ اصل کتابیں پڑھنی چاہئیں جن میں اس شخص نے اپنے خیالات بیان کئے ہیں۔

اس نصیحت کے بعد آپ کے سوالات کے مختصر جوابات عرض کرتا ہوں :-

۱۔ آپ نے میری کتاب مسئلۂ جبر و قدر کے جس فقرے کا حوالہ دے کر مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ تم قضا و قدر کو جزوِ ایمان نہیں سمجھتے وہ فقرہ میری عبارت کا نہیں ہے بلکہ اس شخص کی عبارت کا ہے

[1] یہ سوالات جرمنی میں مقیم ایک طالب علم کی طرف سے موصول ہوئے ہیں۔ (نائب مدیر)

جن کے سوالات کے جواب میں میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ آپ کے اس سوال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو آپ نے میری اس کتاب کو خود نہیں پڑھا، یا پھر آپ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ایک شخص اپنی کسی تحریر کے درمیان جس عبارت کو حاشیہ چھوڑ کر واوین کے درمیان نقل کرتا ہے وہ اس کی اپنی عبارت نہیں ہوتی بلکہ دوسرے شخص کی عبارت ہوا کرتی ہے۔ اگر آپ نے یہ کتاب خود نہیں پڑھی ہے بلکہ کہیں سے سن سنا کر اس فقرے کے حوالے سے مجھ پر ایک الزام چسپاں کر دیا ہے تو آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ یہ حرکت کر کے آپ کیسی سخت بے انصافی کے مرتکب ہوئے ہیں، اور اگر آپ نے اس کتاب کو خود پڑھا ہے اور پھر بھی آپ یہ نہیں سمجھ سکے کہ جس عبارت کا ایک فقرہ آپ نقل کر رہے ہیں وہ میری عبارت نہیں، بلکہ اس سائل کی عبارت ہے جس کا جواب دینے کے لئے میں نے اسے نقل کیا ہے، تو آپ فرمائیں کہ اس قابلیت اور سمجھ بوجھ کے آدمی کو آخر کیا ضرورت پڑی ہے کہ اتنے بڑے بڑے مسائل کے متعلق دوسروں کے عقائد کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ کرنے بیٹھ جائے۔

۲۔ سوال نمبر ۲ میں آپ نے میرے رسالہ "تجدید و احیائے دین" کے حوالے سے جو دوسرا فقرہ نقل کیا ہے وہ تجدید و احیائے دین میں نہیں ہے، بلکہ میری ایک دوسری کتاب "اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر" میں ہے۔ اس غلط حوالے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ آپ نے میری کوئی کتاب بھی نہیں پڑھی ہے بلکہ میرے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والوں سے کچھ سن سنا کر اپنی یہ فرد قرار داد جرم تصنیف کر ڈالی ہے۔ پھر آپ کا یہ ارشاد کہ "یہی عقیدہ علامہ عنایت اللہ خان المشرقی بھی رکھتے ہیں" ——— یہ راز منکشف کرتا ہے کہ آپ نہ مشرقی صاحب کے متعلق کچھ جانتے ہیں اور نہ میرے متعلق۔ براہِ کرم میری کتاب "اسلامی عبادات" کو کہیں سے حاصل کر کے خود پڑھیے۔ اس میں [illegible] سے [illegible] تک کی عبارات پڑھنے سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ مشرقی صاحب کیا کہتے ہیں۔

۳۔ آپ کے سوالات نمبر [illegible] کا جامع جواب یہ ہے:

ظہورِ مہدیؑ اور نزولِ مسیحؑ کے بارے میں کثرت سے جو احادیث مروی ہیں اُن سب کو جمع کر

سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام مہدیؑ کا ظہور اور مسیحؑ ابن مریم علیہ السلام کا نزول دونوں ایک ہی زمانے میں ہوں گے۔ یہ الگ الگ شخصیتیں ہوں گی۔ مسلمانوں کے امیر و امام مہدی علیہ السلام ہی ہوں گے۔ مسیحؑ ابن مریم علیہ السلام اس وقت ایک مستقل صاحب شریعت نبی کی حیثیت سے نہ ہوں گے بلکہ شریعتِ محمدیؐ کے متبع ہوں گے اور مہدی علیہ السلام کے پیچھے نماز ادا کریں گے۔

۴۔ آپ کے آٹھویں سوال کا جواب یہ ہے کہ مسیحؑ کی حیات و وفات کے متعلق میں اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" میں وضاحت کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔ براہِ کرم سورۂ آلِ عمران رکوع ۶، اور سورۂ نساء رکوع ۲۲ کے حواشی پڑھ لیجیے۔ آپ کا یہ ارشاد کہ "تمہاری تحریروں سے شبہ پڑتا ہے کہ تم مسیحؑ و مہدیؑ کے منکر ہو" حوالے کا محتاج ہے۔ آپ کی بڑی عنایت ہو گی اگر میری ان تحریروں کی نشان دہی فرمائیں جن سے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ نیز اگر مضائقہ نہ ہو تو یہ بھی ساتھ ہی فرما دیں کہ وہ تحریریں آپ نے خود پڑھی ہیں یا کسی سے آپ نے یہ باتیں سن کر لکھ دیں۔

آپ برا نہ مانیں اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ درحقیقت آپ کے سوالات جواب دینے کے لائق نہ تھے مگر ان کا جواب صرف اس لئے دے رہا ہوں اور رسالہ ترجمان القرآن میں بھی اسی غرض کے لئے ان کو شائع کر رہا ہوں کہ اُن غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جو بعض غرض پرست علماء اپنی افترا پردازیوں سے سادہ لوح عوام کے دلوں میں پیدا کر رہے ہیں۔ (ا۔م)

چند دلچسپ سوالات

سوال:۔

"حسبِ ذیل استفسارات[1] پر روشنی ڈال کر بے پایاں شکریہ کا موقع دیں:

---

[1] یہی سوالات کچھ لفظی تصرف کے ساتھ جماعت اسلامی کے متعدد رفقا کو موصول ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک منصوبہ بندی کے ساتھ یہ کام ہو رہا ہے۔ (ناشر مرتب)

۱۔ اگر آپ کی جماعت پاکستان میں نہ آجاتی تو تحریکِ اسلامی کے ظہور پذیر ہونے یا پھلنے کے امکانات کا خاتمہ ہو جاتا۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں؟

۲۔ پنچائتی نظام اگر کسی جماعت کے امیر کو "صالح" نمائندہ تجویز نہیں کر سکتا تو اس جماعت کے افراد کیونکر صالح قرار دیئے جاسکتے ہیں؟

۳۔ ایک شیعہ جو (خلفائے ثلثہ کی حکومت کو غیر اسلامی قرار دیتا ہے) اپنے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے آپ کی تحریک میں شامل ہو سکتا ہے یا نہیں؟

۴۔ کیا ایک صالح نمائندہ اپنے حق میں ووٹ ڈال سکتا ہے۔ شرعی دلیل کیا ہے؟

۵۔ آپ کے تجویز کردہ نظام پنچایت ہیں اسمبلی سے باہر اور اندر حلقوں اور عہدوں کی بھرمار اور سر جوڑ کر بیٹھنے کا طریق خلافتِ راشدہ کے زمانے میں موجود تھا؟ یا خلیفۂ وقت عوام کے لئے از خود نمائندے نامزد کیا کرتا تھا؟

۶۔ ہندوستان میں کفر وارتداد کی مہم تیز ہے۔ کیا ان حالات میں پاکستان کا فرض نہیں کہ وہ بزورِ شمشیر ہندوستان پر قابض ہو کر آپ کی صالحانہ قیادت کی روشنی میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لے آئے؟ اس صورت میں کیا موجودہ مالی اور اقتصادی معاملات اسلامی علم بلند کرنے کے راستے میں کبھی روک تو ثابت نہیں ہو سکتے؟

۷۔ آپ وحی و الہام کے مدعی نہیں ہیں بلکہ ریاستِ اسلامیہ میں آپ کے لحاظ سے اب وحی و الہام کی گنجائش تک باقی نہیں ہے۔ ان حالات میں آپ محض چند دلائل سے خود کیونکر مطمئن ہیں کہ آپ کی تحریک ہی صحیح معنوں میں دین کے مزاج کے مطابق ہے اور انقلابِ قیادت کا حقیقی تصور آپ کی جماعت کے بغیر نہیں مل سکتا؟ ممکن ہے دوسری جماعتیں صحیح مسلک پر قائم ہوں اور آپ کی ساری بنیاد غلط فہمی پر ہو؟

جواب:

آپ کے سوالات کا انداز دیکھ کر طبیعت نے کچھ انقباض محسوس کیا تھا مگر جب اس مقام کا نام آیا جہاں سے یہ خط آپ تحریر فرما رہے ہیں تو اتنی معقولیت اور شائستگی بھی غنیمت نظر آئی جو آپ کے

استفسارات میں پائی جاتی ہے۔ خدا کرے کہ اس میں کچھ اور اضافہ ہو۔

آپ کے سوالات کا مختصر جواب حسبِ ذیل ہے:

۱۔ جماعت اسلامی، پاکستان میں کہیں سے آئی نہیں بلکہ یہاں پہلے سے موجود تھی، البتہ اس کا مرکز یہاں ضرور منتقل ہوا ہے، جس طرح متعدد دوسری جماعتوں کے مرکز منتقل ہوئے ہیں۔ ہمیں ایسا کوئی دعویٰ نہیں ہے کہ اس جماعت کے بغیر یہاں تحریکِ اسلامی کے ظہور پذیر ہونے یا بڑھنے کے امکانات کا خاتمہ ہو جاتا۔ ہم جو کچھ سمجھتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد اس مملکت کو عملاً اسلامی مملکت بنانے کے لئے ایک ایسی تحریک اور جماعت کا موجود ہونا ضروری تھا جو پہلے سے منظم اور طاقتور ہو چکی ہو اور الحمدللہ کہ اس ضرورت کو جماعت اسلامی نے بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ اگر یہ جماعت پہلے سے منظم نہ ہو چکی ہوتی تو اس امر کی بہت کم توقع تھی کہ فسق و ضلالت کی طاقتیں یہاں نئے سرے سے کسی تحریک کو اٹھنے اور کسی جماعت کو منظم ہونے کا موقع دیتیں۔

۲۔ کیا آپ کو کسی ذریعے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ کسی جماعت کے امیر کا نام کسی پنچایت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا یا کیا گیا اور اسے غیر صالح قرار دے کر رد کر دیا گیا؟ اگر ایسی کوئی اطلاع آپ کو پہنچی ہے تو ضرور مجھے بھی اس سے مستفید فرمائیں، اور اگر یہ محض ایک قیاس آرائی ہے جو آپ نے اپنی جگہ بیٹھ کر فرمائی ہے تو آپ کو مجھ سے سوال کرنے کے بجائے اپنے اندازِ فکر کی اصلاح کرنی چاہیے۔ علم و واقفیت کے بغیر آپ کا اس طرح کے قیاسات قائم کرنا بجائے خود ہی کوئی بھلا کام نہ تھا، کجا کہ آپ خود اس شخص کے سامنے اپنے اِس قیاس کو پیش فرما رہے ہیں جسے حقیقتِ حال معلوم ہے۔

۳۔ جماعت اسلامی کا عقیدہ اور نصب العین جماعت کے دستور میں لکھ دیا گیا ہے۔ ہر وہ شخص جو اس عقیدے اور نصب العین کو قبول کر کے نظمِ جماعت کی پابندی کا عہد کرے، جماعت میں داخل ہو سکتا ہے۔

۴۔ ایک صالح نمائندے کا خود اپنے حق میں ووٹ ڈالنا اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی ناپسندیدہ کام نہیں ہے مگر موجودہ زمانے کے الیکشن میں خصوصاً کہ آدمی کو جن مکروہات میں مبتلا ہونا چاہئے

پڑتا ہے یہ بھی انھی میں سے ایک ہے، اور اس طرح کے مکروہات کی حیثیت اتنی شدید بھی نہیں ہے کہ ان کی وجہ سے انتخابات جیسے اہم کام سے علیحدہ رہنا درست سمجھا جائے۔

۵۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ ہمارے تجویز کردہ پنچایتی نظام میں حلقوں اور عہدوں کی بھرمار کہاں ہے؟ ہم صرف ایک عہد عام لوگوں سے لیتے ہیں جبکہ انھیں پنچایت کا ممبر بنانے ہیں، اور ایک عہد نمائندے سے لیتے ہیں جبکہ وہ پنچایت میں چن لیا جاتا ہے۔ اس پر لفظ "بھرمار" کا اطلاق آخر کس طرح ہو سکتا ہے۔ خلافتِ راشدہ میں کسی طریقہ کا موجود نہ ہونا اس کے ناجائز یا غیر اسلامی ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ آپ کے پاس اس طریقے کے ناجائز ہونے کی کوئی دلیل ہو تو ارشاد فرمائیں۔ خلفائے راشدین کو اگر ایک جائز کام کی ضرورت پیش نہیں آئی تو انھوں نے اسے نہیں کیا، ہمیں ضرورت پیش آئی ہے تو ہم اسے کر سکتے ہیں۔

آپ کا یہ سوال بالکل عجیب ہے کہ کیا سر جوڑ کر بیٹھنے کا طریق خلافتِ راشدہ کے زمانے میں موجود تھا۔ آپ اس سوال پر ذرا دوبارہ غور فرمائیں، کیا یہ واقعی پوچھنے کے قابل سوال تھا؟

آپ کا یہ ارشاد کہ خلیفۂ وقت از خود عوام کے لئے نمائندے نامزد کر دیتا تھا تاریخ کے ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اُس زمانے میں قبائلی نظام تھا، شیوخِ قبائل آپ سے آپ اپنے قبیلے کے نمائندے ہوتے تھے، اگر الیکشن بھی ہوتا تو وہی لوگ چنے جاتے۔ اس لئے خلفاء انھی حضرات کو مشورے کے لئے طلب کر لیا کرتے تھے۔

۶۔ پاکستان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ خود اپنی حدود میں اسلامی احکام کے اجراء اور ضلالت و الحاد کی تحریکوں کا استیصال کرے۔ اس کے بعد یہ فرض کہ وہ کسی دوسرے ملک کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لئے پہنچے، طاقت کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ طاقت ہو تو ایسا ضرور کرنا چاہیئے، نہ ہو تو ایسا کرنا فرض نہیں ہے۔ کسی کافر حکومت سے خواہ وہ دشمنِ اسلام ہی کیوں نہ ہو کسی مسلم مملکت کا حسبِ ضرورت معاہدہ کرنا بھی ممنوع نہیں ہے۔ اگر یہ ممنوع ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کیوں کرتے؟

۷۔ قرآن اور حدیث جو آپ کے نزدیک "محض چند دلائل" کی تعریف میں داخل ہیں، اور ایک

مطمئن ہوں کہ جماعتِ اسلامی
ے اطمینان کے لئے کافی نہیں ہیں ہم ان ہی کے مطالعہ سے
کے تقاضوں کے مطابق کام
ب دین اسلام کے مزاج کے مطابق ہے اور اگر ہم اس تحریک کے بارے
، تو یقیناً اس کے ذریعے سے صالح قیادت قائم ہو سکتی ہے۔ دوسری جماعتوں کے بارے
یری جو رائے ہے، آپ چاہیں تو اسے غلط فہمی خیال کریں، مگر میں دلائل کی بنا پر رائے قائم کرتا
ں اور دلائل ہی کی بنا پر اپنی رائے سے ہٹ سکتا ہوں۔
وحی میرے نزدیک اب نہیں آسکتی۔ رہا الہام، تو وہ ضروری نہیں ہے۔ ہو تو اچھا ہے، نہ ہو تو
کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ہماری رہنمائی کے لئے بالکل کافی ہے۔ (ا-م)

پاکستان کی قومی و سرکاری زبان

سوال:
ایک صاحب کا انگریزی مضمون ارسالِ خدمت ہے جو اگرچہ مسلم لیگ کے حلقے میں ہیں لیکن
اسلامی نظام حکومت کے لئے آواز اٹھاتے رہتے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ اسلام کے منشا کے
مطابق تبدیلی آئے۔ فی الحال یہ ایک خاص مسئلے پر متوجہ ہیں، یعنی اپنی پوری کوشش اس بات پر صرف
کر رہے ہیں کہ پاکستان کی سرکاری ملکی زبان بروئے دستور عربی قرار پائے۔ ان کے دلائل کا جائزہ لے کر
اپنی رائے سے مطلع فرمائیے۔
محولہ بالا مضمون درج ذیل ہے:-
"پاکستان کی قومی زبان کے مسئلہ کا فیصلہ مستقبل قریب میں ہونے والا ہے۔ میری التجا یہ ہے کہ
آپ عربی زبان کے حق میں آواز بلند کرنے پر پوری توجہ صرف کریں۔ یہ معاملہ اسلام اور پاکستان کے
لئے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور اگر آپ میری ان سطور کو اپنے موقر جریدے میں شائع فرمادیں تو

عربی زبان کلام الٰہی یعنی قرآن شریف کی زبان ہے اور قرآن شریف ہی پر سارے اسلام کا دار و مدار ہے۔ اس لحاظ سے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے عربی سیکھنا ضروری ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب عالم آخرت کی زبان بھی عربی ہوگی۔ پھر اسلام کے سارے سرمایۂ روایات کے علمی ماخذ عربی ہی میں ملتے ہیں۔

بجائے خود عربی دنیا کی زندہ کثیر الاستعمال اور وسیع الظرف زبانوں میں سے ہے۔ پھر عرب، مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کی تمام اسلامی حکومتوں اور بحیرۂ روم کے آس پاس یورپ کے بعض علاقوں کی اکثریت کے لحاظ سے مسلم علاقے ہیں، عربی ہی سرکاری اور قومی زبان ہے۔ علاوہ بریں قرآن شریف کے واسطے سے دنیا بھر کے مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد —— مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک بشمول پاکستان —— عربی سے شناسا ہے۔

عربی زبان بہ حیثیت ایک تمدنی ذریعۂ ربط کے وسیع استعداد رکھتی ہے، اور ہر قسم کی سائنٹفک، فنی اور عام اصطلاحات و مصطلحات کو اپنے اندر جذب کر سکتی ہے۔ اردو اور فارسی کو بھی اس معاملے میں بیشتر عربی کا دست نگر ہونا پڑتا ہے، جیسا کہ زاہد حسین گورنر اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے عربی کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کی دعوت دیتے ہوئے زیادہ وضاحت سے بتایا تھا۔

ساری دُنیا کے مسلمانوں کا خدا ایک ہے، ان کی آسمانی کتاب ایک ہے، اور وہ بہ حیثیت مجموعی ملّتِ واحدہ ہیں، لہٰذا بالکل اسی طرح ان کی قومی زبان بھی ایک ہی —— یعنی عربی —— ہونی چاہیے، چاہے وہ کئی مختلف زبانیں بولتے ہوں۔ ملتِ اسلامیہ کی ترکیب کا دار و مدار ہی تنوعات میں یک جہتی پیدا ہونے پر ہے۔

قراردادِ مقاصد پاکستان کے دستور کا اصل الاصول قرار پا چکی ہے۔ اس کے تحت بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے بالکل بجا طور پر مسلمانوں کے لئے قرآن کی لازمی تعلیم کی سفارش کی ہے۔ خود یہ سفارش بالکل منطقی طور پر عربی زبان کو پاکستان کی قومی زبان بنائے جانے کو لازم قرار دیتی ہے۔

اس فیصلے سے پاکستان کے ہر حصے کے مسلمانوں میں ایک روحِ تازہ دوڑ جائے گی اور

بالآخر یہ چیز پاکستان ــــــ دنیا کی عظیم ترین مسلم مملکت ــــــ کو ملت اور عالم اسلام کی سیاسی تنظیم میں شایانِ شان حصہ ادا کرنے اور ممتاز مقام حاصل کرنے کی ضامن ہوگی۔ یہ اُس صورت میں ناممکن ہے جبکہ کسی دوسری زبان کو قومی زبان قرار دیا جائے۔

سرکاری زبان کو بدلنے کا معاملہ بڑا بھاری معاملہ ہے۔ انگریزی زبان کو ہندوستان میں سرکاری زبان کی حیثیت سے اپنی جگہ پیدا کرنے میں کئی سال لگے۔ اب پاکستان کو اپنی نئی سرکاری زبان اختیار کرنے کے لئے بھی وہی صورت پیش آئے گی ــــــ چاہے وہ کوئی سی زبان بھی ہو۔ ہمارے لئے اب قرین مصلحت یہی ہے کہ ہم ذرا سی دور اندیشی سے کام لیں اور اُس زبان کے حق میں فیصلہ کریں جو ہماری سرزمین کے لئے زیادہ راس آنے والی ہے اور بلحاظ نتائج بعید کے زیادہ مفید ثابت ہونے والی ہے۔

عربی زبان طباعت، سٹینوگرافی اور ٹائپ کے پہلو سے خوب اچھی طرح فروغ یافتہ سہولتیں رکھتی ہے۔ مادری زبانوں کو در کنار رکھ کر دیکھا جائے تو مسلمان عوام دوسری زبان کے مقابلے میں عربی کے لئے امتیازی جذبۂ احترام رکھتے ہیں۔ ہمیں کبھی بھی عوام کے جذبات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

پھر جبکہ مسلم ممالک ــــــ جو زیادہ تر عربی بولنے والے ہیں ــــــ کا متحدہ بلاک بنانے کی اسکیم پیش نظر ہے، تو پاکستان عربی کو اپنی سرکاری زبان قرار دے کر اس معاملے میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے زیادہ بہتر مقام پیدا کر سکتا ہے۔ دنیا بھر کی مسلمان مملکتوں کی لنگوا فرنکا اگر کوئی زبان ہے اور ہو سکتی ہے تو وہ صرف عربی ہے۔

پھر ہر سال کی تقریب حج اسلام کی پانچ بنیادی عبادات میں سے ایک ہے جو بحیثیت ایک فریضے کے دنیا بھر کے ذی استطاعت مسلمان سر انجام دیتے ہیں۔ سالانہ حج اور مسلمانوں کی دوسری ہنگامی کانفرنسوں کے موقع پر کسی وقت اور غیر ضروری خرچ کے بغیر تمام مسلمان ممالک کے درمیان خیالات و افکار کا تبادلہ اور کاروباری تعلقات کا استحکام عربی زبان جاننے ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔

پھر یہ کہ مصر و شام اور لبنان کے عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح ہمارے غیر مسلم ہم وطنوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا کہ پاکستان کی سرکاری زبان عربی ہو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اردو کو عربی پر ترجیح دیں، جبکہ ان کو مغل دور میں فارسی کے خلاف اور ماضی قریب میں انگریزی کے خلاف کوئی شکایت نہ پیدا ہوئی۔

عربی زبان پاکستان کی سرکاری زبان قرار پاکر پاکستان کی علاقائی زبانوں، ان کے رسم الخط اور مستقبل میں صحیح خطوط پر ان کے ارتقا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

علاوہ بریں عربی زبان اختیار کرنے سے پاکستان بھر میں ہمارے بچوں کے لئے تعلیمی بوجھ میں نمایاں کمی آجائے گی، کیونکہ اس صورت میں ان کے لئے صرف اپنی مادری زبان کی تعلیم حاصل کرنا لازمی ہوگا، اور مزید کسی زبان کو وہ سیکھنا چاہیں تو یہ ان کا اپنا اختیاری معاملہ ہوگا۔ اردو یا کسی دوسری علاقائی زبان کو اگر پاکستان کی قومی زبان بنایا گیا تو ان کے کندھوں پر سہ گونہ بار آپڑے گا، کیونکہ عربی تو ہر حال میں مسلمان خاندانوں میں گھریلو طور پر پڑھی جائے گی۔

برعکس اس کے اگر خالص جمہوری نقطۂ نظر سے پاکستان کی زبان کا تعین کیا جائے تو پھر تو بنگالی جو پاکستان کی ۶۰ فی صد آبادی کی زبان ہے، اپنے آپ کو غور کے لئے سب سے پیش پیش رکھنے کی مستحق ہے۔ اردو ایک محدود گروہ میں بولے جانے کی وجہ سے سندھی، پنجابی اور پشتو سے زیادہ قابل لحاظ نہیں ہوسکتی جن کے بولنے والے اپنی بولیوں سے کچھ کم محبت نہیں رکھتے۔ اس کا لحاظ رہے کہ اردو پاکستان کے کسی صوبے میں خصوصی طور پر نہیں بولی جاتی۔ اندریں حالات عربی زبان ہی اس کا وسیلہ ہوسکتی ہے کہ ہم ہر دو خطوں کے لوگ پاکستانی وحدتِ اسلامیہ کے وسیع تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی علاقائی زبانوں کی علمبرداری سے دست بردار ہو جائیں۔"

جواب:

مسلمانوں کے لئے عربی زبان کی اہمیت ناقابلِ انکار ہے۔ ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ عربی زبان کو نہیں بلکہ قرآن مجید کی تعلیم کو بھی ملک کی تمام درسگاہوں میں لازمی کر دیا جائے۔ ہمیں عربی کی بین الاقوامی اور بین الاسلامی اہمیت بھی معلوم ہے، اور اس کا لحاظ رکھنا بھی ہم ضروری سمجھتے ہیں

لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی اس بات کے لیے دلیل نہیں ٹھیرائی جا سکتی کہ پاکستان کی قومی ز
سرکاری زبان عربی قرار دی جائے۔ ایک ملک کی قومی اور سرکاری زبان صرف وہی زبان ہو
جس کو اس ملک کے عام باشندے ملک کے ہر حصے میں جانتے اور سمجھتے ہوں۔ یہ درجہ عربی کو
حاصل نہیں ہے، نہ یہ درجہ اسے آسانی کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ہم ان کوششوں
جو ایک صدی تک انگریزی حکومت نے ہندوستان میں اپنی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت
کرنے میں صرف کیں اور پھر یہ دیکھیں کہ ملک کی ۵۰۰ فی صد سے زیادہ آبادی کو وہ انگریزی
قابل نہ بنا سکی تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہم انگریزوں سے کم از کم دس گنی زیادہ کوشش
آئندہ ایک صدی میں اس لائق ہو سکیں گے کہ عربی زبان کو یہاں ایک کامیاب قومی زبان بنا

اس کے برعکس اردو زبان کو یہ حیثیت بہت بڑی حد تک پہلے ہی سے حاصل ہے۔ جہا
مغربی پاکستان کا تعلق ہے یہ زبان اس کے ہر حصے میں سمجھی جاتی ہے۔ اور سرحد، کشمیر و سندھ
اور پنجاب کے لوگ جب کبھی آپس میں ملتے ہیں یہی زبان استعمال کر کے ایک دوسرے سے تبا
کرتے ہیں۔ میں نے اپنے دوروں کے سلسلے میں بلوچستان کے انتہائی سرے پر بلوچ دیہاتیو
سامنے اردو میں تقریر کی اور پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ تقریر کو بلا تکلف سمجھ گئے۔ میں نے ان پٹھ
کے سامنے بھی تقریر کی ہے، وہ بھی میری بات بآسانی سمجھتے رہے۔ صوبہ سرحد میں تو آزاد ق
علاقوں تک کے لوگ اچھی طرح اردو سمجھ اور بول لیتے ہیں۔ رہا مشرقی پاکستان تو مجھے ابھی تک
راست وہاں کے حالات کا علم نہیں ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ مغربی پاکستان کے برابر نہ ہ
وہاں کے بھی عام باشندے انگریزی اور عربی دونوں کی بہ نسبت اردو سے زیادہ شناسا
اردو بولنے والا آدمی مشرقی بنگال کے کسی حصے میں بھی اس قدر اجنبی نہیں ہو سکتا جس قدر ا
ایسا شخص ہو سکتا ہے جو صرف انگریزی یا صرف عربی جانتا ہو۔ اور اسی طرح مشرقی بنگال
عامی آدمی مغربی پاکستان آکر جس زبان کے ذریعے سے یہاں کے عوام سے بات چیت کر
وہ نہ انگریزی ہے نہ عربی، بلکہ صرف اردو ہے۔

یہ حیثیت اردو کو اس وقت بھی حاصل ہے جبکہ یہ زبان ابھی سرکاری زبان نہیں قرار پا
اب اگر اسے سرکاری زبان قرار دے کر اس کی ترویج کے لئے کوشش کی جائے تو ہم بہت
کے ساتھ، بہت کم وقت میں اسے اتنا عام کر سکتے ہیں کہ یہ ہماری اُن تمام ضرورتوں کو پ
کر سکتی ہے جو ایک قومی اور سرکاری زبان سے وابستہ ہوتی ہیں۔

مجھے صاحبِ مضمون کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ اگر پاکستان کی سرکاری زبا
محض جمہوری بنیاد پر کرنا ہو تو پھر بنگالی کا حق مرجح ہے کیونکہ یہ ۶۰ بز پاکستانیوں کی زبان ہے۔
سروں کو گن کر کسی معاملہ کا فیصلہ کرنا جمہوریت نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ بنگالی ہو یا پشتو یا
یا سندھی، ان میں سے کسی زبان کو بھی اس حالت میں قومی زبان کیسے بنایا جا سکتا ہے جبکہ ا
کے بولنے اور سمجھنے والے صرف اپنے علاقوں تک ہی محدود ہیں اور دوسرے علاقوں کے لئے
زبانیں اتنی ہی اجنبی ہیں جتنی دنیا کی کوئی دوسری زبان ہو سکتی ہے۔ ہم جس زبان کو قومی ز
بنانا چاہتے ہیں وہ پاکستان کے کسی حصے کی بھی مادری زبان نہیں ہے مگر پاکستان کے ہر حصے
کم و بیش عام لوگ اس سے واقف ہیں اور مختلف صوبوں کے عوام باہمی میل جول میں اس کو است
کرتے اور کر سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں نہ بنگالی کو ترجیح دی جا سکتی ہے، نہ پنجابی کو، نہ سندھ
پشتو یا بلوچی کو۔ اگر سر شماری پر ہی فیصلہ کرنا ہے تو اس لحاظ سے کیجئے کہ کس زبان کے سمجھنے وا
پاکستان میں سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔

بلاشبہ یہ مشکل بہت وزن رکھتی ہے کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو بنگلہ زبان مقامی زبان کی ح
سے سیکھنی ہوگی، عربی دینی زبان کی حیثیت سے، انگریزی بین الاقوامی ضرورتوں کے لئے اور پھر ا
سرکاری زبان کی حیثیت سے۔ ہم اس معاملے میں ان کی مشکلات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن یہی
سندھیوں اور پشتو اور بلوچی علاقے کے لوگوں کو بھی پیش آئے گی۔ اس کا بار تنہا مشرقی پاکستان
لوگوں ہی پر نہیں پڑے گا۔ اب ہمیں موازنہ کر کے دیکھ لینا چاہیے کہ عربی کو بالکل نئے سرے
قومی زبان کی حیثیت سے رائج کرنا زیادہ مشکل ہے یا اس زبان کو رائج کرنا جو پہلے ہی [illegible]

پر گھتے ہیں کافی پھیلی ہوئی ہے۔ ان دونوں میں سے جو شکل کم ہو اسے اختیار کر لیجیے۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مشرقی اور مغربی پاکستان جیسے دو دراز خطوں کے درمیان اسلام کے بعد ایک اور اتحادی رشتہ بھی اردو زبان کی شکل میں مہیّا کر رکھا ہے۔ اس نعمت کی قدر نہ کرنا ایک طرح کی ناشکری ہے۔ (ا۔م)

سوسائٹی میں انسان کا فطری مقام

سوال:

فرد اور سوسائٹی کے باہمی تعلقات کی نسبت مندرجہ ذیل خیال اسلامی نقطۂ نظر سے کہاں تک صحیح ہے؟

"شہد کی مکھیوں، چیونٹیوں اور دیمک کے برعکس انسان معاشرے میں زندگی گزارنے کے لئے نہیں بنایا گیا ہے۔ وہ بڑی حد سے زیادہ حد تک ایک فرد ہے۔ بدرجۂ آخر یوں سمجھ لیجئے کہ وہ گلوں میں بٹ کر جینے کی جبلت رکھتا ہے۔ یہی راز ہے فرد اور معاشرے کے غیر مختتم تصادم کا! کوئی مذہب عدم توافق کی اس گرہ کو کھولنے پر قادر نہیں ہے کیونکہ یہ گرہ کھلنے والی ہے ہی نہیں! کیا خود قرآن نے نہیں کہا کہ ہم نے انسان کو احسنِ تقویم پر پیدا کیا (۹۵۔۴) ——— اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ——— کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا (البلد ۴) میری رائے میں ان آیات کی بہترین تاویل یہ ہے کہ ایک مشین ——— نظامِ جسمانی ——— کی حیثیت سے آدمی اشرف المخلوقات ہے، لیکن معاشرے کا رکن ہونے کی حیثیت سے وہ معاشرے کے ساتھ ہمہ وقت متصادم رہنے والا ہے۔"

جواب:

آپ نے جس خیال پر مجھ سے اظہارِ خیال کی فرمائش کی ہے اس کے مصنف نے فرد اور جماعت کی کشمکش کے پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے یا بالفاظِ دیگر ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے صحیح رُخ (APPROACH) اختیار نہیں کیا ہے۔ اس نے انسان کو حیوانات کی ایک قسم فرض کر کے یہ طے کرنے کی کوشش کی ہے کہ

تنظیم پسند حیوانات اور گلہ پسند حیوانات کے درمیان انسان کا صحیح مقام کیا ہے۔ حالانکہ یہ زاویۂ فکر
اس مسئلے کی طرف پیش قدمی کرنے کے لئے سرے سے کوئی نقطۂ آغاز ہی نہیں ہے۔ حیوانات
انسان کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوانات کوئی ذی اختیار مخلوق نہیں ہیں جو مشاہدات اور
تجربات پر غور و فکر کر کے اپنی زندگی کا راستہ خود تجویز کرتے ہوں؟ بلکہ وہ سراسر جبلت کے تابع ہیں۔
شہد کی مکھیوں نے منظم ہیئتِ اجتماعی خود اختیار نہیں کی ہے، نہ پیہم تجربات سے بتدریج ا مر
تنظیم کو ترقی دی ہے، بلکہ یہ تنظیم ان کی جبلت میں ودیعت کر دی گئی ہے اور وہ جب سے وجود
میں ہیں یکسانی کے ساتھ اسی تنظیمی شکل میں رہتی چلی آرہی ہیں۔ یہی حال گلہ پسند، زوج پسند اور
انفرادیت پسند حیوانات کا بھی ہے کہ ہر ایک اپنی جبلت کے مقرر کردہ راستے پر چلا جا رہا ہے اور ا
میں سے کسی نوع نے بھی تجربے اور فکر کی بنیاد پر اپنے طریقِ حیات میں ذرہ برابر کوئی ردو بدل نہیں کیا
ہے۔ برعکس اس کے انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا ایک ایک فرد ذی ارادہ، ذی اختیار، صاحب
فکر اور اخلاقی حیثیت سے شخصاً ذمہ دار واقع ہوا ہے۔ اس کی جبلت کا دائرۂ اثر بہت محدود
رکھا گیا ہے۔ اس کی فطرت میں چند دواعی اور میلانات ضرور رکھ دیئے گئے ہیں مگر ان کی نوعیت
یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کوئی مخصوص راستہ تجویز کرتے ہوں اور انسا
کو اسی خاص راستے پر چلنے کے لئے مجبور کرتے ہوں، بلکہ ان کی نوعیت یہ ہے کہ وہ صرف اپنے
تقاضے انسان کی عقل و فکر کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر انسان اپنی عقل و فکر کی مدد سے ان تق
کو پورا کرنے کی صورتیں تجویز کرتا ہے۔ اس کے ساتھ انسان کو یہ قوت بھی ملی ہوئی ہے کہ وہ تجربات
و مشاہدات کی مدد سے اپنی اختیار کردہ عملی صورتوں میں ردو بدل کرتا ہے اور بتدریج ان کو درست
کرنے اور ترقی دینے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے اپنی فطرت کے تقاضوں
کو سمجھ کر ایک جوڑے کی یکجائی معاشرت سے ابتدا کر کے بتدریج خاندان، قبیلے، قوم، منظم
سوسائٹی، اسٹیٹ اور بین الاقوامی روابط تک اپنی زندگی کو ترقی دی۔ اور یہی وجہ ہے کہ مختلف
زمانوں اور مختلف ممالک میں انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کے لئے بہت سے مختلف نقشے

ہیں اور بار ہا ان نقشوں کو وہ بدلتا اور نئے سرے سے بناتا رہا ہے۔

انسان کی اس مخصوص حیثیت پر اگر آپ غائر نگاہ ڈالیں تو اس گتھی کو سمجھنے کے لئے آپ کو کلید مل سکتی ہے جو فرد اور جماعت کی کشمکش کی شکل میں ہم آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس گتھی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایک طرف نوعِ انسانی کا ہر ہر فرد اپنی ایک خودی رکھتا ہے جس میں تعقل ہے، ارادہ و اختیار ہے اور شخصی ذمہ داری کا احساس ہے۔ دوسری طرف اس خودی کے حامل افراد ایک ایسی اجتماعی زندگی میں شریک ہونے پر مجبور ہوتے ہیں جس کا پورا نقشہ فطرت نے خود نہیں بنا دیا ہے بلکہ فطری داعیات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں کے لوگوں نے مختلف طریقوں سے یہ نقشے خود بنائے ہیں، اور بتدریج اجتماعی تجربات اور مجموعی میلانات اور خارجی اثرات کے تحت ان نقشوں کا نشوونما ہوتا رہا ہے۔ اس طرح لاکھوں کروڑوں افراد کی جدا جدا خودیوں کا ایسی غیر فطری اجتماعیت میں (جو بارہا اپنے بعض پہلوؤں میں خلافِ فطرت بھی واقع ہو جاتی ہے) ٹھیک ٹھیک متوازن اور متناسب طور پر نصب ہونا اور اپنی موزوں جگہ پالینا نہایت مشکل ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وہ کشمکش پیدا ہوتی ہے جو فرد اور جماعت کے درمیان ہر جگہ برپا ہے۔ کیونکہ اس طریقے سے بنی ہوئی اور نشوونما پائی ہوئی اجتماعیت میں افراد کی خودیاں بھی اپنی موزوں جگہ نہ پانے کی وجہ سے بے کلی محسوس کرتی ہیں، اور اجتماعی نظام بھی ان بے چین خودیوں کی انفرادی لگدکوب کے باعث مضطرب ہوتے رہتے ہیں۔ افراد کو ڈھیل ملتی ہے تو اجتماعی نظام درہم برہم ہونے لگتا ہے اور اجتماعی نظام زیادہ کس جاتا ہے تو افراد کی خودیاں یا تو مرجھانے لگتی ہیں یا بغاوت پر اتر آتی ہیں۔

یہ من جملہ اُن اہم اسباب کے ہے جن کی بنا پر انسان کے لئے وحی اور نبوت کی رہنمائی ناگزیر ثابت ہوتی ہے۔ ہزار ہا برس کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ اپنے فطری داعیات اور تقاضوں کو سمجھ کر انھیں پورا کرنے کے طریقے تجویز کرنے کے لئے انسان کو تعقل، تفکر اور استقراء و اختیار کی جو طاقتیں ملی ہوئی ہیں وہ اس کام میں مددگار تو ضرور ہیں مگر اس کے لئے کافی نہیں ہیں۔

ان طاقتوں کے بل بوتے پر انسان خود اپنے لئے ایک صحیح اور معتدل و متوازن طریقِ زندگی نہیں بنا سکتا۔ وہ اس بات کا محتاج ہے کہ اس کا خالق اسے قانونِ زندگی کے بنیادی اصول دے، سعی و عمل کے حدود بتائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن مابعد الطبیعیاتی حقائق کا ضروری علم دے جن کی واقفیت کے بغیر ایک صحیح طریقِ زندگی تجویز کرنا انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ انفرادیت اور اجتماعیت کے درمیان زیادہ سے زیادہ جو توازن ممکن ہے اور افراد کی خودی کی تکمیل کے مواقع باقی رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ مستحکم جو اجتماعی نظام بنایا جا سکتا ہے وہ وہی ہے جس کے اصول اور حدود اور ضروری فروع کی طرف اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے ہماری رہنمائی کی ہے۔

قرآن مجید کی جن دو آیتوں کا آپ نے حوالہ دیا ہے ان کی تفسیر بھی میرے درج بالا بیان سے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ بلکہ بات اور زیادہ کھل جائے اگر آپ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کے بعد یہ بھی پڑھیں کہ ثم رددناہ اسفل سافلین الا الذین امنوا وعملوا الصلحت۔

(ا،م)

سوالات متعلقہ "تفہیم القرآن"

سوال:

مندرجہ ذیل استفسارات پر روشنی ڈالیں:۔

۱۔ آپ نے تفہیم القرآن میں ایک جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ طوفانِ نوحؑ عام نہیں تھا۔ لیکن ظاہری قرائن اس بات کے خلاف ہیں۔ اول کشتی کس لئے بنائی گئی تھی؟ کیوں نہ حضرت نوحؑ کو ہجرت کرنے کا حکم دیا گیا؟ دوم کشتی میں حیوانات میں سے ایک ایک جوڑا لینا بھی اس بات کا مؤید ہے کہ طوفان نہایت عام تھا۔ حضرت نوحؑ کی بددعا میں بھی اس عمومیت کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ ہے کہ رب لاتذر علی الارض من الکفرین دیارا۔

۲۔ ثانیاً آپ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ دنیا کی موجودہ انسانی نسل انہی سب لوگوں کی ہے جو حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔ آپ نے ذریۃ من حملنا مع نوح سے اس کی دلیل اخذ کی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں، کیونکہ نوح کے ساتھ ان کے تین بیٹے بھی کشتی میں سوار تھے۔ ظاہر ہے کہ اس جگہ من حملنا مع نوح سے مراد حضرت نوحؑ کے بیٹے ہیں نہ کہ اور لوگ۔ دوسری جگہ اس کی تفسیر خود قرآن کے یہ الفاظ کرتے ہیں کہ وجعلنا ذریتہ ھم الباقین۔ کتنے کامل حصر کے الفاظ ہیں!

۳۔ سورۂ یوسف کی تفسیر میں جناب نے لکھا ہے کہ زلیخا کو حضرت یوسفؑ نے نکاح میں نہیں لیا، کیونکہ قرآن کریم سے اس عورت کا بدچلن ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن کیا حضرت لوطؑ اور حضرت نوحؑ کی ازواج کافرہ نہ تھیں؟ اگر تھیں تو کفر کیا بدچلنی سے زیادہ شدید نہیں ہے؟ علاوہ بریں حضرت یوسفؑ کے قصے میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ عقدِ نکاح کے وقت تک زلیخا مسلمان ہوچکی تھیں اور سابقہ بدچلنی سے تائب ہوگئی تھیں۔

جواب:

(۱) میں قطعیت کے ساتھ تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ طوفانِ نوحؑ عالمگیر نہ تھا۔ لیکن میرا اندازہ تاریخ و آثارِ قدیمہ کے مطالعہ کی بنا پر یہ ہے کہ طوفان صرف اس علاقے میں آیا تھا جہاں قوم نوحؑ آباد تھی۔ قرآن مجید سے اس کے خلاف یا موافق کوئی صریح بات نہیں ملتی۔

آپ کا یہ معارضہ کہ کشتی بنانے کا حکم کیوں دیا گیا؟ ہجرت کا حکم کیوں نہ دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت تک نسلِ آدم تمام روئے زمین پر نہ پھیلی تھی۔ آباد دنیا اتنی ہی تھی جس میں قوم نوحؑ آباد تھی۔ یہی آپ کے دوسرے معارضات کا بھی جواب ہے۔

(۲) حضرت نوحؑ کے متعلق یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے کہ ان پر ایمان لانے والے صرف ان کے گھر کے لوگ ہی نہ تھے بلکہ ان کی قوم کے دوسرے لوگ بھی تھے، اگرچہ تھوڑے سے تھے، نیز یہ کہ کشتی میں یہ سب اہلِ ایمان سوار کیے گئے تھے۔ سورۂ ہود میں ہے: قلنا احمل فیھا من کل

ہ حملیٰ اثنین و اھلک الا من سبق علیہ القول و من اٰمن و ما اٰمن معہ الا قلیل۔
ان لوگوں کے بارے میں یہ کہیں بھی نہیں کہا گیا کہ ان سب کی نسل ناپید ہو گئی۔ اس کے برعکس قرآن
دو جگہ تصریح کرتا ہے کہ بعد کی نسلیں انھیں لوگوں کی اولاد تھیں جو حضرت نوح کے ساتھ کشتی پر
سوار کئے گئے تھے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ذریۃ من حملنا مع نوح۔ اور سورۂ مریم میں
فرمایا: من النبیین من ذریۃ اٰدم و ممن حملنا مع نوح۔ اس کے جواب میں آپ کا یہ ارشاد
سورۂ صفٰت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وجعلنا ذریتہ ھم الباقین۔ اور یہ حصر پر دلالت
کرتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مقصود یہ ظاہر کرنا نہیں ہے کہ صرف حضرت نوحؑ کی اولاد
ہی باقی رہی بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن لوگوں نے حضرت نوحؑ کو کرب عظیم میں مبتلا کیا تھا وہ مٹ گئے
اور باقی اُس شخص کی ذریت ہی رہی جس کو وہ مٹا دینا چاہتے تھے۔

(۳) زلیخا سے حضرت یوسفؑ کے نکاح کا کوئی ثبوت نہ قرآن میں ہے، نہ کسی حدیث صحیح میں
اور نہ بنی اسرائیل کی معتبر روایات میں۔ نیز قرآن سے اس عورت کی توبہ کا بھی ثبوت نہیں ملتا۔ پھر
آخر خواہ مخواہ اس قصے کی صحت پر اصرار کی کیا ضرورت ہے؟ جس بدچلنی کا ارتکاب امرأۃ عزیز سے ہوا
تھا حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق اس طرح کی کسی بدچلنی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ رہا آپ کا یہ ارشاد
کہ کفر سے زیادہ بدچلنی اور کیا ہو سکتی ہے، تو آپ خود غور کریں گے تو آپ کو اس کی کمزوری
معلوم ہو جائے گی۔ زنا اور اس کے مقدمات ایک ایسی بدچلنی ہیں۔ جو بالاتفاق تمام عالمِ انسانی میں
قبائح اور رذائل میں سے شمار ہوتی ہے۔ اس سے ملوث ہونا اور بات ہے اور کفر و شرک میں مبتلا ہونا
اور بات۔ انبیاء علیہم السلام کے آباء و اجداد اور بعض کے اہلِ بیت تک کفر و شرک میں مبتلا رہے ہیں،
مگر بے عصمتی میں مبتلا نہیں رہے۔ اعتقادی حیثیت سے کفر و شرک خواہ کتنے ہی اہم
ہوں مگر اخلاقی حیثیت سے بے عصمتی بہت زیادہ پست اور دنی چیز ہے جسے کفار و مشرکین تک
بھی ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ (۱۔م)

خالق کے تخلیقی آرٹ میں تنوع اور تجدد

سوال:

"مجھے علم نباتات میں کوئی مہارت نہیں، تاہم تفہیم القرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے چند سوالات پیدا ہوئے ہیں جنہیں اطمینان حاصل کرنے کے لئے پیش کرتا ہوں۔

ترجمان القرآن جلد ۵، عدد ۳،۴ صفحہ ۱۲۵ پر یہ حاشیہ درج ہے کہ "ایک ہی درخت ہے اور اس کا ہر پھل دوسرے پھل سے نوعیت میں متحد ہونے کے باوجود شکل، جسامت، اور مزے میں مختلف ہے۔" اور "ایک ہی جڑ ہے اور اس سے دو الگ تنے نکلتے ہیں جن کے پھل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔"

"مزے میں مختلف" ہونے کی یہ رائے جو آپ نے لکھی ہے، یہ مشاہدے کی بنا پر ہے یا کتابی علم کی بنا پر؟ اگر واقعہ یہی ہے تو بہتر تھا کہ چند ایک درختوں کی مثالیں بھی دی جاتیں۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ ایک ہی درخت کے پھل کے مزے میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوتا، البتہ درخت کے جس حصے کو سورج کی روشنی وافر ملتی ہے اس حصے کے پھل پہلے پختہ ہو جاتے ہیں۔ پھلوں کی شکل اور جسامت میں تو فرق ہو سکتا ہے مگر مزے میں فرق ہونا سمجھ میں نہیں آیا۔"

جواب:

ہر درخت کے پھلوں کی جسامت، رنگ اور مزے کا انحصار اس غذا پر ہے جو ان کو جڑ کے توسط سے پہنچتی ہے، اور اس سردی گرمی پر ہے جو انہیں دھوپ، ہوا اور دوسرے شب و روز کے اثرات سے پہنچتی ہے۔ یہ سب عوامل چونکہ تمام پھلوں پر یکساں طریقے سے اثر انداز نہیں ہوتے، بلکہ ہر ایک پھل اور دوسرے پھل کے معاملے میں ان کے اثرات کچھ نہ کچھ متفاوت ہوتے ہیں، اس لئے جس طرح جسامت اور رنگ میں تھوڑا بہت تفاوت ضرور ہوتا ہے اسی طرح مزے میں بھی کم و بیش تفاوت ہوا کرتا ہے، اگرچہ بہت زیادہ نمایاں نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ یہ ایک عالمگیر حقیقت ہے کہ کائنات میں کوئی دو چیزیں بھی ایسی نہیں ہیں جو

جملہ حیثیات سے بالکل یکساں ہوں، ہر شے کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی انفرادیت رکھ دی ہے جس میں کوئی دوسری شے اس کی شریک نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک ہی آدمی کے جسم کے ایک ہاتھ کے نشانات دوسرے ہاتھ کے نشانات سے مختلف ہوتے ہیں، ایک ہی چہرے کا دایاں رخ بائیں رخ سے مختلف ہوتا ہے، ایک ہی سر کے دو بال تک بالکل یکساں نہیں ہوتے۔ اس طرح صانع کامل و اکمل نے یہ دکھایا ہے کہ اس کی صناعی کمال درجے کی جدت طراز ہے۔ اس حیرت انگیز شان خلاقی پر اگر آدمی کی نگاہ ہو تو اسے یقین آجائے کہ اللہ تعالیٰ اس بے پایاں کائنات کے ہر گوشے میں ہر وقت ہر ہر چیز پر تصرف اور توجہ فرما رہا ہے اور ہر آن اس کا تخلیقی اور تدبیری کام عالمگیر پیمانے پر جاری ہے۔ سخت نادان اور جاہل ہیں وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ خدا اس کارخانۂ ہستی کو حرکت میں لاکر کسی گوشے میں بیکار بیٹھ گیا ہے اور اب یہ کارخانہ ایک لگے بندھے قاعدے کے مطابق آپ سے آپ چل رہا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تخلیق میں یہ بے پایاں تنوع اور صنعت میں یہ کمال درجے کا تجدد کیسے پایا جا سکتا تھا۔ (ا۔م)

مسلم سوسائٹی میں منافقین

سوال:

اسلام کے خلاف دو طاقتیں ابتدا ہی سے برسرپیکار چلی آرہی ہیں: ایک کفر اور دوسری نفاق۔ مگر کافر کی نسبت منافق زیادہ خطرناک دشمن ثابت ہوا ہے، کیونکہ یہ وہ مارِ آستین ہے جو ماتھے پر اخوت اور اسلام دوستی کا لیبل لگا کر مسلمانوں کی بیخ کنی کرتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اگرچہ کافر اور منافق دونوں ہی بالآخر جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں لیکن منافق کی سزا کچھ زیادہ ہی "باشقت" بتائی گئی ہے (بیشک منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔ نساء ۲۱۱) اسی گروہ کے متعلق خدا تعالیٰ نے یوں دو ٹوک فیصلہ کر دیا ہے کہ "اے پیغمبر! ان منافقوں کے حق میں تم خواہ دعائے مغفرت کرو

یا نہ کرو (برابر ہے کیونکہ) چاہے تم ستر مرتبہ ہی مغفرت کے لئے دعا کیوں نہ کرو، تب بھی اللہ انہیں کبھی معاف نہیں کرنے کا (توبہ۔ ۱۰) کم و بیش ساٹھ مختلف علامات اور امتیازی نشانیاں منافقین کی اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیان فرمائی ہیں جن کی روشنی میں ہم پاکستان کے اندر بسنے والی امتِ مسلم کو جب دیکھتے ہیں جو مسلمان کہلاتی ہے تو اکثریت بلا مبالغہ منافقین کی نظر آتی ہے ——— گنہگار مسلمان اس گروہِ منافقین میں شامل نہیں ——— مگر گنہگار مسلمان وہ ہے جس سے برائی کا فعل باقتضائے بشریت جب کبھی سرزد ہو جاتا ہے تو فوراً ہی خدا اور قیامت کا خیال اسے آجاتا ہے۔ سچے دل سے توبہ اور پشیمانی کا اظہار کرتا ہے اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر لیتا ہے۔ منافق اس کے خلاف اپنے برے کاموں پر واقعی نادم ہونے کے بجائے دانستہ کئے جاتا ہے۔

آپ کی نگاہ اور مطالعہ زیادہ وسیع ہے، براہِ کرم آپ اپنی رائے بیان فرمائیے کہ موجودہ مدعیانِ اسلام میں منافقین اور گنہگار اور متقی مسلمانوں کا متناسب اندازاً کیا ہے؟

دوسرا سوال گروہ منافقین کے ساتھ مسلمانوں کے طرزِ عمل کا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے یہ لوگ مسلمانوں کی جماعت سے خارج ہیں (اور یہ منافق قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تمہاری جماعت میں ہیں حالانکہ وہ تم سے نہیں۔ سورۂ توبہ) صرف یہی نہیں کہ ملتِ اسلامیہ سے خارج ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ "یہ منافق تمہارے دشمن ہیں ان سے خبردار رہو" (منافقون۔ ۱)

چونکہ یہ دشمن ہیں لہٰذا حکم ہوتا ہے کہ ان دشمنانِ دین سے کامل علیحدگی اختیار کر لو۔ "ان منافقوں میں سے اپنے ساتھی اور دوست نہ بناؤ ...... اور ان میں سے کسی کو نہ اپنا دوست سمجھو، نہ مددگار۔" (النساء۔ ۱۲) اس بائیکاٹ میں یقیناً یہ بات بھی شامل ہے کہ منافقوں سے رشتے ناطے نہ کئے جائیں۔ علیحدگی کی ایک اور صورت یہ بیان فرمائی ہے کہ "اے نبی! اللہ سے ڈرو اور ان کافروں اور منافقوں کی کسی بات کی پیروی نہ کرو" (احزاب۔ ۱) یعنی نہ تو نماز میں منافقوں کی پیروی کی جائے اور نہ ہی سیاسی قیادت قبول کی جائے، وغیرہ! بائیکاٹ کا اظہار ایک اور طریقہ سے بھی کرنا ضروری ہے۔ "اور ان منافقوں میں سے اگر کوئی مر جائے تو کبھی اس کی نمازِ جنازہ نہ پڑھو اور نہ ہی کبھی اس کی قبر پر دعائے مغفرت کے لئے کھڑے ہو" (توبہ۔ ۱۱)

بحیثیت ایک مسلمان کے خود آپ کا طرزِ عمل اس صورتحال کے بارے میں کیا ہے؟ کیا مسلمانوں کو (جو اکثریت میں ہیں) منافقوں سے (جن کی اکثریت ہے) قطع تعلق کر لینا چاہیے یا کچھ اتمامِ حجت کی گنجائش ہے؟

جواب:

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت کتنے فی صدی کس کس قسم کے لوگ شامل ہیں، مگر ندازہ اپنے مشاہدات و تجربات کی بنا پر یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کو منافق ٹھیرانے میں آپ نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ بلاشبہ اہلِ ایمان کی ہم میں بہت کمی ہے اور یہی ہمارے اخلاقی تنزل کی اصل وجہ ہے، لیکن ہم میں اکثریت منافقوں کی نہیں بلکہ ایسے لوگوں کی ہے جو یا تو م سے ناواقف ہونے کی وجہ سے جاہلیت میں مبتلا ہیں یا تربیت اور نظامِ دینی کے فقدان کی سے ضعیف الایمان ہو کر رہ گئے ہیں اور اپنی گناہ گاری کا احساس رکھنے کے باوجود گناہ گارانہ سے بچنے پر قادر نہیں ہیں۔ منافقین ہمارے اندر موجود تو ضرور ہیں مگر ان کی تعداد کم ہے اور یادہ تر عوام میں نہیں بلکہ اونچے طبقوں میں پائے جاتے ہیں۔ ایک صحیح اسلامی نظامِ زندگی کے

ہماری سوسائٹی ایک طویل دورِ انحطاط سے گزرتے ہوئے جس طرح کے ہمہ گیر اختلال میں مبتلا ہے اس میں کرنے کا کام یہ ہے کہ دعوتِ اصلاح دی جائے اور دینی نظم کو از سرِ نو بپا کیا جائے۔ منافقین اور فاسقین کا تعین کرنا ن سے بائیکاٹ کرنے سے آغازِ اصلاح کرنا صحیح طریقِ کار نہیں ہے۔ پھر یہ بات جس طرح نبی صلعم پر قطعیت کے ساتھ واضح کی گئی تھی کہ سوسائٹی میں کون کون لوگ منافقین ہیں آج محض علامات سے قیاس کر کے اس پر فیصلہ کرنا خوفناک ذمہ داری اپنے سر لینا ہے۔ ضعیف الایمان گنہ گاروں اور منافقین کو باہم دگر چھانٹنا ممکن ہے۔ اس چھانٹائی کا بھی صحیح طریقہ یہی ہے کہ یہاں اقامتِ دین کی ہمہ گیر جد و جہد کی جاتی رہے اور جد و جہد صالحین، ضعیف الایمان لوگوں اور منافقین کو چھانٹنے کی کسوٹی بن جائے۔ یہ جد و جہد آہستہ آہستہ ین کو بالکل ممیز کرتی جائے گی اور آگے چل کر ایک وقت آئے گا کہ ایسے عنصر کو پہچاننے میں کوئی دقت نہ رہے گی۔

[illegible]

قیام کے بارے میں ہماری ساری امیدیں اسی چیز سے وابستہ ہیں کہ ہماری قوم کی عظیم اکثریت اسلام کے ساتھ منافقانہ تعلق نہیں رکھتی ہے بلکہ حقیقت میں اس کی عقیدت مند ہے، اور صرف تعلیم و تربیت اور دینی تنظیم کی محتاج ہے۔ اس لئے ہم توقع رکھتے ہیں کہ اگر اس کمی کو پورا کرنے میں ہمارے صالح عناصر کامیاب ہو جائیں تو منافقین کی اقلیت آخر کار شکست کھا کے رہے گی اور یہاں ایک حقیقی اسلامی نظام اپنی اصل صورت اور روح کے ساتھ قائم ہو کر رہے گا۔ انشاء اللہ ورنہ اگر کہیں خدانخواستہ اس قوم کی اکثریت منافق ہو چکی ہو تو ہمیں اسلام کے احیاء و اعادہ کی تمام امیدوں سے ہاتھ دھو لینا پڑے گا۔

اس کے بعد تو امید کی ایک ذرا [illegible] باقی نہیں رہتی۔ (ا-م)

"ماہنامہ زندگی" رام پور (انڈیا)

موجودہ حالات پر اسلام کی روشنی میں بحث کرنے والا یہ سنجیدہ ماہنامہ گزشتہ چار سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ "اشارات"، "رسائل و مسائل" اور "تفسیر القرآن" کے مستقل عنوانات کے علاوہ اسلام کو ایک ضابطۂ حیات کی حیثیت سے پیش کرنے والے مضامین ہر ماہ اس میں شائع ہوتے ہیں۔

چندہ سالانہ صہ روپے۔ فی پرچہ ۸ر آنے۔

منیجر رسالہ "زندگی" رام پور (انڈیا)

مطبوعات

رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی

مؤلفہ: ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ قانون جامعہ عثمانیہ، دکن۔
ناشر: ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی۔ لاہور۔
قیمت: مجلد مع گردپوش ۵ روپے (ضخامت ۴۸۰ صفحات)

تقسیم ہند کے بعد سے پاکستان میں تصنیف و اشاعتِ کتب اور لوگوں کے ذوقِ مطالعہ کا جیسا کچھ
معیار سامنے ہے اس کے زیرِ اثر گنتی کی ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں کہ جن کے بارے میں کوئی تبصرہ
نگار بجز یہ کہہ سکے کہ یہ کتاب پڑھی جانی چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تالیف انہی کتابوں کی صف میں
شامل ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے بہرحال ایک اسکالر کے ذوقِ تحقیق کے جو نتائج سامنے آتے ہیں
ان میں قاری کے لئے نئی معلومات موجود ہیں اور سوچنے کے نئے راستے کھلتے ہیں۔

کتاب مجموعی طور پر مستشرقانہ انداز کی ہے اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ہماری وہ واحد شخصیت ہیں
مشرقی ہو کر بھی مستشرق قسم کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کی سیاسی زندگی کو پیش کرنے کے لئے
نقشہ مباحث آپ نے پسند کیا ہے اس میں ان پہلوؤں کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی ہے جن میں تاریخی
تحقیقات کے ذوق کو جولانیاں دلانے کے لئے وسیع تر میدان مل سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بجائے
اسلام کے سیاسی مسائل سے عملی وابستگی رکھنے والا کوئی داعیٔ اصلاح و انقلاب اسی موضوع پر قلم اٹھاتا
اس کا راستہ دوسرا ہوتا۔ وہ سارا زور یہ واضح کرنے پر صرف کرتا کہ

۱۔ نبی صلعم کی دعوت کا بنیادی کلمہ محض اعتقادی انقلاب ہی کا محرک نہیں بلکہ سیاسی تغیر کا بھی محرک تھا۔
۲۔ نبی صلعم نے جماعتی تنظیم کے لئے کیا نقشہ وحی کی رہنمائی میں اختیار فرمایا؟
۳۔ مکہ میں جب مخالفانہ پروپگنڈے کا طوفان چاروں طرف سے اٹھنے لگا تو قرآن نے

[illegible]

۴۔ پھر جب مخالفت تشدد میں بدل گئی تو اس دورِ آزمائش میں کن اصولوں پر نبی صلعم نے حالات کا مقابلہ کیا ؟

۵۔ نبی صلعم نے پیشِ نظر انقلاب کے لئے اپنے رفقا کی ذہنی و اخلاقی تربیت کس طرز پر کی۔

۶۔ تحریک نبویؐ مادہ پرستی (MATERIALISM) اور قوم پرستی (NATIONALISM) سے کس درجہ پاک تھی

۷۔ آنحضورؐ کی سیاست کاری کن غیر متغیر بنیادی اصولوں کی پابند تھی ؟

۸۔ "نفع پرستی" کے بجائے از اول تا آخر ٹھوس اخلاقی اصولوں اور قدروں پر کاربند ہونے کا کس کس طرح اہتمام کیا گیا ؟

۹۔ رسول اللہ نے حکمرانی کے لئے جو نیا اسلامی اسلوب دنیا کے سامنے عملاً رکھا وہ واقعات کی روشنی میں اپنے امتیازات کو کیسے نمایاں کرتا ہے ؟

۱۰۔ ریاستِ مدینہ کی خارجہ اور داخلہ پالیسی کو وحی کے مطابق نبی صلعم نے کس طرح عملی صورت دی ؟ وغیرہ۔

لیکن ڈاکٹر صاحب اپنا ایک پختہ مزاج رکھتے ہیں اور اس کے مطابق موصوف نے پیشِ نظر موضوع پر اپنا راستہ منتخب کیا ہے، اور بہرحال اس کتاب کے ذریعے آپ نے بہت کچھ ہمیں دیا ہے جس کے لئے شکر گزار ہونا چاہیئے۔ غنیمت یہ کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے اس تجدد پسند طبقے سے الگ ہیں جو اسلام کے متعلق کوئی ٹھوس واقفیت پیدا کئے بغیر اس کے نازک ترین موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے اور پھر اس کے ساتھ کھیلتا ہے اور مذاق کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہرحال جو کچھ لکھا ہے ایک مسلمان کی طرح لکھا ہے چاہے آپ اُن سے کتنے ہی مقامات پر اختلاف کیا کریں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے لئے جو اچھوتا موضوع پسند کیا ہے اس کے لئے ریسرچ کرتے ہوئے جو دقتیں آپ کو محسوس ہوئی ہیں ان کو بہترین الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "اس کی تحریر کے زمانے میں علمی نقطۂ نظر سے ایک صحرا میں ہوں جہاں کتابوں کا پانی نہ ملنے کی وجہ سے وضو کی بجائے تیمم کرنی پڑی ہے"۔ (یہ "تیمم کرنی پڑی" شاید کسی سند سے درست ہو، مگر مانوس نہیں!)

صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل نبوت اور آغاز دور نبوت کی زندگی کو خاصی تفصیلی معلومات کے ساتھ پیش
کیا ہے۔ اس کے بعد مدینہ کی اسلامی ریاست کے کارپرداز کی حیثیت سے شرح و بسط کے ساتھ
بتایا گیا ہے کہ آنحضور کس حکمت اور تدبر کے ساتھ بڑی بڑی پیچیدگیوں سے ایک نازک دور میں
عہدہ برآ ہوئے۔ ایک طرف قریش مکہ تھے، دوسری طرف یہود و نصاریٰ اور تیسری طرف عرب کے
مختلف قبائل، اور خطرات کی اس مثلث کے درمیان ایک نوالانظام ریاست ایام طفولیت سے
گزر رہا تھا۔ اس موقع پر نبی صلعم نے جس طرح معاہدات کئے، خبریں حاصل کرنے کے انتظامات
کئے، اپنے دشمنوں کی صفوں کو توڑنے میں کامیابی حاصل کی، اور وقت آنے پر کوئی کمزوری دکھائے بغیر
جو اقدامات کئے، ان سب مراحل کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں خاصی روشنی ڈالی ہے۔
آنحضرت کے دعوتی خطوط اور امان ناموں اور معاہدوں کے لئے کتاب کا قریباً ایک تہائی حصہ
وقف کیا گیا ہے۔ ان خطوط و فرامین اور معاہدوں کی مسودات کی تاریخی اور دینی اہمیت ہے بھی بہت
زیادہ، اور پھر یہ ڈاکٹر صاحب کے ذوق سے خصوصی تعلق رکھنے والا میدان ہے نیز مستشرقین نے
ان کو موضوع بحث بنایا ہے، لہٰذا ان پر متوجہ ہونا قدرتی تھا۔
علاوہ بریں ڈاکٹر صاحب کے کچھ اور مضامین بھی جو موضوع سے کسی قدر متعلق قرار دیئے جا سکتے
ہیں، شامل کتاب ہیں۔ قرآن اور سیرت نبوی کے مطالعہ میں سہولت بہم پہنچانے کے لئے عرب اور
ملحقہ ممالک کا ایک اچھا نقشہ بھی دیا گیا ہے۔ دوران مباحث میں بھی چھوٹے چھوٹے توضیحی نقشے موجود ہیں۔
تاریخی بحثوں میں خاص طور پر مطالعہ کئے بغیر کوئی تبصرہ نگار زیادہ مداخلت نہیں کر سکتا لیکن یہاں
چند ایسی چند چیزوں کی طرف اشارے کئے جاتے ہیں جو مطالعہ کرتے ہوئے بیک نگاہ محسوس ہوئیں۔
سورۂ روم کی پیشین گوئی متعلقہ "فتح روم" اپنے پورے ہونے سے "کئی سال" قبل کی نہیں (بلکہ
"چند سال" قبل کی تھی کیونکہ قرآن میں "فی بضع سنین" کے الفاظ ہیں اور لفظ "بضع" دس سے
زیادہ کے لئے عموماً نہیں بولا جاتا۔ رومی فتح سنہ ۲ھ میں ہوئی اور یہ جنگ بدر کی ہم وقت تھی۔

قصہ اگر مؤلف کے نوٹس میں آیا ہوتا جس پر فقہا نے بڑی بحثیں کی ہیں تو ردمی فتح کا صحیح زمانہ ان کے سامنے آجاتا۔

"نسی" کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی دیرینہ رائے یہ ہے کہ قمری اور کبیسہ مہینوں کو تطبیق دینے کے لئے ہر تیسرے سال کو لیپ کا سال شمار کرتے ہوئے قبیلۂ بنی فقیم کا سردار جس کا لقب قلمس ہوا کرتا تھا حج کے موقع پر منیٰ میں ایک خاص تقریب کے ساتھ اعلان کرتا تھا کہ اب جو ذی الحجہ چل رہا ہے اس کے بعد کا نیا چاند محرم الحرام کا نہیں، بلکہ ایک گمنام اور محترم مہینے کا چاند ہوگا اور محرم الحرام کا چاند اس کے بعد آئے گا (۳۰۲) حالانکہ یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ قرآن طریق "نسی" کو "زیادۃ فی الکفر" کہتا ہے، یعنی کوئی بڑی معصیت اس میں شامل تھی۔ وہ معصیت یہ تھی کہ مختلف مواقع پر عربی کیلنڈر کے انچارج اکابر کے مفاد کی رعایت سے ہے نسی کا مہینہ جہاں مناسب سمجھتے تھے لگا دیتے تھے۔ کبھی آگے کبھی پیچھے! ڈاکٹر صاحب کی تحقیق میں یہ چیز نہیں آئی۔

ص ۳۲۲ پر موسیٰ بن عمران نام کی دو شخصیتیں ہونے کا امکان (کسی قدر ضرورت کے تحت) ظاہر کیا گیا ہے، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کا رجحان یہ ہے کہ سورۂ کہف میں موسیٰؑ کا جو طالبعلمانہ سفر مذکور ہے وہ بعض تاریخی دلائل سے موسیٰ علیہ السلام سے قبل کا ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن اگر سورۂ کہف کے مقصدِ نزول اور خصوصاً دفت کے جن سوالات کی طرف اس میں اشارات کئے گئے ہیں ان کی روشنی میں دیکھا جائے تو واقعہ قطعی طور پر موسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہے۔ مگر تحقیق کا یہ میدان ایک مستشرق مزاج مؤرخ کا میدان نہیں ہے۔ افسوس کہ یہاں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔

ص ۳۳۰ پر یہودیوں میں دعوت پھیلانے کی حکمتِ نبوی پر گفتگو کرتے ہوئے قرآن کی آیت ۲/۶۲ و ۵/۶۹ کے حوالے سے ایک "بنیادی مذہب" کا تصور سامنے لایا گیا ہے جو اقل قلیل معتقدات پر مبنی تھا۔ پھر ص ۳۳۴ پر بنیادی مذہب کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب واضح کرتے ہیں کہ یہودیوں، عیسائیوں اور صابیوں سے مطالبہ نہ تھا کہ وہ اپنے اپنے مذہب ترک کر دیں بلکہ اپنے ہی الہامی مذاہب کی تجدید کرنے جیسے چند بنیادی اصولوں پر عمل کریں، یعنی خدا اور رسول کو ماننا۔ ڈاکٹر صاحب کے

الفاظ" یعنی خدا اور رسول کو ماننا" اور پھر ان پر یہ نوٹ کہ قرآن خدا اور رسول میں فرق کرنے کی
ت نہیں دیتا اور ص ۱۴۱ کا یہ نوٹ کہ "یہ ایک بے معنی چیز ہوگی کہ نبی کے بتائے ہوئے راستے پر
، لیکن خود نبی کو نہ مانیں" ڈاکٹر صاحب کی پوزیشن کو صاف کرنے والے ہیں لیکن بنیادی مذہب
ملق مذکورہ باتیں بڑی ڈھیلی ڈھالی اور غلط فہمی پیدا کرنے والی ہیں، جیسے کہ آپ لکھتے ہیں کہ
عوت آج بھی باقی ہے کہ اپنے ہاں کے اصلی مذہب پر رجوع کرو۔" (۲۲۸)۔ سوال یہ ہے کہ ان
پنے ہاں" ہے کیا؟ تحریف شدہ کتب یا مذہبی روایات! کیا نبی صلعم ان کی طرف رجوع کرنے
عوت دے رہے تھے؟ یقیناً نہیں۔ تو پھر صاف بات یوں کیوں نہ کہہ دی جائے کہ دعوت یہ
، اسلام کی طرف پلٹو جو تمہارا بھی دین تھا، لیکن تم نے اس کی حفاظت نہ کی اور اب وہ خالص
ل شکل میں صرف قرآن اور نبی صلعم سے مل سکتا ہے۔ اس قسم کے مسائل میں ادھوری باتیں
سے ہمیشہ فتنے پیدا ہوتے ہیں لہذا مکمل ہوئی بات کہنی چاہیے۔

ص ۳۵۳ پر دین و سیاست کو علیحدہ کرنے کی ایک نظیر قرآن سے نکال کر سامنے لائی گئی ہے اور
فریق کو "تقسیم کار" کے حسین لفظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ طالوت بادشاہ نہیں مقرر کئے گئے تھے
لی کمانڈر تھے۔ قوم نبی سے مطالبۂ جہاد کر رہی تھی اور اس کے لئے ایک امیر جہاد مطلوب تھا۔
ہی لفظ "مَلِک" سے ہو رہی ہے جس کا معنی صرف بادشاہ ہی نہیں۔ اس پر ترجمان القرآن میں
ر تبہ اصلاحی صاحب تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

ورنہ "عبادت و سیاست" میں تقسیم کار کی نوعیت کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ
ت نبی کے ماتحت تھے یا اس سے آزاد؟ اگر ماتحت تھے تو اصل اختیار نبی ہوا اور اگر آزاد
ہو بتایا جائے کہ نبی کے ہوتے ہوئے نبی سے آزاد حاکم کیا مسلمان بھی ہو سکتا ہے؟
"مشترک حکمرانی کی اجازت" کا پورا باب "کچھ بات بنانے" کی کوشش کا مظہر ہے۔ ہارون
سلام کو موسیٰ علیہ السلام نے بطور وزیر (نائب) طلب کیا تھا اور "واشرکہ فی امری" کا

تھیں کی ذمے داری میں شریک کر۔ عثمان کے جن دو حکمرانوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی کوئی دلیل نہیں بن سکتا ہو سکتا ہے کہ ان میں علاقوں کی کوئی تقسیم ہو یا ذمہ داریوں کی، اور پھر ان کے اوپر اسلامی ریاست کی طرف سے عمرو بن العاص ریذیڈنٹ تھے ہی جو ہم آہنگی (COORDINATION) کا وسیلہ تھے۔

اگر ایک اسکول کے دو ہیڈ ماسٹر یا ایک فرم کے دو منیجر اور ایک عدالت کے دو جج بیک وقت مامور ہوں، درانحالیکہ ان میں نائب و منیب کا تعلق نہ ہو تو اس سے جو فساد رونما ہوگا وہی کسی ریاست کے ایک سے زائد حاکموں کی وجہ سے رونما ہوگا۔ اغلباً شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا مدعا بھی دوسرا ہے، وہ یہ کہ اگر ایک امیر کسی پہلو سے کمزوری محسوس کرے تو وہ اس پہلو کے لئے کسی دوسرے شخص کو نائب کی حیثیت سے ساتھ لے سکتا ہے لیکن اسلامی ریاست میں جمہوریت و شورائیت اور تقسیم کار کے نظام کے باوجود اختیار کا آخری مرکز فرد واحد ہوتا ہے۔

کتاب کے آخر میں انڈکس بھی موجود ہے۔

طب اسلامی

مؤلفہ: جناب حکیم محمد یحییٰ خان صاحب حاذق العصر۔
شائع کردہ: مکتبہ ارمغان۔ راولپنڈی۔
قیمت: تین روپے بلا جلد۔ مجلد تین روپے آٹھ آنے۔

یہ کتاب بھی ایک علمی اور تحقیقی کتاب ہے۔ اس کے مؤلف علم طب اور فن طب دونوں میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور موصوف نے جو کچھ لکھا ہے بڑی ذمہ دارانہ حیثیت سے لکھا ہے۔ یہ موضوع جن لوگوں کے لئے وجہ دلچسپی ہو ان کو لازماً یہ کتاب پڑھنی چاہیئے۔ اس کے پس منظر میں ایلوپیتھی اور یونانی طب کے حامیوں کی متعصبانہ بحثوں کی پیدا کردہ فضا موجود ہے لیکن حکیم یحییٰ صاحب خود کم سے کم متعصبانہ نقطۂ نظر سے بالاتر ہیں۔ انھوں نے صرف وقت کے کچھ سوالات کا جواب دیا ہے اور بہت معقول طریق سے دیا ہے۔

شروع ہی میں موصوف نے اس سوئے ظن کا ازالہ کردیا ہے کہ اطباء "اسلامی" کے لفظ سے

ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے اپنی طب کو مذہبی جامہ پہناتے ہیں۔ مولف لکھتے ہیں کہ "طب اسلامی مذہبی طب نہیں ہے بلکہ وہ طب ہے جس نے اسلامی تاریخ کے دور میں ترقی و تحقیق کی منزلیں طے کی ہیں"۔ حالانکہ لوگوں کا اپنا حال یہ ہے کہ چاہیں تو شراب خانے کو بھی اسلامی بنا دیں۔

مؤلف نے طب کی مجموعی تاریخ کا اجمالی خاکہ پیش کرنے کے بعد یونان کے گہوارے میں اس کی پرورش کا حال بتایا ہے اور پھر مسلمانوں نے اس طب میں جو جو کچھ اضافے کئے ہیں اور جن طبی تحقیقاتوں سے اس فن شریف کو مالا مال کر کے آج کے اہلِ مغرب کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ علاج و ادویہ کے علوم میں دنیا کی امامت کریں، ان سب کا جائزہ لیا ہے۔ پھر مسلم اساتذۂ فن اور اس موضوع پر اساتذہ کی لکھی ہوئی علمی کتابوں کا تعارف بھی کرایا ہے۔

حکیم صاحب نے اس چیز کو ثابت کرنے پر خاص زور صرف کیا ہے کہ آج کے تمام انکشافات اور نظریات کی بنیاد میں مسلمان اکابرِ طب کی محنتیں پیوست ہیں۔ اور یہ کھلی ہوئی حقیقت بھی ہے جسے مغرب کے انصاف پسند علما تسلیم کرتے ہیں، لیکن حکیم صاحب کا اندازِ بیان اس مدعا کی طرف جاتا ہے کہ تحقیق و انکشاف کے جو جدید مرحلے طے کئے گئے ہیں وہ کوئی بڑی چیز نہیں ہیں بلکہ "محض اس اجمال کی تفصیل" ہیں۔ یہ رجحان درست نہیں ہے۔ علمِ طب میں جو پیش قدمی مسلمانوں نے ماضی میں کی جس طرح وہ قابلِ قدر تھی اسی طرح طبِ مغرب کی پیش قدمیاں قابلِ قدر ہیں۔ ان پیش قدمیوں کو حقیر سمجھنا اور ان سے بے نیاز رہنے کی کوشش کرنا ایک مسلم کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا۔ ہر ایک دورِ انکشاف میں نو بنو نظریات کا ابھرنا بھی بالکل قدرتی امر ہے اور اسے تلوّن کہہ کر خطرناک قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ دین میں جس طرح "ختمِ نبوت" ہو چکی ہے اس طرح علومِ طبیعی میں "ختمِ تحقیق" نہیں ہوئی کہ "الیوم اکملت لکم علومکم" کا حرفِ آخر کہنے کا کوئی مقام آسکے۔ اب اگر مغرب میں انحطاط کی وجہ سے طب کا بہاؤ رک گیا ہے ——— اور ایک طب ہی کا نہیں

از

ابوالاعلیٰ مودودی

کالجوں اور ہائی اسکول کی آخری جماعتوں کے لئے
بہترین دینی تعلیم کا نصاب

عمدہ جلد	تعداد صفحات	قیمت
خوشنما گردپوش	(۱۹۲)	دو روپے

پردہ

اس کتاب کا مطالعہ ہر اس مسلمان کیلئے ناگزیر ہے جو اسلام اور مغرب کے معاشرتی نظریات و عملیات کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہے اور اسلام کے اصول تمدن پر ذہناً مطمئن ہونا چاہے۔ مرد و زن کے آزادانہ میل جول سے یورپ میں جو فواحش کی کثرت، خاندانی نظام کی بربادی اور کلی قومی ہلاکت نمودار ہوئی ہے اسکی تفصیلی روداد کتاب میں پیش کی گئی ہے ضخامت ۲۳۲ صفحات قیمت ۲ روپے آٹھ آنے

حقوق الزوجین

مرد اور عورت کے قانونی اور معاشرتی حقوق جو اسلام کے عطا کردہ ہیں اُنکی تفصیل اس کتاب میں موجود ہے ضخامت ۱۲۴ صفحات قیمت [illegible]

اسلام اور ضبط ولادت

اس رسالے کا موضوع ضبط تولد کی تحریک کی علمی اور عملی بنیادوں کا ابطال ہے۔ ضخامت ۲۰ صفحات قیمت ایک روپیہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی

اچھرہ - لاہور - پاکستان

شعبان المعظم ۱۳۷۰ھ
جلد ۳۶ ، عدد ۲

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فہرست مضامین

جلد ۳۶ | شعبان ۱۳۷۰ھ — مطابق — جون ۱۹۵۱ء | عدد ۲

سید ابوالخیر مودودی نے کشنل پریس سپمرلین روڈ سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

قرار دادِ مقاصد کے پاس ہونے کا فائدہ صرف یہی نہیں ہوا کہ مسلم قوم اور پاکستانی مملکت کا نصب العین واضح صورت میں متعین ہوگیا اور اس نے ایک پختہ آئینی شکل اختیار کر لی جس کا بدلنا اب ممکن نہیں رہا ہے، بلکہ اس کا دوسرا، اور اس سے بھی زیادہ اہم فائدہ یہ ہوا کہ مملکتِ پاکستان اصولاً ایک اسلامی مملکت میں تبدیل ہوگئی۔ اس دوسرے فائدے کی اہمیت بھی وہ لوگ ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھ سکے ہیں جنہیں آئینی مسائل کا فہم حاصل نہیں ہے، اور اسی بنا پر ان کی سمجھ میں اب تک یہ بھی نہیں آیا ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے اس مملکت کی حیثیت میں اس قرارداد کی بدولت کیا بنیادی فرق واقع ہوگیا ہے۔ لیکن ہم نے چونکہ تمام آئینی و شرعی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد خوب سوچ سمجھ کر یہ سوال اٹھایا تھا، اس لئے ہم پر اس کے سیاسی اور اخلاقی نتائج ہی نہیں، قانونی اور شرعی نتائج بھی پوری طرح روشن تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قرارداد کے پاس ہوتے ہی جماعتِ اسلامی نے فوراً اس کا نوٹس لیا اور اپنے دستور، پالیسی اور طریقِ کار میں اس تغیّر کا اعلان کر دیا جو مملکت کی آئینی حیثیت کے تغیّر سے ٹھیک مطابقت رکھتا تھا۔

یہ معاملہ چونکہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس نے ہماری تحریک کے راستے کو اصولاً اور عملاً بالکل بدل دیا ہے اس لئے ہم اس کی تھوڑی سی توضیح کریں گے تاکہ سمجھ بوجھ رکھنے والے اصحاب اس کو اور ہماری تحریک کی رفتارِ مابعد کو اچھی طرح جان لیں۔

جس ریاست کا دستور تحریری شکل میں مدوّن نہ ہو اس کے اسلام و کفر کو متعین کرنے کا سوال تو ذرا پیچیدہ ہوتا ہے، لیکن ایک تحریری دستور رکھنے والی ریاست کا معاملہ بالکل صاف ہوا کرتا ہے کیونکہ اس کا دستور خود اس راہ کی شہادت [illegible]

اگر کسی ریاست کا دستور صریح طور پر اپنے کفر کی گواہی دے رہا ہو تو اس کے کارپردازوں اور کارفرماؤں میں محض مسلم افراد کی صورتیں دیکھ کر یا ان کی دعائے اسلام سے بھری ہوئی تقریریں سن کر اس کے مسلم ریاست ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس ریاست کے ساتھ وہ معاملہ کیا جا سکتا ہے جو شرعاً صرف ایک مسلم ریاست ہی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک شخص اگر خود اپنی زبان سے مسلم ہونے کا انکار اور غیر مسلم ہونے کا اقرار کر رہا ہو تو ہمارے لئے یہ ممکن نہیں رہتا کہ ہم اس کی زبان سے بعض اسلامی خیالات سن کر اور اس کی زندگی میں بعض اسلامی علامات دیکھ کر اسے مسلمان مان لیں اور اسے نماز میں امام بنا نا یا کسی مسلمان لڑکی سے اس کا نکاح کرنا قبول کر لیں۔ اس طرح کے سارے معاملات اس کے ساتھ بہر حال اُس وقت تک نہیں کئے جا سکتے جب تک کہ وہ زبان ہی سے شہادتِ اسلام ادا نہ کرے۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ ایک غیر اسلامی دستور پر مبنی مملکت کا بھی ہے کہ جب تک اس کی آئینی زبان شہادتِ اسلام ادا نہ کرے ہم نہ اس کو اسلامی مملکت کہہ سکتے ہیں اور نہ اس کے ساتھ وہ روابط قائم کر سکتے ہیں جو شرعاً صرف ایک اسلامی مملکت ہی کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں، خواہ اس کی ساری آبادی مسلمان ہو اور اس کے سارے کارفرما و کارپرداز بھی مسلمان ہی ہوں۔

پاکستان بننے سے پہلے متحدہ ہندوستان میں جو مملکت قائم تھی اس کا دستور صریح طور پر ایک کافرانہ دستور تھا۔ اس میں اسلامی ریاست کی کسی خصوصیت کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ اس لئے اس میں ہماری پوزیشن یہ تھی کہ ہم اس کی تمام ملازمتوں کو اصولاً حرام سمجھتے تھے، اس کے قانون کو جائز قانون تسلیم نہ کرتے تھے، اس کی عدالتوں میں جج وکیل یا مدعی کی حیثیت سے جانے کو شرعاً ممنوع خیال کرتے تھے، اس کی مجالس قانون ساز کی رکنیت اور اس کے انتخابات میں حصہ لینے کو اسلام کے منافی قرار دیتے تھے، اور ہمارا عقیدہ یہ تھا کہ ایسی ریاست میں سانس لینا بھی ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے الّا یہ کہ وہ اسے دار الاسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرے، اور اس جدوجہد کی غرض سے

ٹھیرنے کی صورت میں بھی ہم اس ریاست کے نظم ونسق اور اس کے قوانین سے صرف اتنے تعلق کو جائز سمجھتے تھے
جتنا موجودہ دنیا کی ایک مملکت میں جینے اور اقامتِ دین کا کام کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔ علاوہ بریں اس
ریاست کو "دارالاسلام" میں تبدیل کرنے کی جدوجہد بھی ہم ان طریقوں سے نہ کرسکتے تھے جو موجودہ زمانے کی
اصطلاح میں "آئینی طریقے" کہلاتے ہیں، کیونکہ انتخابات میں حصہ لینا ہمارے نزدیک شرعاً صحیح نہ تھا
اس لئے ہم نے "پرامن، غیر خفیہ، انقلابی دعوت" کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب سیاسی انقلاب رونما ہوا اور اس کے نتیجہ میں پاکستان کی مملکت بنی تو
ایک سخت پیچیدہ صورتِ حال پیش آگئی۔

مملکت زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل تھی جو بالعموم اپنی قومی ریاست کو اسلامی ریاست دیکھنے کے
خواہشمند تھے اور یہ چیز اس بات کی متقاضی تھی کہ ہم اس کی تعمیر وتشکیل میں اپنی قوم کی پوری مدد کریں
دستورِ مملکت جوں کا توں وہی کافرانہ دستور تھا جو سابق انگریزی حکومت چھوڑ گئی تھی، اور اس
کی وجہ سے نہ شرعاً اس نئی مملکت کی حیثیت پچھلی غیر اسلامی مملکت سے مختلف قرار دی جاسکتی تھی اور
نہ اس کے ساتھ کوئی مختلف رویہ اختیار کیا جاسکتا تھا۔

باشندگانِ ملک کے نمائندوں پر مشتمل ایک دستور ساز اسمبلی بنا دی گئی تھی جسے یہ طے کرنا
تھا ــــ اور آئینی طور پر صرف وہی یہ طے کرنے کی مجاز تھی ـــ کہ ملک کا مستقل دستور کیا ہو، مگر اس
نے نہ تو سابق دستور میں کوئی اصولی ترمیم کی (حالانکہ جزوی ترمیمات بہت سی کیں اور کرتی رہی)، اور نہ
آئندہ ہی کے متعلق یہ ظاہر کیا کہ وہ ملک کا جدید نظام کن اصولوں پر قائم کرنا چاہتی ہے۔

یہی وہ پیچیدگی تھی جسے بالآخر قراردادِ مقاصد نے رفع کیا۔ اصولاً ایک تحریری دستور رکھنے والے
ملک میں صرف اس کی دستور ساز اسمبلی یا اسی نوعیت کے اختیارات رکھنے والی کوئی مجلس ہی وہ آئینی
زبان ہوسکتی تھی جس سے شہادتِ اسلام ادا ہونے پر اسے اسلامی ریاست قرار دیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ
تاریخ کو اس نوزائیدہ مملکت کی آئینی زبان سے یہ شہادت ادا ہوئی اسی روز جماعت اسلامی کی مجلس شو

نے اُس کے ایک اسلامی مملکت ہونے کو تسلیم کر لیا اور ٹھیک ۲۴ روز بعد پوری آئینی پوزیشن کا جائزہ لے کر یہ اعلان کیا کہ اب اس ریاست کی شرعی حیثیت سابق غیر مسلم ریاست سے بالکل مختلف ہو چکی ہے، اب اس کی ملازمت جائز ہے، اس کے قوانین اپنی عارضی نوعیت میں قابلِ تسلیم ہیں، اس کی عدالتوں میں جانا حلال ہے، اور اس کی اسمبلی و پارلیمنٹ کے انتخابات میں ہر حیثیت سے حصہ لیا جا سکتا ہے۔ اس دستوری تغیّر کے ساتھ جماعت نے اپنی پالیسی میں بھی یہ تغیّر کیا کہ وہ آئندہ اس ملک کے انتخابات میں حصہ لے کر آئینی طریقوں سے اس کو مکمل دارالاسلام بنانے کی کوشش کرے گی۔ یہ ہماری تحریک کی تاریخ میں ایک اہم نقطۂ انقلاب تھا جس نے ہمارے لئے ایک طریق کار کے بجائے دوسرے طریق کار کا دروازہ کھول دیا۔ اب ایک باقاعدہ اسلامی مملکت بن جانے کے بعد یہ دار، عدُو نہیں رہی جس کے خلاف جدوجہد کرنا ہمارا کام ہو، بلکہ دار دوست، ہمارا اپنا دار بن گئی جسے بنانا، سنوارنا اور ترقی دینا ہمارا کام ہو گیا۔

اس کے بعد سے جماعت جس لائحۂ عمل پر کام کر رہی ہے وہ چار بڑے بڑے مقاصد پر مشتمل ہے۔

اوّل یہ کہ اس مملکت کو ان تمام فکری اور عملی رجحانات سے بچایا جائے جو اسے اسلام کے راستہ سے منحرف کرنے والے ہیں۔

دوم یہ کہ عوام الناس کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح کی جائے یہاں تک کہ ہمارا معاشرہ جاہلیت کی بنیادوں سے ہٹ کر اسلام کی صالح بنیادوں پر قائم ہو اور اس قابل بن جائے کہ اس میں برائیاں دبیں اور بھلائیاں نشوونما پا سکیں۔

سوم یہ کہ ہماری اس نئی مملکت کی تعمیر لازماً انہی بنیادوں پر ہو جو قراردادِ مقاصد میں متعین کر دی گئی ہیں اور کسی ایسی تدبیر کو نہ چلنے دیا جائے جو قراردادِ مقاصد کو بالائے طاق رکھ کر یہاں ایک غیر اسلامی طرز کا نظامِ حکومت قائم کرنے کے لئے اختیار کی جائے۔

چہارم یہ کہ آئندہ انتخابات سے اس مملکت کی موجودہ قیادت کو ایک صالح قیادت سے تبدیل کیا جائے

بھی ہے جو اشتراکیت اور اشتراکیوں پر تو لعنت بھیجتے ہیں مگر خود اشتراکی دماغ سے سوچتے اور اشتراکی زبان میں
م کرتے ہیں اور قرآن و حدیث تک سے اشتراکیت نچوڑ لاتے ہیں۔

دوسری مزاحم طاقت مغربی الحاد و فسق اور اباحیت ہے جو ہمارے اس ملک میں ڈیڑھ سو برس کی تاریخ رکھتی ہے
ے انگریزی تعلیم و تہذیب اور سیاست نے مدت دراز تک دودھ پلا پلا کر پالا ہے جسے چلتے چلتے انگریز اپنے خلف الصدق
یثیت سے مسند اقتدار سونپ گیا ہے، اور جسے یہاں مغربی طاقتوں کی پشتیبانی بھی حاصل ہے۔ پھر چاہے سیاسی مقاصد
معاشی اغراض میں اسکے اور اشتراکیت کے درمیان کتنے ہی اختلافات ہوں مگر دونوں ایک ہی مادی تہذیب کی بیٹیاں
ں اور الحاد و فسق اور اباحیت میں اشتراکی اور غیر اشتراکی متفرنجین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسلئے جہاں تک
یقی اسلام کے نفوذ و قیام کا راستہ روکنے کا تعلق ہے، دونوں اس کام میں متحد ہیں اور ان کی متحدہ کوشش یہ ہے کہ
ن "اسلام" کے نام سے ایک ایسی تہذیب اور ایسے تمدن کو رائج کیا جائے جو اپنی کسی خصوصیت میں امریکہ،
انیہ، فرانس اور روس کے تمدن و تہذیب سے مختلف نہ ہو اور جس میں اسلام کی مقرر کی ہوئی حدوں میں سے
ئی حد قائم نہ رہے۔

جماعت اسلامی کا اصل تصادم انہی دو طاقتوں سے ہے۔ علماء کرام خواہ مخواہ بیچ میں آ کھڑے
ئے ہیں یا "کو دیا" بنا کر لا کھڑے کئے گئے ہیں۔

کوئی تہذیبی و تمدنی حرکت جمود کی چٹانوں سے نہیں روکی جا سکتی۔ اس کو اگر روک سکتی ہے تو ایک
بل کی تہذیبی و تمدنی حرکت ہی روک سکتی ہے۔ ہمارے ہاں اب تک سیلابوں کا مقابلہ چٹانیں کرتی رہی ہیں۔ اسی
ہمارے ملک سمیت قریب قریب تمام مسلمان ملک مغرب کے فکری و تہذیبی سیلابوں میں غرق ہوتے چلے گئے
۔ اب ہم حرکت کا مقابلہ حرکت سے اور سیلاب کا مقابلہ جوابی سیلاب سے کر رہے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ ساری کھوئی ہوئی
ن واپس لے سکیں گے۔ ہماری تحریک کسی ایک گوشے یا ایک میدان میں ان ضلالتوں کا مقابلہ نہیں کر رہی ہے
ہر میدان میں ہمارا اور ان کا تصادم ہے۔ ہم نے ان کے تمام نظریات اور عملی طریقوں پر تنقید کی ہے اور ان کی

قال اسکو معقول ثابت کیا جاسکے ہم انکے ادب کے مقابلہ میں ایک صالح ادب لائے ہیں انکے فلسفے کے مقابلہ میں ایک بہتر فلسفہ لائے ہیں انکی سیاست کے مقابلہ میں ایک
زیادہ مضبوط سیاست لائے ہیں اور ہماری صفوں میں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف قال اللہ وقال الرسول جاننے
ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے ساتھ قال ہیگل وقال مارکس وقال فرائڈ بھی انہی کے برابر جاننے والے ہیں۔ درس گاہوں میں جہاں
ان کی فکر اور تہذیب کی اشاعت کرنیوالے موجود ہیں وہاں انہی کی ٹکر کے فکری و تہذیبی مبلغ ہماری طرف سے بھی موجود
حکومت کے ہر شعبے میں ان کا زہر پھیلانے والے اگر اپنا کام کر رہے ہیں تو ہمارے تریاق کے حاملین بھی بیکار نہیں ہیں۔
ان کو نکالنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے لیکن اب خدا کے فضل سے ان سب کو چن چن کر نکال پھینکنا کسی کے بس
بات نہیں ہے اور انشاء اللہ تجربہ ثابت کر دیگا کہ کسی متحرک نظام فکر و عمل کے متاثرین کو چن کر چھانٹ پھینکنا
ایک بیوقوف ہی ممکن العمل سمجھ سکتا ہے ـــــ سوسائٹی کے ہر طبقے میں ان کے اثرات کے بالمقابل ہمارے اثرات بھی کم یا زیادہ
ہیں مزدور اور کسان اور محنت پیشہ عوام جو اب تک ان کا ابھار بنے ہوئے تھے، بتدریج انکے اثر سے نکل کر ہمارے
آتے جا رہے ہیں۔ اور ایک طاقتور رائے عام غیر اسلامی افکار و اخلاق و اطوار کے خلاف تیار ہوتی جا رہی ہے۔ ان سب
یہ کہ انقلاب قیادت کیلئے ہماری تحریک کی زد براہ راست اُس اقتدار پر پڑتی ہے جس کے سہارے یہاں محض فرنگیت
نہیں دوسری تمام چھوٹی بڑی ضلالتیں بھی پرورش پا رہی ہیں پھر اس کشمکش کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس کے
فریق اپنے اپنے نظریات ہی کی نمائندگی نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس مخصوص کیرکٹر کی بھی نمائندگی کر رہے ہیں جسے ان نظر
ساتھ مناسبت رکھتا ہے ایک طرف اگر اشتراکی اپنے اشتراکی اخلاق اور متفرنجین اپنی فرنگی سیرت کے ساتھ میدان
ہیں تو دوسری طرف جماعت اسلامی بھی خالی خولی تقریریں اور تحریریں اور اجتماعی سرگرمیاں لئے ہوئے سامنے نہیں
بلکہ وہ انفرادی سیرت اور جماعتی اخلاق بھی ساتھ لائی ہے جو اسلام کی اگر مکمل نہیں تو کم از کم صحیح نمائندگی ضرور کرتا
اثرات جہاں جہاں بھی پہنچ رہے ہیں وہاں اسلامی خیالات کے ساتھ اسلامی تہذیب اور اسلامی اطوار کا مظاہرہ
کے ساتھ سر اونچا کر کے پیش کیا جا رہا ہے، اور وہ کیفیت دور ہو رہی ہے کہ ماڈرن سوسائٹی میں ایک شخص نماز
شرماتا تھا اور ایک خاتون برقع اوڑھنے پر لاکھ معذرتیں کرکے بھی ڈرتی تھی کہ معلوم تاریک خیالی کا دھبا اسکے دامن سے
۴۹ء اور ۵۰ء میں ہم نے ان ضلالتوں کے مقابلہ کیلئے اپنے پچھلے لٹریچر پر جن چیزوں کا اضافہ کیا وہ یہ ہے
۳۔ قومی ملکیت ۴۔ پاکستانی عورت دوراہے

تفہیم القرآن

الحجر

نام | چھٹے رکوع کی پہلی آیت کَذَّبَ اَصۡحٰبُ الۡحِجۡرِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول | مضامین اور انداز بیان سے صاف تر شح ہوتا ہے کہ اس سورہ کا زمانۂ نزول سورۂ ابراہیم سے متصل ہے۔ اس کے پس منظر میں دو چیزیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دیتے ایک مدت گزر چکی ہے اور مخاطب قوم کی مسلسل ہٹ دھرمی، استہزاء، مزاحمت، اور ظلم و ستم کی حد ہو گئی ہے جس کے بعد اب تفہیم کا موقع کم اور تنبیہ و انذار کا موقع زیادہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی قوم کے کفر و جمود اور مزاحمت کے پہاڑ توڑتے توڑتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھکے جا رہے ہیں اور دل شکستگی کی کیفیت بار بار آپ پر طاری ہو رہی ہے، جسے دیکھ کر اللہ تعالیٰ آپ کو تسلی دے رہا ہے اور آپ کی ہمت بندھا رہا ہے۔

موضوع اور مرکزی مضمون | یہی دو مضمون اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں۔ یعنی تنبیہ ان لوگوں کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کر رہے تھے اور آپ کا مذاق اڑاتے اور آپ کے کام میں طرح طرح کی مزاحمتیں کرتے تھے۔ اور تسلی و ہمت افزائی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سورہ تفہیم اور نصیحت سے خالی ہے۔ قرآن میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے مجرد تنبیہ، یا خالص زجر و توبیخ سے کام نہیں لیا ہے۔ سخت سے سخت دھمکیوں اور ملامتوں کے درمیان بھی وہ سمجھانے اور نصیحت کرنے میں کمی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس سورہ میں بھی ایک طرف توحید کے دلائل کی طرف مختصر اشارے کیے گئے ہیں، اور دوسری طرف قصۂ آدم و ابلیس سنا کر نصیحت فرمائی گئی ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

الف۔ لام۔ را۔ یہ آیات ہیں کتابِ الٰہی اور قرآنِ مُبین کی۔[1] بعید نہیں کہ ایک وقت وہ آجائے جب وہی لوگ جنہوں نے آج (دعوتِ اسلام کو قبول کرنے سے) انکار کر دیا ہے، پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش ہم نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہوتا۔ چھوڑو انہیں۔ کھائیں، پئیں، مزے کریں، اور بُھلاوے میں ڈالے رکھے اِن کو جھوٹی امید۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لئے ایک خاص مہلتِ عمل لکھی جا چکی تھی۔[2] کوئی قوم نہ اپنے وقتِ مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے، نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں "اے وہ شخص جس پر ذکر نازل ہوا ہے،[3] تو یقیناً دیوانہ ہے۔ اگر تو سچا ہے تو ہمارے

---

[1] یہ اس سورہ کی مختصر تعارفی تمہید ہے جس کے بعد فوراً ہی اصل موضوع پر خطبہ شروع ہو جاتا ہے۔ قرآن کے لئے "مبین" کا لفظ صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیات اس قرآن کی ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف ظاہر کرتا ہے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ کفر کرتے ہی فوراً تو ہم نے کبھی کسی قوم کو بھی نہیں پکڑ لیا ہے، پھر یہ نادان لوگ کیوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ نبی کے ساتھ تکذیب واستہزاء کی جو روش انہوں نے اختیار کر رکھی ہے اس پر چونکہ ابھی تک انہیں سزا نہیں دی گئی، اس لئے یہ نبی سرے سے نبی ہی نہیں ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ ہم ہر قوم کے لئے پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ اس کو سننے، سمجھنے اور سنبھلنے کے لئے اتنی مہلت دی جائے گی، اور اس حد تک اُس کی شرارتوں اور خباثتوں کے باوجود پورے تحمل کے ساتھ اسے اپنی من مانی کرنے کا موقع دیا جاتا رہے گا۔ یہ مہلت جب تک باقی رہتی ہے، اور ہماری مقرر کی ہوئی حد جس وقت تک آ نہیں جاتی، ہم ڈھیل دیتے رہتے ہیں۔

[3] "ذکر" کا لفظ قرآن میں اصطلاحاً کلامِ الٰہی کے لئے استعمال ہوا ہے جو سراسر نصیحت بن کے آتا ہے۔ جتنی کتابیں انبیاء پر نازل ہوئی تھیں وہ سب بھی "ذکر" تھیں اور یہ قرآن بھی "ذکر" ہے۔ ذکر کے اصل معنی ہیں "یاد دلانا"، "ہوشیار کرنا"، اور "نصیحت کرنا"۔

سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتا؟ ——— ہم فرشتوں کو یُوں نہیں اُتار دیا کرتے۔ وہ جب اُترتے ہیں تو حق کے ساتھ اُترتے ہیں، اور پھر لوگوں کو مہلت نہیں دی جاتی[1]۔ رہا یہ ذکر، تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں[2]۔

بقیہ حاشیہ صفحہ سابق، پر نازل ہوتا ہے۔ نہ اسے تسلیم کر لینے کے بعد وہ آپ کو دیوانہ کہہ سکتے تھے۔ دراصل ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ "اے وہ شخص جس کا دعویٰ یہ ہے کہ مجھ پر ذکر نازل ہوا ہے"۔ یہ اُسی طرح کی بات ہے جیسی فرعون نے حضرت موسیٰ کی دعوت سننے کے بعد اپنے درباریوں سے کہی تھی کہ إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ "یہ پیغمبر صاحب جو تم لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں، ان کا دماغ درست نہیں ہے"۔

[1] یعنی فرشتے محض تماشا دکھانے کے لئے نہیں اُتارے جاتے کہ جب کسی قوم نے کہا بلاؤ فرشتوں کو اور وہ فوراً آ حاضر ہوئے۔ نہ فرشتے اس غرض کے لئے کبھی بھیجے جاتے ہیں کہ وہ آ کر لوگوں کے سامنے حقیقت کو بے نقاب کریں اور پردۂ غیب کو چاک کر کے وہ سب کچھ دکھا دیں جس پر ایمان لانے کی دعوت انبیاء علیہم السلام نے دی ہے۔ فرشتوں کو بھیجنے کا وقت تو وہ آخری وقت ہوتا ہے جب کسی قوم کا فیصلہ چکا دینے کا ارادہ کر لیا جاتا ہے۔ اُس وقت بس فیصلہ چکایا جاتا ہے، یہ نہیں کہا جاتا کہ اب ایمان لاؤ تو چھوڑے دیتے ہیں۔ ایمان لانے کی جتنی مہلت بھی ہے اُسی وقت تک ہے جب تک کہ حقیقت بے نقاب نہیں ہو جاتی۔ اس کے بے نقاب ہو جانے کے بعد ایمان لانے کا کیا سوال۔

"حق کے ساتھ اُترتے ہیں" کا مطلب "حق لے کر اُترنا" ہے، یعنی وہ اس لئے آتے ہیں کہ باطل کو مٹا کر حق کو اس کی جگہ قائم کر دیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ لے کر آتے ہیں اور اسے نافذ کر کے چھوڑتے ہیں۔

[2] یعنی یہ "ذکر" جس کے لانے والے کو تم مجنون کہہ رہے ہو، یہ ہمارا نازل کیا ہوا ہے، اُس نے خود نہیں گھڑا ہے۔ اس لئے یہ گالی اس کو نہیں ہمیں دی گئی ہے۔ اور یہ خیال تم اپنے دل سے نکال دو کہ تم اس کا کچھ بگاڑ سکو گے۔ یہ براہ راست ہماری حفاظت میں ہے۔ نہ تمہارے مٹائے مٹ سکے گا، نہ تمہارے دبائے دب سکے گا، نہ تمہارے طعنوں اور اعتراضات سے اس کی قدر گھٹ سکے گی، نہ تمہارے روکے اس کی دعوت رُک سکے گی، نہ اس میں تحریف اور رد و بدل کرنے کا کبھی کسی کو موقع مل سکے گا۔

اے محمدؐ! ہم تم سے پہلے بہت سی گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُن کے پاس کوئی رسول آیا ہو اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔ مجرمین کے دلوں میں تو ہم اس ذکر کو اسی طرح (سلاخ کے مانند) گزارتے ہیں۔ وہ اس پر ایمان نہیں لایا کرتے[1]۔ قدیم سے اس قماش کے لوگوں کا یہی طریقہ چلا آ رہا ہے۔ اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے اور وہ دن دہاڑے اُس میں چڑھنے بھی لگتے تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے ع

یہ ہماری کارفرمائی ہے کہ آسمان میں ہم نے بہت سے مضبوط قلعے[2] بنائے، اُن کو دیکھنے والوں کیلئے

---

[1] عام طور پر مترجمین و مفسرین نے نَسْلُکُہٗ کی ضمیر استہزاء کی طرف، اور لَا یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ کی ضمیر ذکر کی طرف پھیری ہے، اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "ہم اسی طرح اس استہزاء کو مجرمین کے دلوں میں داخل کرتے ہیں اور وہ اس ذکر پر ایمان نہیں لاتے"۔ اگرچہ نحوی قاعدے کے لحاظ سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن ہمارے نزدیک نحو کے اعتبار سے بھی اور نظم کلام کے لحاظ سے بھی زیادہ صحیح یہ ہے کہ دونوں ضمیریں ذکر کی طرف پھیری جائیں۔ سلك کے معنی عربی زبان میں کسی چیز کو دوسری چیز میں چلانے، گزارنے اور پرونے کے ہیں، جیسے تاگے کو سوئی کے ناکے میں گزارنا۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کے اندر تو یہ ذکر قلب کی ٹھنڈک اور روح کی غذا بن کر اترتا ہے، مگر مجرموں کے دلوں میں یہ شتابہ بن کر لگتا ہے اور ان کے اندر اسے سن کر ایسی آگ بھڑک اٹھتی ہے گویا کہ ایک گرم سلاخ تھی جو سینے کے پار ہو گئی۔

[2] بُرج عربی زبان میں قلعے، قصر اور مستحکم عمارت کو کہتے ہیں۔ قدیم علم ہیئت میں "بُرج" کا لفظ اصطلاحاً ان بارہ منزلوں کے لئے استعمال ہوتا تھا جن پر سورج کے مدار کو تقسیم کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا کہ قرآن کا اشارہ انہی بروج کی طرف ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد سیارے لئے ہیں۔ لیکن بعد کے مضمون پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سے مراد عالم بالا کے وہ خطے ہیں جن میں سے ہر خطے کو نہایت مستحکم سرحدوں نے دوسرے خطے سے جدا کر رکھا ہے۔ اگرچہ یہ سرحدیں فضائے بسیط میں غیر مرئی طور پر کھچی ہوئی ہیں، لیکن ان کو پار کر کے کسی چیز کا ایک خطے سے دوسرے خطے میں چلا جانا سخت مشکل ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے ہم بروج کو محفوظ خطوں (Fortified Spheres) کے معنی میں لینا زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔

مزیّن کیا[1]، اور ہر شیطانِ مردود سے ان کو محفوظ کر دیا۔[2] کوئی شیطان ان میں راہ نہیں پا سکتا، الّا یہ کہ کچھ سُن گُن لے لے۔[3] اور جب وہ سُن گُن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شعلۂ روشن اُس کا پیچھا کرتا ہے[4]

---

[1] یعنی ہر خطّے میں کوئی نہ کوئی روشن سیّارہ یا تارا رکھ دیا اور اس طرح سارا عالم جگمگا اٹھا۔ بالفاظِ دیگر ہم نے اس ناپیداکنار کائنات کو ایک بھیانک ڈھنڈار بنا کر نہیں رکھ دیا بلکہ ایک ایسی حسین و جمیل دنیا بنائی جس میں ہر طرف نگاہوں کو جذب کر لینے والے جلوے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کاریگری میں صرف ایک صانعِ اکبر کی صنعت اور ایک حکیمِ اجل کی حکمت ہی نظر نہیں آتی ہے، بلکہ ایک کمال درجے کا پاکیزہ ذوق رکھنے والے آرٹسٹ کا آرٹ بھی نمایاں ہے۔ یہی مضمون ایک دوسرے مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے، اَلَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ (السجدہ ۔ ۱) "وہ خدا کہ جس نے ہر چیز جو بنائی خوب ہی بنائی"۔

[2] یعنی جس طرح زمین کی دوسری مخلوقات زمین کے خطّے میں مقیّد ہیں اُسی طرح شیاطینِ جنّ بھی اِسی خطّے میں مقیّد ہیں، عالمِ بالا تک ان کی رسائی نہیں ہے۔ اس سے دراصل لوگوں کی اُس عام غلط فہمی کو دُور کرنا مقصود ہے جس میں پہلے بھی عوام الناس مبتلا تھے اور آج بھی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شیطان اور اس کی ذرّیت کے لئے ساری کائنات کھلی پڑی ہے، جہاں تک وہ چاہیں پرواز کر سکتے ہیں۔ قرآن اس کے جواب میں بتاتا ہے کہ شیاطین ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتے، انہیں غیر محدود پرواز کی طاقت ہرگز نہیں دی گئی ہے۔

[3] یعنی وہ شیاطین جو اپنے اولیاء کو غیب کی خبریں لا کر دینے کی کوشش کرتے ہیں، جن کی مدد سے بہت سے کاہن، جوگی، عامل اور فقیر نما بہروپیے غیب دانی کا ڈھونگ رچایا کرتے ہیں، اُن کے پاس حقیقت میں غیب دانی کے ذرائع بالکل نہیں ہیں۔ وہ کچھ سُن گُن لینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں، کیونکہ اُن کی ساخت، انسانوں کی بہ نسبت فرشتوں کی ساخت سے کچھ قریب تر ہے، لیکن فی الواقع ان کے پلّے کچھ پڑتا نہیں ہے۔

[4] "شہابِ مبین" کے لغوی معنی "شعلۂ روشن" کے ہیں۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں اس کے لئے "شہابِ ثاقب" کا لفظ استعمال ہُوا ہے، یعنی "تاریکی کو چھیدنے والا شعلہ"۔ اس سے مراد ضروری نہیں کہ وہ ٹوٹنے والا تارا ہی ہو جسے ہماری زبان میں اصطلاحاً شہابِ ثاقب کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اور کسی قسم کی شعاعیں ہوں۔ مثلاً کائناتی شعاعیں (Cosmic Rays) یا ان سے بھی زیادہ شدید کوئی اور قسم جو ابھی ہمارے علم میں نہ آئی ہو۔ (باقی ص ۔۔)

ہم نے زمین کو پھیلایا، اُس میں پہاڑ جمائے، اُس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تُلی مقدار

(بقیہ حاشیہ صفحہ) اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہی شہاب ثاقب مراد ہوں جنہیں کبھی کبھی ہماری آنکھیں زمین کی طرف گرتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ زمانۂ حال کے مشاہدات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دُوربین سے دکھائی دینے والے شہاب ثاقب جو فضائے بسیط سے زمین کی طرف آتے نظر آتے ہیں، ان کی تعداد کا اوسط، الکرب روزانہ ہے، جن میں سے دو کروڑ کے قریب ہر روز زمین کے بالائی خطے میں داخل ہوتے ہیں اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچتا ہے۔ ان کی رفتار بالائی فضا میں کم و بیش ۲۶ میل فی سکنڈ ہوتی ہے اور بسا اوقات ۵۰ میل فی سکنڈ تک دیکھی گئی ہے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ برہنہ آنکھوں نے بھی ٹوٹنے والے تاروں کی غیر معمولی بارش دیکھی ہے۔ چنانچہ یہ چیز ریکارڈ پر موجود ہے کہ ۱۳ نومبر ۱۸۳۳ء کو شمالی امریکہ کے مشرقی علاقے میں صرف ایک مقام پر نصف شب سے لے کر صبح تک ۲ لاکھ شہاب ثاقب گرتے ہوئے دیکھے گئے (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع ۱۹۴۶ء۔ جلد ۱۵۔ صفحہ ۳۹-۳۳۷)۔ ہو سکتا ہے کہ یہی بارش عالم بالا کی طرف شیاطین کی پرواز میں مانع ہوتی ہو، کیونکہ زمین کے بالائی حدود سے گزر کر فضائے بسیط میں، الکرب روزانہ کے اوسط سے ٹوٹنے والے تاروں کی برسات ان کے لئے اس فضا کو بالکل ناقابلِ عبور بنا دیتی ہو گی۔

اس سے کچھ ان محفوظ قلعوں کی نوعیت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بظاہر فضا بالکل صاف شفاف ہے جس میں کہیں کوئی دیوار یا چھت بنی نظر نہیں آتی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی فضا میں مختلف خطوں کو کچھ ایسی نادیدہ فصیلوں سے گھیر رکھا ہے جو ایک خطے کو دوسرے خطوں کی آفات سے محفوظ رکھتی ہیں۔ یہ انہی فصیلوں کی برکت ہے کہ جو شہاب ثاقب دس کھرب روزانہ کے اوسط سے زمین کی طرف گرتے ہیں وہ سب جل کر بھسم ہو جاتے ہیں اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچ سکتا ہے۔ دنیا میں شہابی پتھروں (Meteorites) کے جو نمونے پائے جاتے ہیں اور دنیا کے عجائب خانوں میں موجود ہیں ان میں سب سے بڑا ۶۴۵ پونڈ کا ایک پتھر ہے جو گر کر ۱۱ فیٹ زمین میں دھنس گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مقام پر ۳۶ ½ ٹن کا ایک آہنی تودہ پایا گیا ہے جس کے وہاں موجود ہونے کی کوئی توجیہ سائنس دان اس کے سوا نہیں کر سکے ہیں کہ یہ بھی آسمان سے گرا ہوا ہے۔ قیاس کیجئے کہ اگر زمین کی بالائی سرحدوں کو مضبوط حصاروں سے محفوظ نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان ٹوٹنے والے تاروں کی بارش زمین کا کیا حال کر دیتی۔ یہی حصار ہیں جن کو قرآن مجید نے "بروج" (محفوظ قلعوں) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

ئی، اور اس میں معیشت کے اسباب فراہم کئے، تمہارے لئے بھی اور اُن بہت سی مخلوقات کے
، رازق تم نہیں ہو۔
ر ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقرر
نل کرتے ہیں[۱]۔

ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے ایک اور اہم نشان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ نباتات کی ہر نوع
اس قدر زبردست طاقت ہے کہ اگر اس کے صرف ایک پودے ہی کی نسل کو زمین میں بڑھنے کا موقع
مال کے اندر روئے زمین پر بس وہی وہ نظر آتی، کسی دوسری قسم کی نباتات کے لئے کوئی جگہ نہ رہتی۔
ر اور قادرِ مطلق کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے جس کے مطابق بے حد و حساب اقسام کی نباتات اس زمین
ں اور ہر نوع کی پیداوار اپنی ایک مخصوص حد پر پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اسی منظر کا ایک اور پہلو یہ
ی جسامت، پھیلاؤ، اُٹھان اور نشو و نما کی ایک حد مقرر ہے جس سے نباتات کی کوئی قسم بھی تجاوز
صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ہر درخت، ہر پودے اور ہر بیل بوٹے کے لئے جسم، قد،
بار اور پیداوار کی ایک مقدار پورے ناپ تول اور حساب و شمار کے ساتھ مقرر کر رکھی ہے۔
ں اس حقیقت پر متنبہ فرمایا کہ یہ معاملہ صرف نباتات ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ
سے کے معاملہ میں عام ہے۔ ہوا، پانی، روشنی، گرمی، سردی، جمادات، نباتات، حیوانات،
یز، ہر نوع، ہر جنس اور ہر قوت و طاقت کے لئے ایک حد مقرر ہے جس پر وہ ٹھیری
۔ ایک مقدار مقرر ہے جس سے نہ وہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔ اسی تقدیر اور کمال درجہ
دیر ہی کا یہ کرشمہ ہے کہ زمین سے لے کر آسمانوں تک پورے نظام کائنات میں یہ توازن
ر یہ تناسب نظر آ رہا ہے۔ اگر یہ کائنات ایک اتفاقی حادثہ ہوتی، یا بہت سے
یکری و کارفرمائی کا نتیجہ ہوتی تو کس طرح ممکن تھا کہ بے شمار مختلف اشیاء اور قوتوں کے
ل توازن و تناسب قائم ہوتا اور مسلسل قائم رہ سکتا؟

بار آور ہواؤں کو ہم ہی بھیجتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں، اور اُس پانی سے تمہیں سیراب کرتے ہیں۔ اِس دولت کے خزانہ دار تم نہیں ہو۔

زندگی اور موت ہم دیتے ہیں، اور ہم ہی سب کے وارث ہونے والے ہیں[1] پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان کو بھی ہم نے دیکھ رکھا ہے، اور بعد کے آنے والے بھی ہماری نگاہ میں ہیں۔ یقیناً تمہارا رب ان سب کو اکٹھا کرے گا، وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی[2] ع

ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے بنایا[3]۔ اور اُس سے پہلے جنوں کو ہم لُو کی لپٹ

---

[1] یعنی تمہارے بعد ہم ہی باقی رہنے والے ہیں۔ تمہیں جو کچھ بھی ملا ہوا ہے محض عارضی استعمال کیلئے ملا ہوا ہے آخرکار ہماری دی ہوئی ہر چیز کو یونہی چھوڑ کر تم خالی ہاتھ رخصت ہو جاؤ گے اور یہ سب چیزیں پھر جوں کی توں ہمارے خزانے میں رہ جائیں گی۔

[2] یعنی اُس کی حکمت یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ سب کو اکٹھا کرے۔ اور اس کا علم سب پر اس طرح حاوی ہے کہ کوئی متنفس اُس سے چھوٹ نہیں سکتا، بلکہ کسی اگلے پچھلے انسان کی خاک کا کوئی ذرہ بھی اُس سے گم نہیں ہو سکتا۔ اسلئے جو شخص حیاتِ اُخروی کو مستبعد سمجھتا ہے وہ خدا کی صفتِ حکمت سے بیخبر ہے، اور جو شخص حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ "جب مرنے کے بعد ہماری خاک کا ذرہ ذرہ منتشر ہو جائیگا تو ہم کیسے دوبارہ پیدا کئے جائیں گے" وہ خدا کی صفتِ علم کو نہیں جانتا۔

[3] یہاں قرآن اس امر کی صاف تصریح کرتا ہے کہ انسان حیوانی منازل سے ترقی کرتا ہوا البشریت کے حدود میں نہیں آیا ہے، جیسا کہ نئے دَور کے ڈارونیت سے متأثر مفسرینِ قرآن ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، بلکہ اس کی تخلیق کی ابتدا براہِ راست ارضی مادوں سے ہوئی ہے جسکی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے صلصال من حمأ مسنون کے الفاظ میں فرمایا ہے۔ حمأ عربی زبان میں ایسی سیاہ کیچڑ کو کہتے ہیں جس کے اندر بُو پیدا ہو چکی ہو، یا با لفاظ دیگر خمیر اٹھ آیا ہو۔ مسنون کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی ہیں متغیر، مُنتِن اور املس، یعنی ایسی سڑی ہوئی جس میں سڑنے کی وجہ سے چکنائی پیدا ہو گئی ہو۔ دوسرے معنی ہیں مصوَّر اور مصبوب، یعنی قالب میں ڈھلی ہوئی جس کو ایک خاص صورت دے دی گئی ہو۔ صلصال اس سوکھے گارے کو کہتے ہیں جو خشک ہو جانے کے بعد بجنے لگے۔ یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ خمیر اٹھی ہوئی مٹی کا ایک پتلا بنایا گیا تھا جو بننے کے بعد خشک ہوا اور پھر اس کے اندر رُوح پھونکی گئی۔

سے پیدا کر چکے تھے۔[1] پھر یاد کرو اُس موقع کو جب تمہارے ربّ نے فرشتوں سے کہا کہ "میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں، جب میں اُسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی رُوح سے کچھ پھونک دوں[2]

---

[1] سَمُوم گرم ہوا کو کہتے ہیں اور نار کو سموم کی طرف نسبت دینے کی صورت میں اس کے معنی آگ کے بجائے تیز حرارت کے ہو جاتے ہیں۔ اس سے اُن مقامات کی تشریح ہو جاتی ہے جہاں قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جِن آگ سے پیدا کئے گئے ہیں۔

[2] اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اندر جو روح پھونکی گئی ہے وہ دراصل صفاتِ الٰہی کا ایک عکس یا پرتو ہے۔ حیات، علم، قدرت، ارادہ، اختیار، اور دوسری جتنی صفات انسان میں پائی جاتی ہیں، جن کے مجموعہ ہی کا نام روح ہے، یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو اس کالبدِ خاکی پر ڈالا گیا ہے۔ اور اسی پرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور ملائکہ سمیت تمام موجوداتِ ارضی کا مسجود قرار پایا ہے۔

یوں تو ہر وہ صفت جو مخلوقات میں پائی جاتی ہے، اُس کا مصدر و منبع اللہ تعالیٰ ہی کی کوئی نہ کوئی صفت ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جَعَلَ اللّٰہُ الرَّحْمَۃَ مِاْئَۃَ جُزْءٍ فَاَمْسَکَ عِنْدَہٗ تِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ وَاَنْزَلَ فِی الْاَرْضِ جُزْءً اوَّاحِدًا فَمِنْ ذَالِکَ الْجُزْءِ یَتَرَاحَمُ الْخَلَائِقُ حَتّٰی تَرْفَعُ الدَّآبَّۃُ حَافِرَھَا عَنْ وَلَدِھَا خَشْیَۃَ اَنْ تُصِیْبَہٗ (بخاری و مسلم) "اللہ تعالیٰ نے رحمت کو سو حصوں میں تقسیم فرمایا، پھر ان میں سے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور صرف ایک حصہ زمین میں اُتارا۔ یہ اسی ایک حصے کی برکت ہے جس کی وجہ سے مخلوقات آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرتی ہیں، یہاں تک کہ اگر ایک جانور اپنے بچے پر سے اپنا کھر اٹھاتا ہے تاکہ اُسے ضرر نہ پہنچ جائے، تو یہ بھی دراصل اُسی حصۂ رحمت کا اثر ہے"۔ مگر جو چیز انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ جس جامعیت کے ساتھ اللہ کی صفات کا پرتو اس پر ڈالا گیا ہے اُس سے کوئی دوسری مخلوق سرفراز نہیں کی گئی۔

یہ ایک ایسا باریک مضمون ہے جس کے سمجھنے میں ذرا سی غلطی بھی آدمی کر جائے تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ صفاتِ الٰہی میں سے ایک حصہ پانا الوہیت کا کوئی جز پا لینے کا ہم معنی ہے۔ حالانکہ الوہیت اس سے وراء الورا ہے کہ کوئی مخلوق اس کا ایک ادنیٰ شائبہ بھی پا سکے۔

"تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا" چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔[1] رب نے پوچھا "اے ابلیس! تجھے کیا ہوا کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا؟" اس نے کہا "میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا ہے۔" رب نے فرمایا "اچھا تو نکل جا یہاں سے کیونکہ تو مردود ہے، اور اب روزِ جزا تک تجھ پر لعنت ہے[2]۔" اس نے عرض کیا "میرے رب یہ بات ہے تو پھر مجھے اس روز تک کے لئے مہلت دے جبکہ سب انسان دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔" فرمایا "اچھا تجھے مہلت ہے اس دن تک جس کا وقت ہمیں معلوم ہے۔" وہ بولا "میرے رب، جیسا تو نے مجھے بہکایا اسی طرح اب میں زمین میں ان کے لئے دلفریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکا دونگا[3] سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تُو نے ان میں سے خالص کر لیا ہو۔" فرمایا "یہ راستہ ہے جو سیدھا مجھ تک پہنچتا ہے[4]

[1] تقابل کے لئے سورۂ بقرہ رکوع ۴، سورۂ نساء رکوع ۱۸، اور سورۂ اعراف رکوع ۲ پیش نظر رہے نیز جائے اُن حواشی پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے جو ان مقامات پر لکھے گئے ہیں۔

[2] یعنی قیامت تک تو ملعون رہے گا، اس کے بعد جب روزِ جزا قائم ہوگا تو پھر تجھے تیری نافرمانیوں کی سزا دی جائے گی۔

[3] یعنی جس طرح تُو نے اِس حقیر اور کم تر مخلوق کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر مجھے مجبور کر دیا کہ تیرا حکم نہ مانوں، اسی طرح اب میں اِن انسانوں کے لئے دنیا کو ایسا دلفریب بنا دونگا کہ وہ سب اس سے دھوکا کھا کر تیرے نافرمان بن جائیں گے۔ بالفاظِ دیگر ابلیس کا مطلب یہ تھا کہ میں زمین کی زندگی اور اس کی لذتوں اور اس کے عارضی فوائد و منافع کو انسان کے لئے ایسا خوشنما بنا دوں گا کہ وہ خلافت اور اس کی ذمہ داریوں اور آخرت کی بازپرس کو بھول جائیں گے اور خود تجھے بھی یا تو فراموش کر دیں گے یا تجھے یاد رکھنے کے باوجود تیرے احکام کی خلاف ورزیاں کریں گے۔

[4] هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک معنی وہ ہیں جو ہم نے ترجمہ میں بیان کئے ہیں، اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ هٰذا طریقٌ حقٌّ علیَّ ان اراعیہ، یعنی یہ بات درست ہے، میں بھی اس کا پابند رہوں گا۔

بے شک، جو میرے حقیقی بندے ہیں ان پر تیرا بس نہ چلے گا۔ تیرا بس تو صرف اُن بہکے ہوئے لوگوں ہی پر چلے گا جو تیری پیروی کریں[5]۔ اور اُن سب کے لئے جہنم کی وعید ہے[6]"

[5] اس فقرے کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ کہ میرے بندوں (یعنی عام انسانوں) پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا کہ تو انہیں زبردستی نافرمان بنا دے، البتہ جو خود ہی بہکے ہوئے ہوں اور آپ تیری پیروی کرنا چاہیں اُنہیں تیری راہ پر چلنے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا، انہیں ہم زبردستی اس سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں گے۔

پہلے معنی کے لحاظ سے مضمون کا خلاصہ یہ ہوگا کہ بندگی کا طریقہ اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے، جو لوگ اس راستے کو اختیار کر لیں گے ان پر شیطان کا بس نہ چلیگا، انہیں اللہ اپنے لئے خالص فرما لیگا اور شیطان خود بھی اقراری ہے کہ وہ اس کے پھندے میں نہ پھنسیں گے۔ البتہ جو لوگ خود بندگی سے منحرف ہو کر اپنی فلاح و سعادت کی راہ گم کر دیں گے وہ ابلیس کے ہتھے چڑھ جائیں گے اور پھر جدھر جدھر وہ انہیں فریب دیکر لے جانا چاہے گا، وہ اس کے پیچھے بھٹکتے اور دُور سے دُور تر نکلتے چلے جائیں گے۔

دوسرے معنی کے لحاظ سے اس بیان کا خلاصہ یہ ہوگا: شیطان نے انسانوں کو بہکانے کے لئے اپنا طریق کار یہ بیان کیا کہ وہ زمین کی زندگی کو ان کیلئے خوشنما بنا کر انہیں خُدا سے غافل اور بندگی کی راہ سے منحرف کریگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شرط میں نے مانی، اور مزید توضیح کرتے ہوئے یہ بات بھی صاف کر دی کہ تجھے صرف فریب دینے کا اختیار دیا جا رہا ہے، یہ اقتدار نہیں دیا جا رہا کہ تو ہاتھ پکڑ کر انہیں زبردستی اپنی راہ پر کھینچ لے جائے۔ شیطان نے اپنے نوٹس سے اُن بندوں کو مستثنیٰ کیا جنہیں اللہ اپنے لئے خالص فرمالے۔ اس سے یہ غلط فہمی مترشح ہو رہی تھی کہ شاید اللہ تعالیٰ بغیر کسی معقول وجہ کے یونہی جس کو چاہے گا خالص کر لے گا اور وہ شیطان کی دست رس سے بچ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر بات صاف کر دی کہ جو خود بہکا ہوا ہوگا وہ تیری پیروی کرے گا۔ بالفاظ دیگر جو بہکا ہوا نہ ہوگا وہ تیری پیروی نہ کریگا اور وہی ہمارا وہ مخصوص بندہ ہوگا جسے ہم خالص اپنا کر لیں گے۔

[6] اس جگہ یہ قصہ جس غرض کے لئے بیان کیا گیا ہے اسے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سیاق و سباق کو ملحوظ طور پر ذہن میں رکھا جائے۔ پہلے اور دوسرے رکوع کے مضمون پر غور کرنے سے یہ بات صاف سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہاں

یہ جہنم (جس کی وعید پیروانِ ابلیس کے لئے کی گئی ہے) اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کے لئے ان میں سے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے ؎ بخلاف اس کے متقی لوگ ؎ باغوں اور چشموں میں ہونگے اور ان سے کہا جائے گا کہ داخل ہو جاؤ ان میں سلامتی کے ساتھ بے خوف وخطر۔ اُن کے دلوں میں جو

(بقیہ حاشیہ ؎) آجاتی ہے کہ اِس سلسلۂ بیان میں آدم و ابلیس کا یہ قصہ بیان کرنے سے مقصود کفار کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ تم اپنے ازلی دشمن، شیطان کے پھندے میں پھنس گئے ہو اور اُس پستی میں گرے چلے جا رہے ہو جس میں وہ اپنے حسد کی بنا پر تمہیں گرانا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس یہ نبی تمہیں اُس کے پھندے سے نکال کر اس بلندی کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا ہے جو دراصل انسان ہونے کی حیثیت سے تمہارا فطری مقام ہے لیکن تم عجیب احمق لوگ ہو کہ اپنے دشمن کو دوست، اور اپنے خیر خواہ کو دشمن سمجھ رہے ہو۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی اسی قصہ سے اُن پر واضح کی گئی ہے کہ تمہارے لئے راہِ نجات صرف ایک ہے، اور وہ اللہ کی بندگی ہے۔ اس راہ کو چھوڑ کر تم جس راہ پر بھی جاؤ گے وہ شیطان کی راہ ہے جو سیدھی جہنم کی طرف جاتی ہے۔ تیسری بات جو اس قصے کے ذریعہ سے ان کو سمجھائی گئی ہے، یہ ہے کہ اپنی اس غلطی کے ذمہ دار تم خود ہو۔ شیطان کا کوئی کام اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ ظاہرِ حیاتِ دنیا سے تم کو دھوکا دے کر تمہیں بندگی کی راہ سے منحرف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس سے دھوکا کھانا تمہارا اپنا فعل ہے جس کی کوئی ذمہ داری تمہارے اپنے سوا کسی اور پر نہیں ہے۔ (اس کی مزید توضیح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ ابراہیم۔ رکوع ۴)

؎ جہنم کے یہ دروازے اُن گمراہیوں اور معصیتوں کے لحاظ سے ہیں جن پر چل کر آدمی اپنے لئے دوزخ کی راہ کھولتا ہے۔ مثلاً کوئی دہریت کے راستے سے دوزخ کی طرف جاتا ہے۔ کوئی شرک کے راستہ سے، کوئی نفاق کے راستہ سے، کوئی نفس پرستی اور فسق وفجور کے راستہ سے، کوئی ظلم وستم اور خلق آزاری کے راستہ سے، کوئی تبلیغ ضلالت اور اقامت کفر کے راستہ سے، اور کوئی اشاعتِ فحشاء و منکر کے راستہ سے۔

؎ یعنی وہ لوگ جو شیطان کی پیروی سے بچے رہے ہوں اور جنہوں نے اللہ سے ڈرتے ہوئے عبدیت کی زندگی بسر کی ہو۔

ی بہت کھوٹ کپٹ ہوگی اسے ہم نکال دیں گے[1]، وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر
بیں گے۔ انہیں نہ وہاں کسی مشقت سے پالا پڑیگا اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے[2]۔

اَے نبی! میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت درگزر کرنے والا اور رحیم ہوں، مگر اس کے
ھ میرا عذاب بھی نہایت دردناک عذاب ہے۔

اور انہیں ذرا ابراہیمؑ کے مہمانوں کا قصہ سناؤ[3]۔ جب وہ آئے اس کے ہاں اور کہا "سلام ہو تم پر"،

---

[1] یعنی نیک لوگوں کے درمیان آپس کی غلط فہمیوں کی بنا پر دنیا میں اگر کچھ کدورتیں پیدا ہو گئی ہونگی تو جنت
داخل ہونے کے وقت وہ دُور ہوجائیں گی اور ان کے دل ایک دوسرے کی طرف سے بالکل صاف کر دیئے
ں گے۔ یہی مضمون سورۂ اعراف رکوع ۵ میں بھی گزر چکا ہے۔ اسی آیت کا حوالہ دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ
ضرت طلحہ کے صاحبزادے عمران سے فرمایا تھا کہ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے باپ کے
ان صفائی کرا دے گا۔

[2] اِس کی تشریح اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضورؐ نے خبر دی ہے کہ یُقال لاھل الجنۃ ان لکم
نصحوا ولا تمرضوا ابداً، وان لکم ان تعیشوا فلا تموتوا ابداً وان لکم ان تشبوا ولا
موا ابداً، وان لکم ان تقیموا فلا تظعنوا ابداً۔ یعنی "اہلِ جنت سے کہہ دیا جائے گا کہ اب تم ہمیشہ
ست رہوگے، کبھی بیمار نہ پڑوگے۔ اور اب تم ہمیشہ زندہ رہوگے، کبھی موت تم کو نہ آئے گی۔ اور اب تم ہمیشہ
رہوگے، کبھی بڑھاپا تم پر نہ آئے گا، اور اب تم ہمیشہ مقیم رہوگے، کبھی کوچ کرنے کی تمہیں ضرورت نہ ہوگی"۔
ی مزید تشریح اُن آیات و احادیث سے ہوتی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں انسان کو اپنی معاش
پنی ضروریات کی فراہمی کے لئے کوئی محنت نہ کرنی پڑے گی، سب کچھ اسے بلاسعی و مشقت ملیگا۔

[3] یہاں حضرت ابراہیم اور ان کے بعد متصلاً قوم لوط کا قصہ جس غرض کے لئے سنایا جا رہا ہے اس کو سمجھنے
لئے سورہ کی ابتدائی آیات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ سورہ کے آغاز میں کفارِ مکہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے
نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ "اگر تم سچے نبی ہو تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتے"؟
مختصر جواب دیا[4] صرف اس قدر دے کر چھوڑ دیا گیا تھا کہ "فرشتوں کو ہم یوں نہیں اتارا کرتے، (باقی حاشیہ

تو اس نے کہا "ہمیں تم سے ڈر لگتا ہے"[1] انہوں نے جواب دیا "ڈرو نہیں، ہم تمہیں ایک بڑے سیانے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں"[2] ابراہیم نے کہا "کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی بشارت دیتے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ کیسی بشارت تم مجھے دے رہے ہو؟" انہوں نے جواب دیا "ہم تمہیں برحق بشارت دے رہے ہیں، تم مایوس نہ ہو" ابراہیم نے کہا "اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں" پھر ابراہیم نے پوچھا "اے فرستادگانِ الٰہی! وہ مہم کیا ہے جس پر آپ حضرات تشریف لائے ہیں؟" وہ بولے "ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں[3]۔ صرف لوط کے گھر والے مستثنیٰ ہیں، ان کو ہم بچا لیں گے، سوائے اس کی بیوی کے جس کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جائیگی"[4] ع

پھر جب یہ فرستادے لوط کے ہاں پہنچے تو اس نے کہا "آپ لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہیں"[5] انہوں

(بقیہ حاشیہ ۵۵) انہیں تو ہم جب بھیجتے ہیں حق سے کر ہی بھیجتے ہیں" اب اس کا مفصل جواب یہاں ان دونوں قصوں کے پیرائے میں دیا جا رہا ہے۔ یہاں انہیں بتایا جا رہا ہے کہ ایک "حق" تو وہ ہے جسے لیکر فرشتے ابراہیم کے پاس آئے تھے، اور دوسرا حق وہ ہے جسے لیکر وہ قوم لوط پر پہنچے تھے۔ اب تم خود دیکھ لو کہ تمہارے پاس ان میں کونسا حق ہے کہ فرشتے آسکتے ہیں۔ ابراہیم والے حق کے لائق تو ظاہر ہے کہ تم نہیں ہو۔ اب کیا اُس حق کے ساتھ فرشتوں کو بلانا چاہتے ہو جسے لیکر وہ قوم لوط کے ہاں نازل ہوئے تھے؟

[1] تقابل کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ ہود رکوع ۷ مع حواشی۔

[2] یعنی حضرت اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت۔

[3] اشارے کا یہ اختصار صاف بتا رہا ہے کہ قوم لوط کے جرائم کا پیمانہ اس وقت اتنا لبریز ہو چکا تھا کہ حضرت ابراہیم جیسے باخبر آدمی کے سامنے اس کا نام لینے کی قطعاً ضرورت نہ تھی، بس "ایک مجرم قوم" کہہ دینا بالکل کافی تھا۔

[4] تقابل کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ اعراف رکوع ۱۰، و سورۂ ہود رکوع ۷۔

[5] یہاں بات مختصر بیان کی گئی ہے۔ سورۂ ہود میں اس کی تفصیل یہ دی گئی ہے کہ ان لوگوں کے آنے سے حضرت لوط بہت گھبرائے اور سخت دل تنگ ہوئے اور ان کو دیکھتے ہی اپنے دل میں کہنے لگے کہ آج بڑا سخت وقت آیا ہے۔ اس گھبراہٹ کی وجہ قرآن کے بیان، اشارات اور روایات سے صراحتہ معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ یہ فرشتے نہایت خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوط کے ہاں آئے

نے جواب دیا "نہیں، بلکہ ہم وہی چیز لے کر آئے ہیں جس کے آنے میں یہ لوگ شک کر رہے تھے۔ ہم تم سے سچ کہتے ہیں کہ ہم حق کے ساتھ تمہارے پاس آئے ہیں، لہٰذا اب تم کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلو[1]۔ تم میں سے کوئی پلٹ کر نہ دیکھے[2]۔ بس سیدھے چلے جاؤ جدھر جانے کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔" اور اسے ہم نے اپنا یہ فیصلہ پہنچا دیا کہ صبح ہوتے ہوتے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔

اتنے میں شہر کے لوگ خوشی کے مارے بے تاب ہو کر لوط کے گھر چڑھ آئے[3]۔ لوط نے کہا

---

[1] یعنی اِس غرض سے اپنے گھر والوں کے پیچھے چلو کہ ان میں سے کوئی ٹھیرنے نہ پائے۔

[2] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پلٹ کر دیکھتے ہی تم پتھر کے ہو جاؤ گے، جیسا کہ بائیبل میں بیان ہوا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیچھے کی آوازیں اور شور و غل سن کر تماشا دیکھنے کے لئے نہ ٹھیر جانا۔ یہ نہ تماشا دیکھنے کا وقت ہے، اور نہ مجرم قوم کی ہلاکت پر آنسو بہانے کا۔ ایک لمحہ بھی اگر تم نے معذّب قوم کے علاقے میں دم لیا تو بعید نہیں کہ تمہیں بھی اس ہلاکت کی بارش سے کچھ گزند پہنچ جائے۔

[3] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قوم کی بداخلاقی کس حد کو پہنچ چکی تھی۔ بستی کے ایک شخص کے ہاں چند خوبصورت مہمانوں کا آ جانا اس بات کے لئے کافی تھا کہ اس کے گھر پر اوباشوں کا ایک ہجوم امنڈ آئے اور علانیہ وہ اس سے مطالبہ کریں کہ اپنے مہمانوں کو بدکاری کے لئے ہمارے حوالے کر دے۔ ان کی پوری آبادی میں کوئی ایسا عنصر باقی نہ رہا تھا جو ان حرکات کے خلاف آواز اٹھاتا اور نہ ان کی قوم میں کوئی اخلاقی حس باقی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو علی الاعلان یہ زیادتیاں کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس ہوتی۔ حضرت لوط جیسے مقدس انسان اور معلّمِ اخلاق کے گھر پر بھی جب بدمعاشوں کا حملہ اِس بے باکی کے ساتھ ہو سکتا تھا تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عام انسانوں کے ساتھ ان بستیوں میں کیا کچھ ہو رہا ہوگا۔

تلمود میں اس قوم کے جو حالات لکھے ہیں ان کا ایک خلاصہ ہم یہاں دیتے ہیں جس سے کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوگا کہ یہ قوم اخلاقی فساد کی کس انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عیلامی مسافر ان کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ راستہ میں شام ہو گئی اور اسے مجبوراً ان کے شہر سدوم میں ٹھیرنا پڑا۔ اس کے ساتھ

بھائیو! یہ میرے مہمان ہیں۔ میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو، مجھے رسوا نہ کرو" وہ بولے "کیا ہم

(تفہیم حاشیہ ۸۵) اپنا زادِ راہ تھا جس سے اس نے میزبانی کی درخواست نہ کی بس ایک درخت کے نیچے اتر گیا۔ مگر ایک سدومی اصرار کے ساتھ اٹھا کر اسے اپنے گھر لے گیا۔ رات اسے اپنے ہاں رکھا اور صبح ہونے سے پہلے اس کا گدھا اس کے زین اور مالِ تجارت سمیت اڑا دیا۔ اس نے شور مچایا مگر کسی نے اس کی فریاد نہ سنی، بلکہ بستی کے لوگوں نے اس کا رہا سہا مال بھی لوٹ کر اسے نکال باہر کیا۔ ایک مرتبہ حضرت سارہ نے حضرت لوط کے گھر والوں کی خیریت دریافت کرنے کے لئے اپنے غلام الیعزر کو سدوم بھیجا۔ الیعزر جب شہر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایک سدومی ایک اجنبی کو مار رہا ہے۔ الیعزر نے اسے شرم دلائی کہ تم بیکس مسافروں سے یہ سلوک کرتے ہو۔ مگر جواب میں سرِ بازار الیعزر کا سر پھاڑ دیا گیا۔ ایک مرتبہ ایک غریب آدمی کہیں سے ان کے شہر میں آیا اور کسی نے اسے کھانے کو کچھ نہ دیا۔ وہ فاقے سے بدحال ہو کر ایک جگہ گرا پڑا تھا کہ حضرت لوط کی بیٹی نے اسے دیکھ لیا اور اس کے لئے کھانا پہنچایا۔ اس پر حضرت لوط اور ان کی بیٹی کو سخت ملامت کی گئی اور انہیں دھمکیاں دی گئیں کہ ان حرکتوں کے ساتھ تم لوگ ہماری بستی میں نہیں رہ سکتے۔ اس طرح کے متعدد واقعات بیان کرنے کے بعد تالمود کا مصنف لکھتا ہے کہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں یہ لوگ سخت ظالم، دھوکہ باز اور بدمعاملہ تھے۔ کوئی مسافر ان کے علاقے سے بخیریت نہ گزر سکتا تھا۔ کوئی غریب ان کی بستیوں سے روٹی کا ایک ٹکڑا نہ پا سکتا تھا۔ بارہا ایسا ہوتا کہ باہر کا آدمی ان کے علاقے میں پہنچ کر فاقوں سے مر جاتا اور یہ اس کی لاش کو کپڑے اتار کر برہنہ دفن کر دیتے۔ بیرونی تاجر اگر شامت کے مارے وہاں چلے جاتے تو برسرِعام لوٹ لئے جاتے اور ان کی فریاد کو ٹھٹھوں میں اڑا دیا جاتا۔ اپنی وادی کو انہوں نے ایک باغ بنا رکھا تھا جس کا سلسلہ میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس باغ میں وہ انتہائی بے حیائی کے ساتھ علانیہ بدکاریاں کرتے تھے اور ایک لوط کی زبان کے سوا کوئی زبان ان کو ٹوکنے والی نہ تھی۔ قرآن مجید میں اس پوری داستان کو سمیٹ کر صرف دو فقروں میں بیان کر دیا گیا ہے کہ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ (وہ پہلے سے بہت برے برے کام کر رہے تھے) اور أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنْكَرَ (تم مردوں سے خواہشِ نفس پوری کرتے ہو، مسافروں کی راہ مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں کھلم کھلا بدکاریاں کرتے ہو؟)

بار ہا تمہیں منع نہیں کر چکے ہیں کہ دنیا بھر کے ٹھیکے دار نہ بنو؟" لوط نے عاجز ہو کر کہا " اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں[1]"۔

تیری جان کی قسم اے نبی! اُس وقت ان پر ایک نشہ سا چڑھا ہُوا تھا جس میں وہ آپے سے باہر ہوئے جاتے تھے۔

آخر کار پو پھٹتے ہی اُن کو ایک زبردست دھماکے نے آ لیا اور ہم نے اُس بستی کو تل پٹ کر کے رکھ دیا

[1] اس کی تشریح سورۂ ہود کے حواشی میں بیان کی جا چکی ہے یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ یہ کلمات ایک شریف آدمی کی زبان پر ایسے وقت میں آئے ہیں جب کہ وہ بالکل تنگ آ چکا تھا اور بدمعاش لوگ اس کی ساری فریاد و فغاں سے بے پروا ہو کر اس کے مہمانوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

اِس موقع پر ایک بات کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ سورۂ ہود میں واقعہ جس ترتیب سے بیان کیا گیا ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ حضرت لوط کو بدمعاشوں کے اِس حملہ کے وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے مہمان درحقیقت فرشتے ہیں۔ وہ اس وقت تک یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ چند مسافر لڑکے ہیں جو ان کے ہاں آ کر ٹھیرے ہیں۔ انہوں نے اپنے فرشتہ ہونے کی حقیقت اس وقت کھولی جب بدمعاشوں کا ہجوم مہمانوں کی قیامگاہ پر پل پڑا اور حضرت لوط نے تڑپ کر فرمایا لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ (کاش مجھے تمہارے مقابلے کی طاقت حاصل ہوتی یا میرا کوئی سہارا ہوتا جس سے میں حمایت حاصل کرتا)۔ اس کے بعد فرشتوں نے ان سے کہا کہ اب تم اپنے گھر والوں کو لیکر یہاں سے نکل جاؤ اور ہمیں ان سے نمٹنے کے لئے چھوڑ دو۔ واقعات کی اس ترتیب کو نگاہ میں رکھنے سے پورا اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت لوط نے یہ الفاظ کس تنگ موقع پر عاجز آ کر فرمائے تھے۔ اِس سورہ میں چونکہ واقعات کو اُن کی ترتیب وقوع کے لحاظ سے نہیں بیان کیا جا رہا ہے، بلکہ اُس خاص پہلو کو خاص طور پر نمایاں کرنا مقصود ہے جسے ذہن نشین کرنے کی خاطر ہی یہ قصہ یہاں نقل کیا گیا ہے، اس لئے ایک عام ناظر کو یہاں یہ غلط فہمی پیش آتی ہے کہ فرشتے ابتدا ہی میں اپنا تعارف حضرت لوط سے کرا چکے تھے اور اب اپنے مہمانوں کی آبرو بچانے کے لئے ان کی یہ ساری فریاد و فغاں محض بناوٹی تھی۔

اور ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دی۔[1]

اس واقعے میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو صاحب فراست ہیں۔ اور وہ علاقہ (جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا) گذرگاہ عام پر واقع ہے۔[2] اس میں سامان عبرت ہے ان لوگوں کیلئے جو صاحب ایمان ہیں۔

پھر اگر ایکہ والے ظالم تھے،[3] تو دیکھ لو کہ ہم نے بھی ان سے انتقام لیا، اور ان دونوں قوموں کے اُجڑے ہوئے علاقے کھلے راستے پر واقع ہیں۔[4]

حجر کے لوگ بھی[5] رسولوں کی تکذیب کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات اُن کے پاس بھیجیں اپنی نشانیاں

[1] یہ پکی ہوئی مٹی کے پتھر ممکن ہے کہ شہاب ثاقب کی نوعیت کے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آتش فشانی انفجار (Volcanic Eruption) کی بدولت زمین سے نکل کر اُڑے ہوں اور پھر اُن پر بارش کی طرح برس گئے ہوں۔

[2] یعنی حجاز سے شام، اور عراق سے مصر جاتے ہوئے یہ تباہ شدہ علاقہ راستہ میں پڑتا ہے اور عموماً قافلوں کے لوگ تباہی کے اُن آثار کو دیکھتے ہیں جو اس پورے علاقے میں آج تک نمایاں ہیں۔ یہ علاقہ بحر لوط (بحیرۂ مردار) کے مشرق اور جنوب میں واقع ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس کے جنوبی حصے کے متعلق جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ یہاں اس درجہ ویرانی پائی جاتی ہے جس کی نظیر روئے زمین پر کہیں اور نہیں دیکھی گئی۔

[3] یعنی حضرت شعیب کی قوم کے لوگ۔ اس قوم کا نام بنی مدیان تھا۔ مَدیَن ان کے مرکزی شہر کو بھی کہتے تھے اور ان کے پورے علاقے کو بھی۔ اور غالباً ایکہ ان کے ملک کو اس رعایت سے کہتے تھے کہ اس میں گھنے جنگل واقع ہیں۔

[4] مدین کا علاقہ بھی حجاز سے فلسطین و شام جاتے ہوئے راستے میں پڑتا ہے۔

[5] یہ قوم ثمود کا مرکزی شہر تھا اور اس کے کھنڈر مدینہ کے شمال مغرب میں موجودہ شہر العلا سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ مدینہ سے تبوک جاتے ہوئے یہ مقام (شاہراہ عام) پر ملتا ہے اور قافلے اس وادی میں سے ہو کر گذرتے ہیں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق کوئی یہاں قیام نہیں کرتا۔ آٹھویں صدی ہجری میں ابن بطوطہ حج کو جاتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں سرخ رنگ کے پہاڑوں میں قوم ثمود کی عمارتیں موجود ہیں جو انہوں نے چٹانوں کو تراش تراش کر ان کے اندر بنائی تھیں۔ ان کے نقش و نگار اس وقت تک ایسے تازہ ہیں جیسے آج بنائے گئے ہیں۔ ان مکانات میں اب بھی سڑی گلی انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی ملتی ہیں۔

ان کو دکھائیں، مگر وہ سب کو نظر انداز ہی کرتے رہے۔ وہ پہاڑ تراش تراش کر مکان بناتے تھے اور اپنی جگہ بالکل بے خوف اور مطمئن تھے۔ آخر کار ایک زبردست دھماکے نے ان کو صبح ہوتے آلیا اور ان کی کمائی ان کے کچھ کام نہ آئی[1]۔

ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر خلق نہیں کیا ہے[2] اور فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے، پس اے محمد، تم (ان لوگوں کی بیہودگیوں پر) شریفانہ درگزر سے کام لو۔ یقیناً تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے[3]۔ ہم نے تم کو سات ایسی آیتیں دے رکھی ہیں جو بار بار دہرائی جانے کے لائق ہیں[4]، اور تمہیں قرآن عظیم عطا کیا ہے[5]۔ تم اس متاع دنیا کی طرف

---

[1] یعنی ان کے وہ سنگین مکانات جو انہوں نے پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر بنائے تھے ان کی کچھ بھی حفاظت نہ کر سکے۔

[2] یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین و تسلی کے لئے فرمائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت بظاہر باطل کا جو غلبہ تم دیکھ رہے ہو اور حق کے راستہ میں جن مشکلات اور مصائب سے تمہیں سابقہ پیش آ رہا ہے، اس سے گھبراؤ نہیں، یہ ایک عارضی کیفیت ہے، مستقل اور دائمی حالت نہیں ہے۔ اس لئے کہ زمین و آسمان کا یہ پورا نظام حق پر تعمیر ہوا ہے نہ کہ باطل پر۔ کائنات کی فطرت حق کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے نہ کہ باطل کے ساتھ۔ لہٰذا یہاں اگر قیام و دوام ہے تو حق کے لئے ہے نہ کہ باطل کے لئے۔ (اس مضمون کی تشریح سورۂ ابراہیم رکوع ۳ کے حواشی میں کی جا چکی ہے)۔

[3] یعنی خالق ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی مخلوق پر کامل غلبہ و تسلط رکھتا ہے، کسی مخلوق کی یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کی گرفت سے بچ سکے۔ اور اس کے ساتھ وہ پوری طرح باخبر بھی ہے۔ جو کچھ ان لوگوں کی اصلاح کے لئے تم کر رہے ہو اسے بھی وہ جانتا ہے اور جن ہتھکنڈوں سے وہ تمہاری سعی اصلاح کو ناکام کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں ان کا بھی اسے علم ہے۔ لہٰذا تمہیں گھبرانے اور بے صبر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، مطمئن رہو کہ وقت آنے پر ٹھیک ٹھیک انصاف کے مطابق فیصلہ چکا دیا جائیگا۔

[4] یعنی سورۂ فاتحہ کی آیات۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس سے مراد وہ سات بڑی بڑی سورتیں بھی لی ہیں جن میں دو دو سو آیتیں ہیں یعنی البقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانعام، الاعراف اور یونس یا انفال و توبہ۔ لیکن سلف کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ اس سے سورۂ فاتحہ ہی مراد ہے بلکہ امام بخاری نے دو مرفوع روایتیں بھی اس امر کے ثبوت میں پیش کی ہیں کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سبع من المثانی سے مراد سورۂ فاتحہ بتائی ہے۔ [5] (اس کا حاشیہ صفحہ ۹۲ پر دیکھیں)

آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے، اور نہ ان کے حال پر اپنا دل کڑھاؤ[1]۔ انہیں چھوڑ کر ایمان لانے والوں کی طرف جھکو (اور نہ ماننے والوں سے) کہہ دو کہ میں تو صاف صاف تنبیہ کر دینے والا ہوں۔ یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جیسی ہم نے ان تفرقہ پردازوں کی طرف بھیجی تھی جنہوں نے اپنے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے[2]۔ تو قسم ہے تیرے رب کی، ہم ضرور ان سب سے

(حاشیہ ۵ صفحہ ۹۱) یہ بات بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی تسکین و تسلی کے لئے فرمائی گئی ہے۔ وقت وہ تھا جب حضور اور آپ کے ساتھی سب کے سب انتہائی خستہ حالی میں مبتلا تھے۔ کارِ نبوت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالتے ہی حضور کی تجارت قریب قریب ختم ہو چکی تھی اور حضرت خدیجہ کا سرمایہ بھی دس بارہ سال کے عرصے میں خرچ ہو چکا تھا۔ مسلمانوں میں سے بعض کم سن نوجوان تھے جو گھروں سے نکال دیئے گئے تھے، بعض صنعت پیشہ یا تجارت پیشہ تھے جن کے کاروبار معاشی مقاطعہ کی مسلسل ضرب سے بالکل بیٹھ گئے تھے، اور بعض بیچارے پہلے ہی غلام یا موالی تھے جن کی کوئی معاشی حیثیت نہ تھی۔ اس پر مزید یہ ہے کہ حضور سمیت تمام مسلمان مکے اور اطراف و نواح کی بستیوں میں انتہائی مظلومی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہر طرف سے مطعون تھے، ہر جگہ تذلیل و تحقیر اور تضحیک کا نشانہ بنے ہوئے تھے، اور قلبی و روحانی تکلیفوں کے ساتھ جسمانی اذیتوں سے بھی کوئی بچا ہوا نہ تھا۔ دوسری طرف سردارانِ قریش دنیا کی نعمتوں سے مالا مال اور ہر طرح کی خوشحالیوں میں مگن تھے۔ ان حالات میں فرمایا جا رہا ہے کہ تم شکستہ خاطر کیوں ہوتے ہو، تم کو تو ہم نے وہ دولت عطا کی ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں۔ رشک کے لائق تمہاری یہ علمی و اخلاقی دولت ہے نہ کہ ان لوگوں کی مادّی دولت جو طرح طرح کے حرام طریقوں سے کما رہے ہیں اور طرح طرح کے حرام راستوں میں اس کمائی کو اڑا رہے ہیں اور آخر کار بالکل مفلس و قلاش ہو کر اپنے رب کے سامنے حاضر ہونے والے ہیں۔

[1] یعنی اُن کے اِس حال پر کہ اپنے خیرخواہ کو اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں، اپنی گمراہیوں اور اخلاقی خرابیوں کو اپنی خوبیاں سمجھے بیٹھے ہیں، خود اس راستے پر جا رہے ہیں اور اپنی ساری قوم کو اس پر لئے جا رہے ہیں جس کا یقینی انجام ہلاکت ہے، اور جو شخص انہیں سلامتی کی راہ دکھا رہا ہے اُس کی سعی اصلاح کو ناکام بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیے ڈالتے ہیں۔

[2] اس گروہ سے مراد یہود ہیں۔ ان کو مُقْتَسِمِیْن اس معنی میں فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے دین کو باقی نہ رہنے

پوچھیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

پس اے نبی! جس چیز کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اُسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ کرو۔ تمہاری طرف سے ہم اُن مذاق اڑانے والوں کی خبر لینے کے لئے کافی ہیں جو اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بنا رکھے ہیں۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس کی جناب میں سجدہ بجا لاؤ، اور اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے۔ ع

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۲) تقسیم کر ڈالا، اس کی بعض باتوں کو مانا، اور بعض کو نہ مانا، اور اس میں طرح طرح کی کمی بیشی کر کے بیسیوں فرقے بنا لئے۔ ان کے "قرآن" سے مراد توراۃ ہے جو ان کو اسی طرح دی گئی تھی جس طرح اُمتِ محمدیہ کو قرآن دیا گیا ہے۔ اور اُس "قرآن" کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے سے مراد وہی فعل ہے جسے سورۂ بقرہ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (کیا تم کتاب اللہ کی بعض باتوں پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے کفر کرتے ہو؟)۔ پھر یہ جو فرمایا کہ یہ تنبیہ جو آج تم کو کی جا رہی ہے یہ ویسی ہی ہے جیسی تم سے پہلے یہود کو کی جا چکی ہے، تو اس سے مقصود دراصل یہود کے حال سے عبرت دلانا ہے کہ دیکھو یہ ہے کہ یہودیوں نے خدا کی بھیجی ہوئی تنبیہات سے غفلت برت کر جو انجام دیکھا ہے وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اب سوچ لو، کیا تم بھی یہی انجام دیکھنا چاہتے ہو؟

ملہ یعنی تبلیغ حق اور دعوتِ اصلاح کی کوششوں میں جن تکلیفوں اور مصیبتوں سے تم کو سابقہ پیش آتا ہے، ان کے مقابلے کی طاقت اگر تمہیں مل سکتی ہے تو صرف نماز اور بندگی رب پر استقامت سے ملتی ہے۔ یہی چیز تمہیں تسلی بھی دے گی، تم میں صبر بھی پیدا کرے گی، تمہارا حوصلہ بھی بڑھائے گی، اور تم کو اس قابل بھی بنا دے گی کہ دنیا بھر کی گالیوں اور مذمتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے میں اُس خدمت پر ڈٹے رہو جس کا انجام دہی میں تمہارے رب کی رضا ہے۔

عہدِ نبوت کے عمرانی اور تمدنی مسائل

(حکیم حمید الزمان صاحب صدیقی)

عقل و شعور اور دلِ دردمند رکھنے والے ہر انسان کی نگاہِ تجسس ایک ایسی نئی دنیا کی تعمیر کے لئے چشمِ انتظار ہے جس کی ہر صبح مسرت بدوش اور حیات آفریں ہو اور ہر شام سکون بخش اور گہوارۂ راحت ہو۔ وہ کون ہوگا جو ایسی انسانی سوسائٹی کی ضرورت نہ محسوس کرتا ہوگا جس کا ہر فرد خدا ترس، خود آگاہ اور فرض شناس ہو جس کے حدودِ مملکت میں ہر انسان زندگی کی حقیقی لذتوں سے لطف اندوز ہو، جہاں ایک دل بھی بالادست انسانوں کی چیرہ دستیوں سے اندوہگین نہ ہو اور نہ کوئی آنکھ زندگی کی محبوب اور حسین تمناؤں کی پامالی سے نمناک ہو۔

بلاشبہ ایک سنجیدہ فکر اور با احساس انسان کے لئے ازحد مشکل ہے کہ وہ محنت کش اور دکھیا انسانوں کی چیخ پکار، اخلاق و شرافت کی رسوائی، متاعِ انسانیت کی پامالی اور انسانی خون کی ارزانی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس پر خون کے آنسو نہ بہائے لیکن اس کا کیا علاج کیا جائے کہ اس بے نور اور بے ذوق دورِ انسانیت میں درندہ صفت جاہ پرستوں کی کوئی کمی نہیں مگر ایسے بالغ النظر لوگ بہت کمیاب ہیں جو زمانہ کی رفتارِ نبض کو پہچان کر بیمار دنیا کے لئے نسخۂ شفا مہیا کر سکیں ورنہ مبدأ فیض کے دارالشفا میں ہر درد کا علاج موجود ہے او ساز فطرت میں نغمہ ہائے زندگی کی کوئی کمی نہیں ہے

تو راہ شناس نئی و از مقام بے خبری
چہ نغمہ ایست کہ در بربط سلیمی نیست

دورِ حاضر کا انسانی دماغ جن عملی مسائل سے الجھا ہوا ہے وہ ہمارے ہی زمانہ کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ سے انسانی فکر و توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہر دوسرے دور میں پہلے دور کی نسبت سے مسائل کی سطحی نوعیت و ضعیت بدلتی رہی ہو۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ بدلتی رہی ہے لیکن زندگی کے واقعی اور حقیقی مطا ہر زمانہ میں ایک جیسے رہے ہیں اور اس لئے زندگی سے تعلق رکھنے والے عملی مسائل بھی بنیادی طور پر یکساں رہے ہیں۔ اس بنا پر عقل و بصیرت اور دیانت و انصاف کا اقتضا یہ ہے کہ مسائل حاضرہ کے عملی حل کے

انسانی تاریخ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کیا ماضی کے کسی دَور میں ان مسائل کا مؤثر عملی حل پیش کیا گیا ہے اور کیا کسی انقلابی تصوّرِحیات کے ذریعہ ایسی پاکیزہ انسانی سوسائٹی کی تشکیل عمل میں آئی ہے جس کا ذکر پچھلی سطور میں کیا گیا ہے؟ اگر کسی انسانی دَور میں ایسا ہوا ہے تو ہماری انتہائی بدنصیبی ہوگی کہ ہم اس مقدس انقلاب کے بانی کی پاکیزہ زندگی کی رہنمائی قبول کرنے کے بجائے کسی ایسے شخص کی رہنمائی قبول کریں جو راہ و رسمِ منزل سے ناآشنا ہے۔ یقیناً آج انسانی دنیا کی آفاق گیر تباہی و بدامنی اسی چیز کا نتیجہ ہے کہ آج انسانوں کی زمام کار اُن ائمۂ ضلالت کے ہاتھ میں ہے۔ جو اُن کو خدا اور اُس کے پیغمبروں کی راہ سے پھیر کر فساد و معصیت کی راہ پر چلا رہے ہیں ؎ لا یصلح الناس فوضیٰ لا سراۃ لہم ولا سراۃ اذا جہالہم سادوا

یہ مقدس انقلاب جو چھٹی صدی میں ظہور پذیر ہوا پوری انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا انقلاب تھا۔ جس کی تہ میں عالمگیر اور بین الانسانی تصوّرِحیات کارفرما تھا۔ اور جس نے انسانوں کا زاویۂ نگاہ زندگی کا نقطۂ نظر اور فکر و نظر کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی، یہاں تک کہ کرۂ ارضی پر بسنے والا کوئی انسان ایسا نہ رہ گیا تھا جو اس حیرت انگیز انقلاب سے متاثر نہ ہوا ہو۔

زیرِ نظر مقالہ میں یہ دیکھنا ہے کہ دنیائے انسانیت کے امیرِ اعظم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کارِ نبوت کا آغاز کیا تھا تو اُس وقت آپ کو کن کن مسائل سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اور آپ نے ان مسائل کو حل کرنے کے لئے کونسا طریقِ کار اختیار فرمایا تھا نیز یہ کہ وہ مسائل اُس زمانہ کے وقتی مسائل تھے یا اُن میں اور زمانۂ حال کے مسائل میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے؟ اگر دوسری صورت ہے، یعنی عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل جن کو اربابِ علم و دانش کی پیہم اور رنگا رنگ کاوشیں آج تک حل کرنے سے قاصر رہی ہیں، بنیادی حیثیت سے متذکرۂ بالا دورِ انقلاب کے انسانی مسائل سے مختلف نہیں ہیں، تو اِس صورت میں آج بھی وہی ہمہ گیر تصوّرِحیات اور اُسی طرز کی عملی جدوجہد انسانی دنیا کو ایک نئے انقلاب سے روشناس کر سکتی ہے۔ اور اُس کے نتیجہ میں ایک مقدس اور پاکیزہ انسانی سوسائٹی معرضِ وجود میں آ سکتی ہے۔

زمانۂ قبلِ نبوت کے اجتماعی مفاسد جس انسانی دَور میں رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا آغاز کیا، اگر اُس کا موازنہ موجودہ دَور سے کیا جائے تو ان میں اِس لحاظ سے یقیناً اختلاف پایا جاتا ہے کہ

موجودہ دور علم و تہذیب کے اعتبار سے بہت آگے جا چکا ہے۔ اور انسانی تمدن کی ارتقائی حرکت اور علوم سائنس کی حیرت انگیز وسعت و ترقی نے انسان کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ اور جس تاریخی دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ تاریک خیالی، وہم پرستی، جہالت اور علمی کم مائیگی کا بدترین دور تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر مسائل زندگی کے اُلجھاؤ کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی واضح اور حقیقی فرق نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہاں علم و ہنر کا فقدان انسانیت کے لئے بلائے بے درماں تھا۔ اور یہاں حکمت و دانش کا غلط استعمال اہل دنیا کے لئے وجہ ہلاکت بن گیا ہے۔

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا   آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

بہر حال سطور ذیل میں قبل از نبوت دور کے اُن بنیادی مفاسد کا ذکر کیا جاتا ہے جو اُس وقت انسانی دنیا کو ہلاکت و بربادی کی طرف دھکیل رہے تھے اور بظاہر ان کی اصلاح کی کوئی امید نہ تھی۔

بے روح اور غلط کارانہ مذہب پرستی مذہب انسانی اجتماعیت کا قدیم ترین اور مؤثر ترین عنصر ہے۔ اور اگر وہ الہامی صداقتوں اور ہمہ گیر اصولِ انسانیت پر مبنی ہو تو اپنے ماننے والوں میں خدا ترسی، حق پرستی اور ذکر و فکر کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اُجاگر کرتا ہے۔ نیز قدر حریت کی نگہداشت اور حقوقِ انسانی کے تحفظ کا ضامن ہے۔ ایک سچا مذہب ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کو برداشت نہیں کرتا کہ اس کو ماننے والا اثبات نفس کی تکمیل کے لئے انسانی آبادیوں کو پامال کرے اور بے گناہ انسانوں کی لاشوں پر اپنا تختِ جبروت بچھائے۔ لیکن یہ حقیقت کس قدر روح فرسا اور اندوہناک ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ اہلِ مذاہب نے مذہب کی حقیقی روح کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دی ہو۔ ورنہ آج تک جو کچھ دیکھا اور سُنا گیا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمیشہ مذہب کے نام سے دنیا کے سٹیج پر بہیمیت ناک خونی ڈرامے کھیلے گئے۔ اور مذہب کے پردے میں علم برداران مذاہب جس مکروہ اور بھیانک کردار کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں اُس سے شیطان کی روح بھی لرز جاتی رہی ہو گی۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے بالکل حقیقت پر مبنی ہے اور سوائے چند مستثنیات کے مذہب کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے۔ لیکن جس انسانی دور میں دنیا کے آخری ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ دعوت کیا وہ

اس حیثیت سے بدترین دورِ انسانیت تھا یعنی اُس دَور میں مختلف مذاہب کو ماننے والے لوگ جس طرح مذہب کی توہین و تذلیل کر رہے تھے اُس کی مثال شاید انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کے وقت دُنیا میں یہودیت، مسیحیت، مجوسیت، حنیفیت ہندوازم، بدھ ازم وغیرہ مذاہب کو ماننے والے لوگ بکثرت موجود تھے۔ لیکن بے لوث خدا پرستی اور حقیقت شناسی کسی مذہب میں موجود نہ تھی۔ ہر مذہب چند رسوم و ظواہر کا مجموعہ رہ گیا تھا جو مختلف گروہ بندیوں کے لئے محض لیبل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ہر مذہبی گروہ اپنی غلط کارانہ روش کو عین صواب سمجھتا تھا اور دوسروں کی اچھی چیز بھی اُس کی نگاہ میں بُری تھی گویا اُن کے نزدیک حق و باطل کا معیار صرف یہ رہ گیا تھا کہ جو چیز اُن کی طرف منسوب تھی وہ حق اور جو دوسروں میں پائی جاتی تھی وہ باطل تھی۔ اس غلط بینی اور اعتقادی گمراہی کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ مختلف گروہ بندیوں میں کوئی اصولی، اعتقادی اور عملی چیز وجہِ اشتراک نہ رہی تھی بلکہ ہر گروہ دوسرے گروہ سے بالکلیہ مغایرت رکھتا تھا اور اسی چیز نے اُن گروہ بندیوں میں شدید نفرت اور عصبیت پیدا کر دی تھی۔

قَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصَارٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ (بقرہ)

یہود نے کہا نصرانی کسی مذہب حق پر نہیں ہیں اور نصرانیوں نے کہا یہود حق پر نہیں ہیں حالانکہ یہ دونوں گروہ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں۔

یہ نفرت و عصبیت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ایک گروہ کے لوگ دوسرے گروہ سے ناروا سلوک کرنے میں کوئی قباحت نہیں تصور کرتے تھے۔ دوسروں پر ظلم و تشدد کرتے۔ اُن سے بددیانتی کرتے بلکہ اُن کے مقابلہ میں ہر بد اخلاقی کو روا سمجھتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم نے یہود کے نقطۂ خیال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ (الآیہ)

امیین (غیر اہل کتاب) کے بارے میں ہم پر کوئی الزام نہیں ہے۔

اس زمانہ کے اخلاقی تسفل و انحطاط کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مذہب کی عالمگیر سچائیوں پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں اور جن کی نگاہ حقیقت شناس نیکی کو ہر حال میں نیکی اور برائی کو ہر حال

بں برائی تصور کرتی ہے خواہ نیکی اور برائی کا تعلق اپنوں سے ہو یا بیگانوں سے ۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ
س زمانہ کے اہل مذاہب، مذہب کی اس سیدھی سادی حقیقت سے بھی آشنا نہ تھے ۔

دین و مذہب کی حقیقت ہی یہ ہے کہ وہ انسانی قلب و نظر کو ذوقِ تجسس اور امتیازِ حق و باطل
کی گہری بصیرت عطا کرتا ہے اور انسانی قوائے فکر و عمل کو معین حدود اخلاق کے زیرِ اثر نشو و نما دیتا ہے۔
اس لئے جو لوگ مذہب کی حقیقت سے آگاہ ہیں اُن کی دُور رس نگاہ کفر و معصیت کے ہر چہار سُو چھائے
ہوئے دھندلکے میں بھی حق و صداقت کی متلاشی رہتی ہے اور زندگی کی تگ و دو میں ایک لمحہ کے لئے
بھی ان کی طلب و جستجو اور ذوقِ حق پرستی میں کسی قسم کی کمی نہیں واقع ہوتی بلکہ ان کا جذبۂ شوق بڑھتا ہی
چلا جاتا ہے۔ لیکن جس قوم میں خدا پرستی کی حقیقی رُوح فنا ہو جاتی ہے اس کی آنکھوں سے ایمان و عمل
کے حیات آفریں حقائق اوجھل ہو جاتے ہیں، اور وہ اپنے مذہب کی سطحی اور ثانوی درجہ کی باتوں پر
ہی قناعت کر لیتی ہے یا دینِ آبائی کے اوہام باطلہ کو حقیقت تصور کر لیتی ہے ۔

اِنَّھُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ مُّھْتَدُوْنَ (الاعراف-۳)

ان لوگوں نے اللہ کے مقابلہ میں شیطانوں کو اپنا دوست بنا رکھا ہے اور سمجھتے ہیں کہ وہ راہِ راست پر چل رہے ہیں۔

یعنی چند بے ضرر مذہبی مراسم جن پر عمل کرنے سے کچھ دینا اور کھونا نہ پڑتا ہو ان کی اہمیت کو ضرورت
سے زیادہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ احکام دینی جن میں قربانی جان و مال اور ترک عیش و نشاط کا مطالبہ ہو
ان کو اس طرح پس پشت ڈال دیا جاتا ہے گویا اب ان احکام کی ضرورت ہی نہیں یا وہ بالکل منسوخ ہو چکے
ہیں یا خدائی دین کے مقابلہ میں بالکل ایک نیا دین تراش لیا جاتا ہے اور پھر اسی کو خدائی دین کا نام دے دیا
جاتا ہے یہی وہ اعتقادی و عملی گمراہی ہے جو ہر زمانہ میں قوموں کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنتی رہی ہے۔

مرشدِ رُومی حکیم پاک زاد سرِ مرگ امتاں بر ما کشاد
ہر ہلاکِ امت پیشیں کہ بود زانکہ برجندل گماں بُردند عود

دورِ نبوت کے یہود و نصاریٰ کی بالکل یہی حالت تھی کہ ان کو دین کی زندہ اور متحرک رُوح سے کوئی

سروکار نہ تھا بلکہ انہوں نے دین کو خواہشاتِ نفس کا تابع بنا رکھا تھا۔ جہاں مذہب کا فیصلہ ان کی خواہشات کے خلاف ہوتا وہ کمال دیدہ دلیری سے احکامِ مذہب کی قطع و برید کرکے ان کو خواہشِ نفس کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهٖ (الآیہ)

ان میں نیک و بد اور صواب و ناصواب کی تمیز ہی باقی نہ رہی تھی، علماء و مشائخ ان کو جس راہ پر ڈال دیتے یہ لوگ اسی راہ پر چل پڑتے تھے۔

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (الآیہ) — ان لوگوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا رب بنا رکھا ہے۔

یہود صرف اس بات کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے کہ وہ اسرائیلی یا یہودی النسل ہیں اور نصرانی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ حضرت مسیح کی الوہیت کو مان لینا ہی فلاح و نجات کے لئے کافی ہے لیکن ان کی عملی زندگی کو دیکھ کر کسی کو یقین نہ آسکتا تھا کہ وہ فی الواقع کسی پیغمبر کی رہنمائی کو مانتے اور اللہ کی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم نے ان کی اس گمراہی کا بار بار ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کچھ یہودیوں اور مسلمانوں میں بات چل نکلی، یہودیوں نے دعویٰ کیا کہ "ہمارا مذہب سچا ہے اور نجاتِ اُخروی کا استحقاق بغیر ہمارے کسی کو نہیں ہے"۔ ان کے مقابلہ میں مسلمانوں نے کہا "ہمارے نبی سب سے آخری نبی ہیں اور ہمارا دین آخری اور مکمل دین ہے"۔ لیکن ذیل کی قرآنی آیت میں ان لوگوں سے واشگاف الفاظ میں کہا گیا کہ محض دین و مذہب کی نمائش سے کچھ نہیں بنے گا اصل چیز ایمان و عمل ہے۔ اگر یہ نہیں تو محض کسی مذہب کا کامل و برتر ہونا تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔[1]

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ

نہ تمہاری آرزوئیں اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوئیں کام آئیں گی، (خدا کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ) جو شخص بُرائی کریگا اس کو اس کی سزا ملے گی اور نہیں پائے گا وہ اللہ کے سوا کوئی دوست اور نہ مددگار، اور جو نیک کام کریگا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن بھی ہو وہ جنت میں

نَقِيْرًا ۔ (النساء)

داخل ہوگا ، اور اس پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔

یہود کی عملی حالت کا نقشہ جو قرآن حکیم نے کھینچا ہے اس سے ان کی اخلاقی پستی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۔ (المائدہ)

آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھیں گے کہ گناہ و سرکشی اور حرام خوری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں ، بہت ہی بُرے ہیں وہ اعمال جو وہ کرتے ہیں۔ ان کے علماء اور مشائخ ان کو گناہ و معصیت کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے ؟ بہت ہی بُرا ہے وہ کام جو وہ کرتے ہیں۔

اور عام اہل کتاب سے قرآن حکیم نے یوں خطاب کیا ہے۔

قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (مائدہ)

اے پیغمبر ! آپ کہدیں ، اے علمبردار ان کتاب ! تم کسی صداقت پر نہیں ہو جب تک کہ تم توراۃ و انجیل اور ان احکام کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر اتارے گئے ہیں پوری طرح قائم نہ کرو۔

يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۔ (النساء)

اے اہل کتاب تم اپنے دین میں غلو نہ کرو ، اور اللہ کی ذات پر حق کے سوا کوئی بات نہ کہو۔

مدینہ منورہ اور اس کے اردگرد یہود کثرت سے آباد تھے ۔ یہ لوگ بخت نصر کے حملہ بیت المقدس کے زمانہ میں مدینہ میں آ رہے تھے۔ مدینہ منورہ کے علاوہ یہ لوگ خیبر ، فدک ، وادی القریٰ میں بھی آباد تھے ۔ نیز عرب سے باہر یورپ ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں بھی پائے جاتے تھے لیکن ان کی کوئی جداگانہ ریاست دُنیا کے کسی حصہ میں موجود نہ تھی ، عرب میں ان کا ذریعۂ معاش تجارت ، کھیتی باڑی اور سُودی کاروبار تھا ۔ یہ لوگ حد درجہ کے لالچی اور سنگدل تھے ۔ بڑی بڑی شرحوں پر سودی رقمیں دیتے تھے اور کفالت کے طور پر لوگوں کے بچے بلکہ مستورات تک کو اپنے پاس رہن رکھتے تھے ۔ ان میں دولت کی کثرت تھی ۔ اس وجہ سے ان میں زنا و فحاشی کی کوئی حد نہ تھی اور علماء یہود نے اپنے امراء کی دلجوئی

کے لئے زنا کی سزا (جو تورات نے مقرر کی تھی) بھی بدل ڈالی تھی۔

مسیحی مذہب کے پیرو عرب میں بکثرت موجود تھے۔ ابنِ قتیبہ کا بیان ہے کہ قبائل ربیعہ و غسان عیسائی تھے، قضاعہ میں بھی عیسائیت کا اثر پایا جاتا تھا بلکہ مکہ معظمہ میں بھی کچھ پیروانِ مسیحیت پائے جاتے تھے۔ چنانچہ ورقہ بن نوفل جو ایک خداشناس عیسائی اور عبرانی زبان کے ماہر تھے، مکہ معظمہ کے رہنے والے تھے۔

عیسائیوں میں اگرچہ کچھ بچے کھچے ایسے لوگ بھی تھے جو دل میں اللہ کا خوف رکھتے تھے اور ٹھیک ٹھیک مسیحی مذہب پر عمل پیرا تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی قرآن حکیم نے بھی تعریف کی ہے اور ایک مستند حدیث میں "اِلَّا بقایا من اہل الکتاب" کے الفاظ سے ان کو اس وقت کی گمراہ قوموں سے الگ کیا گیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ان کی عظیم اکثریت سخت گمراہی میں مبتلا تھی۔ چنانچہ ایک مسیحی مصنف ڈریپر لکھتا ہے:۔

"عیسائیوں کے عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر شامل ہو گیا تھا عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھل گیا تھا"۔

اس زمانہ میں ایک گروہ مریمی کے نام سے پیدا ہوا تھا جو حضرت مریمؑ کو بھی شریکِ الوہیت تصور کرتا اور اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا۔ نیز اس زمانہ میں مسیحی فرقوں کے دلچسپ مسائل جن پر وہ پوری قوت صرف کر رہے تھے یہ تھے کہ حضرت مسیحؑ میں صرف خدائی طبیعت پائی جاتی ہے یا خدائی اور انسانی دونوں طبیعتیں ان میں جمع ہیں؟ اور دونوں ہیں تو ان کا منشا ایک ہے یا الگ الگ!

نصرانیوں کی اخلاقی حالت یہود سے کچھ کم افسوسناک نہ تھی۔ زمانۂ نبوت سے پہلے یہ لوگ دنیا کے بہت بڑے حصے پر حکمران تھے اور دولت و اقتدار نے ان میں خطرناک حد تک ذمائم اخلاق پیدا کر دیئے تھے۔ زنا، مے نوشی، مست خوری، اور دیگر اخلاقی بیماریاں ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی تھیں۔ حضرت اقبال نے دورِ حاضر کے مغربی زہر آلود معاشرت پر بڑی خوبی سے طنز کیا ہے ؎

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا نبیِ عفت و غمخواری و کم آزاری

صلا فرنگ سے آیا ہے سوئے پیرانِ کلیسا   مئے و قمار و ہجوم زنانِ بازاری

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عہد رسالت کے ابتدائی دور میں عیسائیوں کی اخلاقی حالت کسی لحاظ سے انیسویں بیسویں صدی کی عیسائیت سے بہتر نہ تھی۔

مجوسیت کا سرچشمہ ایران کی سرزمین تھی لیکن عرب میں بھی کہیں کہیں اس کے اثرات پائے جاتے ، چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ عرب کا قبیلۂ تمیم مجوسی تھا اور اس دور کے مجوسیوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت عصر اقوام سے کہیں زیادہ دردناک تھی۔ زمانۂ بعثت نبوی سے بہت پہلے ایران کے مشہور رہنما مانی نے بسائیت و مجوسیت کے اجزا سے عجیب و غریب ملغوبہ تیار کیا تھا۔ ایک طرف اس کی جدت نوازی کا یہ حال بیٹی اور بہن کی حرمت اٹھادی تھی چنانچہ ایران کے ایک حکمران یزدگرد ثانی نے جو اس شریعت کا پیرو تھا اپنی نی سے نکاح کیا اور کچھ مدت بعد اس کو قتل کر دیا[1]۔

اس کے بعد ایک اشتراکیت پسند مزدک نامی مصلح پیدا ہوا جس نے یہ تعلیم دی کہ دولت اور عورت سی کی ملکیت نہیں۔ اس دین کی اشاعت میں عیاش حکام و امرا نے سرگرم حصہ لیا کیونکہ یہ نیا دین ان کی عیش پسندانہ طبائع سے مناسبت رکھتا تھا۔

قریش کو اس بات پر ناز تھا کہ وہ کعبۃ اللہ کے نگہبان اور ملت ابراہیمی کے پیرو ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ یہود نصاریٰ کے دعووں سے زیادہ بے حقیقت اور بے مغز تھا۔ ملتِ ابراہیمی کا بنیادی عقیدہ توحید ہے لیکن ان لوگوں کی زندگی کے کسی ایک گوشہ میں بھی توحید کا شائبہ تک موجود نہ تھا بلکہ وہ شدید درجہ کی توہم پرستی اور شرک و بدعت میں مبتلا تھے اور ان کے معبودانِ باطل کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ہاں بہت قلیل تعداد میں کچھ ایسے اشخاص بھی ان میں موجود تھے جن کے ضمیر بالکل مردہ نہیں ہو چکے تھے اور وہ اپنی خداداد بصیرت سے اس حقیقت کو جان گئے تھے کہ انسان کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے گھڑے ہوئے معبودوں کے سامنے سرِ نیاز خم کرے۔ چنانچہ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی بت کے سالانہ میلے میں ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث اور زید بن عمرو بن نفیل شریک تھے۔ ان لوگوں نے یک لخت ہی محسوس کیا کہ یہ کیا حماقت ہے کہ ہم انسان ہو کر پتھروں کے سامنے جھکتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی ان لوگوں نے حق و صداقت

کی جستجو شروع کردی۔ ورقہ، عثمان اور عبید اللہ نے مسیحی مذہب قبول کرلیا اور زید نے دینِ حنیفی کی تلاش میں شام کا سفر کیا کئی پادریوں اور راہبوں سے ملے، لیکن جس چیز کی ان کو تلاش تھی اس کا سراغ نہ ملا اور بالآخر اس اجمالی ایمان کو کافی سمجھا کہ "میں ابراہیم کا دین قبول کرتا ہوں"۔ اسی طرح امیہ بن صلت جو طائف کے رئیس اور مشہور شاعر تھے، نے بھی بت پرستی کی مذمت کی تھی۔ غالباً یہ وہی امیہ ہیں جن کی نسبت آنحضرت صلعم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا "اس کا دل مؤمن اور دماغ کافر تھا"

دورِ جاہلیت کے کچھ سنجیدہ فکر اور صحیح الخیال اہلِ سخن کا کلام عربی لٹریچر میں ملتا ہے۔ نابغہ اور زہیر ان میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ نابغہ کے اس شعر سے اُن کی توحید پرستی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

حَلَفْتُ فَلَمْ اَتْرُكْ لِنَفْسِكَ رِيْبَةً ۔۔۔ وَلَيْسَ وَرَاءَ اللّٰهِ لِلْمَرْءِ مَذْهَبُ[1]

اور زہیر کے اِس شعر سے ان کی وسعتِ نظر اور دقیقہ سنجی کا پتہ چلتا ہے:-

وَاِنَّ الْحَقَّ مَقْطَعُهٗ ثَلٰثٌ ۔۔۔ يَمِيْنٌ اَوْ نِفَارٌ اَوْ جِلَاءٌ

ان کے علاوہ ایک جاہلی شاعر کا یہ مشہور شعر ہماری درسی کتابوں میں پایا جاتا ہے؛

اَرَبًّا وَاحِدًا اَمْ اَلْفَ رَبٍّ ۔۔۔ اَدِيْنُ اِذَا تَقَسَّمَتِ الْاُمُوْرُ

غرض سخنِ عشق کی آواز جاہلیت کے بڑے نورا اور گھناؤنے دور میں بھی کہیں کہیں اُٹھ رہی تھی مگر اسکی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے موجودہ مادہ پرستانہ ماحول میں صدائے حق کی ہے۔ اور عربوں کا عام مذاق و ذوق حق پرستی سے قطعی ناآشنا تھا۔

مدینہ منورہ کے مشرک قبائل اوس و خزرج کی دینی حالت بھی یہی تھی۔ یہ لوگ صدیوں پہلے جنوبی عرب (یمن) سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ ابن کثیر نے بیان کیا ہے کہ سیل العرم کے زمانہ میں جو لوگ اِدھر اُدھر پھیل گئے تھے اوس و خزرج بھی انہیں میں سے تھے۔ انہوں نے مدینہ منورہ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ اور یہود سے عہد و پیمان کرلیا تھا[2]۔

بعثتِ نبوی کے وقت ہندوستان کے ہندو اپنی تاریخ کے تاریک دور میں داخل ہوچکے تھے (باقی ص

[1] اغانی تذکرہ نابغہ جلد ۹ - [2] ابن کثیر ص ۲۲۳ -

علمائے کرام کی خدمت میں

گذشتہ اشاعت میں اُن فتووں اور اشتہارات کا ذکر آچکا ہے جو دیوبند، مظاہر العلوم، تھانہ بھون اور دہلی کے بعض مشہور علماء کے قلم سے نکلے ہیں۔ اب ہمیں ایک اور اشتہار وصول ہوا ہے جسے ہندوستان سے لاکر پاکستان میں پھیلایا جارہا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

حضرت مولانا مدنی کا بصیرت افروز بیان

مولانا مولوی عبدالحمید بلندشہری مدرس مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ ضلع سہارنپور کے ایک خط کا وہ اقتباس ہے جو انہوں نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی دامت فیوضہم کو لکھا ہے، ذیل میں صرف وہ حصہ ہے جس کا تعلق اس جماعت سے ہے جس نے اپنا نام جماعت اسلامی رکھا ہے۔

"یہ خیال اس وقت سے پیدا ہوا ہے جب سے مودودیت جو کہ گنگوہ میں صورت فتنہ اختیار کئے ہوئے ہے کچھ تبادلۂ خیالات اور کچھ اُن کے اخبارات کا مطالعہ تردیداً کیا گیا۔ یہ لوگ صحابہؓ تک متجاوز کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ، ابن عمرؓ، عائشہ رضی اللہ عنہا وعنہم کو احیاء تبلیغ دین میں متجاوز عن الاعتدال کے الفاظ اختیار کئے ہیں۔ نیز خود مسلک اعتدال میں فرماتے ہیں کہ میں نے اشخاص ماضی وحال بلا واسطہ دین کو کتاب السنہ۔ کتاب اللہ سے سمجھا ہے نیز حضرت حاجی علیہ الرحمتہ و مجدد الف ثانی علیہ الرحمتہ کے متعلق لکھتے ہیں ان حضرات نے ابتدائے زندگی میں تو اچھا کام کیا مگر اخیر عمر میں ایسی مسموم غذا مسلمانوں کو دے گئے ہیں کہ آج تک مسلمان اس کے زہر سے محفوظ نہیں ہے اور یہی تنقیدات تصوف پر بہت کی ہیں بعض اہل گنگوہ نے دیگر بعض کو حضرت بو سعید علیہ الرحمتہ کے مزار پر جانے سے روکتے ہوئے کہا کہ ایک سنیاسی سبتہ جو پتھروں میں پڑا ہے اور یہ مشہور مقولہ ہے مودودیوں کا کہ دیوبند مظاہر العلوم میں قربانی کے بینڈھے تیار کئے جاتے ہیں علماء پر زبردست ریمارک خاصکر ماضی وحال کے

بزرگوں پر غرض با التفصیل پھر عرض کرونگا اسوقت یہ عرض کرنے کا مقصد ہے کہ آیا ہم کھل کر ان لوگوں کو جواب دیں کیونکہ خاصکر گنگوہ سے مجھکو واسطہ ہے وہاں پر میں اشرف العلوم میں خدمت کرتا ہوں اور شب و روز یہ منکرات سامنے آتے رہتے ہیں تو لامحالہ کہنا پڑتا ہے۔ جواب شافی سے نوازیں"[1]

عبدالحمید بلند شہری

الجواب: انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ خواہ صحابہ اکرام ہوں یا اولیاء عظام یا ائمہ حدیث وفقہ وکلام کوئی بھی معصوم نہیں ہے سب سے غلطیاں ہو سکتی ہیں مگر ان کے متعلق اعتماد کی شہادتیں قرآن حدیث میں بکثرت موجود ہیں اور ان کے اعمالنامے اور اتقاء و علم کی تاریخی روایات معتبرہ اس قدر امت کے پاس ہیں کہ قرون حالیہ کے پاس ان کا عشر عشیر بھی نہیں ہے ان پر تنقید ان ہی جیسے پایۂ علم و اتقاء والا کر سکتا ہے ہمارے زمانہ کے ٹٹپونجئے جن کے پاس علم ہے نہ تقویٰ کیا منہ رکھتے ہیں کہ زبان درازکریں سوائے اپنی بدبختی کے اظہار کے اور کیا حیثیت رکھتے ہیں ؎ چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد ۞ میلش اندر طعنہ پاکاں زند

اللہ تعالیٰ ان کی تعریف فرماتے ہوئے فرماتا ہے محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار۔ الآیۃ دوسری جگہ ہے ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم الآیۃ تیسری جگہ ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔ الآیۃ۔ چوتھی جگہ ہے وکذلک جعلناکم امۃ وسطا۔ الآیۃ اور یہ کم بخت انکی شان میں ہذیان بکتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم من بعدی غرضا۔ الحدیث خدا سے ڈرو میرے اصحاب کے متعلق میرے بعد انکو نشانہ ملامت مت بناؤ آپ فرماتے ہیں خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم الحدیث اور یہ بدبخت ان کی شان میں بدگوئیاں کرتے ہیں سوائے بدنصیبی کے اور کیا ہے ان خبیثوں سے گفتگو اور مناظرہ وغیرہ کرنا اپنے وقت کو ضائع

---

[1] عبارت کی تمام غلطیاں اور بے ربطیاں جوں کی توں اشتہار ہی سے نقل کی گئی ہیں۔ کاتب ترجمان یا ناشر ترجمان کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو اور ہماری ہدایت فرمائے آمین۔ دار العلوم اور مظاہر العلوم یا اُن کے بنیاد رکھنے والوں اور طلباء اور مدرسین کے متعلق ہر گمراہ اور مخالف اہل اسلام اور مخالف اہل سنت ایسے ہی الفاظ کہتا ملے گا۔"

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ دار العلوم دیوبند ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ

المشتہر

مولوی سید شفیق الرحمٰن محلہ عالی کلاں سہارنپور

مطبوعہ قاسمی پریس مراد آباد

یہ اشتہار بازی بجائے خود، جس نوعیت کی ہے کہ اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے سخت انقباض محسوس ہوتا ہے۔ اور ناظرین ترجمان القرآن گواہ ہیں کہ اس طرز کے اشتہارات اور اخبارات و رسائل کے مضامین سے کبھی ان صفحات میں تعرض نہیں کیا گیا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ بعض نادان مرید اور شاگرد اب ایسے اکابر کو اس میدان میں لا رہے ہیں جو اپنے علم و تقویٰ اور روحانی مشیخت کے لحاظ سے ہندوستان و پاکستان کی مذہبی دنیا میں معتمد علیہ ہیں۔ اس لئے مجبوراً پچھلی اشاعت میں بھی ان کی طرف توجہ کرنی پڑی تھی، اور اب اس اشاعت میں دوبارہ اس پر اظہار خیال کرنا پڑ رہا ہے۔ ہماری طرف سے اس سلسلہ میں یہ آخری گزارشات ہیں۔ خدا کرے کہ اس کے بعد پھر ان صفحات کو اس طرز خاص کے پروپیگنڈے کی جواب دہی سے آلودہ کرنے کی نوبت نہ آئے۔

(۱)

سب سے پہلی نمایاں چیز جو مولانا حسین احمد صاحب کے اس بیان میں نگاہ کو کھٹکتی ہے وہ اُن کی زبان ہے جسے ممکن ہے مولانا خود اپنے شایانِ شان سمجھتے ہوں، مگر ہم ان کے ساتھ اتنا حسن ظن رکھتے ہیں کہ یہ زبان ہمیں ان کے مرتبے سے فروتر نظر آتی ہے۔ کسی شخص یا گروہ سے اختلاف ہونا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ سخت سے سخت اختلافات ہو سکتے ہیں اور سخت سے سخت اظہار رائے شریفانہ زبان میں کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ زبان، کہ جس سے اختلاف ہوا اس کے خلاف ٹٹ پونجیے، کم بخت، بدبخت

اور خبیث جیسے رکیک الفاظ استعمال کر ڈالے جائیں، ایک مہذب آدمی کے بھی شایان شان نہیں ہے، کجا کہ ایک ایسا مرد بزرگ اس کو اختیار کرے جو اس برعظیم کی سب سے بڑی دینی درسگاہ کا مسند نشین ہے اور جس کی طرف ہزارہا آدمی تعلیم دین ہی کے لئے نہیں، تزکیۂ نفس کے لئے بھی رجوع کرتے ہیں جب قوم کے مقتدا اور مربی و معلم اس طرح کی باتوں پر اتر آئیں تو بعید نہیں کہ ان سے اخلاق و تہذیب کا سبق لینے والے اصاغر آدمیت سے بالکل ہی عاری ہو جائیں اور اس قوم میں نام کو بھی ایک دوسرے کی عزت کا پاس باقی نہ رہ جائے۔

اذا کان رب البیت بالطبل ضاربًا   فلا تلم الاولاد فیه علی الرقص

مولانا کو اگر یاد نہ ہو تو ہم انہیں یاد دلاتے ہیں کہ کسی وقت ہم نے بھی ان کے نظریۂ قومیت اور ان کی کانگریس سے موافقت پر تنقید کی ہے۔ وہ تنقید اب بھی ہماری کتابوں "مسئلہ قومیت" اور "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم" میں موجود ہے۔ وہ اور ان کے شاگرد اور مرید ہماری ان تنقیدی عبارات کو دیکھ کر خود رائے قائم فرمائیں کہ دونوں زبانوں میں کتنا فرق ہے۔ بالفرض اگر دس بارہ برس بعد اس کا بدلہ لینا ہی ضرور تھا تو جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا کے اصول پر لیا جا سکتا تھا۔ یہ تعدی آخر کس آئین کی رُو سے حضرت کے لئے جائز ہو گئی؟

(۲)

دوسری بات جو اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے، وہ مولانا کی انتہائی غیر ذمہ دارانہ روش ہے جو انہوں نے دوسروں کے دین و اعتقاد پر اظہار رائے کرنے میں اختیار کی ہے۔ ان کے سامنے ایک مفروضہ سوال پیش نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک جماعت کا نام لے کر اس پر چند الزامات لگائے گئے تھے۔ تنابز بالالقاب سے قطع نظر، "مودودیوں" اور "مودودیت" کے الفاظ سے جس جماعت کا ذکر کیا گیا ہے، مولانا اس سے بالکل ناواقف نہ تھے۔ اُن کو خوب معلوم تھا کہ ہندوستان و پاکستان میں ہزارہا مسلمان اُس سے وابستہ اور لاکھوں اس سے متاثر ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس جماعت کے خیالات کہیں چھپے ہوئے نہیں ہیں بلکہ لکھے لکھائے مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ اس کے باوجود ایک سائل نے جیسے کچھ بیہودہ

لزامات بغیر کسی حوالے اور ثبوت کے اس پر لگائے ہیں اُن کو مولانا نے جوں کا توں تسلیم کر لیا اور ان پر ایک ند و تیز جواب غالباً یہ جانتے ہوئے سائل کے حوالہ کر دیا کہ اس سوال و جواب کو ان کے اپنے معتقدین شتہار بازی کے لئے استعمال کرنے والے ہیں۔ انہوں نے کوئی ضرورت یہ تحقیق کرنے کی نہیں سمجھی کہ جس گروہ کے متعلق یہ سوال کیا جا رہا ہے اُس نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے بزرگوں کے متعلق فی الواقع کیا لکھا ہے، کن الفاظ میں لکھا ہے، کس سیاق و سباق میں لکھا ہے، اور اس کی دوسری تحریرات کیا شہادت دیتی ہیں کہ وہ ان بزرگوں کے متعلق کیا خیالات رکھتا ہے۔ انہوں نے یہ معلوم کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہ سمجھی کہ اس گروہ کے بعض اشخاص کی طرف منسوب کر کے جو باتیں سوال میں لکھی گئی ہیں وہ فی الواقع کس نے لکھی ہیں، اُس کی اِس گروہ میں کیا حیثیت ہے، اور اس کی کسی بات کو پورے گروہ کے خیالات کی ترجمانی قرار دیا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ بالفرض اگر مولانا کے پاس اس گروہ کی مطبوعات پڑھنے کے لئے وقت نہ تھا، اور نہ بیان کردہ امور کی تحقیق ہی کے لئے وہ فرصت پاتے تھے، تو آخر کس طبیب نے مشورہ دیا تھا کہ حضرت اس معاملہ میں رائے ضرور دیں؟ میں پوچھتا ہوں، کیا مذہبی پیشوائی کی ایسی ذمہ دارانہ مسند پر بیٹھ کر ایک متقی عالم کی یہ روش ہونی چاہئے؟ کیا تقویٰ اور دیانت اسی چیز کا نام ہے؟ کیا یہی وہ تزکیۂ نفس ہے جس سے حضرت خود بہرہ مند ہیں اور دوسروں کو بہرہ مند فرما رہے ہیں؟ کیا اس جواب کی تحریر کے وقت حضرت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات یاد تھے کہ سبابُ المسلم فسق اور کل المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہٗ؟ کیا یہ جواب لکھتے وقت حضرت نے ایک لمحے کے لئے بھی یہ سوچا تھا کہ ہمیں اور انہیں ایک وقت مرنا اور اپنے رب کی عدالت میں حاضر ہونا ہے، وہاں اگر سائل کے الزامات محض بہتان و افترا ثابت ہو گئے تو حضرت اس کی توثیق کی پاداش سے کیا دیکھیں گے؟

(۴)

مولانا اور اُن کے گروہ کے دوسرے حضرات، جن کی تحریریں حال ہی میں جماعت اسلامی کے خلاف شائع ہوئی ہیں، اس بات کو بالکل بھول گئے ہیں کہ کسی شخص یا گروہ کے عقیدہ و مسلک کے متعلق کوئی رائے قائم یا ظاہر کرنا دیانتہً اس وقت تک صحیح نہیں ہے جب تک کہ انصاف کے ساتھ اس کی تمام یا اکثر

تحریروں کو خود نہ پڑھ لیا جائے۔ کسی خدا ترس آدمی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ محض سنی سنائی باتوں پر دوسروں کو ضال اور مُضل قرار دے بیٹھے۔ یا چند نیاز مندوں کی پیش کی ہوئی نشان زدہ عبارتوں پر رائے قائم کر لے اور اسے شائع کر دے، یا پہلے کسی کی خبر لینے کا عزم کر لیا جائے اور پھر اس کی کتابیں اس غرض سے کھنگالی جائیں کہ کہاں اس کو مطعون کرنے اور اس پر الزام تراشنے کی کوئی گنجائش ملتی ہے، یا ایک شخص کی بعض عبارتوں سے ایسے معانی اور نتائج نکالے جائیں جن کی تردید خود اسی شخص کی بہت سی دوسری عبارتیں کر رہی ہوں۔ اس طرح کی حرکتیں وہ لوگ تو کر سکتے ہیں جن کے پیش نظر صرف دنیا اور اس کی زندگی ہے، مگر جنہیں خدا اور آخرت کا بھی کچھ خیال ہو اُن سے ایسی حرکات بالکل خلاف توقع ہیں۔

ان حضرات کی وہ تمام تحریریں ہم نے بالاستیعاب پڑھی ہیں جو انہوں نے ہمارے خلاف لکھی ہیں۔ اُن کا پورا تجزیہ کرنے کے بعد جو کچھ ہم نے پایا ہے وہ یہ ہے:-

۱۔ بعض مقامات پر ہماری اصل عبارتیں نقل کرنے کے بجائے اپنے نکالے ہوئے نتائج اپنے الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں اور انہیں ہمارے سر تھوپ دیا گیا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں۔ یہ حرکت تمام ایسے مقامات پر کی گئی ہے جہاں الزام لگانے والے نے یہ محسوس کیا کہ اگر وہ ہماری عبارت کو ہمارے الفاظ میں نقل کریگا تو اپنا الزام ثابت نہ کر سکے گا۔

۲۔ بعض مقامات پر ہمارے چند فقرے ایک سلسلۂ عبارت سے الگ کر کے اُن سے اپنے مَن مانے نتائج نکالے گئے ہیں۔ حالانکہ اگر وہی مضمون پورا پڑھا جائے یا وہ کتاب پوری دیکھی جائے جس کے چند فقروں پر ان نتائج کی بنا رکھی گئی ہے تو اُس سے بالکل برعکس نتائج نکلتے ہیں۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یا تو محض کسی کے دکھلائے ہوئے نشان زدہ فقرے مفتی صاحب نے ملاحظہ فرمائے اور فتویٰ رسید کر دیا، یا پھر پورا مضمون پڑھنے کے باوجود دانستہ الزام تراشی فرمائی۔

۳۔ بعض مقامات پر ہماری عبارات میں کھلی کھلی تحریفیں کی گئی ہیں۔ کہیں آگے پیچھے اپنے الفاظ ملائے گئے ہیں اور کہیں ایک فقرے کو اُن فقروں سے الگ کیا گیا ہے جو اصل مدعا کو ظاہر کرتے تھے۔ اس طرح کی تحریفات غالباً یہ سمجھ کر کی گئی ہیں کہ جن لوگوں کی نظر سے ہماری اصل مطبوعات گزری ہیں ان کی

نگاہ میں چاہے محرّف کی رتی برابر وقعت باقی نہ رہے، مگر بہت سے ناواقف لوگ تو دھوکا کھا ہی جائیں گے
۴۔ بعض مقامات پر ہماری عبارت تو صحیح نقل کی گئی ہے مگر ہمارا منشا سمجھنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی گئی اور خالص بدظنی کے ساتھ ہمارے الفاظ سے بالکل غلط معنی نکال لئے گئے، حالانکہ ہم سے پوچھا جائے تو ہم اپنے الفاظ کا صحیح محمل بتاسکتے ہیں اور اپنی دوسری تحریروں سے ثابت کرسکتے ہیں کہ ان الفاظ سے ہمارا اصل مُدّعا کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک عبارت اگر دو یا زائد معنوں کی محتمل ہو تو معتبر صرف وہی معنی ہونگے جو خود مصنف بیان کرے اور جن کی شہادت اس کی دوسری عبارتیں دیں۔ نہ کہ وہ جو ایک معاند بیان کرے۔
۵۔ بعض مقامات پر کسی ماخذ اور حوالے کے بغیر ہماری طرف ایک عقیدہ یا مسلک یا جزئیہ منسوب کر دیا گیا ہے، حالانکہ ہم اس سے بارہا بالفاظ صریح براءت ظاہر کرچکے ہیں اور ہماری تحریروں سے ہرگز اُس الزام کا ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا۔ ہم حیران ہیں کہ یہ آخر دیانت کی کونسی قسم ہے کہ کسی کو زبردستی گمراہ، بدعقیدہ اور مجرم بنانے کی کوشش کی جائے درآنحالیکہ وہ باربار اُس سے براءت ظاہر کر رہا ہو۔
۶۔ بعض مقامات پر ہمارے خلاف ایسے اعتراضات کئے گئے ہیں جن کے مدلل جوابات ہماری تحریروں میں موجود ہیں۔ یہ اعتراض اگر اُن تحریروں کو پڑھے بغیر کئے گئے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان حضرات کو دوسروں پر اعتراض جڑنے کا بڑا شوق ہے مگر ان کے مسلک سے واقف ہونے کی تکلیف گوارا نہیں ہے۔ اور اگر جوابی دلائل سے واقف ہونے کے باوجود ان اعتراضات کو دہرایا گیا ہے اور جوابی دلائل سے تعرّض نہیں کیا گیا تو یہ صریح جھگڑالو ذہنیت کی علامت ہے۔
۷۔ بعض مقامات پر ہماری تحریک، یا ہمارے مسلک، یا کسی خاص معاملہ میں ہمارے نقطۂ نظر پر ایک جامع رائے کا اظہار کیا گیا ہے مگر اس کی تائید میں کوئی شہادت ہماری تحریروں سے پیش نہیں کی گئی، نہ یہ بتایا گیا کہ اس رائے کی بنیاد کیا ہے۔ اس طرح کی بے بنیاد رائے زنیاں کرنے پر اگر کوئی اتر آئے تو دنیا میں کون ہے جو اس کی رائے کی ضرب سے بچ سکتا ہو۔
۸۔ بعض مقامات پر ساری اعتراضی تقریر کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک ہم نے

کسی فقہی مسئلے کے بیان میں، یا کسی کلامی مسئلے کی تشریح میں کوئی غلطی کی ہے۔ لیکن اُسے بیان ایسے مبالغہ آمیز انداز سے کیا گیا ہے کہ گویا معاذ اللہ ہم نے سارے دین کو ہدم کر ڈالا ہے۔ حالانکہ نہ علمی مسائل میں غلطی کر جانا کوئی دنیا سے نرالا واقعہ ہے اور نہ ہر غلطی لازماً گمراہی ہوتی ہے۔

۹۔ بعض مقامات پر ایسے امور کو مخالفت اور فتوے بازی کی بنیاد بنایا گیا ہے جن میں اختلاف کی گنجائش ہے اور فریقین کے پاس اپنے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں شرعی دلائل موجود ہیں۔ اس طرح کے اختلافی مسائل کو ایک علمی بحث کا موضوع تو بنایا جا سکتا ہے، مگر کسی معقول انسان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ان کی بنیاد پر مخالفت کا طوفان اُٹھائے گا اور فتوے بازی پر اتر آئے گا۔

یہ تجزیہ جو ہم نے ان حضرات کی مخالفانہ تحریروں کا کیا ہے اس کے ہر جزء کی نظیریں ہم ان کی تحریروں سے پیش کر سکتے ہیں۔ وہ جب چاہیں اس کے نظائر ان کی خدمت میں حاضر کر دیے جائیں گے۔ اس سے پہلے اشتراکی، قادیانی، منکرین حدیث، بریلوی اور مسلم لیگی حضرات اس طرح کی بنیادیں ہم پر کرتے رہے ہیں۔ بعض مناظرہ باز اہل حدیث نے بھی یہ شیوہ اختیار کیے رکھا ہے۔ بعض اخبارات اور رسائل کا تو برسوں سے مستقل طریقہ ہی یہ رہا ہے کہ ان ہتھکنڈوں سے ہمارے خلاف رائے عام پیدا کریں۔ لیکن ہم کسی ایسے شخص کو قابلِ التفات نہیں سمجھتے جس کے طرزِ عمل میں حیا اور خوفِ خدا کے فقدان کی علامات پائی جاتی ہوں۔ دیوبند اور مظاہر العلوم کے ان اکابر کو ہم ابھی تک اس صف میں شامل نہیں سمجھتے۔ اُن سے یہ توقع باقی ہے کہ وہ اس حد تک اپنے آپ کو گرا ہوا ثابت نہ کریں گے۔ اسی لئے ہم نے ان پر اتنا وقت صرف کیا ہے۔ خدانخواستہ جس روز اس پہلو سے ہمیں مایوسی ہو گئی، اس کے بعد انشاء اللہ ان کے ہزار مضامین اور اُن کی لاکھ اشتہار بازیوں کا ایک جواب بھی ادھر سے سننے میں نہ آئے گا۔

(۴)

ہمارے لئے یہ بات سخت حیرت کن ہے کہ ہماری مخالفت میں صرف علماء دیوبند ہی نہیں، دوسرے گروہوں کے علماء بھی جن باتوں کو بار بار چھانٹ چھانٹ اور اُچھال اُچھال کر سامنے لا رہے ہیں وہ قریب قریب سب کی سب ایسی ہیں جن کو ہم نے احیاناً کبھی کسی بحث کے ضمن میں، یا کسی سوال کے جواب میں

لکھ دیا ہے، بلکہ بعض باتیں تو ایسی نکال نکال کر لائی جا رہی ہیں جو برسوں سے ترجمان القرآن کے پرانے فائ
میں پڑی تھیں اور خود ہمیں بھی یاد نہیں کہ وہ ہمارے قلم سے نکلی ہیں۔ ان میں شاید کوئی ایک چیز بھی ایسی نہ
جس کی ہم نے خاص طور پر تبلیغ کی ہو، یا جس کے ماننے کی لوگوں کو دعوت دی ہو، یا جس کو ہم نے بار بار
ہو۔ لیکن ہمارے یہ مخالف علماء اپنے فتووں اور مضامین اور اشتہارات میں ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں
ہمارا اوڑھنا بچھونا یہی مسائل ہیں، انہی کے ذکر و بیان میں ہم نے اپنی عمر کھپائی ہے اور انہی کو پھیلانے
ہم رات دن لگے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس جن خیالات کو پھیلانے کی فی الواقع ہم برسوں سے کوشش
رہے ہیں، جن چیزوں کو ہم نے بار بار لکھا اور کہا ہے، جن باتوں کو ماننے کی دنیا بھر کو دعوت دی ہے
چیز کو قائم کرنے کی سعی میں ایک مدتِ دراز سے ہم اپنی جان کھپا رہے ہیں، اور جن چیزوں کو مٹانے
لئے ہم نے اپنا سارا زور صرف کر دیا ہے، ان کا یا تو سرے سے ان حضرات کی تحریروں میں کہیں ذکر
نہیں ہے، یا کبھی کبھار کسی نے "ہنرش نیز بگو" کی شرط پوری کرنے کے لئے اُن کا ذکر کیا بھی ہے تو بس ا
اُچٹتا ہوا اشارہ کر دیا ہے۔ کیا ان حضرات میں سے کوئی صاحب ذرا سی تکلیف فرما کر ہمیں بتائیں گے
اس انتخاب میں کیا حکمت پیشِ نظر ہے؟ قرآن سے جو اصول ہم نے سمجھا ہے وہ تو یہ ہے کہ آدمی
اُن کاموں سے جانچا جاتا ہے جن کی اسے زیادہ فکر ہو اور جن میں وہ اکثر مشغول رہے۔ یہ غالب فکر
اکثری مشغولیت اگر حق ہو تو کبھی کبھار کے غلط کام بلا توبہ بھی معاف ہو سکتے ہیں کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْ
السَّیِّئَاتِ۔ مگر یہ عجیب ماجرا ہے کہ ہمارے دورِ حاضر کے بزرگانِ دین ایک گروہ کے وقتی اور احیا
عارضی کاموں کو اس مقصد کے لئے چُنتے اور پکڑتے پھرتے ہیں کہ اس کی مستقل دعوت اور اس کے شب
کے مشغلے اور اس کی غالب فکر پر اُن کے ذریعے سے پانی پھیر دیں۔ یہ حرکتیں دیکھ کر دل بے اختیار اللہ
کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے آخرت کی عدالت کے جملہ اختیارات اپنے ہی ہاتھ میں رکھے۔ اگر خدانخو
کچھ بھی اختیار ان حضرات کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہوتا تو نہ معلوم یہ کن ترازوؤں سے خلق خدا کو تو
کیسی کیسی چھوٹی باتوں پر لوگوں کے عمر بھر کے اعمال حبط کر دیتے۔

ان حضرات کی خاص کوشش یہ ہے کہ اُن باتوں کو کسی نہ کسی طرح ہمارے سر منڈھیں جن سے

خلاف عوام کے جذبات بھڑک سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جماعت اسلامی والے عام مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں، اپنے
سوا سب کو کافر سمجھتے ہیں، گناہِ کبیرہ کے ارتکاب پر سلبِ ایمان کا حکم لگاتے ہیں، صحابہ کرام کی توہین کرتے
ہیں، بزرگانِ دین اور خصوصاً اکابر صوفیہ کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کا امیر مجدّد اور مہدی ہونے کا مدعی ہے اور
آگے کچھ اور بنایا جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان الزامات کے ثبوت فراہم کرنے میں جیسی کچھ محنت کی جا رہی ہے
اور جس جانفشانی کے ساتھ ہزاروں صفحات کے مضامین میں سے لفظ لفظ چن کر ہمارے خیالات کا ایک
ایسا مجموعہ تیار کیا جا رہا ہے جو خود ہمارے علم میں بھی پہلی مرتبہ انہی حضرات کے واسطے سے آیا ہے، وہ
چاہے کسی اور کی نگاہ سے مخفی ہو، مگر ہماری نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہم اس کمالِ فن کی داد تو ضرور دیتے
ہیں کیونکہ ہم ہر کمالِ فن کے قدر شناس ہیں، خواہ وہ نقب زنی و جیب تراشی کا ہی کمال کیوں نہ ہو۔ مگر معلوم
صرف یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اپنی دنیا اور عاقبت سنوارنے کی فکر چھوڑ کر آخر اس کام میں یہ عرق ریزی کس لئے
کی جا رہی ہے؟ اور یہ اصول قرآن، حدیث یا طریقِ سلف میں کہاں سے اخذ کیا گیا ہے کہ تم ضرور ڈھونڈ
ڈھونڈ کر لوگوں کو مطعون کرنے کے وجوہ تلاش کرو اور پھر بھی کام نہ چلے تو اپنی طرف سے گھڑ گھڑ کر فردِ جرم مکمل کرو؟

(۵)

ایک اور بات جو ہمارے لئے اس سے کچھ کم حیران کن نہیں ہے وہ ہمارے معاصرین میں بعض اکابر
کے نقطۂ نظر کا تغیر ہے جو پچھلے چند برس میں رونما ہوا ہے، حالانکہ ہمارے خیالات برسوں پہلے جو کچھ تھے
وہی آج ہیں، اور ہماری وہ تحریریں جن پر آج ہم ضالّ اور مُضلّ، بلکہ بدبخت اور خبیث تک ٹھہرائے جا رہے ہیں،
اس وقت سے بہت پہلے شائع ہو چکی تھیں جبکہ ان بزرگوں کی نگاہ میں ہم کم از کم ضالّ اور مُضلّ تو نہ تھے۔
۱۹۴۳ء کے آغاز میں انجمن اصلاح القریٰ۔ ریداہ آباد، ضلع ڈول پور سے جناب مولانا کفایت اللہ
صاحب کی خدمت میں ہمارے متعلق ایک استفسار بھیجا گیا تھا۔ اس کا جو جواب مولانا کی طرف سے
موصول ہوا اس کے الفاظ یہ تھے:۔

"مودودی صاحب کی تحریرات بیشتر صحیح ہیں اور ان کی تحریک میں نظری طور پر کوئی غلطی
اور گمراہی نہیں ہے۔ صرف یہ بات محلِ غور ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس تحریک کے مفید ہونے

ہونے کے لئے ظروف مساعد ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ محرک صاحب حال ہے یا صرف صاحب قال
ایک اور صاحب نے ضلع بارہ بنکی سے اُسی زمانہ میں مولانا کی خدمت میں جماعت اسلامی
متعلق ایک سوال بھیجا تھا جس کا یہ جواب آیا تھا :۔

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا نظریہ اصولاً تو صحیح ہے مگر آج کل عملی نہیں ہے جیسے کوئی کہے
کہ حدود شرعیہ جاری ہونی چاہئیں یہ بات اصولاً تو صحیح ہے مگر اس زمانہ میں قطع ید سارق پر اور رجم
زانی پر جاری کرنا عملاً ممکن نہیں ہے کیونکہ غیر اسلامی حکومت حائل ہے۔ تاہم اگر کوئی انکی جماعت
میں داخل ہو کر حسب استطاعت اسلامی خدمت کرے تو مضائقہ نہیں ہے"
آج وہی مولانا کفایت اللہ صاحب ایک دوسرا فتویٰ صادر فرماتے ہیں جو سہارنپور کے شائع
ایک اشتہار میں یوں درج ہے :۔

"مودودی جماعت کے افسر مولوی ابوالاعلیٰ مودودی کو میں جانتا ہوں۔ وہ کسی معتبر اور
مستند علیہ عالم کے شاگرد اور فیض یافتہ نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کی نظر اپنے مطالعہ کی وسعت کے لحاظ
سے وسیع ہے، تاہم دینی رجحان ضعیف ہے، اجتہادی شان نمایاں ہے، اور اسی وجہ سے ان
کے مضامین میں بڑے بڑے علماء اعلام بلکہ صحابہ کرام پر بھی اعتراضات ہیں۔ اس لئے مسلمانوں
کو اس تحریک سے علیحدہ رہنا چاہئے اور ان سے میل جول، ربط و اتحاد نہ رکھنا چاہئے۔ ان
کے مضامین بظاہر دلکش اور اچھے معلوم ہوتے ہیں، مگر ان میں ہی وہ باتیں دل میں بیٹھتی جاتی
ہیں جو طبیعت کو آزاد کر دیتی ہیں اور بزرگان اسلام سے بدظن بنا دیتی ہیں"
اسی ۱۹۴۵ء کے آخری مہینوں میں مولانا حسین احمد صاحب سے جماعت اسلامی کی دعوت
متعلق سوال کیا گیا تھا اور اس کا جواب انہوں نے یہ دیا تھا :۔

"مولانا مودودی کا نظریہ بہت سی تحریروں میں اور رسالوں وغیرہ میں شائع ہوتا رہا ہے
مجھ کو اس قدر فرصت نہیں ہے کہ بالاستیعاب دیکھوں۔ جس قدر مضامین نظر سے گزرے ہیں
حالات موجودہ میں ناممکن العمل ہیں، واللہ اعلم

میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ موجودہ دَور میں اور اس ماحول میں کیا شرعی تکلیف ہم پر ان امور پر حسب تصریحات عائد ہوتی ہے یا نہیں "۔

ایک اور صاحب نے جو اُس وقت فیروز پور جھرکہ میں نائب تحصیلدار تھے، جماعت کی تمام مطبوعات مولانا کو بھیجی تھیں اور ان سے درخواست کی تھی کہ انہیں ملاحظہ فرما کر یہ بتائیں کہ جمعیت علماء ہند کے مسلک اور جماعت اسلامی کی دعوت میں سے کون حق پر ہے۔ نیز خصوصیت کے ساتھ "ایک اہم استفتا" کی طرف توجہ دلا کر پوچھا تھا کہ اس پمفلٹ کو پڑھ کر میرا دل اپنی ملازمت سے اچاٹ ہو گیا ہے، آپ مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔ اس کا جو جواب حسین آباد ضلع مظفر نگر سے مولانا کے اپنے قلم کا لکھا ہوا (مورخہ ۳۰ ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ) وصول ہوا اس کے الفاظ یہ تھے :-

"محترما، میں اس قدر مصروف اور عدیم الفرصت ہوں کہ روزانہ ڈاک کا دیکھ لینا بھی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ کتابوں کا دیکھنا اور جواب لکھنا۔ مودودی صاحب فارغ ہیں، جو چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں چھپوا دیتے ہیں۔ جمعیت العلماء نے جو طریقہ سیاسیات میں اختیار کیا ہے وہ حسب استطاعت اَہْوَنُ الْبَلِیَّتَیْن کی بنا پر ہے۔ موجودہ گردوپیش میں جو طاقت اور قدرت موجود ہے اسی پر اس کی حرکت و سکون کا مدار ہے۔ مودودی صاحب جو فلسفہ پیش فرما رہے ہیں اس کے دیکھنے اور اس پر تنقید و تبصرہ کرنے یا اس کا جواب لکھنے کی ضرورت ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور اگر آتی بھی تو مہلت نہیں ہے۔ مودودی صاحب اور ان کے موافقین اپنے عمل کو حرکت میں لائیں۔ ہم ان کا مقابلہ نہ کریں گے اور نہ کوئی محاذ قائم کریں گے۔ اگر ہماری سمجھ میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے وہی عمل شرعی اور مفید سمجھ میں آیا تو ہم بھی متبع بن جائیں گے ورنہ حسب قاعدۂ قرآنیہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا ہم معذور ہیں۔

دوسری چیز آپ نے اپنی ملازمت کے متعلق پوچھی ہے۔ میں جہاں تک سمجھا ہوں آپ کو جبکہ دوسرا طریقہ اکل حلال میسر ہے تو آپ کو اس ملازمت کو چھوڑ ہی دینا چاہئے اگرچہ وہ "اہم استفتا" میری نظر سے نہیں گزرا مگر جو مضمون آپ نے اس کا ذکر فرمایا ہے اقرب الی الحق

ہے۔ آپ کے احباب کا حکم میری سمجھ میں نہیں آتا اگرچہ وہ علماء ہیں۔"

آج ٹھیک پانچ برس بعد ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ میں وہی مولانا حسین احمد صاحب ہمارے متعلق رائے کا اظہار فرماتے ہیں جو اس مضمون کے آغاز میں نقل کی جا چکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس انق رائے اور اس تغیرِ فکر و نظر کی علت کیا ہے؟ اگر اُس وقت سے اب تک کچھ نئی گمراہیاں ہم سے ہو گئی ہیں جن سے اُس وقت تک ہمارا دامن پاک تھا، تو انہا عنایت فرمائیں اس سے آگاہ یا اگر اب اِن حضرات کو اُن کتابوں کے پڑھنے کی فرصت مل گئی ہے جنہیں اُس وقت نہ پڑھا تھا، اور ان کا مطالعہ فرما کر وہ ہماری گمراہیوں پر آج مطلع ہوئے ہیں، تو کم از کم یہی بات بصراحت ارشاد فر جائے۔ اور اگر بات یہ نہیں ہے بلکہ یہ سارے فتوے اور مضامین اب اس لئے لکھنے شروع جماعت اسلامی کی بڑھتی ہوئی تحریک سے اپنے حلقۂ اثر کے آدمیوں کے ٹوٹنے کا اندیشہ ان بزرگ لاحق ہو گیا ہے، اور ساری فکر نہیں اب ان ٹوٹنے والوں کو روکنے کی ہے — وہی فکر جس اشتراکیوں، مسلم لیگیوں، بریلویوں، قادیانیوں، اہلِ حدیث اور منکرین حدیث کو ہماری مخالفت پر لگا رکھا ہے — تو گستاخی معاف، یہ اندازِ فکر اہلِ حق کو زیب نہیں دیتا اور نہ یہ ہتھکنڈے ان کے شایاں ہیں۔ یہ تو دوکانداروں کے سوچنے کا انداز ہے کہ مقابل کی دوکان اُن کے گاہکوں اور اسا توڑنے نہ پائے، اور شاید کوئی شریف دوکاندار بھی، اگر تھوڑی سی خدا ترسی اُس میں ہو، اس ح کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا کہ محض گاہک بچانے کے لئے حریف دوکاندار کے مال میں کیڑے ڈا بہرحال اپنی پوزیشن مشخص کرنا اِن حضرات کا اپنا کام ہے۔ رہے ہم، تو الحمد للہ کہ ہم دوکاندا کسی کے حریفِ تجارت ہیں۔ جس چیز کو ہم نے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ سے حق پایا ہے خلق اللہ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ جسے حق معلوم ہو، قبول کرے، اس کا اپنا بھلا ہے۔ جسے معلوم ہو، رد کر دے، اس کا معاملہ اُس کے خدا سے ہے۔ ساری دنیا اسے قبول کر لے تو بجز آ نصیحت کے ہمیں کوئی اجر اس سے مطلوب نہیں۔ اور اگر ساری دنیا اسے رد کر دے تو ہمارا کوئی نقصان نہیں۔

(۶)

آخر میں ہم تمام اُن علماء سے جو اپنے آپ کو اہلِ حق میں سے سمجھتے ہوں، اور جن کو فی الواقع دنیا کے ساتھ آخرت کی بھی کچھ فکر ہو، تین باتیں صاف صاف کہہ دینا چاہتے ہیں۔

اوّل یہ کہ ہم اس وقت فسق و ضلالت کی اُس حکمرانی کو مٹانے کے درپے ہیں جو علوم و افکار پر، اخلاق و معاشرت پر، تہذیب و تمدن پر اور معیشت و سیاست پر قائم ہے، اور ہماری تمام کوششیں اس کام کے لئے وقف ہیں کہ زندگی کے ان تمام شعبوں پر خدا کے دین کی حکمرانی قائم ہو۔ آپ حضرات اگر کچھ بھی تو سّم کی صلاحیت رکھتے ہیں تو کھلے کھلے آثار آپ کو یہ بتا سکتے ہیں کہ دین کی حمایت میں اس وقت وہ کونسی مستعد اور منظم طاقت ہے جس کو فسق و ضلالت کی ساری طاقتیں اپنا اصلی حریف سمجھ رہی ہیں اور کس کے خلاف انہوں نے اپنا پورا زور لگا رکھا ہے۔ اشتراکیوں سے پوچھئے کہ علماء کے پورے گروہ کو آپ اپنے لیے زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں یا جماعت اسلامی کو؟ منکرینِ حدیث کی اپنی تحریروں میں دیکھ لیجئے کہ اہلِ حدیث اور دوسرے تمام حامیانِ حدیث کے خلاف اُن کا غصہ زیادہ بھڑکا ہوا ہے یا جماعت اسلامی کے خلاف؟ قادیانیوں کے اپنے اخبارات و رسائل آپ کو بتا دیں گے کہ اِن کو جماعت اسلامی کا زیادہ خوف لاحق ہے یا اپنے دوسرے مخالفین کا؟ مغربیت کے علمبرداروں کی تحریریں اور تقریریں اور عملی تدبیریں آپ کے سامنے خود شہادت دیں گی کہ وہ زیادہ پریشان جماعت اسلامی سے ہیں یا باقی ماندہ پورے مذہبی طبقے سے؟ اس حالت میں جبکہ اِن طاقتوں سے ہماری کشمکش برپا ہے، آپ کو خوب سوچ لینا چاہئے کہ آپ کا وزن کس پلڑے کی طرف جا رہا ہے۔ آپ لڑنا چاہیں تو شوق سے لڑیں۔ مگر اپنا انجام سوچ لیں۔ اگر خدا کے ہاں آپ سے بازپرس ہوئی اور پوچھا گیا کہ جب طاعت اور فسق، اور ہدایت اور ضلالت کے درمیان معرکہ برپا تھا تو تم نے کس کو کس پر ترجیح دی تھی، اس وقت آپ کیا جواب دیں گے؟ اس وقت آپ اپنے یہ فتوے اور یہ مضامین اور یہ اعتراضات حجت میں پیش کر کے بچ نکلنے کی توقع رکھتے ہوں، اور آپ کو اُمید ہو کہ ہماری خطائیں اور لغزشیں گنا کر آپ ثابت کر سکیں گے کہ اس معرکہ کے فریقین میں دراصل گُشتنی و گردن زدنی ہم ہی تھے، تو بسم اللہ، اپنی یہ مہم جاری رکھیے

اور کچھ کسر ابھی باقی رہ گئی ہو تو اسے بھی پورا کر ڈالیے

دوم یہ کہ اگر فی الحقیقت آپ میں سے کوئی نفسانیت کی بنا پر نہیں بلکہ حقانیت کی بنا پر ہم سے ناراض ہے تو اس کو چاہئے کہ زبان کھولنے سے پہلے ان باتوں کے ساتھ ہمارے ذخیرہ کا مطالعہ کر کے اس معاملہ میں ایک جچی تلی رائے قائم کرے کہ آیا ہماری حیثیت ایک ایسے گروہ کی ہے جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، یا ایسے گروہ کی جس کی مخالفت بھی کرنی ضروری ہے، یا ایسے گروہ کی جو معرکہ کے فریقین میں سے اس بات کے لئے احق ہے کہ آپ اس کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں؟ جو وقت کشمکش برپا ہے اور یہ ایک قطعی فیصلہ پر پہنچے بغیر ختم ہونے والی نہیں ہے، اس لئے آپ کو متنفر مسائل پر اپنی اعتراضی تقریریں مرتب کرنے سے پہلے یہ طے کرنا ہو گا کہ آیا اپنی تمام کردہ وناکردہ خطاؤں کے باوجود ہم اُن لوگوں کی بہ نسبت آپ حضرات کے لئے زیادہ قابلِ برداشت ہیں جو یہاں فسق و ضلالت پھیلا رہے ہیں، یا ہم ایسے ناقابلِ برداشت ہو چکے ہیں کہ ہمارے مقابلہ میں اشتراکی، ملحد، منکرینِ حدیث، اور فرنگیت کے علمبردار، سب کو آپ برداشت کر سکتے ہیں؟

سوم یہ کہ ہمارا ہمیشہ سے یہ اعلان ہے اور آج بھی ہم اس پر قائم ہیں کہ ہماری جس بات کو خدا کی کتاب اس کے رسول کی سنت کے خلاف ثابت کر دیا جائے ہم بلا تامل اس سے رجوع کر لیں گے۔ اب اگر اختلاف رکھنے والے حضرات محض فتنہ پردازی نہیں چاہتے بلکہ اختلافات کا تصفیہ چاہتے ہیں تو ان کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے کہ اشتہار بازی کریں یا مخالفانہ پراپیگنڈے پر اتر آئیں، بلکہ صحیح راستہ یہ ہے اور کھلا ہوا ہے کہ انہیں ہم پر جتنے بھی اعتراضات ہوں وہ انہیں یک جا مرتب کر کے ہمارے پاس بھیج دیں، ہم انشاء اللہ ان کی تحریر کو ان صفحات میں لفظ بلفظ درج کر دیں گے اور اپنے جوابات سے ان کا ازالہ کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ یا اگر وہ خود اپنے ہی کسی اخبار اور رسالے میں اپنے اعتراضات شائع کرنا پسند فرمائیں تو ہم اس شرط کے ساتھ ان کا جواب دینے کے لئے تیار ہیں کہ اول تو وہ آئندہ دل آزار طعنہ زنی بند کر کے اپنے جملہ اعتراضات بیک وقت مرتب فرما دیں، دوسرے یہ کہ وہ اس بات پر راضی ہوں کہ جس طرح ہم ان کے اعتراضات کو لفظ بلفظ نقل کر کے ان کا جواب دیں گے

بھی ہمارے جواب کو اپنے ہاں لفظ بلفظ نقل کرکے پھر جو چاہیں اس پر خامہ فرسائی کریں۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۰۳)

اس دور کو اہل تاریخ نے "پُرانک دور" کا نام دیا ہے جس میں وید اور گوتم بدھ کی تعلیم کے بجائے پُرانوں کی تعلیم پر عمل شروع ہوگیا تھا۔ یہ دور بدھ ازم کے دورِ تنزل سے مسلمانوں کے داخلۂ ہند تک جاری رہا، مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ دور قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک دور تھا، اس عہد میں بت پرستی اوج کمال کو پہنچ گئی۔ مندر اور عبادت گاہیں زنا وفحش کاری کے اڈے بن گئیں اور مندروں کے پجاری ایسے اخلاق سوز اعمال کا ارتکاب کرنے لگے کہ ان کے تصور ہی سے انسانی روح کانپ اٹھتی ہے۔ غرض ہندوستان میں ہندوؤں کی دینی اور اخلاقی حالت بھی اس انتہائی حالت کو پہنچ گئی تھی کہ اس کی اصلاح کی کوئی توقع نہ رہی تھی۔

(باقی)

ایک تنبیہ

ایک فاضل دوست نے متنبہ کیا ہے کہ ترجمان کے پچھلے شمارہ کے ص ۳۴۹ پر "اراذلنا بادی الرائے" کا ترجمہ "حقیر اور رائے سے کورے" کیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یہ تنبیہ بالکل درست ہے اور میں اس کے لئے شکر گذار ہوں۔ لیکن میں نے یہ ترجمہ نہیں کیا تھا بلکہ حکیم عبدالرشید محمود صاحب نے ہم لوگوں کیلئے "رائے سے کورے" کا جو لفظ استعمال کیا تھا میں نے "بادی الرائے" کے لفظ کے اندر اس کی جھلک دکھائی تھی کہ یہ دونوں الفاظ ایک ہی قسم کے ذہن سے تراوش ہوتے ہیں اور معاملہ کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے حکیم صاحب قبلہ کے الفاظ واوین کے اندر کر دیئے تھے تاکہ ناظرین پر واضح ہوسکے کہ

ایں دو شمع اندکہ از یک گر افروختہ اند

امید ہے اس سے کسی صاحب کو غلط فہمی نہیں ہوگی

امین احسن (اصلاحی)

رسائل و مسائل

قانونِ حجاب کے لحاظ سے برقع کا جواز و عدم جواز

سوال:

احقر ایک مدت سے ذہنی اور قلبی طور پر آپ کی تحریک اقامتِ دین سے وابستہ ہے۔ پردہ کے مسئلہ پر آپ کے افکارِ عالیہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ لیکن آخر میں آپ نے مروجہ برقع کو بھی Defend کیا ہے۔ اس کے متعلق دو ایک باتیں دل میں کھٹکتی ہیں۔ براہ مہربانی ان پر روشنی ڈال کر مشکور فرمائیں:

پردے کی غایت صنفی میلان کی انتشار پسندی کو روکنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ میلان ہر دو اصناف میں پایا جاتا ہے (گو دونوں میں فرق کی نوعیت سے انکار نہیں) اسی وجہ سے پردے کی اصل روح — غضِ بصر — کا حکم مرد اور عورت دونوں کے لئے ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ برقع کی "دیوار" کے پیچھے عورتوں کی بہت بڑی اکثریت "نگاہ کے زنا" کی مرتکب ہوتی رہتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہ ہوتی ہے کہ ہم تو مردوں کو دیکھ رہی ہیں لیکن مرد ہمیں نہیں دیکھ رہے اور Satisfaction: ہماری اس "نظارہ بازی" کا علم ہی کسی کو ہے۔ سو اس طرح کی خواتین میں جوہرِ حیا — صنفِ نازک کا اصل جوہر — بہت کم ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں برقع اوڑھ کر ایک اوسط معاشی وسائل کے کنبہ کی عورتیں اپنے کام کاج بھی ملحقہ انجام نہیں دے سکتیں۔ سفر ہی کو لیجئے، گاڑیوں اور بسوں وغیرہ میں چڑھنا اور اترنا برقع پوش عورت کے لئے خطرہ سے خالی نہیں ہوتا۔

پردہ — "مکمل پردہ" — کی اہمیت و معقولیت سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ مروجہ برقع کے بجائے وہ کوئی موزوں تر طریقہ استعمال ہو۔ مثال کے طور پر آج

سے چند سال پیشتر تک دیہات کی شریف عورتیں خود کو ایک چادر میں مستور کرتی تھیں۔ چادر میں وہ یہ جرأت نہ کر سکتی تھیں کہ کسی مرد کو مسلسل دیکھیں اور ان کی آنکھوں میں شرم و حیا کا بہت اعلیٰ مظاہرہ ہوتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ برقع کی نسبت اس چادر میں بہت اچھی طرح پردہ ہوتا تھا۔

آپ کی مصروفیات کے علم کے باوجود آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔

جواب:

آپ نے اپنے سوال میں کئی چیزوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ بہتر ہو کہ ایک ایک چیز کو آپ الگ الگ لیں اور پھر اس پر غور کر کے رائے قائم کریں۔ پہلی بات غور طلب یہ ہے کہ کیا غضِ بصر کی تلقین اور اخلاقی تربیت کے بغیر یہ ممکن ہے کہ کوئی عورت کسی غیر مرد کو گھورنے سے روکی جا سکے؟ آپ برقع کی نقاب پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ صرف مرد کو عورت پر نگاہ ڈالنے سے روکتی ہے، عورت کو اس ناجائز نظر بازی سے نہیں روکتی۔ مگر یہ عیب تو صرف نقاب میں نہیں ہے، چادر میں بھی ہے۔ شریعت اس کی اجازت دیتی ہے کہ عورت چادر سے منہ ڈھانک کر جب باہر نکلے تو اسے راستہ دیکھنے کے لئے کم از کم اتنی جگہ کھلی رکھنی چاہئے کہ اس کی آنکھ سامنے دیکھ سکے۔ پھر یہ عیب چلمن میں بھی ہے جو آپ دروازوں اور کھڑکیوں پر ڈالتے ہیں، بلکہ یہ عیب ہر اس چیز میں ہے جس سے کوئی عورت باہر جھانک سکتی ہو۔ آپ خود بتائیں کہ ان منافذ کو آپ کیسے روک سکتے ہیں؟ اور کیا فی الواقع شریعت کا بھی یہ مطالبہ ہے کہ ان سب منافذ کو بند کیا جائے؟

اسی کتاب پردہ میں میں نے وہ روایت نقل کی ہے جس میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو حبشیوں کے کھیل کا تماشہ دکھایا تھا۔ وہاں میں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مردوں کا عورتوں کو دیکھنا اور عورتوں کا مردوں کو دیکھنا نہ شرعاً بالکل یکساں ہے اور نہ نفسیات کے اعتبار سے ان کی حیثیت برابر ہے۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اگر برقع بجائے خود بھڑکیلا اور جاذبِ نظر نہ ہو، سادہ اور بے زینت ہو تو شرعاً اس پر کس اعتراض کی گنجائش ہے؟ کیا وہ شریعت کے کسی مطالبہ کو پورا نہیں کرتا؟ اگر کرتا ہے

تو ہمارے پاس اس کے ناجائز ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کے نزدیک دوسری چیز اس سے بہتر طریقہ پر شریعت کے منشا کو پورا کرتی ہو۔ ایسی کوئی چیز آپ کی نگاہ میں آپ اسے تجویز کر سکتے ہیں، مگر برقع کو ناجائز کہنا کسی طرح درست نہیں۔

برقع اوڑھ کر چلنے پھرنے اور بسوں وغیرہ پر چڑھنے کے سلسلے میں آپ جو مشکلات بیان کی ہیں وہ جواز و عدم جواز کی بحث سے غیر متعلق ہیں۔ آپ کے نزدیک چادر میں اس سے کم مشکلات یا کسی قسم کی مشکلات نہیں ہیں تو خواتین کو اس کی طرف توجہ دلائیں، وہ تجربہ سے اُسے مناسب پائیں تو بخوشی اسے اختیار کریں گی۔

اسلام کے قانون اراضی پر چند سوالات

سوال:

ایک مقامی عالم نے جماعت کا منشور پڑھ کر دو سوالات کئے ہیں۔ ان کا جواب عنایت فرمایا جائے:

۱۔ زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں جاگیروں کی واپسی میں واجبی حدود سے زائد واپس لینے کی دلیل بیان فرمائیں، جبکہ حضرت زبیرؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے اور چابک کی حد تک کی زمین دی تھی۔

۲۔ بے دخلی مزارعین کے سلسلہ میں یہ تو واضح ہے کہ فصل کی برداشت سے پہلے بے دخلی نہیں ہوسکتی لیکن اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ بے دخلی روکی جائے۔ اگر کوئی اور صورت ہو تو مع دلیل بیان کریں۔

ایک دوسرے عالم نے یہ سوال بھی کیا ہے کہ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کی نعمتوں سے ہر شخص و بشر کو منتفع ہونا چاہئے۔ اب انتفاع عامہ کے لئے اگر ملکیتوں کو نظام حکومت کے سپرد کر دیا جائے تو یہ قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہے۔

جواب:-

۱۔ پہلے سوال کے سلسلے میں یہ بات اصولی طور پر جان لینی چاہیے کہ حکومت کی عطا کردہ جاگیروں پر جاگیرداروں کے حقوق ملکیت اس طرح قائم نہیں ہو جاتے جس طرح کسی شخص کو اپنی زر خرید یا ملکیت موروثی ملکیتوں پر حاصل ہوتے ہیں۔ جاگیروں کے معاملہ میں حکومت کو ہر وقت نظرثانی کرنے کا حق حاصل ہے، اور کسی عطیہ کو نامناسب پاکر حکومت منسوخ بھی کر سکتی ہے اور اس میں ترمیم بھی کر سکتی ہے۔

اس کی کئی نظیریں احادیث و آثار میں موجود ہیں۔ ابیض بن حمّال بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مآرب میں ایک ایسی زمین دی جس سے نمک نکلتا تھا۔ بعد میں جب لوگوں نے حضورؐ کو توجہ دلائی کہ وہ تو نمک کی بڑی کان ہے تو آپؐ نے اسے اجتماعی مفاد کے خلاف پاکر اپنا عطیہ منسوخ فرما دیا۔ اس سے صرف یہی بات معلوم نہیں ہوتی کہ سرکاری عطایا پر نظرثانی کی جا سکتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کو حدِ اعتدال سے زیادہ دے دینا اجتماعی مفاد کے خلاف ہے، اور اگر ایسا عطیہ دیا جا چکا ہو تو اس پر نظرثانی کرنی چاہیے۔ یہی بات اس روایت سے معلوم ہوتی ہے جس میں ذکر آتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت طلحہؓ کو ایک زمین کے عطیہ کا فرمان لکھ دیا اور فرمایا کہ اس پر فلاں فلاں اصحاب کی شہادت ثبت کرا لو جن میں سے ایک حضرت عمرؓ بھی تھے۔ جب حضرت طلحہؓ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے تو آپؓ نے اس پر اپنی مہر لگانے سے انکار کر دیا اور کہا "أھذا کلہ لک دون الناس؟" کیا اتنی ساری زمین دوسروں کو چھوڑ کر تنہا تم اکیلے کو دے دی جائے؟ (ملاحظہ ہو کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۷۵-۷۶)

رہا حضرت زبیرؓ کا معاملہ، تو جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ زمین ان کو دی ہے اس وقت بے حساب زمینیں غیر آباد پڑی تھیں اور حضورؐ کے سامنے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کسی طرح ان کو آباد کیا جائے، اسی لئے آپؐ نے اس زمانہ میں بکثرت لوگوں کو افتادہ اراضی کے بڑے بڑے رقبے عطا فرمائے تھے۔

۲۔ بیع وقف کے متعلق حکومت ایسا قانون بنانے کی مجاز ہے کہ کوئی مالک کسی مزارع کو معقول

وجہ کے بغیر بے دخل نہ کر سکے۔ اس کے ناجائز ہونے کی دلیل کیا ہے؟ اگر کوئی نص اسمیں مانع نہیں ہے تو پھر یہ اجازت امام کے اُن اختیارات میں آپ سے آپ شامل ہے جو اسے لوگوں کے درمیان عدل قائم کرنے اور اجتماعی فتنوں کی روک تھام کرنے کے لئے مصالح عامہ کی خاطر دیئے گئے ہیں۔ اس وقت جبکہ ہماری آبادی کی بہت بڑی اکثریت کا مدارِ زندگی کلیتہً زمین پر ہے، مالکوں کو یہ کھلا ہوا حق دے دینا کسی طرح بھی مصلحتِ عامہ کے مطابق نہیں ہے کہ وہ جب جس کاشت کار کو چاہیں بلا معقول وجہ کے اپنی زمین سے بے دخل کر دیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کہیں کوئی کاشتکار اطمینان سے بیٹھ سکے اور لاکھوں زراعت پیشہ لوگوں کی زندگی ہر وقت معلق رہے۔

۳۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ عجیب وغریب نتیجہ جو اخذ کیا گیا ہے اس کے متعلق مجھے تو بڑی مسرت ہوگی کہ آخر قرآن کے کونسے مقامات اس کے ماخذ ہیں؟ احتیاطاً آپ میری کتاب مسئلہ ملکیتِ زمین کے پہلے دو باب ان عالم صاحب کی خدمت میں پیش فرما دیں تاکہ وہ اُن باتوں کو نہ دہرائیں جن کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے، یا اگر انہیں دہرائیں تو کم ازکم یہ بھی ساتھ ساتھ بتا دیں کہ میرے جواب کے کن پہلوؤں سے وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ اس طرح میرا وقت بھی بچ جائے گا اور اُن کا وقت بھی۔

دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں شادی بیاہ کے تعلقات

سوال:-

الجہاد فی الاسلام کے دوران مطالعہ میں ایک آیت والذین آمنوا ولم یہاجروا مالکم من ولایتھم من شیئٍ الخ نظر سے گذری۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ اس آیت میں آزاد مسلمانوں اور غلام مسلمانوں کے تعلقات کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ پہلے مالکم من ولایتھم من شیئٍ سے یہ بتایا گیا ہے کہ جو مسلمان دارالکفر میں رہنا قبول کریں یا رہنے پر مجبور ہوں ان سے دارالاسلام کے مسلمانوں کے تمدنی تعلقات نہیں رہ سکتے، نہ وہ باہم رشتے قائم کر سکتے ہیں اور نہ ایک دوسرے کا ورثہ پا سکتے

مل سکتا ہے۔"

اب عرض یہ ہے کہ ہندوستان و پاکستان "دارالکفر" اور "دارالاسلام" کی صورت میں دو ملک وجود میں آگئے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت بھی اظہر من الشمس ہے۔ ان کی ذہنیتیں بھی بڑی حد تک بدل چکی ہیں، غرضیکہ ان تمام لوازمات سے لیس ہو چکے ہیں جو ایک غلام قوم کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ بہتیرے رہنے پر مجبور ہیں اور بہت سے وہاں کی رہائش عمداً قبول کئے ہوئے ہیں بعض ہجرت کر کے اپنے دین و ناموس کی حفاظت کی خاطر پاکستان چلے آئے ہیں۔ ان میں اکثر ایسے بھی ہیں جن کے والدین ہندوستان ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں اور مرتے دم تک اس کو چھوڑنے پر تیار نہیں مگر اولاد پاکستان چلی آئی ہے اور اب ہندوستان کی سکونت اختیار کرنے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں۔

اندریں حالات حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:-

(۱) ایسی حالت میں اولاد، والدین یا کسی اور رشتہ دار کے ورثہ و ترکہ سے محروم رہے گی؟ اگر وہ ان کے انتقال پر اپنے حق وراثت کا دعویٰ کریں تو کس حد تک یہ دعویٰ جائز یا ناجائز ہوگا؟

(۲) موجودہ حالات کے پیش نظر کوئی پاکستانی (مہاجر یا اصلی باشندہ) ہندوستانی مسلمان لڑکی سے شادی کر سکتا ہے یا نہیں؟ کرنے کی صورت میں تعلقات جائز سمجھے جائیں گے یا ناجائز؟

جواب:

جہاں تک مجھے علم ہے قرآن کا منشا یہی ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت اور شادی بیاہ کے تعلقات نہ ہوں۔ رہا ان مہاجرین کا معاملہ جن کے ایسے رشتہ دار دارالکفر میں رہ گئے ہیں جن کے وہ وارث ہو سکتے ہیں تو [illegible] کے بارے میں بھی میرا خیال یہی ہے کہ نہ وہ ہندوستان میں اپنی میراث پا سکتے ہیں اور نہ ان کے ہندوستانی رشتہ دار پاکستان [illegible] ان سے میراث پانے کا حق رکھتے ہیں۔ نکاح کے بارے میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہجرت سے نکاح آپ ہی آپ تو نہیں ٹوٹ سکتا [illegible] اگر زوجین میں سے ایک دارالاسلام میں ہجرت کر آیا ہے اور دوسرا ہجرت پر تیار نہ ہو تو عدالت میں اس بنیاد پر درخواست دی [illegible] تی ہے اور ایسے زوجین کا نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے۔ آئندہ شادی بیاہ کا تعلق پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان نہ ہونا چاہیے

اصولِ دعوتِ اسلام | مؤلفہ: مولانا محمد طیب صاحب قاسمی، مہتمم دارالعلوم دیوبند (انڈیا)
شائع کردہ: ادارۂ دعوت الحق، غریب خانہ، گوشہ محل روڈ۔ حیدر آباد

قیمت: ایک روپیہ دو آنہ - جلد معمولی۔

فاضل مؤلف کے دینی علم و فضل سے کون متعارف نہ ہوگا۔ موصوف کا یہ رسالہ تبلیغ کی حقیقت اس کے مقتضیات اور اس کی حکمت پر خاصی روشنی ڈالتا ہے۔ بحث اپنے تمام ضروری پہلوؤں کے ساتھ مختلف عنوانات کے تحت مرتب کی گئی ہے۔ کتاب کے فکری پس منظر میں مولانا محمد الیاس مرحوم کی تبلیغی تحریک کارفرما ہے۔

مبلغ کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اس کا کلام تعریض و تلمیح سے پاک ہو (صفحہ ۵) اور یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ "بشرا ولا تنفرا ویسرا ولا تعسرا وتطاوعا ولا تختلفا"۔ مگر کیا فرماتے ہیں اس بارے میں کہ مبلغ کو تکفیر کے اختیارات کس حد تک حاصل ہیں؟ یہ چیز تو "ولا تنفرا" کی تعریف میں آتی نہیں ناں!

مولانائے محترم نے صاف گوئی سے کام لے کر یہ حقیقت فاش کر دی ہے کہ "آج کی مسلم دنیا کا ملکی نظام نہ صرف یہی کہ ترویج اسلام کا معین نہیں بلکہ اس کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ اور تبلیغ حق کے لئے ایک محکم سنگِ راہ ثابت ہو رہا ہے"۔ لیکن اس رکاوٹ کو ہٹانے میں کتنے "مبلغین" حصہ ادا کر رہے ہیں اور جو اس کام میں لگے ہیں ان کے ساتھ "مستند اربابِ دعوت و اصلاح" کا سلوک کیا ہے؟

بہرحال رسالہ بڑا قابلِ قدر ہے۔

شیلزمین | مؤلفہ: شیخ عبدالملک صاحب کرنالی شاپ ۳ انارکلی، لاہور
شائع کردہ: گوشۂ ادب لاہور۔

قیمت: مجلد مع گرد پوش تین روپے۔

کاروباری دنیا رہے اور منافع کے محور پر گھومنے کی وجہ سے "دل و دماغ" کے لحاظ سے بالعموم ویر
ی رہتی ہے۔ لیکن شیخ عبدالمالک صاحب نے زبردستی اپنے لئے "تشخص" کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ یہ نسخ مناسب
لکھی ہوئی ایک کتاب پہلے بھی ہمارے سامنے آئی تھی اور اب یہ دوسری فنی تالیف پیش نظر ہے۔ ہمارے
ن کے ہر سیلزمین کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئیے ۔۔۔ بلکہ شیخ صاحب کا دعوی تو یہ ہے کہ ہر شخص سیلزمین
وتا ہے اور کامیاب زندگی سیلزمین بنے بغیر کسی کے لئے ممکن نہیں۔
یہ بات کچھ اچھی نہیں معلوم ہوئی کہ ایک فنی تالیف میں "پروپگنڈے" کا عنصر نمایاں طور پر موجود ہے۔

...مۂ طیبہ کی حقیقت

مؤلفہ: جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی۔
شائع کردہ: مکتبۂ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ۔
قیمت: آٹھ آنے

مولانا الیاس مرحوم کی برپا کردہ دینی تحریک کا محور کلمہ طیبہ ہے۔ اس تحریک کے ایک اہم خادم
ے کلمۂ طیبہ کے مفہوم، اس کی روح اور حقیقت کے بارے میں یہ پمفلٹ علمی انداز سے مرتب فرمایا ہے
بادت و استعانت کے باہم لازم و ملزوم ہونے کی وضاحت بہت مفید ہے۔
البتہ یہ چیز کھٹکتی ہے کہ مولانا کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو مالک و حاکم ماننا توحید کا "ثانوی مطالبہ"
ے اور یہ مطالبہ "عبادت و استعانت" سے کچھ الگ سا ہے۔
توحید کے انسانی سیرت پر جو اعلیٰ اثرات رونما ہونے چاہئیں ان کو بھی مولانا نے بڑی خوبی
ے اجمالاً پیش کر دیا ہے۔
"توحید کامل کے مقام تک پہنچنے کا نصاب" یہ تجویز کیا گیا ہے کہ "اسی کلمہ لا الہ الا اللہ کے ذکر کی کثرت
جائے یعنی تسلسل اور تکرار کے ساتھ دل اور زبان ہم آہنگ ہو کر ادا کیا کریں" اور یہ کام کسی صاحب دل
خ کی تلقین اور نگرانی میں ہونا چاہیئے۔"

کلمہ کے دوسرے جزو "محمد الرسول اللہ" کی تشریح کرتے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ماننے کے تین تقاضے اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ اجمالاً حقیقتِ رسالت سامنے آجاتی ہے۔

ترجمان القرآن

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین میں مولانا نے ہر طرح کے سوالات کے جوابات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیدئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔ بہت جلد شائع ہو رہی ہے

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۱)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۳۴)	"
خلافیات	(۱۵)	"
عام مسائل	(۷)	"
معاشی مسائل	(۱۵)	"
سیاسی مسائل	(۱۰)	"

ترجمان القرآن

فہرست مضامین

جلد ۳۶ | رمضان سنہ ۱۳۷۰ھ ــــ مطابق ــــ جولائی سنہ ۱۹۵۱ء | عدد ۴

ابوالخیر [illegible] پریس [illegible] میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ہمارے لائحۂ عمل کا دوسرا بنیادی مقصد، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یہ ہے کہ عوام الناس کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح کی جائے تاکہ ہمارا معاشرہ جاہلیت کی بنیادوں سے ہٹ کر اسلام کی صالح بنیادوں پر قائم ہو اور اس قابل بن جائے کہ اس میں برائیاں دبیں اور بھلائیاں نشوونما پا سکیں۔ اس مقصد کے لیے جس پروگرام پر ہم کام کر رہے ہیں اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک شخص موجودہ معاشرے کے امراض کی اُس تشخیص کو اچھی طرح سمجھ لے جو ہم نے کی ہے۔ کیونکہ تشخیص کو سمجھے بغیر علاج کو سمجھنا مشکل ہے۔ نہ ہمارے اپنے کارکن تجویز علاج پر صحیح طریقہ سے عمل کر سکتے ہیں اگر وہ تشخیص مرض کو نہ سمجھیں، اور نہ ہمارے کام کو دیکھنے والے صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں اگر وہ یہ نہ جانیں کہ ہمارے نزدیک وہ مرض کیا ہے جس کا علاج ہم کرنا چاہتے ہیں۔

ہماری نگاہ میں اس وقت ہمارا معاشرہ تین مختلف عناصر پر مشتمل ہے۔

ایک وہ عنصر جو یا تو ذہنی طور پر اسلام سے منحرف ہے، یا اخلاقی حیثیت سے اسکی اطاعت و پیروی پر راضی نہیں ہے، یا جس کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں اصلی اور حقیقی اسلام اور پورا اسلام نافذ نہ ہونے پائے۔ یہ عنصر بہت سے چھوٹے بڑے گروہوں میں بٹا ہوا ہے۔

ان میں کچھ مخلص ملاحدہ ہیں جو سوچ سمجھ کر غیر اسلامی نظریات پر ایمان لائے ہیں، غیر اسلامی اقدار کو اپنا چکے ہیں، اپنے الحاد کا صاف صاف اظہار کرتے ہیں اور اسلام کے نام سے فریب نہیں دیتے۔ اگرچہ اتنی منافقت ان میں بھی پائی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے نام تبدیل نہیں کیے اور مسلم سوسائٹی سے اپنا ظاہری تعلق نہیں توڑا، تاہم یہی بسا غنیمت ہے کہ وہ اسلام کے علمبردار نہیں بنتے، بلکہ اُس کے منکرین بن کر سامنے آتے ہیں۔

کچھ دوسرے لوگ مکار ملاحدہ ہیں جن کے دل اور دماغ تو مخلص ملاحدہ ہی کی طرح اسلام سے منحرف

ہو چکے ہیں، مگر وہ اس کے علمبردار اور اس کو قائم کرنے کے مدعی بن کر اٹھتے ہیں تاکہ مسلمانوں کی قیادت و سیادت پر وہی فائز ہوں اور اقتدار کی باگیں انہی کے ہاتھ میں رہیں۔

کچھ اور لوگ نیم الحاد اور نیم اسلام کے مقام پر ہیں۔ اسلام سے بالکل انکار تو نہیں کرتے مگر قرآن و سنت کا خالص اسلام ان کے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ اس کے بجائے وہ اپنی مرضی کا ایک نیا اسلام تصنیف کر کے اسے حقیقی اسلام بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی قرآن سے کھیل رہا ہے، کوئی قرآن و حدیث دونوں کو تختۂ مشق بنا رہا ہے، کوئی ابوذر غفاریؓ کی آڑ لے رہا ہے، اور کسی کے ہاتھوں بیچارے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی شامت آ رہی ہے۔

کچھ اور لوگ ہیں جن کی اسلام سے بغاوت فکری و نظری بنیادوں پر نہیں بلکہ یا تو اخلاقی بنیادوں پر ہے یا معاشی بنیادوں پر۔ یہ ہمارے مترفین ہیں۔ ان کو یہ گوارا نہیں ہے کہ اسلام آکر ان کی خواہشاتِ نفس اور اُن کی آزادیوں پر حدود و قیود عائد کرے، ان کی حرام خوریوں کا خاتمہ کر دے، اور ان کے معاشی ظلم کا استیصال کر کے ان کی آمد و خرچ پر پہرے بٹھائے۔ اس گروہ کے لوگوں کو اسلام کبھی یاد آتا ہے تو صرف اُس وقت جب اشتراکی نظریات کی چوٹ ان کے مفاد پر پڑتی نظر آتی ہے۔ اس وقت وہ اسلام کو اپنے گھرانے کے پرانے خادم کی حیثیت سے پکارتے ہیں کہ آ اور اس غاصب کو مار کر بھگا دے۔ مگر عین اس فریاد کے وقت بھی وہ اپنی زندگی کے کسی دوسرے معاملہ میں اس "خاندانی ملازم" کو بولنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس باب میں اگر وہ ذرا سی لب کشائی بھی کر بیٹھے تو بیچارہ فوراً ملازم سے "ملّا ازم" بن کر رہ جاتا ہے۔

ایک اور گروہ مذہبی سوداگروں کا ہے جن کا سارا کاروبار ہی اس پر منحصر ہے کہ عام مسلمان اپنے دین سے جاہل رہیں، مشرکانہ اوہام میں مبتلا رہیں، خلق اور خالق کے درمیان ان کو بطور ایک مستقل واسطے کے تسلیم کریں، اور اپنی بے قید دنیوی زندگی کی کامیابیوں کے لئے، نیز ساری بے قیدیوں کے باوجود نجات کی گارنٹی حاصل کرنے کے لئے ان کی روحانی تائید اچھی قیمت پر خریدتے رہیں۔

ان سے بہت مختلف کچھ دوسرے مذہبی سوداگر بھی موجود ہیں جن کے لئے سب سے بڑا مسئلہ اپنی گدیوں اور چھوٹی چھوٹی مذہبی ریاستوں کی حفاظت کا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے جن اماموں اور اکابر کو الگ

سے حضرات میں پایا ہے یا خود اپنی محنت سے فراہم کیا ہے ان کو وہ ہر قیمت پر اپنے کاروبا
وابستہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اقامتِ دین کی کسی ہمہ گیر تحریک کو ۔۔۔ خواہ وہ کیسی ہی صحیح ،
تی ہو اور کتنی ہی سلامت روی کے ساتھ چلائی جا رہی ہو، اور خواہ ان کا اپنا علم اور ضمیر اس کے
کی شہادت دے رہا ہو ۔۔۔ برداشت کرنا ان کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے دیکھتے ہی ا
یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں ان کے اپنے حلقے ٹوٹ کر اس بڑے دائرے میں جذب نہ ہو جا
ان کی مرکزیت مجروح ہو کر نہ رہ جائے۔ ان میں سے اکثر "اہلِ دین" حضرات نے "اہلِ دنیا" سے ط
کی مصالحتیں کر رکھی ہیں، دین و دنیا کی تقسیم اور دین کے محدود تصور کو بڑے بڑے نظر فریب مذہ
سے ثابت کر رکھا ہے، اور ان دلائل کو بڑی بڑی پاکیزہ اور محترم مذہبی شخصیتوں کے ذاتی عمل
کر رکھا ہے۔ ان کے ہاں اب تک جس تخیل کو مقبولیت حاصل رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایک بہت
زندگی وہ ہے جسے اہلِ دنیا اپنے حسبِ منشا جس طرح چاہیں اور جن قوانین و ضوابط پر چاہیں چلاتے رہیں
مراسم بڑی عقیدت مندیوں کے ساتھ ادا کریں، مذہبی شخصیتوں کے آگے خراجِ عقیدت پیش کرتے رہیں
اداروں کی فیاضانہ سرپرستی کرتے رہیں، اور مذہب کے محدود دائرے میں اہلِ مذہب کی ریاست
رکھیں۔ اور اگر کہیں وہ ایک شیخ الاسلامی کا عہدہ قائم کر کے پرسنل لا کی حد تک قضا و افتاء کے ا
اور مذہبی اوقاف و مدارس کی نگرانی بھی ان کے حوالہ کر دیں تو بس یہ ایک آئیڈیل اسلامی ریاست
حضرات کے لئے اب یہ ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر دین کی وہ تعبیر و تفسیر صحیح ہے جس کی
دین و دنیا کی تقسیم کا ہر نظریہ غلط، کفر و فسق کی سیادت و قیادت سے ہر مصالحت غلط، اور پور
زندگی پر دین کا ہمہ گیر تسلط ناگزیر، تو اس کے بعد ان کے علم اور عمل کی کیا ساکھ باقی رہ جاتی ہے
اب تک اس تعبیر و تفسیر کے خلاف رہی ہے۔

ان مختلف گروہوں کے درمیان آپس میں بڑے اختلافات ہیں، اور ہم ان میں سے کسی
بھی بے انصافی نہیں کر سکتے کہ ان کے اختلافات کو بناوٹی قرار دیں۔ درحقیقت بڑے اختلا

ساتھ یہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی پر بھی یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ دین کے بارے میں اس کا نظریہ کسی دوسرے گروہ کے نظریہ سے متفق ہے۔ لیکن اس بات کو جاننے اور ماننے کے باوجود جس بنا پر ہم ان سب کو ملا کر ایک عنصر قرار دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب اقامت دین کی کوئی تحریک اٹھتی ہے تو یہ سارے گروہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک ہو جاتے ہیں۔ پچھلی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے اور آج کا تجربہ بھی یہی ظاہر کر رہا ہے۔ اس لئے تحریک اقامت دین کے نقطۂ نظر سے یہ سب ایک ہی عنصر قرار پاتے ہیں۔

تعداد کے لحاظ سے یہ عنصر بحیثیت مجموعی ہماری قوم کا ایک بہت ہی قلیل عنصر ہے، لیکن سیاسی طاقت اور معاشی وسائل، دونوں پر اس کا قبضہ ہے۔ عوام الناس کی بڑی تعداد اس کے پھندے میں پھنسی ہوئی ہے۔ اور جھوٹ کی اشاعت سے عوام کو فریب دینے کے بہت سے ہتھکنڈے اس کے پاس ہیں۔

ہمارا اس عنصر کے ساتھ دوگونہ معاملہ ہے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے، وہ سب ہمارے انسانی اور قومی بھائی ہیں۔ ہم ان کا شخصی احترام کرتے ہیں خواہ وہ ہمیں گالیوں ہی سے کیوں نہ نوازیں۔ ان کے ساتھ ہمارا کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے۔ بلکہ ہم دل سے ان کے خیر خواہ ہیں اور اپنی حد تک انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح ان کی اصلاحِ خیال ہو جائے اور اللہ تعالیٰ ان کا سینہ حق کے لئے کھول دے لیکن جہاں تک ان کے ایک ایسے عنصر کا تعلق ہے جو تحریک اقامت دین کی راہ روکنے والا ہے، ہماری ان سے جنگ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس عنصر کے بہت کم افراد کو بے لاگ حق پرستی کی توفیق نصیب ہوا کرتی ہے، اور وہ بھی اپنے نفس کے ساتھ جہاد اکبر کئے بغیر اس چیز کو اختیار نہیں کر سکتے۔ اس لئے نہ تو محض چند صالح بندے مل جانے کی امید پر اس عنصر کے ساتھ مداہنت برتی جا سکتی ہے، اور نہ کوئی ایسا شخص جو دین اللہ الخالص کے قیام کا خواہشمند ہو اس کے ساتھ مصالحت پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ درحقیقت اقامت دین کی راہ کا روڑا ہی عنصر ہے۔ اس کو ہٹانا، عوام الناس کو اس کے دباؤ اور اثر سے نکالنا، اور اقتدار کی مسندوں سے اس کو بے دخل کرنا ایک ایسا ناگزیر تخریبی کام ہے جس کے بغیر کوئی تعمیری و اصلاحی کام بارآور ہو

نہیں رکھتا۔

دوسرا عنصر اُن صالح لوگوں پر مشتمل ہے جو دین کو تھوڑا یا بہت جانتے ہیں، اور جس قدر بھی اسے جانتے ہیں اُس کو اخلاص کے ساتھ مانتے ہیں، اور ہر اُس چیز کی اطاعت و حمایت کے لئے تیار رہتے ہیں جو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی دلیل سے حق ثابت ہو جائے۔ یہ لوگ قوم کے ہر طبقے میں موجود ہیں۔ غریبوں میں بھی اور امیروں میں بھی۔ رعیت میں بھی اور حکام میں بھی۔ نئے تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی اور پرانے طرز کے علماء میں بھی۔ اگرچہ یہ بھی تعداد میں بہت کم ہیں، لیکن مایوس کن حد تک کم نہیں ہیں، بلکہ شاید ہم مبالغہ نہ کرینگے اگر یہ کہیں کہ اول الذکر عنصر سے اس دوسرے عنصر کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قوم کی اصل طاقت یہی لوگ ہیں اور یہاں اصلاح کی حقیقی امیدیں ہیں، انہی سے وابستہ ہیں، اپنی بد اعمالیوں کے باوجود اب تک اس قوم پر اللہ کی جو رحمتیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں ان کی وجہ یہی ہے کہ اس گئی گذری حالت میں بھی یہ بقیۃ القوم اس کے اندر معتد بہ تعداد میں موجود ہیں اور ان کے ہاتھوں خیر و صلاح کے قیام کے امکانات ہیں۔

اس گروہ میں مختلف قسم کی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے ناقص مطالعہ کی وجہ سے دین کے محدود تصور میں مبتلا ہیں اور وسیع و ہمہ گیر تصور کو اخذ کرنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں بعض جزئیات و کلیات کے فرق کو نہیں سمجھتے اور غیر اہم چیزوں کو اتنا اہم قرار دے بیٹھے ہیں کہ اصل اہمیت رکھنے والی چیزیں ان کی نگاہ میں کم وزن ہو گئی ہیں۔ بعض کا فہم دین تو صحیح ہے، مگر یا تو وہ اپنے فرض کو ابھی تک پوری طرح نہیں پہچانتے، یا ان کے اندر قوتِ عمل کی کمی ہے، یا اُن پر یاس کا غلبہ ہے، یا ان کو علم نہیں ہے کہ ان کے ملک میں اقامتِ دین کی کوئی سعی ہو رہی ہے، یا وہ سعی کرنے والوں کو ابھی شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، یا انہیں توقع ہے کہ محدود قسم کی صلاحی تدبیروں سے کام چل جائیگا۔

ہماری تمام تر کوشش یہ ہے کہ اس عنصر کی یہ ساری کمزوریاں دور ہوں، یہ بیدار ہو، منظم ہو، حرکت میں آئے، اور خواہ یہ ہمارے ساتھ ملے یا نہ ملے، بہرحال اقامتِ دین کی سعی میں ہم کو اس کا زیادہ سے

زیادہ تعاون حاصل ہو۔

تیسرا عنصر عوام پر مشتمل ہے۔ یہ ہماری قوم کا سوادِ اعظم ہے۔ ہماری کل آبادی کا ۹۰ فیصدی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ یہ لوگ اسلام سے گہری عقیدت اور مخلصانہ محبت رکھتے ہیں۔ اس کے نام پر جان و مال پہلے بھی قربان کرتے رہے ہیں اور آج بھی اس پر آمادہ ہیں۔ اسلام کے سوا کوئی چیز ان کو اپیل نہیں کرتی، اور جس چیز کو یہ جان لیں کہ یہ اسلام کے خلاف ہے، اُسے چاہے مجبوراً برداشت کر لیں دل سے کبھی گوارا نہیں کرتے۔ مگر ان غریبوں کو کئی روگ لگے ہوئے ہیں۔

سب سے بڑا اور بنیادی روگ یہ ہے کہ جس اسلام سے یہ عشق رکھتے ہیں اس کو جانتے نہیں ہیں۔ اس کی تفصیلات سے ہی نہیں، اس کے اصول و مبادی تک سے بے خبر ہیں۔ اسی لئے ہر ضال و مضل شخص اسلام کا لباس پہن کر ان کو بہکا سکتا ہے۔ ہر غلط عقیدہ اور غلط طریقہ اسلام کے نام سے ان کے اندر پھیلایا جا سکتا ہے۔

دوسرا بڑا روگ یہ ہے کہ ایک مدتِ دراز سے ان کی اخلاقی تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہوا ہے۔ یہ خودرَو درختوں کی طرح اُگتے اور پرورش پاتے رہے ہیں۔ اسلامی اخلاق تو درکنار، بنیادی انسانی اخلاقیات تک ان میں پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ پچھلے ڈیڑھ دو سو برس کے دورِ غلامی میں اخلاقی حیثیت سے یہ مسلسل پستی کی جانب بڑھتے رہے ہیں۔

اس پر مزید یہ کہ ان کی اپنی قوم کے اہلِ دماغ اور با اثر طبقوں نے (جن کو ہم نے پہلے عنصر میں شمار کیا ہے) انہیں اور بہت سے نئے روگ لگا دیئے ہیں۔ یہ غریب تعلیم کے لئے جدید درسگاہوں میں جاتے ہیں تو وہاں زیادہ تر مخلص اور مکار ملاحدہ، یا نیم مسلم و نیم ملحد حضرات سے ان کو پالا پڑتا ہے۔ قدیم مدارس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اکثر مذہبی سوداگروں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ دینی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو خطیبوں اور واعظوں کی عظیم اکثریت انہیں گمراہ کرتی ہے۔ روحانی تربیت کے طالب ہوتے ہیں تو پیروں کی غالب اکثریت ان کے لئے رہزن ثابت ہوتی ہے۔ دنیوی معلومات کے سرچشموں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اُن اخبارات اور رسائل سے ان کو سابقہ پیش آتا ہے جن کی بہت بڑی

اکثریت ہماری قوم کے سب سے زیادہ رذیل طبقہ کے ہاتھ میں ہے۔ قومی اور ملکی معاملات کی سربراہ کاری کے لئے لیڈر ڈھونڈتے ہیں تو وہ زیادہ تر ملاحدہ اور نیم ملاحدہ اور متفرنین کے گروہ سے نکلتے ہیں۔ اپنی معیشت کی تلاش میں رزق کے منبعوں کی طرف جاتے ہیں تو وہاں بیشتر ان لوگوں کو قابض پاتے ہیں جنہوں نے حرام وحلال کے امتیاز کو مستقل طور پر ختم کر رکھا ہے۔ غرض، ہماری قوم کے وہ طبقے جو دراصل ایک قوم کے دل اور دماغ ہوتے ہیں اور جن پر اُس کے بناؤ اور بگاڑ کا انحصار ہُوا کرتا ہے، اس وقت بدقسمتی سے ایک ایسا عنصر بنے ہوئے ہیں جو اسے بنانے کے بجائے بگاڑنے پر تُلا ہُوا ہے اور بناؤ کی ہر صحیح و کارگر تدبیر میں مزاحم ہے۔

موجودہ مسلم معاشرے کے عناصر ترکیبی کا یہ تجزیہ اور اس کے امراض کی یہ تشخیص اگر صحیح ہے، تو اب تجویز علاج پر غور کیجئے۔ ہمارے نزدیک علاج کی کوئی صورت بجز اس کے نہیں ہے کہ

عنصر دوم کو جہاں تک ممکن ہو قوم کے تمام طبقوں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا جائے، ان کی ذہنی واخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے کی پوری کوشش کی جائے، اور انہیں منظم کر کے اصلاح کے کام میں لگایا جائے۔

عنصر سوم میں اسلام کا صحیح علم اور جامع و ہمہ گیر تصور زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلایا جائے اور ان کے اندر بنیادی انسانی اخلاقیات اور اسلامی اخلاقیات کو نشوونما دینے کی باقاعدہ سعی کی جائے۔

عنصر اول کے ضمیر کو پوری حکمت اور دلسوزی کے ساتھ اپیل کرنے کی کوشش تو برابر جاری رہے مگر اصلاح کی بے جا توقعات اس سے وابستہ کر کے قوم کے سواد اعظم کو اس کے قبضہ و تسلط سے نکالنے کی کوشش میں ہرگز تساہل یا نرمی و رعایت سے کام نہ لیا جائے۔ رہا اس کے جھوٹ کا طوفان، اور اس کے فتنوں کا امیگزین، اور اس کا سیاسی اور معاشی دباؤ، تو اس سے ڈر کر پیچھے ہٹنا تو ہمارے نزدیک فرار من الزحف سے کم تر درجے کا گناہ نہیں ہے۔

علاج کی اس تجویز کو سمجھ لینے کے بعد کسی شخص کو ہمارے عملی پروگرام کے سمجھنے میں دقت پیش

تفہیم القرآن

النحل

نام رکوع ۹ کی آیت وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی محض علامت ہے نہ کہ عنوان اور موضوع بحث۔

زمانۂ نزول متعدد اندرونی شہادتوں سے اس کے زمانۂ نزول پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً:۔

رکوع ۶ کی پہلی آیت وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہجرت حبشہ واقع ہو چکی تھی۔

رکوع ۱۴ کی آیت مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِهٖ الآیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ظلم و ستم پوری شدت کے ساتھ ہو رہا تھا اور یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شخص ناقابل برداشت اذیت سے مجبور ہو کر کلمۂ کفر کہہ بیٹھے تو اس کا کیا حکم ہے۔

رکوع ۱۵ کی آیات وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً ..... اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ کا صاف اشارہ اس طرف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد مکہ میں جو ہفت سالہ قحط رونما ہوا تھا وہ اس سورہ کے نزول کے وقت ختم ہو چکا تھا۔

اسی رکوع ۱۵ میں ایک آیت ایسی ہے جس کا حوالہ سورۂ انعام میں دیا گیا ہے، اور دوسری آیت ایسی ہے جس میں سورۂ انعام کی ایک آیت کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان دونوں سورتوں کا نزول قریب العہد ہے۔

ان شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس سورہ کا زمانۂ نزول بھی مکے کا آخری دور ہی ہے، اور اسی کی تائید سورہ کے عام انداز بیان سے بھی ہوتی ہے۔

موضوع اور مرکزی مضمون شرک کا ابطال، توحید کا اثبات، دعوت پیغمبر کو نہ ماننے کے

بُرے نتائج پر تنبیہ و فہمائش، اور حق کی مخالفت و مزاحمت پر زجر و توبیخ۔

مباحث اس سورہ کا آغاز بغیر کسی تمہید کے یک لخت ایک تنبیہی جملے سے ہوتا ہے۔ کفار مکہ بار بار کہتے تھے کہ جب ہم تمہیں جھٹلا چکے ہیں اور کھلم کھلا تمہاری مخالفت کر رہے ہیں تو آخر وہ خدا کا عذاب آ کیوں نہیں جاتا جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو۔ اس بات کو بالکل تکیہ کلام کی طرح دہرانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر نہ ہونے کا سب سے زیادہ صریح ثبوت سمجھتے تھے۔ اس پر فرمایا کہ بیوقوفو! خدا کا عذاب تو تمہارے سر پر تُلا کھڑا ہے، اب اس کے ٹوٹ پڑنے کے لئے جلدی نہ مچاؤ بلکہ جو ذرا سی مہلت باقی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد فوراً ہی تفہیم کی تقریر شروع ہو جاتی ہے اور حسب ذیل مضامین بار بار یکے بعد دیگرے سامنے آنے شروع ہوتے ہیں:

(۱) دل لگتے دلائل اور آفاق و انفس کے آثار کی کھلی کھلی شہادتوں سے سمجھایا جاتا ہے کہ شرک باطل ہے اور توحید ہی حق ہے۔

(۲) منکرین کے اعتراضات، شکوک، حجتوں اور حیلوں کا ایک ایک کر کے جواب دیا جاتا ہے۔

(۳) باطل پر اصرار اور حق کے مقابلہ میں استکبار کے بُرے نتائج سے ڈرایا جاتا ہے

(۴) اُن اخلاقی اور عملی تغیرات کو مجمل مگر دل نشین انداز سے بیان کیا جاتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین انسانی زندگی میں لانا چاہتا ہے، اور اس سلسلہ میں مشرکین کو بتایا جاتا ہے کہ خدا کو رب ماننا جس کا انہیں دعویٰ تھا محض خالی خولی مان لینا ہی نہیں ہے بلکہ اپنے کچھ تقاضے بھی رکھتا ہے جو عقائد، اخلاق اور عملی زندگی میں نمودار ہونے چاہئیں۔

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی ڈھارس بندھائی گئی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کفار کی مزاحمتوں اور جفاکاریوں کے مقابلہ میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہئے

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

آگیا اللہ کا فیصلہ[1]، اب اس کے لئے جلدی نہ مچاؤ۔ پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں[2]۔ وہ اس روح[3] کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے

---

[1] یعنی بس وہ آیا ہی چاہتا ہے، اُس کے ظہور و نفاذ کا وقت قریب آ لگا ہے۔ اِس بات کو صیغۂ ماضی میں یا تو اس کے انتہائی یقینی اور انتہائی قریب ہونے کا تصور دلانے کے لئے فرمایا گیا، یا پھر اس لئے کہ کفار قریش کی سرکشی و بدعملی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور آخری فیصلہ کن قدم اٹھائے جانے کا وقت آ گیا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "فیصلہ" کیا تھا اور کس شکل میں آیا؟ ہم یہ سمجھتے ہیں (و اللہ اعلم بالصواب) کہ اس فیصلے سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے ہجرت ہے جس کا حکم تھوڑی مدت بعد ہی دیا گیا۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی جن لوگوں کے درمیان مبعوث ہوتا ہے ان کے جحود و انکار کی آخری سرحد پر پہنچ کر ہی اسے ہجرت کا حکم دیا جاتا ہے، اور یہ حکم ان کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد یا تو ان پر تباہ کن عذاب آ جاتا ہے، یا پھر نبی اور اس کے متبعین کے ہاتھوں ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جاتی ہے۔ یہی بات تاریخ سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ ہجرت جب واقع ہوئی تو کفار مکہ سمجھے کہ یہ فیصلہ ان کے حق میں ہے، مگر آٹھ دس سال کے اندر ہی دنیا نے دیکھ لیا کہ نہ صرف مکے سے بلکہ پوری سرزمین عرب ہی سے کفر و شرک کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دی گئیں۔

[2] پہلے فقرے اور دوسرے فقرے کا باہمی ربط سمجھنے کے لئے پس منظر کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ کفار جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار چیلنج کر رہے تھے کہ اب کیوں نہیں آ جاتا خدا کا وہ فیصلہ جس کے تم ہمیں ڈراوے دیا کرتے ہو، تو دراصل اس کے پیچھے اُن کا یہ خیال کارفرما تھا کہ ان کا مشرکانہ مذہب ہی برحق ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خواہ مخواہ اللہ کا نام لے کر ایک غلط مذہب پیش کر رہے ہیں جسے اللہ کی طرف سے کوئی منظوری حاصل نہیں ہے۔ ورنہ کیسے ممکن تھا کہ ہم اللہ سے پھرے ہوئے ہوتے اور یہ اُس کے بھیجے ہوئے ہوتے اور پھر بھی جو کچھ ہم ان کے ساتھ کر رہے ہیں اس پر ہماری شامت نہ آ جاتی۔ اس لئے خدائی فیصلے کے قریب آ لگنے کا اعلان کرتے ہی فوراً یہ ارشاد ہوا کہ اس کے نفاذ میں تاخیر کی وجہ ہرگز وہ نہیں ہے جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ اللہ اس سے بلند تر اور پاکیزہ تر ہے کہ کوئی اس کا شریک ہو۔

[3] یعنی روح نبوت کو جس سے بھر کر نبی کام اور کلام کرتا ہے۔ یہ وحی اور یہ پیغمبرانہ اسپرٹ چونکہ اخلاقی زندگی

[illegible] کے ذریعے نازل فرما دیتا ہے[1] (اس ہدایت کے ساتھ کہ لوگوں کو) "آگاہ کر دو، میرے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے، لہٰذا تم مجھی سے ڈرو۔"[2] اس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے، وہ بہت بالا و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔[3]

(بقیہ حاشیہ ۱۵۱) میں وہی مقام رکھتی ہے جو طبعی زندگی میں رُوح کا مقام ہے، اس لئے قرآن میں متعدد مقامات پر اس کے لئے رُوح کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

[1] فیصلہ طلب کرنے کے لئے کفار جو چیلنج کر رہے تھے اس کے پس پشت چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار بھی موجود تھا، اس لئے شرک کی تردید کے ساتھ اور اس کے معاً بعد آپ کی نبوت کا اثبات فرمایا گیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بناوٹی باتیں ہیں جو یہ شخص بنا رہا ہے۔ اللہ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ نہیں، یہ ہماری بھیجی ہوئی رُوح ہے جس سے مملو ہو کر یہ شخص نبوت کر رہا ہے۔

پھر یہ جو فرمایا کہ اپنے جس بندے پر اللہ چاہتا ہے یہ رُوح نازل کرتا ہے تو یہ کفار کے اُن اعتراضات کا جواب ہے جو وہ حضور پر کرتے تھے کہ اگر خدا کو نبی ہی بھیجنا تھا تو کیا بس ایک محمد بن عبداللہ ہی اس کام کے لئے رہ گیا تھا، مکے اور طائف کے سارے بڑے بڑے سردار مر گئے تھے کہ ان میں سے کسی پر بھی نگاہ نہ پڑ سکی! اس طرح کے بیہودہ اعتراضات کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا، اور یہی متعدد مقامات پر قرآن میں دیا گیا ہے کہ خدا اپنے کام کو خود جانتا ہے، تم سے مشورہ لینے کی حاجت نہیں ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو مناسب سمجھتا ہے آپ ہی اپنے کام کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔

[2] اس فقرے سے یہ حقیقت واضح کی گئی کہ رُوح نبوت جہاں جس انسان پر بھی نازل ہوئی ہے یہی ایک دعوت لیکر آئی ہے کہ خدائی صرف ایک اللہ کی ہے اور بس وہی اکیلا اس کا مستحق ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے، کوئی دوسرا اس لائق نہیں کہ اس کی ناراضی کا خوف، اس کی سزا کا ڈر، اور اس کی نافرمانی کے نتائج بد کا اندیشہ انسانی اخلاق کا لنگر اور انسانی فکر و عمل کے پورے نظام کا محور بن کر رہے۔

[3] دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ شرک کی نفی اور توحید کا اثبات، جس کی دعوت خدا کے پیغمبر دیتے ہیں، اُسی کی شہادت زمین و آسمان کا پورا کارخانہ تخلیق دے رہا ہے۔ یہ کارخانہ (بقیہ ۱۵۲) پر

اس نے انسان کو ایک ذرا سی بوند سے پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے صریحاً وہ ایک جھگڑالو ہستی بن گیا۔ اس نے جانور پیدا کیے جن میں تمہارے لئے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی، اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی۔ اُن میں تمہارے لئے جمال ہے جبکہ صبح تم انہیں چرنے کے لئے بھیجتے ہو اور جبکہ شام انہیں واپس لاتے ہو۔ وہ تمہارے بوجھ ڈھو کر ایسے ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲) کوئی خیالی گورکھ دھندا نہیں ہے بلکہ ایک سراسر مبنی بر حقیقت نظام ہے۔ اس میں تم جس طرف چاہو نگاہ اٹھا کر دیکھ لو، شرک کی گواہی کہیں سے نہ ملے گی، اللہ کے سوا دوسرے کی خدائی کہیں چلتی نظر نہ آئیگی، کسی چیز کی ساخت یہ شہادت نہ دیگی کہ اس کا وجود کسی اور کا بھی رہین منت ہے۔ پھر جب یہ ٹھوس حقیقت پر بنا ہوا نظام خالص توحید پر چل رہا ہے تو آخر تمہارے اس شرک کا سکہ کس جگہ رواں ہو سکتا ہے جبکہ اس کی تہ میں وہم و گمان کے سوا واقعیت کا شائبہ تک نہیں ہے؟

اس کے بعد آثار کائنات سے اور خود انسان کے اپنے وجود سے وہ شہادتیں پیش کی جاتی ہیں جو ایک طرف توحید پر اور دوسری طرف رسالت پر دلالت کرتی ہیں۔

له اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے نطفے کی حقیر سی بوند سے وہ انسان پیدا کیا جو بحث و استدلال کی قابلیت رکھتا ہے اور اپنے مدعا کے لئے حجتیں پیش کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس انسان کو خدا نے نطفہ جیسی حقیر چیز سے پیدا کیا ہے اُس کی خودی کا طغیان تو دیکھو کہ وہ خود خدا ہی کے مقابلہ میں جھگڑنے پر اُتر آیا ہے۔ پہلے مطلب کے لحاظ سے یہ آیت اُسی استدلال کی ایک کڑی ہے جو آگے مسلسل کئی آیتوں میں پیش کیا گیا ہے (جس کی تشریح ہم اس سلسلۂ بیان کے آخر میں لیں گے)۔ اور دوسرے مطلب کے لحاظ سے یہ آیت انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے سے پہلے ذرا اپنی ہستی کو دیکھ۔ کس شکل میں تو کہاں سے نکل کر کہاں پہنچا، کس جگہ تو نے ابتداءً پرورش پائی، پھر کس راستے سے تو برآمد ہو کر دنیا میں آیا، پھر کن مرحلوں سے گزرتا ہوا تو جوانی کی عمر کو پہنچا، اور اب اپنے آپ کو بھول کر تو کس کے منہ آ رہا ہے۔

اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں۔ وہ اور بہت سی چیزیں تمہارے فائدے کے لئے پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم تک نہیں ہے[1] اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جبکہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں[2]، اگر وہ چاہتا تو تم سب کو

---

[1] یعنی بکثرت ایسی چیزیں ہیں جو انسان کی بھلائی کے لئے کام کر رہی ہیں اور انسان کو خبر تک نہیں ہے کہ کہاں کہاں کتنے خدام اس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

[2] توحید اور رحمت و ربوبیت کے دلائل پیش کرتے ہوئے یہاں اشارۃً نبوت کی بھی ایک دلیل پیش کر دی گئی ہے۔ اس دلیل کا مختصر بیان یہ ہے کہ دنیا میں انسان کے لئے فکر و عمل کے بہت سے مختلف راستے ممکن ہیں اور عملاً موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے راستے بیک وقت تو حق یعنی مطابق حقیقت نہیں ہو سکتے۔ سچائی تو ایک ہی ہے اور صحیح نظریۂ حیات صرف وہی ہو سکتا ہے جو اس سچائی کے مطابق ہو۔ پھر عمل کے بیشمار ممکن راستوں میں سے صحیح راستہ بھی صرف وہی ہو سکتا ہے جو صحیح نظریۂ حیات پر مبنی ہو۔ اس صحیح نظریے اور صحیح راہ عمل کا علم انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے، بلکہ اصل بنیادی ضرورت یہی ہے کیونکہ دوسری تمام چیزیں تو انسان کی صرف ان ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں جو ایک اونچے درجے کا جانور ہونے کی حیثیت سے اس کو لاحق ہوا کرتی ہیں۔ اور یہ ایک ضرورت ایسی ہے جو انسان ہونے کی حیثیت سے اس کو لاحق ہے۔ یہ اگر پوری نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کی ساری زندگی ہی ناکام ہو گئی۔ اب غور کرو کہ جس خدا نے تمہیں وجود میں لانے سے پہلے تمہارے لئے یہ کچھ سر و سامان مہیا کر کے رکھا، اور جس نے وجود میں لانے کے بعد تمہاری حیوانی زندگی کی ایک ایک ضرورت کو پورا کرنے کا اتنی دقیقہ سنجی کے ساتھ اتنے بڑے پیمانے پر انتظام کیا، کیا اس سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ اس نے تمہاری انسانی زندگی کی اس سب سے بڑی اور اصلی ضرورت کو پورا کرنے کا بندوبست نہ کیا ہوگا؟ یہی بندوبست تو ہے جو نبوت کے ذریعہ سے کیا گیا ہے۔ اگر تم نبوت کو نہیں مانتے تو بتاؤ کہ تمہارے خیال میں خدا نے انسان کی ہدایت کے لئے اور کونسا انتظام کیا ہے؟ اس کے جواب میں تم نہ یہ کہہ سکتے ہو کہ خدا نے ہمیں راستہ تلاش کرنے کے لئے عقل و فکر دے رکھی ہے، کیونکہ انسانی عقل و فکر پہلے ہی بے شمار مختلف راستے ایجاد کر بیٹھی ہے جو حقیقت [illegible]

ع

ہدایت دینے والا ہے۔

وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لئے پانی برسایا جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانوروں کے لئے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس پانی کے ذریعہ سے کھیتیاں اگاتا ہے اور زیتون، اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔ اس میں ایک بڑی نشانی ہے اُن لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ۱۲۲) کی صحیح دریافت میں اس کی ناکامی کا کھلا ثبوت ہے۔ اور نہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ خدا نے ہماری رہنمائی کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے، کیونکہ خدا کے ساتھ اس سے بڑھ کر بدگمانی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ حیوانی حیثیت سے تو انسان کی پرورش اور اس کے نشو و نما کا اتنا مفصل اور مکمل انتظام کرے مگر انسانی حیثیت سے اس کو یونہی تاریکیوں میں بھٹکنے اور ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دے۔

لہ یعنی اگرچہ یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس ذمہ داری کو (جو نوع انسان کی رہنمائی کے لئے اس نے خود اپنے اوپر عائد کی ہے) اس طرح ادا کرتا کہ سارے انسانوں کو پیدائشی طور پر دوسری تمام بے اختیار مخلوقات کے مانند برسرِ ہدایت بنا دیتا۔ لیکن یہ اس کی مشیت کا تقاضا نہ تھا۔ اس کی مشیت ایک ایسی ذی اختیار مخلوق کو وجود میں لانے کی متقاضی تھی جو اپنی پسند اور اپنے انتخاب سے صحیح اور غلط، ہر طرح کے راستوں پر جانے کی آزادی رکھتی ہو۔ اسی آزادی کے استعمال کے لئے اس کو علم کے ذرائع دیئے گئے، عقل و فکر کی صلاحیتیں دی گئیں، خواہش اور ارادے کی طاقتیں بخشی گئیں، اپنے اندر اور باہر کی بے شمار چیزوں پر تصرف کے اختیارات عطا کئے گئے، اور باطن و ظاہر میں ہر طرف بے شمار ایسے اسباب رکھ دیئے گئے جو اس کے لئے ہدایت اور ضلالت، دونوں کے موجب بن سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ بے معنی ہو جاتا اگر وہ پیدائشی طور پر راست رو بنا دیا جاتا۔ اور ترقی کے اُن بلند ترین مدارج تک بھی انسان کا پہنچنا ممکن نہ رہتا جو صرف آزادی کے صحیح استعمال ہی کے نتیجے میں اس کو مل سکتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لئے جبری ہدایت کا طریقہ چھوڑ کر رسالت کا طریقہ اختیار فرمایا تاکہ انسان کی آزادی بھی برقرار رہے اور اس کے عقل کا امتحان بھی ہوتا رہے اور راہِ راست بھی معقول ترین طریقہ سے انسان کے سامنے پیش کر دی جائے۔

اس نے تمہاری بھلائی کے لئے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور سب ستارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور یہ جو بہت سی رنگ برنگ کی چیزیں اس نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں ان میں بھی ضرور نشانی ہے اُن لوگوں کے لئے جو سبق حاصل کرنے والے ہیں۔

وہی ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت لے کر کھاؤ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنہیں تم پہنا کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو[1] اور اس کے شکر گذار بنو۔

اس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تاکہ زمین تم کو لیکر ڈھلک نہ جائے[2]۔ اس نے دریا جاری کئے اور قدرتی راستے بنائے[3] تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اس نے زمین میں راستہ بتانے والی علامتیں رکھ دیں[4]

---

[1] یعنی حلال طریقوں سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سطح زمین پر پہاڑوں کے ابھار کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے زمین کی گردش اور اس کی رفتار میں انضباط پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر پہاڑوں کے اس فائدے کو نمایاں کر کے بتایا گیا ہے جس سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے تمام فائدے ضمنی ہیں اور اصل فائدہ یہی حرکت زمین کو اضطراب سے بچا کر منضبط (Regulate) کرنا ہے۔

[3] یعنی وہ راستے جو عموماً ندی نالوں اور دریاؤں کے ساتھ بنتے چلے جاتے ہیں۔ ان قدرتی راستوں کی اہمیت خصوصیت کے ساتھ پہاڑی علاقوں میں محسوس ہوتی ہے، اگرچہ میدانی علاقوں میں بھی وہ کچھ کم اہم نہیں ہیں۔

[4] یعنی خدا نے ساری زمین بالکل یکساں بنا کر نہیں رکھ دی بلکہ ہر خطے کو مختلف امتیازی علامات (Landmarks) سے ممتاز کیا۔ اس کے بہت سے دوسرے فوائد کے ساتھ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے راستے اور اپنی منزل مقصود کو الگ پہچان لیتا ہے۔ اس نعمت کی قدر آدمی کو اسی وقت معلوم ہوتی ہے جبکہ اسے کبھی ایسے ریگستانی علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہو جہاں اس طرح کے امتیازی نشانات تقریباً مفقود ہوتے ہیں اور آدمی ہر وقت بھٹک جانے کا خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر [illegible]

اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں ؕ

(حاشیہ صفحہ ۴۹۰) بحری سفر میں آدمی کو اس عظیم الشان نعمت کا احساس ہوتا ہے کیونکہ وہاں نشاناتِ راہ بالکل ہی مفقود ہوتے ہیں۔ لیکن صحراؤں اور سمندروں میں بھی اللہ نے انسان کی رہنمائی کا ایک فطری انتظام کر رکھا ہے اور وہ ہیں تارے جنہیں دیکھ دیکھ کر انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک اپنا راستہ معلوم کر رہا ہے۔

یہاں پھر توحید اور رحمت و ربوبیت کی دلیلوں کے درمیان ایک لطیف اشارہ دلیلِ رسالت کی طرف کر دیا گیا ہے۔ اس مقام کو پڑھتے ہوئے ذہن خود بخود اس مضمون کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ جس خدا نے تمہاری مادّی زندگی میں تمہاری رہنمائی کے لئے یہ کچھ انتظامات کئے ہیں کیا وہ تمہاری اخلاقی زندگی سے اتنا بے پروا ہو سکتا ہے کہ یہاں تمہاری ہدایت کا کچھ بھی انتظام نہ کرے؟ ظاہر ہے کہ مادّی زندگی میں بھٹک جانے کا بڑے سے بڑا نقصان بھی اخلاقی زندگی میں بھٹکنے کے نقصان سے بدرجہا کم ہے۔ پھر جس ربِّ رحیم کو ہماری مادّی فلاح کی اتنی فکر ہے کہ پہاڑوں میں ہمارے لئے راستے بناتا ہے، میدانوں میں نشاناتِ راہ کھڑے کرتا ہے، صحراؤں اور سمندروں میں ہم کو راستہ دکھانے کے لئے آسمانوں پر قندیلیں روشن کرتا ہے، اس سے یہ بدگمانی کیسے کی جا سکتی ہے کہ اس نے ہماری مادّی فلاح کے لئے کوئی راستہ نہ بنایا ہو گا، اُس راستہ کو نمایاں کرنے کے لئے کوئی نشان نہ کھڑا کیا ہو گا، اور اُسے صاف صاف دکھانے کے لئے کوئی سراجِ منیر روشن نہ کیا ہو گا؟

ملے یہاں تک آفاق اور انفس کی بہت سی نشانیاں جو پے در پے بیان کی گئی ہیں ان سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ انسان اپنے وجود سے لیکر زمین اور آسمان کے گوشے گوشے تک جدھر چاہے نظر دوڑا کر دیکھ لے، ہر چیز پیغمبر کے بیان کی تصدیق کر رہی ہے اور کہیں سے بھی شرک کی (اور ساتھ ساتھ دہریت کی بھی) تائید میں کوئی شہادت فراہم نہیں ہوتی۔ یہ ایک حقیر بوند سے بولتا چالتا اور حجت و استدلال کرتا انسان بنا کھڑا کرنا۔ یہ اس کی ضرورت کے عین مناسب بہت سے جانور پیدا کرنا جن کے بال اور کھال، خون اور دودھ، گوشت اور پیٹھ، ہر چیز میں انسانی فطرت کے بہت سے مطالبات کا حتیٰ کہ اس کے ذوقِ جمال کی مانگ تک کا جواب موجود ہے۔ یہ آسمان سے بارش کا انتظام اور یہ زمین میں طرح طرح کے پھلوں اور غلوں اور چاروں کی روئیدگی کا انتظام جس کے ساتھ بے شمار شعبے آپس میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کھاتے

(باقی حاشیہ)

پھر کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے، دونوں یکساں ہیں؟ ؎ کیا تم اتنا بھی

(بقیہ حاشیہ ۴۵) چلے جاتے ہیں اور پھر انسان کی بھی فطری ضرورتوں کے عین مطابق ہیں۔ یہ رات اور دن کی باقاعدہ آمد و رفت، اور یہ چاند اور سورج اور تاروں کی انتہائی منظم حرکات جن کا زمین کی پیداوار اور انسان کی مصلحتوں سے اتنا گہرا ربط ہے۔ یہ زمین میں سمندروں کا وجود اور یہ ان کے اندر انسان کی بہت سی طبعی اور جمالی طلبوں کا جواب۔ یہ پانی کا چند مخصوص قوانین سے جکڑا ہوا ہونا اور پھر اس کے یہ فائدے کہ انسان سمندر جیسی ہولناک چیز کا سینہ چیرتا ہوا اس میں اپنے جہاز چلاتا ہے اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر اور تجارت کرتا پھرتا ہے۔ یہ دھرتی کے سینے پر پہاڑوں کے اُبھار اور یہ انسان کی ہستی کے لئے ان کے فائدے۔ یہ سطح زمین کی ساخت سے لیکر آسمان کی بلند فضاؤں تک بے شمار علامتوں اور امتیازی نشانوں کا پھیلاؤ اور پھر اس طرح ان کا انسان کے لئے مفید ہونا۔ یہ ساری چیزیں صاف شہادت دے رہی ہیں کہ ایک ہی ہستی نے یہ منصوبہ سوچا ہے، اسی نے اپنے منصوبے کے مطابق ان سب کو ڈیزائن کیا ہے، اسی نے اس ڈیزائن پر ان کو پیدا کیا ہے، وہی ہر آن اس میں نت نئی چیزیں بنا بنا کر اس طرح لا رہا ہے کہ مجموعی اسکیم اور اس کے نظم میں ذرا فرق نہیں آتا، اور وہی زمین سے لیکر آسمانوں تک اس عظیم الشان کارخانے کو چلا رہا ہے۔ ایک بیوقوف یا ایک ہٹ دھرم کے سوا اور کون یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک اتفاقی حادثہ ہے، یا یہ کہ اس کمال درجہ منظم، مربوط اور متناسب کائنات کے مختلف کام یا مختلف اجزاء مختلف خداؤں کے آفریدہ اور مختلف خداؤں کے زیر انتظام ہیں۔

؎ یعنی اگر تم یہ مانتے ہو (جیسا کہ فی الواقع کفار مکہ بھی مانتے تھے اور دنیا کے دوسرے مشرکین بھی مانتے ہیں) کہ خالق اللہ ہی ہے اور اس کائنات کے اندر تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں سے کسی کا کچھ بھی پیدا کیا ہوا نہیں ہے تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خالق کے خلق کیے ہوئے نظام میں ان غیر خالق ہستیوں کی حیثیت اس کے برابر یا کسی طرح بھی اس کے مانند ہو؟ کیونکر ممکن ہے کہ اپنی خلق کی ہوئی کائنات میں جو اختیارات خالق کے ہیں وہی ان غیر خالقوں کے بھی ہوں، اور اپنی مخلوق پر جو حقوق خالق کو حاصل ہیں وہی حقوق غیر خالقوں کو بھی حاصل ہوں؟ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ خالق اور غیر خالق کی صفات ایک جیسی ہونگی، یا وہ ایک جنس کے افراد ہونگے، حتیٰ کہ ان کے درمیان باپ اور اولاد کا رشتہ ہوگا؟

نہیں سمجھتے؟ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے، حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی درگزر کرنے والا اور رحیم ہے[17]، حالانکہ وہ تمہارے کھلے سے بھی واقف ہے اور چھپے سے بھی۔[18]
اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں، مُردہ ہیں نہ کہ زندہ، اور ان کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ انہیں کب (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھایا

---

[17] پہلے اور دوسرے فقرے کے درمیان ایک پوری داستان اَن کہی چھوڑ دی ہے، اس لئے کہ وہ اس قدر عیاں ہے کہ اس کے بیان کی حاجت نہیں۔ اس کی طرف محض یہ لطیف اشارہ ہی کافی ہے کہ اللہ کے بے پایاں احسانات کا ذکر کرنے کے معاً بعد اس کے غفور و رحیم ہونے کا ذکر کر دیا جائے۔ اسی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جس انسان کا بال بال اللہ کے احسانات میں بندھا ہوا ہے وہ اپنے محسن کی نعمتوں کا جواب کیسی کیسی نمک حرامیوں، بے وفائیوں، غداریوں اور سرکشیوں سے دے رہا ہے، اور پھر اس کا محسن کیسا رحیم اور حلیم ہے کہ ان ساری حرکتوں کے باوجود وہ سالہا سال ایک نمک حرام شخص کو اور صدہا برس ایک باغی قوم کو اپنی نعمتوں سے نوازتا چلا جاتا ہے۔ یہاں وہ بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو علانیہ خالق کی ہستی ہی کے منکر ہیں اور پھر بھی نعمتوں سے مالا مال ہوئے جا رہے ہیں۔ وہ بھی پائے جاتے ہیں جو خالق کی ذات، صفات، اختیارات، حقوق، سب میں غیر خالق ہستیوں کو اس کا شریک ٹھیرا رہے ہیں اور منعم کی نعمتوں کا شکریہ غیر منعموں کو ادا کر رہے ہیں، پھر بھی نعمت دینے والا ہاتھ نعمت دینے سے نہیں رکتا۔ وہ بھی ہیں جو خالق کو خالق اور منعم ماننے کے باوجود اس کے مقابلے میں سرکشی و نافرمانی ہی کو اپنا شیوہ اور اس کی اطاعت سے آزادی ہی کو اپنا مسلک بنائے رکھتے ہیں، پھر بھی مدت العمر اس کے بے حد و حساب احسانات کا سلسلہ ان پر جاری رہتا ہے۔

[18] یعنی کوئی احمق یہ نہ سمجھے کہ انکارِ خدا اور شرک اور معصیت کے باوجود نعمتوں کا سلسلہ بند نہ ہونا کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ کو لوگوں کے کرتوتوں کی خبر نہیں ہے۔ یہ کوئی اندھی بانٹ اور غلط بخشی نہیں ہے جو بے خبری کی وجہ سے ہو رہی ہو۔ یہ تو وہ حلم اور درگزر ہے جو مجرموں کے پوشیدہ اسرار بلکہ دل کی چھپی ہوئی نیتوں تک سے واقف ہونے کے باوجود کیا جا رہا ہے، اور یہ وہ فیاضی و عالی ظرفی ہے جو صرف رب العالمین ہی کو زیبا دیتی ہے۔

جائے گا؟ ع

تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔ مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے اُن کے دلوں میں انکار بس کر رہ گیا ہے اور وہ گھمنڈ میں پڑ گئے ہیں[2]۔ اللہ یقیناً ان کے سب کرتوت جانتا ہے، چھپے ہوئے بھی اور

---

[1] یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں خاص طور پر جن بناوٹی معبودوں کی تردید کی جا رہی ہے وہ فرشتے یا جن، یا شیاطین، یا لکڑی پتھر کی مورتیاں نہیں ہیں، بلکہ اصحابِ قبور ہیں۔ اس لئے کہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں، ان پر اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اور لکڑی پتھر کی مورتیوں کے معاملہ میں بعث بعد الموت کا کوئی سوال نہیں ہے اس لئے مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ کے الفاظ انہیں بھی خارج از بحث کر دیتے ہیں۔ اب لامحالہ اس آیت میں اَلَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد وہ انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین اور دوسرے غیر معمولی انسان ہی ہیں جن کو غالی معتقدین داتا، مشکل کشا، فریاد رس، غریب نواز، گنج بخش، اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر اپنی حاجت روائی کے لئے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ عرب میں اس نوعیت کے معبود نہیں پائے جاتے تھے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ جاہلیتِ عرب کی تاریخ سے اس کی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ کون پڑھا لکھا نہیں جانتا ہے کہ عرب کے متعدد قبائل، ربیعہ، غسان، کلب، تغلب، قضاعہ، کنانہ، حرث، کعب، کندہ وغیرہ میں کثرت سے عیسائی اور یہودی پائے جاتے تھے، اور یہ دونوں مذاہب بُری طرح انبیاء، اولیاء اور شہداء کی پرستش سے آلودہ تھے۔ پھر مشرکین عرب کے اکثر نہیں تو بہت سے معبود وہ گزرے ہوئے انسان ہی تھے جنہیں بعد کی نسلوں نے خدا بنا لیا تھا۔ بخاری میں ابن عباس کی روایت ہے کہ وَدّ، سواع، یغوث، یعوق، نسر، یہ سب صالحین کے نام ہیں جنہیں بعد کے لوگ بُت بنا بیٹھے۔ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ اَساف اور نائلہ دونوں انسان تھے۔ اسی طرح کی روایات لات اور مناۃ اور عزّیٰ کے بارے میں بھی موجود ہیں۔ اور مشرکین کا یہ عقیدہ بھی روایات میں آیا ہے کہ لات اور عزّیٰ اللہ کے ایسے پیارے تھے کہ اللہ میاں جاڑا لات کے ہاں اور گرمی عزّیٰ کے ہاں بسر کرتے تھے، سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۔

[2] یعنی آخرت کے انکار نے ان کو اس قدر غیر ذمہ دار بے فکر، اور دنیا کی زندگی میں مست بنا دیا ہے [illegible]

رکھتے ہوئے بھی۔ وہ اُن لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو غرورِ نفس میں مبتلا ہوں۔

اور جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمہارے ربّ نے یہ کیا چیز نازل کی ہے تو کہتے ہیں: "اجی وہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں"۔ یہ باتیں وہ اس لئے کرتے ہیں کہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں، اور ساتھ ساتھ کچھ ان لوگوں کے بوجھ بھی سمیٹیں جنہیں یہ بربنائے جہالت گمراہ کر رہے ہیں۔ دیکھو! کیسی سخت ذمہ داری ہے جو یہ اپنے سر لے رہے ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے لوگ (حق کو نیچا دکھانے کے لئے) ایسی ہی مکاریاں کر چکے ہیں، تو دیکھ لو کہ اللہ نے اُن کے مکر کی عمارت جڑ سے اکھاڑ پھینکی اور اس کی چھت اُوپر سے ان کے سر پر آ رہی اور ایسے رُخ سے اُن پر عذاب آیا جدھر سے اس کے آنے کا ان کو گمان تک نہ تھا پھر قیامت کے روز اللہ انہیں ذلیل و خوار کرے گا۔ وہ اُن سے کہے گا "بتاؤ اب کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے لئے تم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۸) کہ اب انہیں کسی حقیقت کا انکار کر دینے میں باک نہیں رہا، کسی صداقت کی ان کے دل میں قدر باقی نہیں رہی، کسی اخلاقی بندش کو اپنے نفس پر برداشت کرنے کے لئے وہ تیار نہیں ہیں، اور انہیں یہ تحقیق کرنے کی پرواہ ہی نہیں رہی کہ جس طریقہ پر وہ چل رہے ہیں وہ حق ہے بھی یا نہیں۔

[۱] یہاں سے تقریر کا رُخ دوسری طرف پھرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلہ میں جو شرارتیں کفارِ مکہ کی طرف سے ہو رہی تھیں، جو حجتیں آپ کے خلاف پیش کی جا رہی تھیں، جو حیلے اور بہانے ایمان نہ لانے کے لئے گھڑے جا رہے تھے، جو اعتراضات آپ پر وارد کیے جا رہے تھے، ان کو ایک ایک کرکے لیا جاتا ہے اور ان پر فہمائش، زجر اور نصیحت کی جاتی ہے۔

[۲] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا چرچا جب اطراف و اکناف میں پھیلا تو مکہ کے لوگ جہاں کہیں جاتے تھے ان سے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارے ہاں جو صاحب نبی بن کر اٹھے ہیں وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ قرآن کس قسم کی کتاب ہے؟ اس کے مضامین کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے سوالات کا جواب کفارِ مکہ ہمیشہ ایسے الفاظ میں دیتے تھے جن سے سائل کے دل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی لائی ہوئی کتاب کے متعلق کوئی نہ کوئی شک بیٹھ جائے، یا کم از کم اس سے دلچسپی باقی نہ رہے۔

(اہل حق سے) جھگڑے کیا کرتے تھے؟" [1] جن لوگوں کو دنیا میں علم حاصل تھا وہ کہیں گے "آج رسوائی اور بدبختی ہے کافروں کے لئے"۔ ہاں [2] انہی کافروں کے لئے جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہوئے جب ملائکہ کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہیں [3] تو (سرکشی چھوڑ کر) فوراً ڈگیں ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں "ہم تو کوئی قصور نہیں کر رہے تھے"۔ ملائکہ جواب دیتے ہیں "کر کیسے نہیں رہے تھے، اللہ تمہارے کرتوتوں سے خوب واقف ہے، اب جاؤ، جہنم کے دروازوں میں گھس جاؤ، وہیں تم کو ہمیشہ رہنا ہے [4]"۔ پس حقیقت یہ ہے کہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے متکبّروں کے لئے۔

---

[1] یہاں دونوں فقروں کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے سامع کا ذہن تھوڑے غور و فکر سے خود بھر سکتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ یہ سوال کریگا تو سارے میدان حشر میں ایک سناٹا چھا جائیگا۔ کفار و مشرکین کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ ہوگا، اس لئے وہ دم بخود رہ جائیں گے۔ تب اہل علم کے درمیان آپس میں یہ باتیں ہونگی۔

[2] یہ فقرہ اہل علم کے قول پر اضافہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ خود بطور تشریح فرما رہا ہے۔ جن لوگوں نے اسے بھی اہل علم ہی کا قول سمجھا ہے انہیں بڑی تاویلوں سے بات بنانی پڑی ہے اور پھر بھی بات پوری نہیں بن سکی ہے۔

[3] یعنی جب موت کے وقت ملائکہ ان کی روحیں ان کے جسم سے نکال کر اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں۔

[4] یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت جس میں قبض روح کے بعد متقیوں اور ملائکہ کی گفتگو کا ذکر ہے، قرآن مجید کی ان متعدد آیات میں سے ہے جو صریح طور پر عذاب و ثواب قبر کا ثبوت دیتی ہیں۔ حدیث میں "قبر" کا لفظ مجازاً عالم برزخ کے لئے استعمال ہوا ہے، اور اس سے مراد وہ عالم ہے جس میں موت کی آخری ہچکی سے لے کر بعث بعد الموت کے پہلے جھٹکے تک انسانی ارواح رہیں گی۔ منکرین حدیث کو اس پر اصرار ہے کہ یہ عالم بالکل عدم محض کا عالم ہے جس میں کوئی احساس اور شعور نہ ہوگا اور کسی قسم کا عذاب یا ثواب نہ ہوگا۔ لیکن یہاں دیکھیے کہ کفار کی روحیں جب قبض کی جاتی ہیں تو وہ موت کی سرحد کے پار کا حال بالکل اپنی توقعات کے خلاف پا کر سراسیمہ ہو جاتی ہیں اور فوراً سلام ٹھونک کر (باقی صفحہ

دوسری طرف جب خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ "بہترین چیز اتری ہے" اس طرح کے نیکوکار

(بقیہ حاشیہ صفحہ) ملائکہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتی ہیں کہ ہم کوئی بُرا کام نہیں کر رہے تھے۔ جواب میں ملائکہ ان کو ڈانٹ بتلاتے ہیں اور جہنم داخل ہونے کی پیشگی خبر دیتے ہیں۔ دوسری طرف اتقیا کی روحیں جب قبض کی جاتی ہیں تو ملائکہ ان کو سلام بجا لاتے ہیں اور جنتی ہونے کی پیشگی مبارکباد دیتے ہیں۔ کیا برزخ کی زندگی، احساس، شعور، عذاب اور ثواب کا اس سے بھی زیادہ کھلا ہوا کوئی ثبوت درکار ہے؟ اسی سے ملتا جلتا مضمون سورۂ نساء رکوع ۱۴ کی پہلی آیت میں بھی ہے جہاں ہجرت نہ کرنیوالے مسلمانوں سے قبض روح کے بعد ملائکہ کی گفتگو کا ذکر آیا ہے۔ اور ان سب سے زیادہ صاف الفاظ میں عذاب برزخ کی تصریح سورۂ مومن رکوع ۵ میں کی گئی ہے جہاں اللہ تعالیٰ فرعون اور آل فرعون کے متعلق فرماتا ہے کہ "ایک سخت عذاب ان کو گھیرے ہوئے ہے یعنی صبح و شام وہ آگ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، پھر جب قیامت کی گھڑی آجائے گی تو حکم دیا جائے گا کہ آل فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو۔"

حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور حدیث، دونوں سے موت اور قیامت کے درمیان کی حالت کا ایک ہی نقشہ معلوم ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ موت محض جسم و روح کی علیٰحدگی کا نام ہے نہ کہ بالکل معدوم ہو جانے کا۔ جسم سے علیحدہ ہو جانے کے بعد روح معدوم نہیں ہو جاتی بلکہ اُس پوری شخصیت کے ساتھ زندہ رہتی ہے جو دنیا کی زندگی کے تجربات اور ذہنی و اخلاقی اکتسابات سے بنی تھی۔ اس حالت میں روح کے شعور، احساس، مشاہدات اور تجربات کی کیفیت خواب سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ ایک مجرم روح سے فرشتوں کی بازپرس اور پھر اس کا عذاب اور اذیت میں مبتلا ہونا اور دوزخ کے سامنے پیش کیا جانا، سب کچھ اُس کیفیت سے مشابہ ہوتا ہے جو ایک قتل کے مجرم پر پھانسی کی تاریخ سے ایک دن پہلے ایک ڈراؤنے خواب کی شکل میں گزرتی ہوگی۔ اسی طرح ایک پاکیزہ روح کا استقبال اور پھر اس کا جنت کی بشارت سننا اور جنت کی ہواؤں اور خوشبوؤں سے متمتع ہونا، یہ سب بھی اُس (باقی ص ۱۵۲ پر)

لوگوں کے لئے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ بڑا اچھا گھر ہے متقیوں کا، دائمی قیام کی جنتیں جن میں وہ داخل ہوں گے نیچے نہریں بہ رہی ہونگی اور سب کچھ وہاں ان کی عین خواہش کے مطابق ہوگا۔[1] یہ جزا دیتا ہے اللہ متقیوں کو۔ اُن متقیوں کو جن کی روحیں پاکیزگی کی حالت میں جب ملائکہ قبض کرتے ہیں تو کہتے ہیں سلام ہو تم پر، جاؤ جنت

(بقیہ حاشیہ ص۱۵۱) ملازم کے خواب سے ملتا جلتا ہوگا جو حُسنِ کارکردگی کے بعد سرکاری بلاوے پر جیسے گورنر میں حاضر ہوا ہو اور وعدۂ ملاقات کی تاریخ سے ایک دن پہلے آئندہ انعامات کی اُمیدوں سے لبریز ایک سُہانا خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ خواب یک لخت نفخِ صورِ دوم سے ٹوٹ جائے گا اور یکایک میدانِ حشر میں اپنے آپ کو جسم و روح کے ساتھ زندہ پاکر مجرمین حیرت سے کہیں گے کہ يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (ارے یہ کون ہمیں ہماری خوابگاہ سے اٹھا لایا؟)۔ مگر اہلِ ایمان پورے اطمینان سے کہیں گے کہ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (یہ وہی چیز ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کا بیان سچا تھا)۔ مجرمین کا فوری احساس اُس وقت یہ ہوگا کہ وہ اپنی خوابگاہ میں (جہاں بسترِ موت پر انہوں نے دنیا میں جان دی تھی) شاید کوئی ایک گھنٹہ بھر سوئے ہونگے اور اب اچانک اس حادثہ سے آنکھ کھلنے کے بعد کہیں بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ مگر اہلِ ایمان پورے ثباتِ قلب کے ساتھ کہیں گے کہ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (اللہ کے دفتر میں تو تم روزِ حشر تک ٹھیرے رہے ہو اور یہی روزِ حشر ہے مگر تم اس چیز کو نہ جانتے تھے)

[1] یہ ہے جنت کی اصل تعریف کہ وہاں انسان جو کچھ چاہے گا وہی اسے ملیگا اور کوئی چیز اس کی مرضی اور پسند کے خلاف واقع نہ ہوگی۔ دنیا میں کسی رئیس، کسی امیرِ کبیر، کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی یہ نعمت کبھی میسر نہیں آئی ہے، نہ یہاں اس کے حصول کا کوئی امکان ہے۔ مگر جنت کے ہر مکین کو راحت و مسرت کا یہ درجۂ کمال حاصل ہوگا کہ اس کی زندگی میں ہر وقت ہر طرف سب کچھ اس کی خواہش اور پسند کے عین مطابق ہوگا۔ اس کا ہر ارمان نکلے گا، اس کی ہر آرزو پوری ہوگی، اس کی ہر چاہت عمل میں آکر رہے گی۔

ہیں اپنے اعمال کے بدلے ۔

اے محمدؐ، اب جو یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں تو اس کے سوا اب اور کیا باقی رہ گیا ہے کہ ملائکہ ہی آپہنچیں، یا تیرے رب کا فیصلہ صادر ہو جائے؟ [1] اس طرح کی ڈھٹائی ان سے پہلے بہت سے لوگ کر چکے ہیں، پھر جو کچھ ان کے ساتھ ہوا وہ ان پر اللہ کا ظلم نہ تھا بلکہ ان کا اپنا ظلم تھا جو انہوں نے خود اپنے اوپر کیا۔ ان کے کرتوتوں کی خرابیاں آخر کار ان کی دامن گیر ہو گئیں اور وہی چیزیں ان پر مسلط ہو کر رہیں جن کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ۔

یہ مشرکین کہتے ہیں "اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اس کے سوا کسی اور کی عبادت کرتے اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھیراتے [2]" ایسے ہی بہانے ان سے پہلے کے لوگ بھی بناتے رہے ہیں [3]۔ تو کیا رسولوں پر صاف صاف بات پہنچا دینے کے سوا اور بھی کوئی ذمہ داری ہے؟ ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا، اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ "اللہ کی

---

[1] یہ چند کلمے بطور نصیحت اور تنبیہ کے فرمائے جا رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک سمجھانے کا تعلق ہے، تم نے ایک ایک حقیقت پوری طرح کھول کر سمجھا دی ہے، دلائل سے ان کا ثبوت دے دیا ہے، کائنات کے پورے نظام سے اس کی شہادتیں پیش کر دی ہیں، اور شرک پر جمے رہنے کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اب یہ لوگ ایک صاف سیدھی بات کو مان لینے میں کیوں تامل کر رہے ہیں؟ کیا اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ موت کا فرشتہ سامنے آکھڑا ہو تو زندگی کے آخری لمحے میں مانیں گے؟ یا خدا کا عذاب سر پر آجائے تو اس کی پہلی چوٹ کھا لینے کے بعد مانیں گے؟

[2] مشرکین کی اس حجت کو سورۂ انعام رکوع ۱۸ کی آخری آیتوں میں بھی نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ وہ مقام اور اس کے حواشی اگر نگاہ میں رہیں تو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہو گی۔

[3] یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ آج تم لوگ اللہ کی مشیت کو اپنی گمراہی اور بداعمالی کے لئے حجت بنا رہے ہو، یہ تو وہی پرانی دلیل ہے جسے ہمیشہ سے بگڑنے ہوئے لوگ اپنے ضمیر کو دھوکا دینے اور ناصحوں کا منہ بند کرنے کے لئے استعمال کرتے رہتے ہیں۔

بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو[1] اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی[2]۔ پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہو چکا ہے[3]

(بقیہ حاشیہ ۱۵۸) یہ مشرکین کی حجت کا پہلا جواب ہے۔ اس کا پورا لطف اٹھانے کے لئے یہ بات ذہن میں رہنی ضروری ہے کہ ابھی چند سطریں پہلے مشرکین کے اس پروپیگنڈا کا ذکر گزر چکا ہے جو وہ قرآن کے خلاف یہ کہہ کہہ کر کیا کرتے تھے کہ "اجی، وہ تو پرانے قوموں کی فرسودہ کہانیاں ہیں" گویا ان کو نبی پر اعتراض یہ تھا کہ یہ صاحب نئی بات کونسی لائے ہیں، وہی پرانی باتیں دہرا رہے ہیں جو طوفان نوح کے وقت سے لیکر آج تک ہزاروں مرتبہ کہی جا چکی ہیں۔ اس کے جواب میں یہاں ان کی ایک دلیل (جسے وہ بڑے زور کی دلیل سمجھتے ہوئے پیش کرتے تھے) کا ذکر کرنے کے بعد یہ لطیف اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرات آپ ہی کون سے نادرن ہیں، یہ مایہ ناز دلیل جو آپ لائے ہیں اس میں قطعی کوئی اُپج موجود نہیں ہے، ایک دقیانوسی بات ہے جو ہزاروں برس سے گمراہ لوگ کہتے چلے آ رہے ہیں، اور آپ نے بھی اسی کو دُہرا دیا ہے۔

[1] یعنی تم اپنے شرک اور اپنی خود مختارانہ تحلیل و تحریم کے حق میں ہماری مشیت کو کیسے سند جواز بنا سکتے ہو جبکہ ہم نے ہر اُمت میں اپنے رسول بھیجے اور ان کے ذریعہ سے لوگوں کو صاف صاف بتا دیا کہ تمہارا کام صرف ہماری بندگی کرنا ہے، طاغوت کی بندگی کے لئے تم پیدا نہیں کئے گئے ہو۔ اس طرح جبکہ ہم پہلے ہی معقول ذرائع سے تم کو بتا چکے ہیں کہ تمہاری ان گمراہیوں کو ہماری رضا حاصل نہیں ہے، تو اس کے بعد ہماری مشیت کی آڑ لیکر تمہارا اپنی گمراہیوں کو جائز ٹھیرانا صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ تم چاہتے تھے کہ ہم سمجھانے والے رسول بھیجنے کے بجائے ایسے رسول بھیجتے جو ہاتھ پکڑ کر تم کو غلط راستوں سے کھینچ لیتے اور زبردستی تمہیں راست رو بناتے

[2] یعنی ہر پیغمبر کی آمد کے بعد اس کی قوم دو حصوں میں تقسیم ہوئی بعض نے اس کی بات مانی (اور یہ مان لینا اللہ کی توفیق سے تھا) اور بعض اپنی گمراہی پر جمے رہے۔

[3] یعنی تجربے سے بڑھ کر تحقیق کے لئے قابل اعتماد کسوٹی اور کوئی نہیں ہے، اب تم خود دیکھ لو کہ تاریخ انسانی کے پے در پے تجربات کیا ثابت کر رہے ہیں۔ عذاب الٰہی فرعون و آل فرعون پر آیا یا موسیٰ اور (باقی ۱۵۹ پر)

—— اے محمدؐ، تم چاہے ان کی ہدایت کے لئے کتنے ہی حریص ہو، مگر اللہ جس کو بھٹکا دیتا ہے پھر اسے ہدایت نہیں دیا کرتا اور نہ اس طرح کے لوگوں کی کوئی مدد کر سکتا ہے۔

یہ لوگ اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ "اللہ کسی مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہ اٹھائے گا"—— اٹھائیگا کیوں نہیں، یہ تو ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اور ایسا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اللہ ان کے سامنے اس حقیقت کو کھول دے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں، اور منکرینِ حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے[۱]۔ رہا اس کا امکان تو ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لئے

(بقیہ حاشیہ ۱۵۶) بنی اسرائیل پر؟ صالحؑ کے جھٹلانے والوں پر آیا یا ماننے والوں پر؟ ہودؑ اور نوحؑ اور دوسرے انبیاء کے منکرین پر آیا یا مومنین پر؟ کیا واقعی ان تاریخی تجربات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جن لوگوں کو ہماری مشیت نے شرک اور شریعت سازی کے ارتکاب کا موقع دیا تھا ان کو ہماری رضا حاصل تھی؟ اس کے برعکس یہ واقعات تو صریحاً یہ ثابت کر رہے ہیں کہ فہمائش اور نصیحت کے باوجود جو لوگ ان گمراہیوں پر اصرار کرتے ہیں انہیں ہماری مشیت ارتکابِ جرائم کا خوب خوب موقع دیتی رہی ہے تاکہ ان کا سفینہ اچھی طرح بھر کر ڈوبے۔

[۱] یہ حیات بعد الموت اور قیامِ حشر کی عقلی اور اخلاقی ضرورت ہے۔ دنیا میں جب سے انسان پیدا ہوا ہے حقیقت کے بارے میں بے شمار اختلافات رونما ہوئے ہیں۔ انہی اختلافات کی بنا پر نسلوں اور قوموں اور خاندانوں میں پھوٹ پڑی ہے۔ انہی کی بنا پر الگ نظریات رکھنے والوں نے اپنے الگ مذہب الگ معاشرے الگ تمدن بنائے یا اختیار کئے ہیں۔ ایک ایک نظریے کی حمایت اور وکالت میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے مختلف زمانوں میں جان، مال، آبرو، ہر چیز کی بازی لگا دی ہے۔ اور بے شمار مواقع پر ان مختلف نظریات کے حامیوں میں ایسی سخت کشاکش ہوئی ہے کہ ایک نے دوسرے کو بالکل مٹا دینے کی کوشش کی ہے، اور مٹنے والے نے مٹتے مٹتے بھی اپنا نقطۂ نظر نہیں چھوڑا ہے۔ عقل چاہتی ہے کہ ایسے اہم اور سنجیدہ اختلافات کے متعلق کبھی تو صحیح اور یقینی طور پر معلوم ہو کہ فی الواقع ان کے اندر حق کیا ہے اور باطل کیا، راستی پر کون ہے اور ناراستی پر کون۔ اس دنیا میں تو کوئی امکان اس پردے کے اٹھنے کا نظر نہیں آتا۔ اس دنیا (باقی صفحہ پر)

اس سے زیادہ کچھ کرنا نہیں ہوتا کہ اسے حکم دیں "ہو جا" اور بس وہ ہو جاتی ہے۔[1]
جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دیں گے
اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔[2] کاش جان لیں وہ مظلوم جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے

(بقیہ حاشیہ ص۱۵۵) کا نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ اس میں حقیقت پر سے پردہ اٹھ نہیں سکتا۔ لہٰذا لامحالہ عقل کے اس تقاضے کو پورا کرنے کیلئے ایک دوسرا ہی عالم درکار ہے۔

اور یہ صرف عقل کا تقاضا ہی نہیں ہے بلکہ اخلاق کا تقاضا بھی ہے۔ کیونکہ ان اختلافات اور ان کشمکشوں میں بہت سے فریقوں نے حصہ لیا ہے۔ کسی نے ظلم کیا ہے اور کسی نے سہا ہے۔ کسی نے قربانیاں کی ہیں اور کسی نے قربانیوں کو وصول کیا ہے، ہر ایک نے اپنے نظریے کے مطابق ایک اخلاقی فلسفہ اور ایک اخلاقی رویہ اختیار کیا ہے اور اس سے اربوں اور کھربوں انسانوں کی زندگیاں بُرے یا بھلے طور پر متاثر ہوئی ہیں۔ آخر کوئی وقت تو ہونا چاہئے جبکہ ان سب کا اخلاقی نتیجہ صلے یا سزا کی شکل میں مترتب ہو۔ اس دنیا کا نظام اگر صحیح اور مکمل اخلاقی نتائج کے ظہور کا متحمل نہیں ہے تو ایک دوسری دنیا ہونی چاہئے جہاں یہ نتائج ظاہر ہو سکیں۔

[1] یعنی لوگ سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ پیدا کرنا اور تمام اگلے پچھلے انسانوں کو یک وقت جِلا اٹھانا کوئی بڑا ہی مشکل کام ہے۔ حالانکہ اللہ کی قدرت کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے کسی ارادے کو پورا کرنے کے لئے کسی سروسامان، کسی سبب و وسیلے، اور کسی سازگاریٔ احوال کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا ہر ارادہ محض اس کے حکم سے پورا ہوتا ہے۔ اس کا حکم ہی سروسامان وجود میں لاتا ہے، اس کے حکم ہی سے اسباب و وسائل پیدا ہو جاتے ہیں، اس کا حکم ہی اس کی مراد کے عین مطابق احوال تیار کر لیتا ہے۔ اس وقت جو دنیا موجود ہے یہ بھی مجرد حکم سے وجود میں آئی ہے، اور دوسری دنیا بھی آناً فاناً صرف ایک حکم سے ظہور میں آسکتی ہے۔

[2] یہ اشارہ ہے اُن مہاجرین کی طرف جو کفار کے ناقابل برداشت مظالم سے تنگ آکر مکے سے حبش کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ منکرین آخرت کی بات کا جواب دینے کے بعد یکایک (باقی ص۱۵۷ پر)

ہیں کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں (کہ کیسا اچھا انجام ان کا منتظر ہے)۔

اے محمدؐ! ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے[1]۔ اہلِ ذکر سے پوچھ لو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے[2]۔ پچھلے رسولوں کو بھی ہم نے روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا، اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لئے اُتاری گئی ہے[3] اور تاکہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۶) مہاجرین حبشہ کا ذکر چھیڑ دینے میں ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے اس سے مقصود کفارِ مکہ کو متنبہ کرنا ہے کہ ظالمو! یہ جفا کاریاں کر چکنے کے بعد اب تم سمجھتے ہو کہ کبھی تم سے باز پرس اور مظلوموں کی دادرسی کا وقت ہی نہ آئے گا۔

[1] یہاں مشرکینِ مکہ کے ایک اعتراض کو نقل کیے بغیر اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ اعتراض وہی ہے جو پہلے بھی تمام انبیاء پر ہو چکا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین نے بھی آپ پر بارہا کیا تھا کہ تم ہماری ہی طرح کے انسان ہو پھر ہم کیسے مان لیں کہ خدا نے تم کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

[2] یعنی علماء اہلِ کتاب اور وہ دوسرے لوگ جو چاہے سکہ بند علماء نہ ہوں مگر بہرحال کتبِ آسمانی کی تعلیمات سے واقف اور انبیاء سابقین کی سرگزشت سے آگاہ ہوں۔

[3] تشریح و توضیح صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی، اور اپنی رہنمائی میں ایک پوری مسلم سوسائٹی کی تشکیل کر کے اور "ذکر الہٰی" کے منشا کے مطابق اُس کے نظام کو چلا کر بھی۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے وہ حکمت بیان کر دی ہے جس کا تقاضا یہ تھا کہ لازماً ایک انسان ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا جائے۔ "ذکر" فرشتوں کے ذریعہ سے بھی بھیجا جا سکتا تھا براہِ راست چھاپ کر ایک ایک انسان تک بھی پہنچایا جا سکتا تھا۔ مگر محض ذکر بھیج دینے سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت و ربوبیت اُس کی تنزیل کا تقاضا کرتی ہے۔ اُس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری تھا کہ اس ذکر کو ایک قابل ترین انسان لے کر آئے۔ وہ اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ جن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئے اس کا مطلب سمجھائے۔ جنہیں کچھ شک ہو ان کا شک رفع کرے

لوگ (خود بھی) غور و فکر کریں۔

(بقیہ حاشیہ ۴۶) شک رفع کرے جنہیں کوئی اعتراض ہو ان کے اعتراض کا جواب دے۔ جو نہ مانیں اور مخالفت اور مزاحمت کریں ان کے مقابلہ میں وہ رویہ برت کر دکھائے جو اس "ذکر" کے حاملین کی شان کے شایاں ہے۔ جو ماننے والے ان کی زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو کے متعلق ہدایات دے، ان کے سامنے خود اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر پیش کرے، اور ان کو انفرادی و اجتماعی تربیت دے کر ساری دنیا کے سامنے ایک ایسی سوسائٹی کو بطور مثال رکھ دے جس کا پورا اجتماعی نظام "ذکر" کے منشا کی شرح ہو۔

یہ آیت جس طرح اُن منکرینِ نبوت کی حجت کے لئے قاطع تھی جو خدا کا "ذکر" بشر کے ذریعہ سے آنے کو نہیں مانتے تھے، اُسی طرح آج یہ اُن منکرینِ حدیث کی حجت کے لئے بھی قاطع ہے جو نبی کی تشریح و توضیح کے بغیر صرف "ذکر" کو لے لینا چاہتے ہیں۔ وہ خواہ اس بات کے قائل ہوں کہ نبی نے تشریح و توضیح کچھ بھی نہیں کی تھی صرف ذکر پیش کر دیا تھا، یا اس کے قائل ہوں کہ ماننے کے لائق صرف ذکر ہے نہ کہ نبی کی تشریح، یا اس کے قائل ہوں کہ آب ہمارے لیے صرف ذکر کافی ہے نبی کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں، یا اس بات کے قائل ہوں کہ اب صرف ذکر ہی قابلِ اعتماد حالت میں باقی رہ گیا ہے نبی کی تشریح یا تو باقی ہی نہیں رہی یا باقی ہے بھی تو بھروسے کے لائق نہیں ہے، غرض ان چاروں باتوں میں سے جس بات کے بھی وہ قائل ہوں، ان کا مسلک بہرحال قرآن کی اس آیت سے ٹکراتا ہے۔ اگر وہ پہلی بات کے قائل ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی نے اس منشا ہی کو فوت کر دیا جس کی خاطر ذکر کو فرشتوں کے ہاتھ بھیجنے یا براہِ راست لوگوں تک پہنچا دینے کے بجائے اسے واسطۂ تبلیغ بنایا گیا تھا۔ اور اگر وہ دوسری یا تیسری بات کے قائل ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں نے (معاذ اللہ) یہ فضول حرکت کی کہ اپنا ذکر ایک نبی کے ذریعہ سے بھیجا، کیونکہ نبی کی آمد کا حاصل بھی وہی ہے جو نبی کے بغیر صرف ذکر کے مطبوعہ شکل میں نازل ہو جانے کا ہو سکتا تھا۔ اور اگر وہ چوتھی بات کے قائل ہیں تو دراصل یہ قرآن اور نبوتِ محمدی، دونوں کے نسخ کا اعلان ہے جس کے بعد اگر کوئی مسلک معقول باقی رہ جاتا ہے تو وہ صرف اُن لوگوں کا مسلک ہے جو ایک نئی نبوت اور نئی وحی کے قائل ہیں۔ (باقی صفحہ ۱۵۹ پر)

پھر کیا وہ لوگ جو (دعوتِ پیغمبر کی مخالفت میں) بدتر سے بدتر چالیں چل رہے ہیں اس بات سے بالکل ہی بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے، یا ایسے گوشے سے اُن پر عذاب لے آئے جدھر سے اس کے آنے کا ان کو سان گمان تک نہ ہو، یا اچانک چلتے پھرتے ان کو پکڑ لے، یا ایسی حالت میں انہیں پکڑے جبکہ انہیں خود آنے والی مصیبت کا کھٹکا لگا ہوا ہو اور وہ اس سے بچنے کی فکر میں چوکنے ہوں؟ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے یہ لوگ اس کو عاجز کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی نرم خو اور رحیم ہے۔

اور کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے کہ اس کا سایہ کس طرح اللہ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۸) اس لئے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ خود قرآن مجید کے مقصدِ نزول کی تکمیل کے لئے نبی کی تشریح کو ناگزیر ٹھیرا رہا ہے اور نبی کی ضرورت ہی اس طرح ثابت کر رہا ہے کہ وہ ذکر کے منشا کی توضیح کرے۔ اب اگر منکرینِ حدیث کا یہ قول صحیح ہے کہ نبی کی توضیح و تشریح دنیا میں باقی نہیں رہی ہے تو اس کے دو نتیجے کھلے ہوئے ہیں۔ پہلا نتیجہ یہ ہے کہ نمونۂ اتباع کی حیثیت سے نبوتِ محمدیؐ ختم ہو گئی اور ہمارا تعلق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف اُس طرح کا رہ گیا جیسا ہود اور صالح اور شعیب علیہم السلام کے ساتھ ہے کہ ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں، ان پر ایمان لاتے ہیں، مگر ان کا کوئی اُسوہ ہمارے پاس نہیں ہے جس کا ہم اتباع کریں۔ یہ چیز نئی نبوت کی ضرورت آپ سے آپ ثابت کر دیتی ہے۔ صرف ایک بے وقوف ہی اس کے بعد ختمِ نبوت پر اصرار کر سکتا ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اکیلا قرآن نبی کی تشریح و تبیین کے بغیر خود اپنے بھیجنے والے کے قول کے مطابق ہدایت کے لئے ناکافی ہے، اس لئے قرآن کے ماننے والے خواہ کتنے ہی زور سے چیخ چیخ کر اسے کافی قرار دیں، مدعی سست کی حمایت میں گواہانِ چست کی بات ہرگز نہیں چل سکتی اور ایک نئی کتاب کے نزول کی ضرورت آپ سے آپ خود قرآن کی رُو سے ثابت ہو جاتی ہے۔ قاتلہم اللہ۔ اس طرح یہ لوگ حقیقت میں انکارِ حدیث کے ذریعہ سے دین کی جڑ کھود رہے ہیں۔

حضور سجدہ کرتے ہوئے دائیں اور بائیں گرتا ہے؟ سب کے سب اس طرح اظہار عجز کر رہے ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جس قدر جاندار مخلوقات ہیں اور جتنے ملائکہ ہیں سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں۔ وہ ہرگز سرکشی نہیں کرتے، اپنے رب سے، جو ان کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے اسی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ع

سجدہ

اللہ کا فرمان ہے کہ "دو خدا نہ بنا لو، خدا تو بس ایک ہی ہے لہٰذا تم مجھی سے ڈرو۔" اُسی کا ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور خالصاً اُسی کا دین (ساری کائنات میں) چل رہا ہے۔ پھر کیا اللہ کو چھوڑ کر تم کسی اور سے تقویٰ کروگے؟

تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اسی کی طرف دوڑتے ہو۔ مگر جب اللہ اس وقت کو ٹال دیتا ہے

---

۱ یعنی تمام جسمانی اشیاء کے سائے اس بات کی علامت ہیں کہ پہاڑ ہوں یا درخت، جانور ہوں یا انسان، سب کے سب ایک ہمہ گیر قانون کی گرفت میں جکڑے ہوئے ہیں، سب کی پیشانی پر بندگی کا داغ لگا ہوا ہے، اُلوہیت میں کسی کا کوئی ادنیٰ حصہ بھی نہیں ہے۔

۲ یعنی زمین ہی کی نہیں، آسمانوں کی بھی وہ تمام ہستیاں جن کو قدیم زمانے سے لے کر آج تک لوگ دیوی، دیوتا اور خدا کے رشتہ دار ٹھیراتے آئے ہیں دراصل غلام اور تابعدار ہیں، ان میں سے بھی کسی کا خداوندی میں کوئی حصہ نہیں۔

ضمناً اس آیت سے ایک اشارہ اس طرف بھی نکل آیا کہ جاندار مخلوقات صرف زمین ہی میں نہیں ہیں بلکہ عالمِ بالا کے سیاروں میں بھی ہیں۔

۳ دو خداؤں کی نفی میں دو سے زیادہ خداؤں کی نفی آپ سے آپ شامل ہے۔

۴ دوسرے الفاظ میں اسی کی اطاعت پر اس پورے کارخانۂ ہستی کا نظام قائم ہے۔

۵ یا بالفاظِ دیگر کیا اللہ کے بجائے کسی اور کا خوف اور کسی اور کی ناراضی سے بچنے کا جذبہ تمہارے نظامِ زندگی کی بنیاد بنے گا؟

۶ یعنی یہ توحید کی ایک صریح شہادت تمہارے اپنے نفس میں موجود ہے۔

تو یکایک تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو اس مہربانی کے شکریے میں شریک کرنے لگتا ہے[1] تاکہ اللہ کے احسان کی ناشکری کرے۔ اچھا، مزے کر لو، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

یہ لوگ جن کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں[2] ان کے حصے ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے مقرر کرتے ہیں[3] ——— خدا کی قسم، ضرور تم سے پوچھا جائے گا کہ یہ جھوٹ تم نے کیسے گھڑ لیے تھے؟ یہ خدا کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں[4]۔ سبحان اللہ! اور ان کے لئے وہ جو یہ خود چاہیں[5]؟ جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اُس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے؟ ——— دیکھو کیسے برے حکم ہیں جو یہ خدا کے بارے میں لگاتے ہیں[6]۔ بری صفات سے متصف کیے جانے

---

[1] یعنی اللہ کے شکریہ کے ساتھ ساتھ کسی بزرگ یا کسی دیوی دیوتا کے شکریے کی بھی نیازیں اور نذریں چڑھانی شروع کر دیتا ہے اور اپنی بات بات سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے نزدیک اللہ کی اس مہربانی میں اُن حضرت کی مہربانی کا بھی دخل تھا، بلکہ اللہ ہرگز مہربانی نہ کرتا اگر وہ حضرت مہربان ہو کر اللہ کو مہربانی پر آمادہ نہ کرتے۔

[2] یعنی جن کے متعلق کسی مستند ذریعۂ علم سے انہیں یہ تحقیق نہیں ہوا ہے کہ اللہ میاں نے اُن کو واقعی شریکِ خدا نام زد کیا ہے، اور اپنی خدائی کے کاموں میں سے کچھ کام یا اپنی سلطنت کے علاقوں میں سے کچھ علاقے ان کو سونپ رکھے ہیں۔

[3] یعنی اُن کی نذر، نیاز اور بھینٹ کے لئے اپنی آمدنیوں اور اپنی اراضی کی پیداوار میں سے ایک مقرر حصہ الگ نکال رکھتے ہیں۔

[4] مشرکینِ عرب کے معبودوں میں دیوتا کم تھے، دیویاں زیادہ تھیں، اور ان دیویوں کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ اسی طرح فرشتوں کو بھی وہ خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔

کے لائق تو وہ لوگ ہیں جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے۔ رہا اللہ تو اس کے لئے سب سے برتر صفات ہیں، وہی تو سب پر غالب اور حکمت میں کامل ہے۔ اگر کہیں اللہ لوگوں کو ان کی زیادتی پر فوراً ہی پکڑ لیا کرتا تو روئے زمین پر کسی متنفس کو نہ چھوڑتا۔ لیکن وہ سب کو ایک وقتِ مقرر تک مہلت دیتا ہے، پھر جب وہ وقت آجاتا ہے تو اس سے کوئی ایک گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ آج یہ لوگ وہ چیزیں اللہ کے لئے تجویز کر رہے ہیں جو خود اپنے لئے انہیں ناپسند ہیں، اور جھوٹ کہتی ہیں ان کی زبانیں کہ ان کے لئے بھلا ہی بھلا ہے۔ ان کے لئے تو ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے دوزخ کی آگ، ضرور یہ سب سے پہلے اس میں پہنچائے جائیں گے۔

خدا کی قسم، اے محمدؐ، تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں میں ہم رسول بھیج چکے ہیں (اور پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے کہ) شیطان نے ان کے برے کرتوت انہیں خوشنما بنا کر دکھائے (اور رسولوں کی بات انہوں نے مان کر نہ دی)۔ وہی شیطان آج ان لوگوں کا بھی سرپرست بنا ہوا ہے اور یہ دردناک سزا کے مستحق بن رہے ہیں۔ ہم نے یہ کتاب تم پر اس لئے نازل کی ہے کہ تم ان اختلافات کی حقیقت ان پر کھول دو جن میں یہ پڑے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب رہنمائی اور رحمت بن کر اتری ہے ان لوگوں کے لئے جو اسے مان لیں۔[۱]

(حاشیہ ۵۶ صفحہ سابق) یعنی اپنے لئے جس بیٹی کو یہ لوگ اس قدر موجبِ ننگ و عار سمجھتے ہیں اسی کو خدا کے لئے بلا تأمل تجویز کر دیتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ خدا کیلئے اولاد تجویز کرنا بجائے خود ایک شدید جہالت اور گستاخی ہے، مشرکین عرب کی اس حرکت پر یہاں اس خاص پہلو سے گرفت اس لئے کی گئی ہے کہ اللہ کے متعلق ان کے تصورات کی پستی واضح کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ مشرکانہ عقائد نے اللہ کے معاملہ میں ان کو کس قدر جری اور گستاخ بنا دیا ہے اور وہ کس قدر بے حس ہو چکے ہیں کہ اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے کوئی قباحت تک محسوس نہیں کرتے۔

[۱] دوسرے الفاظ میں، اس کتاب کے نزول سے ان لوگوں کو اس بات کا بہترین موقع ملا ہے کہ اوہام اور تقلیدی تخیلات کی بنا پر جن بے شمار مختلف مسلکوں اور مذہبوں میں یہ بٹ گئے ہیں ان کے بجائے صداقت کی ایک ایسی پائیدار بنیاد پالیں جس پر یہ سب متفق ہو سکیں۔ اب جو لوگ اتنے بے وقوف ہیں کہ اس نعمت کے آجانے پر بھی اپنی سابقہ حالت ہی کو ترجیح دے رہے ہیں وہ تباہی اور ذلت کے سوا اور کوئی انجام دیکھنے والے نہیں ہیں۔ اب تو سیدھا راستہ وہی پائیگا اور وہی برکتوں اور رحمتوں سے مالا مال ہوگا جو اس کتاب کو مان لیگا۔

عہد نبوت کے عمرانی اور تمدنی مسائل

(حکیم حیدر زمان صاحب صدیقی)

(قسط دوم)

نظامِ تمدن کی ہیئت ناکیاں انسانی تمدن و اجتماع اگر کسی پاکیزہ اور بلند اخلاقی تصور پر مبنی نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ بہیمانہ طبقاتی نزاع، خود غرضانہ گروہ بندی، ملت کش مفاد پرستی، ظالمانہ سیاست اور معاشی ناہمواریوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس بات کو کوئی مانے یا نہ مانے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ایسا پاکیزہ نصب العین دینِ حق کے سوا کسی دوسری جگہ سے دستیاب نہیں ہوتا اور جہاں دین کی روح کا فقدان ہو وہاں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان اپنے مقصدِ وجود اور حقیقی نصب العین کو جان سکے لیکن سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ سردارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی تمام قومیں دین کی حقیقی روح سے محروم اور لذتِ حق پرستی سے ناآشنا تھیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی سیاست و معیشت اور عمران و تمدن کا پورا نظام انتشار و فساد کی نذر ہو گیا تھا ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الآیہ)

انسانی تاریخ کا یہ دور غیر الٰہی حاکمیت کے جبر و استبداد، سرمایہ پرستانہ ذہنیت کی سفاکی، ظالمانہ اور فاسقانہ معاشرت اور ہمہ گیر فسادِ انسانیت کا ایک ایسا ہیجانی دور تھا جس کی مثال ماضی کی پوری تاریخ میں بمشکل ہی مل سکتی ہے۔ بادشاہوں کی قبائیں فاقہ کش اور مفلوک الحال عوام کے خونِ ناحق سے رنگین تھیں ایوان کے تحت زرنگار ہزاروں انسانوں کی لاشوں پر بچھائے گئے تھے۔ امراء و حکامِ ملک کا خون چوس رہے تھے، چاروں طرف ظلم و معصیت کا طوفان بپا تھا، قلب و نظر کی صلاحیتیں مٹ گئی تھیں، نیکی کو برائی اور برائی کو نیکی تصور کیا جانے لگا تھا۔ انسانی طبائع شر و فساد سے مانوس ہو گئی تھیں اور اخلاق و شرافت کے لئے دنیا کے کسی گوشہ میں پناہ گاہ نہ رہی تھی اور حد یہ کہ چند گنے چنے انسانوں کو چھوڑ

کہ کسی انسانی دل میں حق کی طلب و جستجو کی خواہش ہی باقی نہ رہی تھی ۔

مشرق خراب و مغرب ازاں بیشتر خراب عالم تمام مردہ و بے ذوق جستجو

یہ حالات تھے جن میں خالق کائنات نے اپنے آخری نبی حضرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ذریعہ اس ظلمت کدۂ عالم کو نورِ ہدایت سے روشن کیا ۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی اقوام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مفاسد کا سرسری جائزہ لیا جائے تاکہ اس سے اندازہ ہو سکے کہ آنحضرت صلعم کے زمانۂ بعثت میں اجتماعی اور تمدنی مسائل کی نوعیت کیا تھی اور آپ کو کن کن عملی مسائل سے سابقہ پڑا ؟ اس کے بعد ہم کسی ایک نتیجہ پر پہنچ سکیں گے کہ عصرِ حاضر کے انسانی مسائل وہی ہیں جو اس دور میں تھے یا اُن سے مغائر ہیں ؟

زہرناک قومی تعصب اور بے قید سیاست : بعثت نبوی کے وقت دنیا کی تمام چھوٹی بڑی قوموں کا اجتماعی کردار پستی کی انتہائی حد کو پہنچ گیا تھا ۔ ان کی سیاست بے اصولے پن، نسل کشی، قومی عصبیت، تخریب پسندی، سفاکانہ حملہ و ہجوم اور بے دردانہ قتل و غارت کے لئے وقف تھی اور ان کے معاشی منصوبوں کا انحصار آوارہ گردی، غارت گری اور لوٹ مار کی متنوع اسکیموں پر تھا اور ان کی معاشرت ظالمانہ اور انسانیت کُش قوانین پر مبنی تھی چنانچہ اس دور کی متمدن قوموں، روم و ایران اور ہند و چین کے حالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو حیرانی ہوتی ہے کہ اگر تہذیب و تمدن اسی کا نام ہے تو پھر وحشت و بہیمیت کے لئے کونسا نام تجویز کیا جائے ؟

روما کی حکومت اس وقت دو بازوؤں میں تقسیم ہو چکی تھی ۔ مغربی بازو اور مشرقی بازو ۔ مغربی بازو اخلاقی طور پر تسفل و انحطاط کے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکا تھا چنانچہ مشہور مسیحی مورخ گبن لکھتا ہے : اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو ان کی تباہی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال و تباہی سے نہیں بچا سکتی تھی ۔

نیز یہی مورخ مذکور لکھتا ہے ــــ رومی حکومت مخالفین کی نظر میں مذہبی منشیات مسکرات اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالم اور ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی ۔ کفایت شعاری [illegible] تھی ۔

اس دور میں کلیسا کی جانب سے سب اخلاقی پستی جاری تھی اور جس نسبت سے کلیسا کے مصائب بڑھ رہے تھے اسی نسبت سے ٹیکسوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا[1]۔

اس سیاسی بدنظمی یا اخلاقی پستی کا نتیجہ تھا کہ جرمنی کی وحشی اقوام نے مغربی بازو کو کچل کر رکھ دیا اور گو ان حملہ آور جرمنوں نے عیسائیت قبول کر لی مگر قبول مذہب ان کے سفاکانہ اور وحشیانہ مظالم میں کمی نہ کر سکا۔

سلطنت روما کے مشرقی بازو کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی چونکہ اس کی سرحدیں مملکت ایران سے ملتی تھیں اس لئے یہ ہمیشہ اہل ایران سے الجھا رہا اور پے بہ پے جنگوں نے اس کو بالکل نچوڑ دیا تھا۔ عہد نبوی کے آغاز میں ایرانیوں نے اہل روم کو عبرتناک شکست دی تھی اور ان کے اہم صوبوں مصر و شام و فلسطین پر قبضہ کر لیا تھا اور ۶ھ یعنی صلح حدیبیہ کے زمانہ میں رومیوں نے اہل ایران کو ایسی شکست دی کہ وہ پھر کبھی نہ سنبھل سکے لیکن بیزنطینیوں کے داخلی مفاسد نے ان کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اس فتح عظیم سے فائدہ اٹھاتے۔

رومیوں اور ایرانیوں کی خونریز لڑائیوں میں جو چیز سب سے زیادہ افسوسناک تھی وہ یہ ہے کہ ان کی قومی عصبیت اور مذہبی جنون اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ انسانیت و شرافت کی کوئی قدر ان کی نظر میں مستحق احترام نہ رہی تھی اور مذہب و اخلاق کی پامالی کا خوفناک سے خوفناک منظر بھی ان کے دلوں کو پسیجنے کے لئے کافی نہ تھا۔ چنانچہ خسرو پرویز نے جب فلسطین پر حملہ کیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو نذر آتش کر دیا اور بے دردی سے ہزارہا عیسائیوں کو تہ تیغ کیا۔ اور جو بچے کھچے تھے ان کو گرفتار کر لیا۔ اسی طرح رومی سلطنت کے حکمران ہرقل نے جب شمال کی طرف سے ایران پر حملہ کیا تو اس نے بھی جوابی طور پر مجوسیوں کے آتشکدوں کو برباد کیا اور لاکھوں انسانوں کا خون بہایا۔

یہ کوئی اتفاقی واقعات نہ تھے بلکہ یہ وحشت و بہیمیت اس دور کی اقوام کے قومی کردار کا

---

[1] [illegible]

جنونا نیفک بن گئی تھی اور اس سے پہلے بھی بارہا اس قسم کے واقعات منظر عام پر آ چکے تھے۔ چنانچہ رسول عربی صلعم کی ولادت سے ایک سو سال پہلے کا ایک واقعہ جس کو اسلامی مورخین نے قلمبند کیا ہے یہ ہے کہ یمن کے ذونواس نامی یہودی بادشاہ نے نجران کے عیسائیوں کو جبری حکم دیا تھا کہ وہ عیسائیت چھوڑ کر یہودی بن جائیں اور اہل نجران کے انکار پر اس نے نجرانی عیسائیوں کو آگ کے دہکتے ہوئے شعلوں میں دھکیل دیا تھا۔[1] نجران کے کچھ لوگ جو اس آزمائش سے بچ نکلے تھے حبشہ کے نجاشی کے پاس پہنچے اور داستان ظلم پوری کی پوری سنائی، نیز انجیل کے جلے ہوئے اوراق بھی دکھائے اور نجاشی سے انتقام کی درخواست کی۔ اس پر نجاشی نے قیصر سے مدد طلب کی اور بہت بھاری مسلح فوج لے کر یمن پر حملہ آور ہوا، ذونواس کو عبرتناک شکست ہوئی اور اب یمن پر باقاعدہ عیسائی حکومت قائم ہو گئی۔ لیکن ان عیسائی حکمرانوں میں سے ابرہہ نامی ایک حکمراں نے آنحضرت صلعم کی ولادت سے کچھ ہی دن پہلے کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی غرض سے مکہ پر چڑھائی کی تھی جس کا اجمالی ذکر قرآن حکیم میں بھی موجود ہے۔

عیسائی حکومتوں میں یہودیوں پر جو مظالم ڈھائے جاتے تھے ان کے تصور ہی سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ خود پیروان مسیحؑ کئی فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر فرقہ اتنا متعصب اور تنگ نظر تھا کہ دوسرے فرقوں کی جان اور مال اس کے دست تعدی سے محفوظ نہ رہتے تھے یہاں تک کہ برسر اقتدار طبقہ نے دوسرے فرقوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا چنانچہ گبن لکھتا ہے جب حکمراں طبقہ سے مسلمانوں کی جنگ شروع ہوئی تو دوسرے فرقوں کے عیسائیوں نے باہر سے آنے والے اجنبی مسلمانوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور جی کھول کر اپنے ہم مذہبوں کے خلاف مسلمانوں کو مدد دی اور مسلمانوں کے ماتحت رہنا ان کو دوسرے عیسائی فرقوں کے ماتحت رہنے سے اچھا معلوم ہوتا تھا۔[2]

آنحضرت کی بعثت کے وقت چین اور ہندوستان جو ایشیائی ممالک میں اپنی قدیم تہذیب اور تاریخی عظمت کے اعتبار سے ممتاز سمجھے جاتے تھے، ایک عبوری دور سے گذر رہے تھے اور نہایت

[1] طبری ص ۹۲۵۔ [2] تاریخ زوال و انحطاط روما۔

خطرناک قسم کی خانہ جنگیوں میں مبتلا تھے۔ ہند کے برہمنوں اور بدھ ازم کے علمبرداروں میں ایک مدت سے کشمکش چل رہی تھی اور بالآخر برہمنیت کے جبر و تشدد نے بدھ ازم کو ملک بدر کر دیا تھا اور آخر الذکر نے چین میں جا پناہ لی تھی۔ لیکن چین میں پہلے سے فتنوں کی بھرمار تھی اور بڑی مشکل سے اس کو وہاں قدم جمانے کی اجازت ملی۔

یہ تو دوسری اقوام کے حالات تھے لیکن خود عرب قوم جس میں آنحضرت صلعم پیدا ہوئے اجتماعی اور سیاسی اعتبار سے اس کی حالت بھی کچھ کم تشویشناک نہ تھی۔ یہ ایسی خودسر قوم تھی کہ اس میں قومی مرکزیت کا کبھی احساس ہی نہیں پیدا ہوا تھا اور اس وجہ سے یہاں کوئی متحدہ عرب اسٹیٹ قائم نہ ہو سکا تھا۔ اس ملک میں سینکڑوں قبائل آباد تھے اور ہر قبیلہ آزاد و خود مختار تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں اعیانیت کے طرز کی شہری مملکتیں قائم تھیں۔ پڑوس کے حکمرانوں کی للچائی ہوئی نگاہیں گاہے گاہے اس آزاد خطہ ارضی کی طرف اٹھتی رہیں اور شاہان روم و ایران کی طرف سے بارہا کوشش کی گئی کہ اس خودسر قوم کو ہتھیا لیا جائے۔ لیکن وہ اس میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ چنانچہ عثمان بن الحویرث کو جب قیصر نے مکہ کی بادشاہت کی سند عطا کی اور اس نے واپس آکر مکہ میں اعیان قریش کے اجتماع میں قیصر کا پیغام سنایا تو اس بات کے باوجود کہ اہل مکہ کا معاشی مفاد اہل روم و شام سے وابستہ تھا، انہوں نے کھلے طور پر انکار کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ اہل مکہ ہمیشہ سے آزاد و خود مختار رہے ہیں اور وہ ہرگز کسی کی آمریت کو پسند نہیں کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیصر نے مکہ والوں کو شام کے تجارتی سفر سے روک دیا، مگر یہ انتقامی اقدام بھی اہل مکہ کو بیرونی طاقت کی غلامی پر مجبور نہ کر سکا۔ غرض عربوں میں ایک طرف اگر یہ خوبی تھی کہ وہ حریت نواز اور جمہوریت پسند تھے تو دوسری طرف مرکزیت کے فقدان نے ان میں انتہائی درجہ کی بہیمیت و خودسری اور قبائلی عصبیت پیدا کر دی تھی اور اس جاہلی عصبیت نے سرزمین عرب کو صدیوں تک قتل و غارت اور سفاکی و خون آشامی کی آماجگاہ بنائے رکھا۔ اس ملک میں انسانی جان کی قیمت مکھی اور مچھر کے برابر بھی نہ تھی۔

نیز آزادانہ بدوی زندگی نے عربوں میں کچھ اچھے جوہر بھی پیدا کر دیئے تھے مثلاً ہمت، پامردی،

شجاعت وثبات، عزتِ نفس، فیاضی کی قسم کی صفات ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھیں لیکن زندگی کا کوئی پاکیزہ تصور نہ ہونے کی وجہ سے ان کی یہ صفات اصلاح و تعمیر کی بجائے تخریب انسانیت کے لئے استعمال ہو رہی تھیں۔ ایک قبیلہ کے لوگ دوسرے قبیلہ والوں سے نہایت حقیر اور معمولی بات پر الجھ جاتے اور دونوں کی طرف سے سینکڑوں انسانی لاشیں فرشِ خاک پر ڈھیر ہو جاتیں چنانچہ بکر و تغلب کی مشہور لڑائی جو حرب بسوس کے نام سے متعارف ہے صرف اتنی سی بات پر چھڑ گئی تھی کہ بسوس نامی عورت کی اونٹنی دوسرے فریق کی چراگاہ میں داخل ہوئی اور اس نے پناہ دیتے ہوئے پشتوں کے اڈے توڑ دیئے۔ اس پر کلیب وائل نے اونٹنی کو ہلاک کر دیا اور اس کے نتیجہ میں بکر اور تغلب کی جنگ چھڑ گئی جو چالیس سال تک جاری رہی۔

قبیلوی عصبیت نے ان کو خیر و شر اور نیک و بد کے احساس و شعور سے بالکل بے نیاز کر دیا تھا۔ قتل و غارتگری، ظلم و معصیت، فحش کاری اور دیگر جرائم ان کی نگاہ میں عیب نہ تھے بلکہ قابل فخر کارنامے تصور کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر اپنی نسبت لکھتا ہے۔

وانی لا ازال اخا حروب ــــ اذا لم اجن کنت مجن جان

آنحضرت صلعم کے ایام جوانی میں قریش اور قبیلہ قیس کے درمیان بڑے عرصہ تک جنگ جاری رہی جو فجار کے نام سے مشہور ہے اس جنگ نے دونوں طرف سے کئی خاندان برباد کر دیئے تھے۔ مدینہ کے قبائل اوس اور خزرج ہمیشہ باہم جنگ آزما رہتے تھے اور زمانہ بعثت سے کچھ ہی عرصہ پہلے بعاث کی لڑائی سے فارغ ہوئے تھے۔

غرض عرب کی داخلی سیاست کی اصلاح کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہ تھا جو کسی سیاسی رہنما کی ذہنی اپج سے حل ہو جاتا، اور اس پر مستزاد یہ کہ عرب کا محل وقوع بھی ایسا تھا کہ وہ ہر طرف سے اپنے وقت کی بڑی طاقتوں میں گھرا ہوا تھا۔ اور ان متمدن طاقتوں کے سیاسی اور معاشی دباؤ سے عرب بڑی حد تک متاثر تھے۔ اس کی تفصیل کے لئے عرب کے تاریخی پس منظر کو سامنے لانا ضروری ہے۔ عرب کسی زمانہ میں ایشیا و یورپ کے ممالک کے لئے تجارتی گزرگاہ کی حیثیت رکھتا تھا اور ...

زیست کا ذریعہ بھی بیرونی تجارت ہی تھی۔ عرب ہمیشہ سے تجارت کی غرض سے بیرونی ممالک مصر و شام، مشرقی افریقہ، عراق و فلسطین اور ہند و چین کا سفر کرتے تھے بلکہ عرب کی قدیم تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مردم خیز خطۂ ارضی اپنے باشندوں کو آب و دانہ کے لئے ہمیشہ باہر دھکیلتا رہا ہے۔ اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ عرب کی سرزمین کا بڑا حصہ پیداوار کی کمی کی وجہ سے خود مکتفی نہ تھا اور ان لوگوں کو طوعاً و کرہاً معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے اپنی بے آب و گیاہ مرز بوم کو چھوڑ کر سرسبز و شاداب ممالک کا رُخ کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ عرب کی قدیم ترین تاریخ گواہ ہے کہ حضرت مسیحؑ سے دو تین ہزار سال قبل عرب کی کچھ قومیں صحرائے عرب سے نکل کھڑی ہوئیں اور انسانی آبادیوں کو پامال کرتی ہوئی آندھی کی طرح آناً فاناً دنیا کے بہت بڑے حصہ پر چھا گئیں۔ ان قوموں نے بیشتر ممالک مثلاً مصر و شام، مشرقی افریقہ، ایران و عراق، قرطاجنہ، کریٹ اور یونان کو زیر نگیں کیا اور بڑی بڑی مملکتیں قائم کیں۔ چنانچہ ابن خلدون نے لکھا ہے:۔

وکان لھذہ الامم ملوك ودول فی	ان اقوام میں کئی بادشاہ ہو گزرے ہیں، جزیرۂ عرب
جزیرۃ العرب وامتد ملکھم فیھا الی شام	میں ان کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم تھیں اور ان کے کچھ
ومصر فی شعوب منھم (تاریخ ابن خلدون جلد ۲)	قبائل کی وسعت مملکت مصر و شام تک پہنچ گئی تھی۔

یہ قومیں وہی ہیں جن کو قرآن حکیم نے عاد اُولیٰ کے نام سے موسوم کیا ہے اور قدیم عربی تاریخ میں عرب عاربہ (خالص عرب) اور عرب بائدہ (تباہ ہونے والے عرب) کے ناموں سے متعارف ہیں۔ اور اُمم سامیہ اُولیٰ میں سے جو لوگ عرب ہی میں رہ گئے تھے انہوں نے عرب کے شمال میں عظیم مملکت قائم کی تھی۔ قرآن حکیم نے ان کو "ثمود" کا نام دیا ہے۔

زمانہ کی نیرنگیوں نے قوموں کو ایک ہی حال میں کب رہنے دیا ہے؟ شاید یہ بات منشائے خداوندی کے خلاف ہے کہ ایک ہی قوم ہمیشہ کے لئے انسانی دنیا پر مسلط رہے، اس لئے اس قوم کا اقتدار بھی آخر کچھ حامی النسل قوموں کے ہاتھوں ختم ہوا۔

یقال انھم انتقلوا الی جزیرۃ العرب	کہا جاتا ہے کہ وہ بابل سے جزیرۂ عرب کی طرف منتقل ہو
من بابل لما زاحمھم فیھا بنو حام۔ (کتاب العبر جلد ۱)	گئے جبکہ حامی النسل لوگوں نے ان کو مار بھگایا۔

اسی طرح مصر میں قبطی اقوام نے نئی حکومت قائم کر لی اور دوسرے ممالک میں بھی ان کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس کے بعد عراق و یمن و شام میں مختلف قومیں برسرِ حکومت رہیں۔ یہاں تک کہ رومی عیسائی سلطنت نے مصر و شام اور فلسطین پر تسلط قائم کر لیا۔ اور عراق و یمن اہل فارس کے زیرِ نگیں آ گئے۔ لیکن چونکہ ایران و روم میں مسلسل آویزش رہتی تھی اور اس کے علاوہ عرب کے خانہ بدوش بدوی قبائل عراق اور شام میں داخل ہو کر لوٹ مار کرتے تھے اس لئے ایرانی حکومت نے مصلحت اندیشی کے طور پر عراق میں عرب اسٹیٹ قائم کر دیا اور رومانے دمشق میں عربوں کی ایک ریاست قائم کر دی۔ یہ ریاستیں جن سیاسی اغراض کے لئے قائم ہوئی تھیں اُن کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوئیں اور نہ صرف یہ کہ ان سرحدی ریاستوں نے حاجز مملکت (بفر اسٹیٹ) کا کام دیا اور ایرانی و بیزنطینی عرب بدوؤں کے غارت گرانہ حملوں سے محفوظ ہو گئے بلکہ ایران و روم کی جنگوں میں ان ریاستوں کے لوگ اپنے اپنے اقتدارِ اعلیٰ کے ماتحت سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور میدانِ جنگ میں پیش پیش رہتے تھے۔ بالآخر بیزنطینیوں کا اثر و نفوذ یہاں تک بڑھا کہ شمالی عرب کے بہت سے قبائل مثلاً دومۃ الجندل، اذرح، جربا وغیرہ نے عیسائیت قبول کر لی۔ اور بیزنطینی حکومت نے یہاں بھی کچھ عرب سرداروں کی ریاستیں قائم کر دیں اور اس طرح اس نے اپنے آپ کو محفوظ بنا لیا تھا۔ اسی طرح عراق اور یمن پر ایرانی تسلط بھی دعوتِ نبوی کے لئے مستقل خطرہ تھا۔

غرض عرب کی خارجی سیاست کچھ اس قدر پیچیدہ تھی کہ محض سیاسی بصیرت اور عقل و تدبیر سے اس کو حل نہ کیا جا سکتا تھا بلکہ اس کے لئے پیغمبرانہ بصیرت اور الہامی طریقِ کار کی ضرورت تھی۔ مذکورہ مسائل کے علاوہ عرب اور بیرونِ عرب کا معاشی مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت نہ رکھتا تھا اور یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جو ملک سیاسی لحاظ سے شدید انتشار و ابتری کا شکار ہو یلپے بہ پے جنگوں نے اس کے ملکی نظام کو درہم برہم کر دیا ہو وہاں معاشی خوشحالی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر امرا اور حکومت میں دولت کی نامساویانہ تقسیم ایک ناگزیر اور طبعی چیز ہے اور ظاہر ہے کہ اس وقت تمام دنیا کی قومیں مطلق العنان حکمرانوں یا قبائلی سرداروں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی تھیں۔

یہ باتیں تو تمام ممالک میں مشترک تھیں لیکن عرب کا معاشی مسئلہ دوسرے ممالک کی نسبت سے

زیادہ اُلجھا ہوا تھا بلکہ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ملک کے پیداواری وسائل کے فقدان نے عربوں کو
پریشان حال رکھا۔ اس ملک کی پیداوار کھجور تھی۔ بعض علاقوں میں غلہ کی کاشت ہوتی تھی لیکن وہ اتنی نہ
دوسرے علاقوں کے لئے برآمد کی جا سکے، نیز بکریوں اور اونٹنیوں کا دودھ بھی صحرائی لوگوں کی غذا کے
آتا تھا۔ زیادہ تر یہ لوگ لوٹ مار اور غارت گری کے ذریعہ تن پروری کے لئے ایندھن مہیا کرتے تھے۔
...دن نے لکھا ہے کہ اگر ان کو چولھے کے لئے پتھر کی ضرورت ہوتی تو کسی مکان کی دیوار توڑ ڈالتے اور
...ں کی ضرورت پڑتی تو کسی مکان کی چھت اکھاڑ لیتے۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری اخلاقی نقطۂ نظر
...تنی ہی معیوب کیوں نہ ہو لیکن ان کی نظر میں معیوب نہ تھی بلکہ ان کو اپنے اس ظالمانہ کردار پر ناز
...اس کے علاوہ کچھ لوگوں کا ذریعۂ معاش بیرونی ممالک کی تجارت تھی۔

...نیز ملک کے طول و عرض میں یہودی سرمایہ دار پھیلے ہوئے تھے۔ تجارت کی اہم منڈیوں پر ان کا
...ھا اور اس کے علاوہ یہ لوگ وسیع پیمانہ پر سودی کاروبار بھی کرتے تھے، عرب عوام ان کے قرضوں
...سے دبے ہوتے تھے اور یہودی بنئے نہایت گراں شرح سود پر قرضے دیتے تھے۔ ان زردہ
...انسانوں کی سنگ دلی کا یہ حال تھا کہ ضمانت کے طور پر لوگوں کے بچوں اور عورتوں کو گرو رکھتے تھے
...س اجمالی بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس ملک کے عوام کی معاشی زندگی حد درجہ پست
...ہم کو اس خوفناک افلاس و فاقہ مستی سے نکالنا ملک کا اہم اجتماعی و ملی سوال تھا۔

...ربوں کے معاشرتی رسم و رواج اور اخلاقی و مجلسی مفاسد اس درجہ گہرے اور خطرناک تھے کہ عام
...میں ان کی اصلاح کی کوئی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ بلند و پست، اونچ نیچ اور شریف و وضیع کا امتیاز
...ئی روایات میں غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا اور اخلاقی و مجلسی مفاسد کی تو کوئی حد ہی نہ تھی یہ مسئلہ
...مستقل موضوع بحث ہے اور اس کے تفصیلی گوشوں سے بحث کرنا اس موقع پر مشکل ہے یہاں
ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔

...طائف کی سفارت نے جب آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف باریابی حاصل کیا
...ہ کہا ہم اس شرط پر اسلام قبول کرتے ہیں کہ ہمارے یہ مطالبات تسلیم کئے جائیں پہلے یہ کہ زنا

ہمارے لئے جائز رکھی جائے کیونکہ ہم میں اکثر لوگ مجرد زندگی بسر کرتے ہیں اور زنا کے بغیر ان کو چارہ نہیں۔ دوسرے شراب سے منع نہ کیا جائے کیونکہ یہ ہماری قومی تجارت ہے۔ تیسرے سودی کاروبار کی ممانعت سے ہمیں مستثنیٰ کیا جائے کیونکہ یہ ہمارا ذریعۂ معاش ہے۔ آنحضرت صلعم نے یہ تمام شرطیں نامنظور کیں۔ لیکن اس واقعہ سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی مجلسی زندگی کس قدر بے لگام اور معصیت آلود تھی۔

عرب کے علاوہ دوسرے ممالک کا بھی یہی حال تھا۔ مثال کے طور پر ہندوستان ہی کو لیجئے۔ یہاں ذات پات کی تفریق اور نامنصفانہ مجلسی قوانین نے آبادی کو کئی طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کسی اونچی ذات کا مرد اگر کسی نیچی ذات کی عورت سے زنا کرتا تو اس کے لئے کوئی سزا نہ تھی لیکن کسی اعلیٰ ذات کو اچھوت نسل کا آدمی چھو لیتا تو اس کی سزا موت تھی۔ اس ملک کی اخلاقی پستی کا یہ عالم تھا کہ عورتیں جوئے میں ہاری جاتی تھیں۔ ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے۔ قومی تہواروں میں شراب کے دور چلتے تھے اور نشہ کی حالت میں ماں، بہن اور بیٹی کی تمیز نہ رہتی تھی اور اس پر طرفہ یہ کہ اس کام کو نیکی کا کام تصور کیا جاتا تھا۔

یہود کے اخلاقی اور مجلسی مفاسد کو قرآن حکیم نے بالوضاحت بیان کیا ہے۔

نتائج بحث و فکر گذشتہ بحث سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ رسول عربی صلعم کی بعثت کے وقت انسانی زندگی کے اجتماعی مفاسد کیا تھے؟ ان مفاسد پر دوبارہ سرسری نگاہ ڈالئے تاکہ آپ کو ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکے کہ عصر حاضر کے اجتماعی مفاسد کو اس دور کے مفاسد سے کیا نسبت ہے؟

(۱) بے مقصد اور بے روح مذہبیت: یعنی اس دور کی تمام قومیں اگرچہ کسی نہ کسی مذہب کی پیرو تھیں، لیکن اس کے باوجود ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی دین کی روح سے بالکل تہی مایہ تھی اور یہی وہ بنیادی فساد تھا جس نے ان لوگوں کی نگاہ سے زندگی کا حقیقی تصور بالکل اوجھل کر دیا تھا۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو دیگر تمام مفاسد کا سرچشمہ یہی ہے۔

(۲) شدید نسلی و قومی تعصب۔ اس دور میں سطح ارضی پر سینکڑوں چھوٹی بڑی قومیں آباد تھیں

اور ہر قوم اس زعم میں مبتلا تھی کہ عظمت و شرف اور فضیلت و منقبت کے تمام محاسن و کمالات صرف اسی کے لئے مخصوص ہیں اور دوسرے لوگ محض اس کی محکومی اور تابعداری کے لئے پیدا ہوئے ہیں یعنی ہر قوم یہ عقیدہ رکھتی تھی کہ مخلوق خدا پر خدائی کرنے کا حق اسی کو حاصل ہے اور دوسری قوموں کا بس یہی کام ہے کہ اس کی بندگی کریں۔

(۳) بے قید سیاست یعنی اس دور میں زندگی کا اجتماعی اور سیاسی نظام دین کی پابندی سے بالکل آزاد تھا اور اس ثنویت نے قوموں کی اجتماعی زندگی میں مہلک جراثیم پیدا کر دیے تھے۔

(۴) دولت کی نامنصفانہ تقسیم۔

(۵) ظالمانہ معاشرتی اور مجلسی رسم و رواج۔

اس تفصیل سے آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اس دور کے عملی مسائل کیا تھے اور اس بات کو سمجھنا بھی کچھ مشکل نہیں کہ دورِ حاضر کے عملی مسائل بنیادی حیثیت سے دورِ رسالت کے مسائل سے مختلف نہیں ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ چودہ سو سال پہلے کے انسانی دور اور موجودہ دور میں کچھ فرق نہیں ہے۔ یقیناً فرق ہے اور ہونا چاہئے۔ لیکن سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے کہ انسانیت کے حقیقی اور بنیادی مسائل میں چودہ سو سال گذرنے کے بعد بھی کوئی فرق نہیں پڑا یقیناً آج بھی پیروانِ مذاہب، مذہب کی حقیقی سپرٹ سے بالکل محروم ہیں، اور ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آسکتا کہ یہ کسی دین کے پیرو ہیں۔ اسی طرح اقوام حاضرہ کا نسلی اور قومی تعصب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ دین و سیاست کی جدائی ایک مستقل عقیدہ بن چکی ہے۔ معاشی ناہمواریاں اور معاشرتی مفاسد بھی انسانی سوسائٹی میں گہرا اثر پیدا کر چکے ہیں۔ لہٰذا جب انسانیت کا مرض وہی ہے جو چودہ سو سال پہلے تھا تو علاج بھی وہی کیوں نہ ہو جو پہلے ایک مرتبہ آزمایا جا چکا ہے۔ یعنی آج اگر ہم دیانت داری سے ان مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ایک تابناک مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔

رسائل و مسائل

خاتم النبیینؐ کے بعد دعوائے نبوت

سوال :۔ "ترجمان القرآن (جنوری، فروری) کے صفحہ ۲۳۶ پر آپ نے لکھا ہے کہ "میرا اب تک کا تجربہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی جھوٹ کو فروغ نہیں دیتا۔ میرا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ . . . . جن لوگوں کو میں صداقت و دیانت سے بے پروا اور خوف خدا سے خالی پاتا ہوں، ان کی باتوں کا کبھی جواب نہیں دیتا . . . . . خدا ہی ان سے بدلہ لے سکتا ہے . . . . . اور ان کا پول انشاء اللہ دنیا ہی میں فاش ہو گا۔"

میں عرض کروں کہ میں نے جماعت احمدیہ کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے کام سے دلچسپی ہے۔ میرے مندرجہ ذیل استفسارات اسی ضمن میں ہیں :۔

ا۔ یہ صرف آپ ہی کا تجربہ نہیں، بلکہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :"اللہ تعالیٰ کاذبوں سے محبت نہیں کرتا" اور "اللہ کی لعنت ہے جھوٹوں پر" اور پھر اس قسم کے جھوٹوں پہ کہ "ولو تقوّل علینا بعض الاقاویل ـــــ" ان کی سزا تو فوری گرفت اور وصالِ جہنم ہے (لاخذنا منه باليمين ثم لقطعنا منه الوتين - حاقہ ۱) اس صورت میں اگر مرزا صاحب جھوٹے تھے تو کیا وجہ ہے کہ (ا) ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی گرفت نہیں کی؟ (ب) ان کی جماعت بڑھ رہی ہے اور مرزا صاحب کے مشن کو جو مسلمانوں کے نزدیک گمراہ کن ہے تقویت پہنچ رہی ہے اور اب تو اس جماعت کی جڑیں بیرونی ممالک میں مضبوط ہو گئی ہیں (ج) مرزا صاحب کے پیغام کو ساٹھ سال ہو گئے ہیں۔ ہم کب تک خدائی فیصلے کا انتظار کریں؟ فی الحال تو وہ ترقی کر رہے ہیں (د) جو جماعتیں یا افراد اس گروہ کی مخالفت کر رہے ہیں وہ کیوں اتنے ترقی نہیں

کردیتے۔ اور معاملہ خدا پر نہیں چھوڑ دیتے؟

۲۔ منشور ۱۴ مارچ آپ کی جماعت کے ایک جرمنی نژاد ہمدرد نے برلن میں جماعت احمدیہ کے ساتھ تبلیغ اسلام میں تعاون کا ذکر کیا ہے۔ اگر آپ بھی ان کی تبلیغ اسلام کو صحیح سمجھتے ہیں، تو پاکستان میں ان کے ساتھ تعاون کیوں نہیں کرتے؟

جواب:۔ آپ جس سرسری نظر سے ایک مدعی نبوت کے معاملے کو دیکھ رہے ہیں، یہ طریقہ ایسے اہم معاملے پر رائے قائم کرنے کے لئے موزوں نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ تو سراسر ایک جھوٹے الزام کے بارے میں تھا جو بعض خود غرض لوگوں نے میرے اوپر لگایا تھا۔ اس بات کو آپ چسپاں کر رہے ہیں ایک ایسے شخص کے معاملے پر جس نے خود نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ آپ کو سمجھنا چاہئے کہ ایک مدعی نبوت کے معاملے میں لامحالہ دو صورتوں میں سے ایک صورت پیش آتی ہے۔ اگر وہ سچا ہے تو اس کو نہ ماننے والا کافر، اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کو ماننے والا کافر۔ ایک ایسے نازک معاملے کا فیصلہ آپ صرف اتنی سی بات پر کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی تک ان پر کوئی گرفت نہیں کی، اور ان کی جماعت بڑھ رہی ہے، اور یہ کہ ہم کب تک خدائی فیصلہ کا انتظار کریں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے اور اس کی جماعت ترقی کرتی نظر آئے اور آپ کی تجویز کردہ مدت انتظار کے اندر اس پر خدا کی طرف سے گرفت نہ ہو تو بس یہ باتیں اس کو نبی مان لینے کے لئے کافی ہیں؟ کیا آپ کے ذہن میں نبوت کو جانچنے کے یہی معیار ہیں؟

آیت ولو تقول علینا بعض الاقاویل سے جو استدلال آپ نے کیا ہے وہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ محمد صلعم جو حقیقت میں اللہ کے نبی ہیں، اگر خدا کی وحی کے بغیر کوئی بات خود تصنیف کر کے خدا کے نام سے پیش کریں تو ان کی رگ گلو کاٹ دی جائے گی۔ اس سے یہ معنی نکالنا صحیح نہیں ہے کہ جو شخص حقیقت میں نبی نہ ہو اور غلط طور پر اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کرے اس کی رگ گلو بھی کاٹی جائے گی۔ اور نہ اس آیت

میں اللہ تعالیٰ نے سچے اور جھوٹے نبی کی پہچان کے لئے یہ بات بطور ایک معیار کے پیش کی ہے کہ جس مدعی نبوت کی رگ گلو نہ کاٹی جاتے وہ سچا نبی ہے اور جس کی رگ کاٹ دی جاتے وہ جھوٹا مدعی۔ قرآن کی آیتوں میں تاویل کی یہ کھینچ تان جو ظاہر ہے کہ آپ کی اپنی اُپج کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ مرزا صاحب کی جماعت سے ہی آپ نے سیکھی ہے، بجائے خود اس بات کی علامت ہے کہ یہ جماعت خوفِ خدا سے کس قدر خالی ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے اس کی بات کو ان معیاروں پر نہیں جانچا جائے گا جو آپ نے پیش کئے ہیں بلکہ اسے پورے اطمینان کے ساتھ اس بنیاد پر رد کر دیا جائے گا کہ قرآن و احادیثِ صحیحہ اس معاملے میں قطعی ناطق ہیں کہ آنحضرت صلعم کے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ میں ان دلائل سے بھی واقف ہوں جو مرزا صاحب اور ان کے متبعین نے بابِ نبوت کے کھلے ہونے پر قائم کئے ہیں۔ مگر میں آپ سے صاف عرض کرتا ہوں کہ ان دلائل سے اگر کوئی متاثر ہو سکتا ہے تو وہ صرف ایک بے علم یا کم علم آدمی ہی ہو سکتا ہے، ایک صاحب علم آدمی کو تو ان کے دلائل دیکھ کر صرف ان کے جہل ہی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔

ترجمان القرآن میں جرمنی کا جو مکتوب شائع ہوا ہے اس کی اشاعت کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی ہر بات ہمارے نزدیک سچی ہے۔ ہمارا مدعا تو یہ تھا کہ ہمارے ملک کے مسلمانوں کو اپنے جرمن نومسلم بھائیوں کی حالت سے آگاہ کیا جائے اور ان کی مدد پر اکسایا جائے۔ وہ لوگ بیچارے نئے نئے مسلمان ہیں، ان کو کیا خبر کہ دنیائے اسلام میں کس کس قسم کے فتنے اٹھ رہے ہیں۔ ان کو تو اسلام کے نام سے جو چیز جہاں سے بھی ملے گی وہ اس سے اپنی تشنگی بجھانے کی کوشش کریں گے یہ ہمارا کام ہے کہ انھیں اسلام کے متعلق صحیح لٹریچر فراہم کر کے دیں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ بے چارے ناواقفیت میں کسی فتنے کے شکار نہ ہو جائیں۔

سوال:۔ آپ کا جواب ملا۔ افسوس کہ وہ میری تشفی کے لئے کافی نہیں ہے۔

میں نے آپ ہی کی دی ہوئی حقیقت "خدا تعالیٰ خود جھوٹے کو سزا دیگا" کی روشنی میں پوچھا تھا کہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی جو سب مسلمانوں کے نزدیک کاذب ہیں ان پر کیوں خدا تعالیٰ کی گرفت نہیں ہوتی، اور یہ کہ خدا تعالیٰ کس طرح اپنے بندوں کو اتنے عرصے سے گمراہ ہوتے دیکھ رہا ہے؟

میں مرزا صاحب کی تصنیف کردہ تقریباً ۲۵ کتب تحقیقی نظر سے دیکھ چکا ہوں۔ اور اس کے بعد علمائے اسلام کی بعض کتب بھی ان کے رد میں دیکھی ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آپ کی کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں پڑھی۔ ویسے علماء کی کتب کے متعلق میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ:

انہوں نے مرزا صاحب کی تحریروں میں تحریف کر کے غلط مطالب ان کی طرف منسوب کئے ہیں۔

جس موضوع پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے اس پر انہیں عبور نہیں تھا۔

بعد میں میری خط و کتابت پر یہ لوگ عموماً خاموش رہے ہیں۔

مرزا صاحب کی کتب سے میں جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کی ذات اور اقوال یعنی ظاہر و باطن آنحضور صلعم کے عشق سے پُر ہے۔ میں اس بنیاد کو لے کر مرزا صاحب کے دعوے کی طرف بڑھا تھا اور اب مجھ پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ:۔

۱۔ مرزا صاحب کے دعاوی قرآن اور اقوالِ نبویؐ کے خلاف نہیں۔

۲۔ مرزا صاحب کی نبوت آنحضرتؐ کی شان گھٹانے کے لئے نہیں بلکہ اگر موسوی فیضان سے قریہ قریہ نبی ہو سکتے ہیں تو مقامِ محمدی کے مطابق گاؤں گاؤں ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو بتائیں کہ ہم نے شریعتِ محمدیہ پر عمل کر کے مکالمۂ الٰہیہ حاصل کیا ہے۔ خود مرزا صاحب نے فرمایا ہے کہ۔

"ایں چشمۂ رواں کہ بخلقِ خدا دہم یک قطرۂ ز بحرِ کمالِ محمدؐ است"

اب آپ نے پھر مجھے مرزا صاحب کے دعوے کو پرکھنے کی اجازت دی ہے۔ کیا آپ براہِ کرم قرآن کریم سے میری رہنمائی کے لئے مرزا صاحب کے کسی ایک دعوے کو جھوٹا ثابت کر دیں گے؟

جواب: پچھلا خط آپ کی تشفی کے لئے کافی ہوتا، اگر آپ تشفی چاہتے۔ میں نے

ترجمان القرآن میں مجھ کو کیا تھا وہ تو ان لوگوں کے بارے میں تھا جو مجھ پر ایک جھوٹا بہتان لگاتے ہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ پر یہ اعتماد ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ ضرور جھوٹوں کو سزا دیگا۔ مگر آپ اسے ایک مدعی نبوت کے دعوے کو جانچنے کے لئے معیار ٹھیرا رہے ہیں اور معیار بھی اس شان کے ساتھ کہ اگر مدعی کو سزا ملتی ہوئی نظر نہ آئے تو ضرور اپنے دعوے میں سچا ہے۔ آپ خود سوچیں کہ میرے قول کو مجھ پر حجت بنانے کی یہ کوشش جو آپ نے فرمائی ہے یہ آخر کہاں تک معقول ہے۔ کیا میں نے اپنے خلاف بہتان لگانے والوں کے متعلق یہ بھی کہا تھا کہ اگر انہیں دنیا میں سب کی آنکھوں کے سامنے سزا نہ ملے تو ضرور مجھ پر ان کا بہتان سچا ہے؟ کیا واقعی لوگوں کے صادق و کاذب اور راہ یاب و گمراہ ہونے کے لئے یہ کوئی صحیح معیار ہے کہ جسے دنیا میں سزا مل جائے وہ جھوٹا اور گمراہ، اور جسے سزا نہ ملے وہ سچا اور ہدایت یافتہ؟

آپ عجیب بات فرما رہے ہیں کہ مرزا صاحب کے دعوے کو ۶۰ سال گذر چکے ہیں، آخر کب تک کوئی انتظار کرے۔ دعوائے نبوت کی صداقت کو پرکھنے کی یہ عجیب کسوٹی جو آپ نے تجویز فرمائی ہے ذرا اس کی توضیح تو فرمائیے کہ ایک جھوٹے مدعی کو آپ کے نزدیک کس قسم کی سزا ملنی چاہئے؟ اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ غیب سے ایک ہاتھ بڑھے اور اس کی رگِ گلو کاٹ دے، تو میں عرض کرونگا کہ یہ سزا تو مسیلمہ تک کو نہیں ملی جس نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ جو مدعی نبوت انسانوں کے ہاتھ سے مارا جائے وہ جھوٹا ہے تو ان انبیاء کے متعلق آپ کیا فرمائیں گے جن کی نبوت کی تصدیق خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا ہے کہ ان کی قوم نے انہیں قتل کر دیا؟ قرآن میں یہ آیات تو آپ کی نظر سے گذری ہی ہونگی کہ قل قد جاءکم رسل من قبلی بالبینٰت وبالذی قلتم فلم قتلتموھم ان کنتم صٰدقین (آل عمران رکوع ۱۹) اور فبما نقضھم میثاقھم وکفرھم بآیات اللہ وقتلھم الانبیاء بغیر حق (النساء رکوع ۲۲)۔ ان آیات کی روشنی میں آپ کو ایک مرتبہ پھر اپنے انداز فکر پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ نبی کا دعویٰ اس طرح کے قیاس پر

نہیں ہو جاتا۔ دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ اس سے پہلے نبوت کے کلام الٰہی کی روشنی میں اس کا مقام کیا ہے؟ وہ چیز کیا لایا ہے؟ اور اس کی زندگی کیسی ہے؟ ان معیاروں پر کوئی شخص پورا نہ اترتا ہو تو آپ محض [illegible] لیں گے اگر اس کے دعوے کو صرف اس بنا پر مان لیں گے کہ آپ کی آنکھوں نے اسے اس دنیا میں سزا پاتے نہیں دیکھا۔

جو تین معیار میں نے اوپر بیان کئے ہیں ان میں سے موخر الذکر دو معیار ایسی صورت میں سرے سے قابلِ لحاظ ہی نہیں رہتے جبکہ پہلے ہی معیار سے کسی مدعیٔ نبوت کا دعویٰ بخیریت نہ گذر سکے۔ جب قرآن اور احادیث صحیحہ ہی سے یہ ثابت ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نیا نبی نہیں آسکتا تو یہ دیکھنے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے کہ حضور کے بعد دعوائے نبوت کرنے والا کیا لایا ہے اور کیسا انسان ہے۔ اگرچہ مرزا صاحب میرے نزدیک دوسرے اور تیسرے معیار کے لحاظ سے بھی مقام نبوت سے اس قدر فروتر ہیں کہ بابِ نبوت کھلا بھی ہوتا تو کم از کم کوئی معقول آدمی تو ان پر نبوت کا گمان نہیں کر سکتا تھا، لیکن میں اس بحث کو قرآن و حدیث کے قاطع فیصلے کے بعد غیر ضروری بھی سمجھتا ہوں اور خدا و رسول کے مقابلے میں گستاخی بھی۔

یہ سوال کہ قرآن و حدیث سے بابِ نبوت کے قطعی طور پر بند ہونے کے دلائل کیا ہیں، اس کا متحمل نہیں ہے کہ ایک خط میں اس کا جواب دیا جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے فرصت دی تو ان شاء اللہ اس موضوع پر ایک مفصل مضمون لکھوں گا، ورنہ سورۂ احزاب کی تفسیر میں تو یہ بحث آ ہی رہی ہے۔

چند کاروباری مسائل

سوال: ایک درآمد کنندہ (Importer) غیر ممالک سے مال منگانے کے لئے [illegible]

[illegible] کرتا ہے۔ اور میں اپنے اس [illegible]

مال کو انہی شرائط کے مطابق جن شرائط پر اس نے خود مال بک کیا ہے، فروخت کر دیتا ہے۔
یعنی دس فیصدی بیعانہ کے ساتھ!

مذکورہ بالا شرائط میں سے ایک اہم اور واضح شرط یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر مال مذکور تحریر کردہ مدت کے اندر شپ (Ship) نہ ہو سکا، یا کسی ہنگامی حالت کی وجہ سے سرے سے سودا ہی منسوخ ہو گیا تو خریدار کو بیعانہ واپس لے کر معاملہ ختم کرنا ہوگا۔ (عملاً اسی طرح ہوتا ہے)

گویا مال شپ نہ ہونے کی صورت میں خریدار اس مال کے نفع نقصان کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اگر مال بک ہو گیا تو مال کا بھگتان ہوتا ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں بیعانہ واپس اور سودا منسوخ۔ چاہے یہ سودا کئی جگہ پر فروخت ہو چکا ہو۔

اس طریق کار میں وہ کونسے نقائص اور خرابیاں ہیں جن کی بنا پر اسے شرعاً نادرست کہا جاتا ہے۔ اس قسم کا لاکھوں روپیہ کا کاروبار قریباً ہر مہینے ہم کرتے ہیں اور اس الجھن میں پڑ گئے ہیں کہ یہ طریقہ درست بھی ہے یا نہیں۔ ایک "صاحب علم" کی رائے اس کے حق میں بھی ہے۔

جواب: جس صورت معاملہ کو آپ دریافت کر رہے ہیں اس کی دو الگ الگ شکلیں ہیں اور دونوں کا حکم الگ ہے۔

ایک شکل یہ ہے کہ آپ نے ایک مال بنک کی معرفت بک کرایا اور بعد میں آپ کی اور ایک دوسرے تاجر کی باہمی قرارداد سے وہ بکنگ اس کے نام منتقل ہو گیا۔ یہ شکل اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ یہ بکنگ خواہ منافع کے ساتھ بیچی جائے یا محض ایک شخص سے دوسرے شخص کے نام منتقل ہو، بہرحال وہ ایک شخص کی طرف سے دوسرے شخص کی طرف پوری طرح منتقل ہو جائے۔ یعنی بنک میں لیٹر آف کریڈٹ شخص اول کے بجائے شخص ثانی کے نام پر کھل جائے اور شخص اول کا اس مال کے سودے سے کوئی تعلق باقی نہ رہے، اس کی ہر چیز کا ضامن شخص ثانی ہی ہو، شخص اول کی کوئی ذمہ داری اس معاملہ کے ساتھ لگی نہ رہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ اس مال کو بک کرانے کے بعد قبل اس کے کہ وہ یہاں پہنچے اور آپ کے

قبضہ میں آنے نا آپ اسے اپنے مال کی حیثیت سے منافع پر دوسرے شخص کے ہاتھ بیچیں اور بیعانہ لے لیں۔ پھر دوسرا تیسرے کے ہاتھ، تیسرا چوتھے کے ہاتھ اسی غائب مال کو اپنا اپنا منافع لگا کر بیچتا اور بیعانہ لیتا چلا جائے۔ اس شکل میں خواہ شپ منٹ نہ ہو سکنے یا سودا منسوخ ہو جانے پر ہر ایک شخص بیعانہ واپس کر دینے کا کفیل ہی کیوں نہ ہو اور خواہ ہر ایک نے یہ وعدہ ہی کیوں نہ کر لیا ہو کہ سودے کی منسوخی کی صورت میں کوئی بھی نفع و نقصان کا مطالبہ نہ کرے گا، بہر حال یہ خرید فروخت شرعاً ممنوع ہے۔ اس کے ممنوع ہونے کی نقلی دلیل یہ ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا ہے:۔

"لا تبع ما لیس عندک[1]" (احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ) "اذا اشتریت شیئاً فلا تبعه حتی تقبضه[2]" (احمد) "نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یشتری الطعام ثم یباع حتی یستوفی[3]" (احمد، مسلم) "کانوا یتبایعون الطعام جزافاً باعلی السوق فنھاھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یبیعوہ حتی ینقلوہ[4]" (بخاری، مسلم، ابوداؤد)۔

ان احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز کو خرید کر قبضے میں لئے بغیر بیچنا ممنوع ہے۔

اس کے ممنوع ہونے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اول تو اس طرح کی خرید و فروخت میں جھگڑے کے امکانات ہیں۔ دوسرے اس میں بغیر کسی حقیقی تمدنی خدمت کے ایک شخص سے دوسرا شخص ایک غائب چیز کو اپنا منافع لگا لگا کر بیچتا اور خریدتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ صارفین (consumers) تک پہنچتے پہنچتے اس چیز کی قیمت چڑھ کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ یہ بہت سے بچولیوں کی منافع

---

[1] کوئی ایسی چیز نہ بیچو جو فی الواقع تمہارے پاس موجود نہ ہو۔

[2] جب تم کوئی چیز خریدو تو اسے اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے آگے فروخت نہ کرو۔

[3] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ ایک شخص غلہ خریدے اور پورا پورا ماپ تول کر لینے سے پہلے اسے آگے کو فروخت کر دے۔

[4] لوگ غلے کے ڈھیر منڈی میں کھڑے کھڑے خریدتے اور وہیں بیچ دیتے تھے۔ حضور نے حکم دیا کہ جب تک غلہ اس جگہ سے منتقل نہ کر دیا جائے آگے نہ بیچا جائے۔

شخص مخبر اس لیے کہ وہ واقعی کوئی خدمت اس مال کے پیدا کرنے یا فراہم کرنے میں انجام دیں
بجاے خود اشیاء کی قیمتیں چڑھنے کی موجب بنتی ہے۔

سوال: حسب ذیل سوالات کے جواب مطلوب ہیں:

(۱) میری دکان لباس خانہ (General Merchant) کی ہے۔ جنرل مرچنٹ کے ہاں ہر قسم کے سودے فروخت ہوتے ہیں، خاص کر پوڈر، کریم، لپ اسٹک، نیل پالش، سینٹ، عطر، ریشمی فیتیاں، ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ، شیونگ سٹ، سنگار دان، بچوں کے کھلونے، زیورات وغیرہ۔ کیا متذکرہ بالا چیزیں ناجائز ہیں، یا ان کو فروخت کرنا از روئے شریعت ممنوع ہے؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تمام چیزیں تعیش میں مدد دیتی ہیں لہٰذا یہ مسرفانہ فعل ہے۔ اس کو فروخت کرنے اور استعمال کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ کیا یہ درست ہے؟

(۲) کیا شریعت نے نفع کی مقدار مقرر کی ہے؟ اگر ہے تو کیا؟ اور اگر نہیں ہے تو کہاں تک نفع لیا جا سکتا ہے؟ کیا دکاندار کو اس چیز کا اختیار ہے کہ وہ اپنی چیز مارکیٹ کے لحاظ سے یا کسی اور دام پر فروخت کر سکے؟ (واضح رہے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں بہت کم نفع ہوتا ہے، یا خرید کی قیمت یا کچھ کم پر فروخت کرنی پڑتی ہیں)

(۳) موجودہ دور میں ہر کاروبار کو عورت کے اشتہار کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے۔ الحمدللہ کہ میں اس لعنت سے بچا ہوا ہوں لیکن جو چیزیں ولایت سے آتی ہیں یا ملک و قوم کے لوگ تیار کرتے ہیں ان پر عورت کی تصویر مختلف ہیئتوں (Poses) میں نمایاں رہتی ہے۔ ریپر کو پھاڑ دینے سے چیز کو فروخت کرنا مشکل بلکہ غیر ممکن ہے۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ بعض دوست شکایت کرتے ہیں کہ تم تصویروں کی خرید و فروخت کرتے ہو اور یہ حرام ہے۔

(۴) کیا شریعت نے سودے کو ایک دام پر فروخت کرنے کی قید لگائی ہے؟ اگر نہیں تو مول بھاؤ چکانا درست ہے؟

(۵) دکان پر بے پردہ عورتیں آتی ہیں اور نیم نقاب پوش بھی۔ اسلام کا حکم ہے کہ نگاہ

حمت پیدہ مری نظر پڑے تو انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہاں ان سے گفتگو تک کرنی پڑتی ہے۔ عورتوں کو دکان پر نہ آنے دیا جائے تو یہ بھی ٹھیک نہیں کیونکہ اس ماحول میں تو اکثریت ایسی عورتوں کی ہے جو مردوں کے بدلے شاپنگ کرتی ہیں۔

(۶) بالعموم ہر دکاندار دو قسم کے کھاتے رکھتا ہے۔ ایک تو اس کا نجی کھاتا ہوتا ہے دوسرا اسیل ٹیکس اور انکم ٹیکس کے افسران کو دکھانے کے لئے۔ کیا یہ طریقہ درست ہے؟ اگر نہیں تو تاجر کیا کرے؟ ایک صاحب جن کا تعلق میرے بازار سے نہیں لیکن میں انہیں جانتا ہوں، انہوں نے ایک سال کا پورا حساب انکم ٹیکس کے افسر کے سامنے پیش کیا، ایک پیسہ کی بھی انہوں نے چوری نہ کی تھی۔ لیکن افسر نے ٹیکس کے علاوہ مزید بھاری رقم ان پر لاد دی۔ اور شبہ یہ ظاہر کیا کہ جو حساب اسے دکھایا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہئے؟

جواب :- آپ کے سوالات کے جوابات علی الترتیب درج ذیل ہیں :-

(۱) بساط خانہ میں جو چیزیں آپ فروخت کرتے ہیں (جن کی کچھ فہرست بھی آپ نے دی ہے)، ان میں سے کوئی چیز بھی فی نفسہٖ حرام نہیں ہے۔ ان کا استعمال جائز بھی ہو سکتا ہے اور ناجائز بھی۔ دکاندار کی حیثیت سے آپ پر یہ دیکھنا فرض نہیں ہے کہ کون ان چیزوں کو کس طرح استعمال کریگا۔ آپ کے لئے صرف یہ بات کافی ہے کہ آپ کوئی حرام چیز فروخت نہ کریں، نہ بیع وشری میں حرام طریقے استعمال کریں۔

(۲) شریعت نے نفع کے لئے کوئی مقدار مقرر نہیں کی ہے۔ یہ تو عرف اور انصاف کے معروف تصور پر مبنی ہے کہ کس تجارت میں کتنا منافع واجبی ہے اور کتنا ناواجب۔

(۳) جو چیزیں دکاندار کی حیثیت سے آپ باہر سے منگواتے ہیں یا ملک کے صناعوں سے خریدتے ہیں ان پر اگر عورتوں کی تصاویر ہوں تو یہ چیز اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ آپ یہاں چیزوں کی خرید و فروخت حرام ہو جائے۔ آپ قصداً یہ تصویریں ان اشیاء پر خود نہیں

لگاتے ہیں اور نہ آپ کی فرمائش پر یہ کارخانوں میں لگائی جاتی ہیں۔ یہ تو ایک بلائے عام ہے جس میں ہم سب مجبوراً مبتلا ہو رہے ہیں۔ معترضین کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ اس طرح آپ تصویروں کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ دراصل آپ تصویریں خریدتے اور بیچتے نہیں ہیں بلکہ وہ چیزیں خریدتے اور بیچتے ہیں جن پر کارخانہ داروں نے دنیا کی بگڑی ہوئی ریت کی بنا پر تصویریں چپکا رکھی ہیں۔

(۴) سودے کو ایک ہی دام پر بیچنا کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ خریدار سے بات چیت کر کے آپ کم و بیش پر بھی فروخت کر سکتے ہیں۔ مگر جھوٹ بولنا اور جھوٹی قسمیں کھانا جائز نہیں۔ خریدار کو یہ یقین دلانے کی کوشش نہ کیجئے کہ یہ مال اتنے کو خریدا ہے۔ درآنحالیکہ وہ اس سے کم میں آپ کو پڑا ہو، یا یہ کہ اس میں آپ کو کوئی نفع نہیں بچتا، درآنحالیکہ اس میں نفع بچتا ہو۔

(۵) عورتیں اگر بے پردہ آپ کی دکان پر آئیں تو انہیں آنے سے روکنا یا ان کے ہاتھ مال بیچنے سے انکار کرنا آپ پر فرض نہیں ہے۔ البتہ آپ کا فرض یہ ہے کہ غضِ بصر سے کام لیں، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کریں، ان کے حسن و آرائش سے یا ان کی گفتگو سے لذت لینے کی کوشش نہ کریں۔ تقویٰ کی اسی ایک ذرا سی مشق پر آپ عامل ہو جائیں تو انشاء اللہ اپنی دکان پر بیٹھے بیٹھے آپ کو درجۂ ولایت حاصل ہو جائے گا۔ تنہا یہی مجاہدہ بہت سے خانقاہی مجاہدوں پر بھاری ہے۔

(۶) اس بگڑے ہوئے ماحول میں جو شخص چور اور جعل ساز نہیں ہے وہ بھی چور اور جعل ساز ہی فرض کیا جاتا ہے، کیونکہ دنیا اب یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ کوئی شخص کاروبار میں سچا اور ایماندار بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے بگاڑ کی حالت میں جو لوگ سچائی اور ایمانداری کی راہ چلنے کا عزم کریں انہیں اس کی سزا بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ جھوٹے اور بددیانت لوگ تو رشوت دے کر اپنے جرائم کی پاداش سے بچ نکلتے ہیں مگر سچے اور ایماندار آدمی کے لئے یہاں دوہری سزا ہے، ایک سزا سچائی اور ایمانداری سے کام کرنے کی اور دوسری رشوت نہ دینے کی۔ یہ سزا بھگتنے کی ہمت نہ ہو تو جس بگاڑ میں دنیا مبتلا ہے آپ بھی اسی میں مبتلا ہو جائیے۔ دنیا اور آخرت میں سے ایک کو انتخاب کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

سوال: کسی مشترک کاروبار مثلاً کسی کمپنی کے حصص کی زکوٰۃ کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آسکا۔ حصہ بجائے خود تو کوئی قیمتی چیز نہیں ہے، محض ایک کاغذ کا ٹکڑا ہے۔ صرف اس دستاویز کے ذریعے حصہ دار کمپنی کی املاک وجائداد مشترکہ میں شامل ہو کر بقدر اپنے حصہ کے مالک یا حصہ دار قرار پاتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ کمپنی کے املاک کیا اور کس نوعیت کے ہیں۔ اگر کمپنی کی جائداد تعمیرات (بلڈنگ)، اراضیات اور مشینری پر مشتمل ہو تو حصہ دار کی شراکت بھی ایسے ہی املاک کی ہوگی جس پر آپ کے بیان کردہ اصول کے ماتحت زکوٰۃ نہیں آتی۔ حصہ دار کے حصہ کی مالیت تو ضرور ہے لیکن وہ اس تمام مالیت کا جزو ہے جو غیر منقولہ جائداد کی شکل میں کمپنی کو مجموعی حیثیت سے حاصل ہے۔ پھر حصہ دار کے حصے پر زکوٰۃ کیوں عائد ہونی چاہیئے؟

جواب: کمپنی کے جس حصہ دار کے حصہ کی مالیت بقدر نصاب ہے اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ قدر نصاب کا مالک ہے۔ اب اگر اس نے اپنے اس روپے کو کمپنی کے کاروبار میں لگا رکھا ہے تو اس سے اس کے حصے کی مالیت کے لحاظ سے انفرادی طور پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی بلکہ کمپنی سے تجارتی زکوٰۃ کے قواعد کے مطابق تمام ایسے حصہ داروں کی زکوٰۃ اکٹھی لے لی جائے گی

لہ "حصہ" کے متعلق سائل نے بہت ہی غلط تصور پیش کیا ہے۔ کاغذ کا ٹکڑا نہ حصہ ہوتا ہے نہ اصل اہمیت رکھتا ہے، بلکہ وہ ایک دستاویز ہوتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ فلاں شخص فلاں کاروبار میں اس تناسب سے حصہ دار ہے۔ غور کیجئے کہ اگر دو آدمی ایک دکان میں برابر کے شریک ہوں اور وہ اپنی شراکت کے لئے دستاویز لکھ کر رکھ لیں تو دستاویز ان کا اصل حصۂ شرکت نہیں ہوگی بلکہ حصص کا ریکارڈ ہوگی یہی صورت زیادہ حصہ داروں کے مشترک کاروبار کی ہے۔ اسی بنا پر یہ بھی غلط کہا گیا ہے کہ "حصہ بجائے خود تو کوئی قیمتی چیز نہیں ہے"، حالانکہ دراصل حصہ ہی بجائے خود قیمتی چیز ہے۔ کیونکہ "حصہ" نام ہے کسی تناسب سے ایک کاروبار اور اس کے سرمائے اور متعلقہ املاک کے حقوق مالکانہ میں شریک ہونے کا، اور حصہ کی قیمت دراصل انہی حقوق مالکانہ کی قیمت ہوتی ہے۔ حصہ کوئی خیالی وجود نہیں بلکہ ایک ٹھوس مادی حقیقت ہے۔

(باقی حاشیہ)

جن کو زکوٰۃ ادا کرنے کے قابل قرار دیا گیا ہو کمپنی کی زکوٰۃ کا حساب لگانے میں مشینری، مکان، فرنیچر وغیرہ جیسے آلاتِ پیدائش کو مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔ اس کے باقی ماندہ املاک جو اموالِ تجارت مشتمل ہوں اور اس کے خزانہ کی رقم جو ختم سال پر موجود ہو ان سب پر زکوٰۃ لے لی جائے گی۔ اور کمپنی کا کاروبار اس نوعیت کا نہ ہو تو اس کی سالانہ آمدنی کے لحاظ سے اس کی مالی حیثیت مشخص کی جائے گی اور اس پر زکوٰۃ لگا دی جائیگی۔

رُکنیتِ جماعتِ اسلامی کی ایک درخواست پر فیصلہ

سوال :۔ ایک مقامی جماعتِ اسلامی کے امیر رپورٹ کرتے ہیں :

" . . . . . . صاحب عرصہ سے سرگرمی سے کام کر رہے ہیں، رکنیت کے اہل ہیں عرصہ سے ان کی درخواست پڑی ہے . . . . ان کی ذاتی زندگی شریعت کے مطابق ہے۔ مگر دکان کے حسابات اصلی پیش نہیں کرتے ہیں . . . کیونکہ انکم ٹیکس والے نفع کی فیصدی اتنی زیادہ لگاتے ہیں کہ اگر اصل بکری دی جائے تو ساری آمدنی ٹیکس میں چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی چیز قابلِ اعتراض نہیں ہے . . . ."

اس پر حلقہ کی جماعتِ اسلامی کے امیر رپورٹ کرتے ہیں :۔

" درخواست کنندہ نہایت صالح نوجوان ہے اور جماعت کے کاموں میں کافی ایثار اور سرگرمی کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔ اس کے بارے میں صرف انہی جعلی حسابات کا معاملہ ہمارے لئے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اگر صحیح حسابات پیش کئے جائیں تو سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس کی نذر نہ صرف منافع کی کمائی بلکہ پونجی کا ایک حصہ بھی ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں وہ نہایت مجبوری کی حالت میں غلط حسابات پیش کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف ہمارے لئے بھی یہ مشکل ہے کہ ایک ایسے شخص کو جو جان بوجھ کر غلط بات کو صحیح بنا کر پیش

کرتا ہے بحیثیت کے تے کیسے قبول کریں چونکہ یہ ایک منفرد کیس نہیں ہے . . . اسلئے اپنی
اور حلقہ کی مجلس شوریٰ کی رہنمائی کے لئے یہ درخواست آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں کہ آپ
ہمیں اس کے متعلق مشورہ دیں کہ ایسے حالات میں ہم کیا رویہ اختیار کریں "؟

جواب :۔ ہم نے یہ جماعت اس لئے نہیں بنائی ہے کہ ایک ایک آدمی ایک ایک مجبوری کی بنا پر دین و اخلاق کے ایک ایک اصول کو توڑتا چلا جائے ۔ اگر ہمیں ایسا کرنا ہوتا تو پھر اس جماعت کے بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی ۔ ہمارے پیش نظر تو ایسے لوگوں کو منظم کرنا ہے جو بہرحال صداقت اور دیانت پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں اور جھوٹ اور بد دیانتی کی طاقتوں سے دبنے کے بجائے اُن سے لڑیں ۔ اگر ہم اس طرح جماعت کے نظم میں ڈھیل دیتے چلے جائیں کہ جن جن بد دیانتیوں کے لئے لوگ مجبور ہوں ان کی اجازت دے دیا کریں تو اس جماعت میں بھی ضعیف الاخلاق لوگ جمع ہو جائیں گے اور ان سے کوئی اصلاح کا کام نہ ہو سکے گا ۔ یہ ہم کو معلوم ہے کہ سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس نے کس طرح تمام تجارت پیشہ لوگوں کو جھوٹا اور جعل ساز بنا دیا ہے ۔ یہ بھی ہم کو معلوم ہے کہ سرکاری ملازموں کو رشوت دے کر بڑی آسانی سے وہ تمام تکلیفیں رفع کی جا سکتی ہیں جو اس سلسلے میں پیش آسکتی ہیں ۔ یہ بھی ہم کو معلوم ہے کہ اگر کوئی شخص رشوت بھی نہ دے اور جعلی حسابات بھی نہ رکھے تو اس کے لئے کاروبار چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود نہ ہم اپنے ارکان کو رشوت دینے کی اجازت دے سکتے ہیں اور نہ جعلی حسابات رکھنے کی ۔ اس کے بجائے ان کا کام یہ ہے کہ وہ تجارت پیشہ لوگوں میں اخلاقی حس پیدا کرنے کی کوشش کریں ۔ ان کو منظم کریں اور ان کی باقاعدہ انجمنیں قائم کر کے ـــــ اور اگر وہ پہلے سے قائم ہوں تو ان کی رائے کو ہموار کر کے ـــــ یہ متفقہ فیصلہ کرائیں کہ کوئی شخص کسی سرکاری افسر کو ایک پیسہ رشوت نہ دے ، کوئی شخص جھوٹے حسابات نہ رکھے ، اگر سرکاری ملازمین انتقاماً ان کے اصلی حسابات کو غلط قرار دے کر ان کی فروخت یا آمدنی فرضی طور پر زائد تشخیص کریں اور ان پر زیادہ ٹیکس عاید کریں تو کوئی شخص اس ٹیکس کا ایک پیسہ ادا نہ کرے ، اگر ایسے بے جا ٹیکس کی وصولی کے لئے

کسی کی دکان کا مال نیلام کیا جائے تو اس پر کوئی شخص بولی نہ دے جب تک اس طرح کی تنظیمیں نہ ہونگی ہمارے ارکان کو نقصان اٹھا کر کام کرنا پڑے گا کیونکہ نناوے بے ایمانوں کے درمیان ایک ایماندار کبھی چین سے زندگی بسر نہیں کرسکتا لیکن اگر سب کو ـــ یا کم از کم اکثریت ہی کو ـــ دیانت اور راستبازی پر متفق کر لیا جائے تو سب کے لئے حلال روزی حاصل کرنا بھی ممکن ہو جائے گا اور سرکاری ملازمین کی زیادتیوں کا بھی سدِباب ہو سکے گا۔

طالبانِ قانونِ شریعت

سوال :- میاں ممتاز دولتانہ اور دیگر وزراء کی حالیہ تقاریر سے متاثر ہو کر مالکانِ زمین اس بات پر آمادہ ہو رہے ہیں کہ وہ اپنے حقوق کو محفوظ کرانے کے لئے شریعت کے قانون کے نفاذ کا مطالبہ کریں اور دوسری کسی ایسی ویسی سکیم کو تسلیم نہ کریں جو ان کے حقوق کو سلب کرنے والی ہو۔ چنانچہ کیمبل پور میں ایسے ہی لوگوں نے مل کر "طالبانِ قانونِ شریعت" کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی ہے جو کیمبلپور کے ضلع میں اس مطالبہ کو اٹھائے گی اور دوسرے اضلاع میں بھی اس کو حرکت میں لانے کی کوشش کرے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس انجمن نے اس غرض کے تحت ایک ہینڈبل بعنوان "انجمن طالبانِ قانونِ شریعت کا مطالبہ" اور ایک مراسلہ بنام ممبرانِ پنجاب اسمبلی طبع کرایا ہے۔ ۔ ۔ ۔ موجودہ حالات میں ہمیں توقع ہے کہ یہ لوگ ہمارے نصب العین یعنی نفاذِ قانونِ شریعت سے دلچسپی لیں۔ اس بارے میں آپ ہمیں ہدایت فرمائیں کہ آیا ہم ان کے ساتھ مل کر کام کرسکتے ہیں؟

جواب :- ایسے "طالبانِ قانونِ شریعت" کے ساتھ کسی تعاون اور اشتراکِ عمل کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ہے جو پوری شریعت کو ہڑپ کر جانے کے بعد کسی ایک مسئلہ میں شرعی قانون کے طالب بن کر اس لئے کھڑے ہو رہے ہوں کہ اس مسئلے میں شریعت کا قانون اُن کی

خواہشِ نفس کے مطابق ہے۔ ایسے لوگوں کو آپ صاف بتا دیجئے کہ ہمارا ان کے ساتھ کوئی میل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ شریعتِ الٰہی کا نفاذ اور قیام نہیں چاہتے بلکہ اسے اپنے مفاد کے تحفظ کا آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ فی الواقع شریعت کے حامی اور طالب ہیں تو پوری شریعت کے قیام اور نفاذ کو اپنے پروگرام میں شامل کریں اور اپنی زندگیوں اور معاملات سے اس کی عملی شہادت دیں اگر وہ ایسا کر دیں تو ان کے ساتھ تعاون اور اشتراکِ عمل کے مسئلے پر غور کیا جا سکتا ہے ورنہ نہیں۔

ریڈیو کے ذریعہ سے رویتِ ہلال کی خبر

سوال۔ کیا فرماتے ہیں علماءِ دین مندرجۂ ذیل مسئلہ میں کہ رویتِ ہلال کے لئے ریڈیو کا اعلان شرعاً نافذ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ صرف ریڈیو کے اعلان سے عید الفطر اور عید الضحیٰ کے احکام و نماز و ذبائح کر سکتے ہیں یا نہیں۔ قرآن اور حدیث سے اور استنباطِ ائمہ مجتہدین سے مدلل جواب تحریر فرماویں۔ بینوا توجروا۔

جواب۔ میری رائے میں اس مسئلے کے متعلق فرداً فرداً علماء سے سوال کرنے کے بجائے حکومتِ پاکستان سے مطالبہ کرنا چاہئے کہ وہ ملک کے مستند علماء کی ایک مجلس اس مسئلے کا تصفیہ کرنے کے لئے مقرر کرے اور وہ مجلس جو فیصلہ بھی کرے اسی پر ملک میں عمل کیا جائے۔ ہماری اپنی حکومت قائم ہو جانے کا کیا فائدہ ہے اگر ہمارے ہاں اس طرح کے مسائل کا تصفیہ کرنے کا بھی کوئی اجتماعی انتظام نہ ہو سکے اور ہر عید و بقر عید پر اختلاف کا ایک ہنگامہ برپا ہوتا رہے۔ علماء کی انفرادی آراء بہر حال اس باب میں مختلف رہیں گی اور ان سے فتوے لینے کا کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔

(ا۔ م)

مطبوعات

The Kingdom of God

مؤلفہ: جناب سید علی احمد شاہ صاحب پریذیڈنٹ آزاد کشمیر گورنمنٹ

شائع کردہ: شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار، لاہور

قیمت درج نہیں۔

انتیس صفحے کا یہ انگریزی پمفلٹ اسلامی دستوریات سے بحث کرتا ہے۔ جناب مؤلف نے دستورِ پاکستان کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں جن ترامیم کی ضرورت محسوس کی ہے ان کو مختصراً سلسلہ وار پیش فرمایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پمفلٹ دینی جوش کا مظہر ہے اور متعدد ترامیم ایسی ہیں کہ جن سے اسلام پسند طبقہ مطمئن ہوگا۔ پھر پمفلٹ اس بات کی بھی شہادت دیتا ہے کہ شاہ صاحب نے قرآن اور بائیبل کی خاصی ورق گردانیاں کی ہیں۔

لیکن دوسرے پہلو سے ایک تبصرہ نگار کی نگاہ بعض ایسے پہلو بھی دیکھتی ہے کہ جن کی طرف بڑے ادب و احترام سے اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ اول تو تحریر کا مزاج اور بحث کا اسلوب دستوریاتی نہیں اور پھر استدلال میں مذہبی عقیدت کا زور جتنا شامل ہے اتنا فکری انداز نہیں ہے۔ اس پر مزید یہ کمزوری کہ بعض مواقع پر کسی موضوع کے لئے جن آیات قرآنی کا حوالہ دیا گیا ہے ان کا کوئی بنیادی تعلق اس موضوع سے نہیں، اور جن آیات قرآنی میں اس موضوع کے لئے مواد ہے وہ بالکل درکنار رہ گئی ہیں۔ اس طرح آیات کو اصل محل سے ہٹا کر استعمال کرنے کی جو مثالیں پیدا ہو گئی ہیں ان میں سے بطور نمونہ ایک کا تذکرہ یہاں کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ "مرکزی مقننہ کو مؤلف" ہاؤس آف پیرنٹس" (House of Parents) کا نام دیتے ہیں اور اس نام کو قرآنی روح کے مطابق قرار دیتے ہوئے ان آیات کو حوالہ میں پیش کرتے ہیں جن میں اطاعت و خدمت والدین کا حکم دیا گیا ہے۔

آپ کی رائے میں پاکستان کی ریاست "اسلامی" ہونے کے باوجود کثیر الاحزاب ریاست

(Multi Nation State) قرار پاتی ہے کیونکہ آپ ص۲۸ پر صدر حکومت کے حلف کی توضیح پر گفتگو کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ وہ اکثریت رکھنے والی پارٹی (یعنی مسلمانوں) میں سے ہوگا اس عبارت سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اسلامی ریاست کی کارفرمائی مسلم اکثریت اور غیر مسلم اقلیتوں کے درمیان مشترک ہے۔ اسے سہو سمجھا جا سکتا تھا لیکن دوسری جگہ آپ نے وزارت میں غیر مسلموں کو شریک کرکے واضح کر دیا ہے کہ درحقیقت آپ کا تصور یہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مرکزی مقننہ کے لئے مردوں اور عورتوں کے مشترک ایوان اعلیٰ (کیونکہ دونوں صنفوں کے بغیر "ایوان والدین" کیسے بنتا) کی ضرورت کو نمایاں کیا ہے۔

پھر "وزیر اعظم" کے لئے خلیفہ کی اصطلاح تجویز کرنا، اور اس پر منجملہ دیگر آیات کے "اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہ" کو دلائل کی صف میں لا رکھنا بھی بہت عجیب معلوم ہوا۔

دفعہ ۴ ص۲۶ کے تحت بلوں کی توثیق پر گفتگو کرتے ہوئے آپ یہ تجویز فرماتے ہیں کہ بل تو ایوان پاس کرے لیکن جب وہ صدر ریاست کے سامنے منظوری کے لئے جائے تو وہ ماہرین علوم دین کے مشورے سے اس کی منظوری کا فیصلہ کرے۔ یوں تو ماہرین علوم دین کا مشورہ صدر حکومت کے لئے قدم قدم پر لازم ہوگا لیکن اگر اس مقصد کے لئے دستور کے تحت کوئی خاص مجلس تشکیل پائے تو پھر ثنویت کا یہ سسٹم حد درجہ خطرناک ہے۔ جب بھی دنیا کے ماہرین اور دین کے ماہرین کو آپ الگ کریں گے تو دونوں میں تصادم ہوکے رہے گا۔ دنیا کے ماہرین بل پاس کریں اور دین کے ماہرین اس بل کی قسمت کا فیصلہ کریں تو یہ صورت بہرحال چلنے والی نہیں۔ آپ کے معمولی ایوان ہی کو دین و دنیا کے ماہرین کا جامع ہونا چاہئے بغیر اس کے مقننہ کی کل کبھی سیدھی نہ بیٹھے گی۔

یہ چند باتیں نہ بطور سوئے ادب عرض کی گئی ہیں، نہ بطور تنقیص بلکہ محض تبصرہ کے ناخوشگوار تقاضے کے تحت پورے جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ عرض کی گئی ہیں۔ ان ساری چیزوں کے باوجود ہم جناب مؤلف کے جذبہ کی قدر کرتے ہیں۔

(بقیہ اشارات) نہیں آسکتی۔ قیام پاکستان کے بعد ہم نے عوام کو اسلامی ریاست کے صحیح تصور سے آشنا کرنے، اور نظام اسلامی پر متفق کرنے کی جو کوشش کی تھی، اور اس کے ساتھ ہمدردوں اور متفقین کے حلقے بنانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، بیشک اس تجویز علاج کے مذکورۂ بالا تینوں اجزاء کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی تھی۔ پھر قرارداد مقاصد پاس ہونے کے بعد اس کے تقضیات (Implications) اور اس کے تقاضوں کو کھول کھول کر عوام کے ذہن نشین کرنا، اس کی ایک ایک خلاف ورزی جو عنصر اوّل کی طرف سے ہوئی، نمایاں کر کے عوام کو اس کی طرف توجہ دلانا، اس کی تعمیل پر ارباب اقتدار کو مجبور کرنے کیلئے رائے عامہ کو تیار کرنا، اور صالح قیادت کی ضرورت و اہمیت عوام کے ذہن نشین کرنا، یہ سب کچھ بھی اسی تجویز علاج کے مطابق تھا۔ اس کے بعد انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ اور اس کا مخصوص طریق کار بھی اسی علاج کے پروگرام کا ایک جزء تھا اور یہ صرف ایک پنجاب کی انتخابی جدوجہد ہی میں ہم نے پانچ چھ مہینے کی مختصر مدت میں کم و بیش ۲۵ لاکھ آدمیوں تک، جن میں دیہاتی اور شہری، دونوں قسم کے عوام شامل تھے، اسلام کی دعوت پہنچائی، ان میں سے تقریباً سوا دو لاکھ آدمیوں کو ہر خوف، لالچ اور فریب کے علی الرغم اس دعوت کے حق میں ووٹ دینے پر آمادہ کر لیا، اور ان میں سے عنصر دوم کے تقریباً دو ہزار بہترین آدمیوں کو اصلاح کی عملی سعی میں ہاتھ بٹانے کے لئے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اسی طریقہ سے اب سرحد و سندھ کے انتخابات کو بھی ان شاء اللہ ہم اس مقصد کے لئے استعمال کریں گے۔

یہ ہماری ابتدائی کوششیں تھیں۔ اب اس علاج کے لئے جو جامع پروگرام ہم نے بنایا ہے وہ ہماری مجلس شوریٰ کے تازہ اجلاس کی کارروائی میں سامنے آ چکا ہے۔ اس پروگرام کی خصوصیات یہ ہیں:۔

(۱) حلقہ ہائے متفقین کی تنظیم اس غرض کے لئے ہے کہ اصلاح کے کام میں عنصر دوم کا تعاون زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر اور زیادہ سے زیادہ باقاعدگی کے ساتھ حاصل کیا جائے۔

(۲) تربیت گاہوں کا قیام اس غرض کیلئے ہے کہ ارکان جماعت کے ساتھ تمام متفقین کو بھی ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے اس رہنمائی کیلئے تیار کیا جائے۔

(۳) حلقہ ہائے متفقین کے سامنے سر دست کام کا جو ابتدائی پروگرام رکھا گیا ہے وہ اس غرض کیلئے ہے کہ متفق اصحاب اور خواتین تدریج عوام سے ربط پیدا کرنے کیلئے آگے بڑھیں اور ان کی مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، تمدنی اور معاشی حالت درست کرنے کی سعی کی ابتدا کر دیں۔ آگے چل کر رفتہ رفتہ اس دائرہ عمل کو زیادہ وسیع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) مزدوروں اور پیشہ ور گروہوں کی تنظیم اس غرض کیلئے ہے کہ ان کی معاشی مشکلات کے حل میں مدد دینے کے ساتھ ان کی اخلاقی اور دینی حالت کو بھی درست کیا جائے، اور انہیں اشتراکی تحریک کا آلۂ کار بننے سے بچایا جائے۔